خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
2014
WWW.PAKSOCIETY.COM
طاہر جاوید مغل
کے قلم سے نئی داستان ستاروں پہ کمند
اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM


انشائیہ — 07
آپ کے خط — 81
66
86
88
125
150
159

محفل شعر و سخن — قارئین — 164
167
176
ماروی — حال کے آئینے میں ماضی کے بکھرے عکس در عکس — 215
لاوا — منظر امام — 217
227
235
258

جلد 44 • شمارہ 07 جولائی 2014 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
E-mail:jdpgroup@hotmail.com (021)35802551 لیکس (021)35895313 فون: 74200 کراچی 215 خط و کتابت کا پتا: وسٹیکر نمبر
پبلشر پروپرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی


SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

نئے اور پرانے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
جلد سازی کی سہولت موجود ہے
دوکان نمبر 13

انشائیہ

جون ایلیا

# حکمت عملی

شام ہے اور ایک حالت استفہام ہے۔ میں اور میرا ہمزاد بیٹھے سوچ رہے ہیں اور بول رہے ہیں۔ یہ عمل وقفے وقفے سے جاری ہے۔ جو لفظ ہماری زبان پر بار بار آرہا ہے وہ "سیاست" ہے۔ ہے یوں کہ جہاں سماج ہے وہاں سیاست اور جہاں سیاست ہے وہاں سماج۔

دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک ایسے سماج کے خواب دیکھتا ہے جہاں کوئی سیاسی نظام یعنی حکومت یا ریاست نہ پائی جاتی ہو۔ اس گروہ کو اردو میں نراجی اور عربی میں فوضوی (Anarchist) کہتے ہیں۔ ایسا ہی سماج میرا اور میرے ہمزاد کا خواب رہا ہے۔ یہ خواب کب اور کتنی نسلیں گزرنے کے بعد پورا ہوگا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن گمان یہ ہے کہ یہ خواب ضرور پورا ہوگا۔ یہ ایک ایسا خواب ہے جسے ہمیشہ مضحکہ خیز سمجھا گیا ہے۔ اس پر انیسویں صدی میں بھی بری طرح ہنسا گیا اور اس صدی میں بھی اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انسانی ذہن کے سب سے خوب صورت خوابوں کا مذاق کیوں اڑایا جاتا ہے؟ جو خیالات انسانی ذہن کا سرمایہ ہیں، بیش قیمت ترین سرمایہ انہیں دیوانگی کی پیداوار کیوں سمجھا جاتا ہے؟ جو خیالات دیوانگی کی پیداوار سمجھے گئے انہی نے تاریخ میں انقلابی کردار ادا کیا۔ وہ فکر و خیال کے دیوانے ہی تھے جنہوں نے فرزانگی کی پرورش اور پرداخت کی۔ تہذیب کی تاریخ دراصل دیوانوں ہی کی کارگزاری کی سرگزشت ہے۔

ذکر تھا، سیاست کا۔ سیاست کو ایک ایسا عمل سمجھا جاتا ہے جو چالاکی، عیاری، سازش، فریب دہی اور دروغ گوئی سے تعلق رکھتا ہو۔ ایسا سمجھنا "سیاست" کے ساتھ بے حد افسوس ناک ناانصافی ہے۔ یہاں میں جس امر کو واضح کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں وہ یہ ہے کہ سیاست یا ملک داری (حکومت) حکمت سے تعلق رکھتی ہے اور حکمت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکمت نظری اور دوسری حکمتِ عملی۔ حکمت نظری، منطق، ریاضت، طب، علم ہیئت (Astronomy)، طبیعیات اور دوسرے علوم سے تعلق رکھتی ہے۔

اب رہی حکمتِ عملی، حکمت عملی کی تین قسمیں ہیں اور وہ ہیں تہذیب اخلاق، تدبیر منزل یعنی امور خانہ داری کی تنظیم اور سیاست (یعنی حکومت یا ملک داری) اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاست حکمتِ عملی کی سب سے برتر قسم ہے۔

اگر میری یہ بات صحیح ہے اور ظاہر ہے کہ صحیح ہے اس لیے کہ یہ بات میرے ذہن کی ایجاد نہیں ہے بلکہ مہذب معاشروں کی تسلیم شدہ بات ہے تو مجھے بتایا جائے کہ سیاست دانوں یا حکمرانوں کی اکثریت جس طرز سیاست پر عمل پیرا ہے کیا اس کا حکمت سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہے......؟

میری اس بات کے پیش نظر سیاست یا ملک داری کا کام چلانے والے لوگوں کا معاشرے کے حکیم ترین یا دانش مند ترین لوگوں کے حلقے سے تعلق ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے یا نہیں...... اگر ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ ہونا چاہیے تو کیا ہم بہت رعایت دینے کے بعد بھی سیاست دانوں یا حکمرانوں کو حکیم ترین اور دانش مند ترین نہ سہی، بہت ادنیٰ مفہوم کے اعتبار سے حکیم یا دانش مند قرار دے سکتے ہیں؟ یہاں چند لمحوں کے لیے رک کر ذرا ہنس لیجیے...... سیاست داں یا حکمراں اور حکیم ...... سیاست داں یا حکمراں اور دانش مند! توبہ توبہ...... یہ تو نیم حکیم بھی نہیں ہیں...... ہاں خطرۂ جاں ضرور ہیں۔

میں دنیا کے سیاست دانوں یا ملک داروں کی ایک بڑی تعداد سے سوال کرنا چاہتا ہوں اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا تمہارے عوام نے قومی معاملوں میں کبھی قوم کو مایوس کیا......؟ ان میں سے کس کی مجال ہے جو یہ کہے کہ مایوس کیا۔ ہرگز مایوس نہیں کیا۔ پھر تم کیسی بد بلا ہو جو اپنی قوم کو لگاتار مایوس کرتے چلے آرہے ہو، تمہارے عوام نے ہمیشہ تم پر اعتبار کیا، پر تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمہارے پیش رو اور تم ہمیشہ ناقابل اعتبار ٹھہرے۔ انہوں نے ہمیشہ تم سے اپنی عزیز ترین امیدیں وابستہ کیں پر تم نے انہیں بڑے برے اور بھونڈے انداز کے ساتھ ناامید کیا۔ تمہارا تو لا تو بس بڑبولے پن کا ہنر مند اور آنکھوں میں دھول جھونکنے پر کاربند رہا ہے۔

آخر تم لوگ کس غرے میں ہو۔ کیا تم روشنی کے بیٹے ہو۔ کیا تم رنگ و خوشبو کے بیٹے ہو، کیا تم سلیقے اور شائستگی کے لے پالک ہو......؟ نہیں جانا جاتا کہ آخر تم کون ہو؟ جنہوں نے تم سے شروع شروع میں آس لگائی، ان کی بھویں بھی سفید ہو چکی ہیں اور جوان کے بعد آئے وہ...... اور جو ان کے بعد آئے وہ اس عذاب میں مبتلا ہیں جسے ہونے کے احساس کی جان کنی کہتے ہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ انسانوں کے حقیقی مسئلوں کو نہ تو سائنس داں حل کر سکتے ہیں، نہ فلسفی، نہ شاعر اور نہ ادیب۔ یہ فرض تو صرف سیاست داں اور حکمراں ہی ادا کر سکتے ہیں اس لیے کہ عوام ان ہی کی بات سنتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اپنی بات منوانے کی طاقت صرف سیاست دانوں یا حکمرانوں ہی کو حاصل ہے۔ آج انسانوں کے مسئلے پہلے سے کہیں زیادہ الجھے ہوئے ہیں اور یہ الجھے ہوئے مسئلے کسی ایک ملک یا ایک علاقے کے عوام کو متاثر نہیں کررہے بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو متاثر کررہے ہیں۔ کیا دنیا کے سیاست دانوں اور حکمرانوں کا گروہ اس صورت حال کو حکمت پسندی، دانش مندی اور انسان دوستی کے ساتھ پیش نظر رکھے گا یا نہیں؟

❀❀❀



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

# ایک خط

محترم قارئین

السلام علیکم!

جولائی 2014ء کا دیدہ زیب شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس شمارے کے آنے تک رمضان المبارک کے رحمتوں، برکتوں اور بخششوں والے مہینے کے آغاز کا وقت ہوگا۔ دعا ہے کہ ان باسعادت لمحات سے ہر مومن کو فیض حاصل ہو (الٰہی آمین) اللہ کا کرم اپنی جگہ اور انسان کی انسان پر کرم نوازی اپنی جگہ ــــ جس طرح طوفان آتے اور گزر جاتے ہیں اور اپنے پیچھے تباہی کی بے شمار داستانیں چھوڑ جاتے ہیں اسی طرح گزشتہ دنوں بجٹ کا طوفان آیا اور گزر گیا۔ اب عوام کی بے بسی اور مہنگائی پر دہائی کیا کچھ رقم کرتی ہے اس سے کسی بھی بااختیار طبقے کو کوئی فرق نہیں پڑتا ــــ گویا حالیہ بجٹ اعداد و شمار کا ایک خوب صورت گورکھ دھندا ہے۔ امن و امان کی بگڑتی صورت حال سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا طبقہ طالب علموں کا ہے جو لوڈشیڈنگ اور شدید گرمی کے باوجود بڑی بڑی فیس دے کر کوچنگ جاری رکھتے ہیں اور جب امتحانات کا وقت آتا ہے تو شہر میں کوئی بھی حادثہ رونما ہو جاتا ہے اور اطمینان سے پرچے ملتوی ہو جاتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو زندگی کی تیز رفتاری اور شدید بے زاری ہمیں پُرسکون حالت میں کوئی کام کرنے نہیں دیتی۔ ٹیکسوں کی ادائیگی کے باوجود بنیادی سہولتوں سے محروم انسان جیسے نہ پانی ملے نہ بجلی ــــ کبھی سڑکوں سے ... ٹریفک بالکل غائب کبھی گاڑیوں کا بے تحاشا اژدہام ــــ کبھی دہشت گردی اور ڈکیتیوں کا خوف ـــ اسپتالوں سے دوا اور مسیحاؤں کی غیر موجودگی ــــ گھریلو تشدد کے واقعات، مہنگائی کے ہاتھوں لوگ متعلقہ شعبوں میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بجائے گھریلو مسائل کے حل ڈھونڈتے رہیں تو ایسے میں انسان غفلت کا شکار اور زندگی درہم برہم نہ ہو تو کیا ہو ــــ جس طرح دنیا کے نقشے پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں، اسی طرح سسپنس کے صفحات پر بھی محبوب قلم کار طاہر جاوید مغل کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو رہا ہے "ستاروں پر کمند" امید ہے کہ قارئین کی محبتوں کا ساتھ یونہی قائم رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی قارئین کے لیے ایک اور اطلاع ہے کہ بعض خطوط میں دیگر قارئین کے لیے اتنی چبھتی یا تلخ نکتہ چینی ہوتی ہے کہ شکایت کا سبب بن جاتی ہے۔ چند معقول شکایات کے نتیجے میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ذاتی تبصروں اور نوک جھوک کو حذف کر دیا جائے تاکہ محفل کے مرد و خواتین شرکا میں سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

یہ بزم گرم باتیں نہ صرف زندگی کا حصہ ہیں بلکہ ہماری محفل کا بھی ایک دلکش رنگ ہیں تو آیئے چلتے ہیں اپنی رنگ برنگی محفل کی جانب۔

✠ **محمد خواجہ، کورنگی، کراچی** سے محفل کی زینت بنے ہیں "جون کا شمارہ ملا۔ فرصت تھی ادھر پورا شمارہ پڑھ ڈالنے کی آرزو تھی مگر بجلی کی لوڈشیڈنگ، اقالت کا دورانیہ طویل۔ اب کتنے گھنٹے کی بجلی جانے کی گنتی بھی یاد نہیں۔ پانی کی شدید قلت بجلی کی وجہ سے۔ تربوز بہت مارکیٹ میں آ گیا۔ بہت ہلکا 25 روپیہ VIP۔35 سے 40 روپے۔ پوچھا بھائی۔ یہ دو اقسام کیوں، کہنے لگا رمضان کے لیے آپ کو تیار رکھتا ہے، کیونکہ اگر رمضان میں 40-50 کا تربوز لینا پڑا تو آپ کو شدید جھٹکا نہ لگے۔ شکریہ بھائی۔ سرورق بالکل نیا نہیں لگا۔ انشائیہ میں شعور ایسا فلسفہ ہے جو سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ خطوط کی محفل میں پہلا خط رضوان تنولی کریڈی کا تھا۔ رمضان پاشا نے دو جان لیوا قسط میں اتنا الجھا لیا کہ جیسے مرنے پر آ گئے۔ خدا آپ کو زندگی دے لیکن پس زنداں کی جناب گزر گئی، کہانی ختم۔ آپ کی الجھن ختم۔ ماہا ایمان کس نے کہا کہ اس محفل میں آپ کو بھول گئے۔ پس زنداں، خدا طاہر جاوید مغل کے ہاتھ میں یوں ہی قلم نہیں تھمایا۔ کیا کہانی تحریر کی، کیا منظر کشی کی۔ محبت کی معراج، انسانی درندگی، انسان کے ساتھ لیکن انجام المناک۔ آپ کی اگلی نئی داستان ستاروں پر کمند کے لیے خوش آمدید۔ برف کے جذبے، ایک بڑی عمدہ لیکن گمبھیر حالات اور دولت کی لالچ سے شروع ہو کر برے انجام پر ختم ہوئی۔ اچھی تحریر ہے۔ نیکی برباد، تنویر ریاض نے بہت گہرائی والی کہانی تحریر کی ہے۔ یہ بالکل آج کل کے دور کی بھرپور عکاسی ہے۔ دھچکا، حلیم انور نے ایک نقب زن اور ایک ذہین عورت صرف دو کرداروں سے اچھی تحریر پیش کی لیکن عورت کی ذہانت کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ خون کا رشتہ، ثمر عباس نے غیر ملکیوں کی بے راہ روی اور عیاری کی تصویر دکھا دی۔ نسخہ، منظر امام نے ایک ایسا نفسیاتی نسخہ تحریر کیا ہے، جو ایک چاہتے ہوئے بھی عمل پیرا ہونے کی جسارت نہیں کرتا لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جوان کو پایہ تکمیل پہنچا کر زندگی کی رنگینیوں کو پھیکا پڑنے نہیں دیتے۔ ابوزرتاب نے ہندوستان سے ایک انہونی اور دلچسپ تحریر پیش کی۔ کمال ہے ایک شخص آدھا، آدھا مٹھائی کھا سکتا تھا۔ کہانی کا سسپنس سوز۔ اچھا لگا۔ نظریہ حیات، بشور ہادی صاحب یہ بتائیں کس انگریزی کہانی سے متاثر ہو کر آپ نے یہ کہانی لکھی۔ اس میں شراب ہی شراب ہے۔ ہم کراچی والوں کو اتنا پانی نصیب نہیں، ہمی کی شخصیت کو کیا نام دیں۔ محفل شعر و سخن مختلف ذوق کے اشعار، ایک ایسا مجموعہ نظر جو دل و دماغ کو فرحت بخشے۔ زنگ آلود، ملک صفدر حیات کا ایک اور کارنامہ۔ چودھری حشمت عجیب احمق تھا کہ اپنی زنگ آلودگی نظر نہ آئی اور الٹے سیدھے کام کرتا رہا لیکن صاحب کے کردار اور شخصیت کی مضبوطی نے نہ صرف مسئلہ حل کر دیا۔ حساب دوستاں، الیاس سیتاپوری ہمیشہ بڑی عمدہ اور تاریخی کہانیاں لکھتے ہیں۔ اس دفعہ بھی ایک ایسی کہانی جس میں ایک معصوم شخص اور ایک مکار شخص کی داستان ہے۔ کترنیں، اس دفعہ کچھ کترنیں بہت ہی بامقصد اور دلچسپ رہیں۔



انجیر کے خواص اور نقل برائے عقل۔" (شکریہ)

✠ **توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی** سے چلے آ رہے ہیں۔ "جون کا شمارہ انتہائی خوب صورت اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے سرورق کے ساتھ 16 مئی کی ایک تپتی دوپہر کو ملا۔ اداریے میں عصر حاضر کے ایک پیچیدہ اور تقریباً لاینحل قومی مسئلے، یعنی لوڈشیڈنگ کے مسئلے کو چھیڑا گیا تھا۔ حکمران کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چار سالوں میں ضرورت سے زیادہ بجلی پیدا کی جائے گی۔ ایک جوک ہے کہ مستقبل میں والدین اپنے بچوں کو بجلی کے کھمبے کے پاس لے جا کر انہیں بتائیں گے کہ بیٹا یہاں پر پہلے تاریں ہوا کرتی تھیں اس میں بجلی نام کی ایک سہولت آتی تھی جس سے ہمارے گھروں میں روشنی ہوا کرتی تھی اب وہ دن کچھ زیادہ دور بھی نہیں کیونکہ 24 میں سے 14 گھنٹے کی لوڈشیڈنگ کا مطلب ہے بجلی اپنے اختتام کی طرف آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکی ہے۔ مہرین ناز صاحبہ عمرے پر جا کر ہمیں اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔ تاریخی کہانی حساب دوستاں میں لیث اور پولس کے درمیان عثمان کے حصول کے لیے اچھی خاصی رسّاکشی جاری ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اس بار ملک صاحب کچھ عجیب قسم کا زنگ آلود کیس لے کر آئے تھے، جہاں مجرموں کو صرف تنبیہہ دے کر کام چلایا گیا۔ کترنوں پر اس بار رضوان تنولی چھائے ہوئے تھے۔ محفل شعر و سخن میں قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت خوب تھا۔"

✠ **ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی** سے شریک محفل ہیں "جون کا سسپنس اپنے وقت پر مل گیا۔ ٹائٹل گرل کو تمام کمل کانٹوں سے لیس مجسم انتظار پایا۔ انشائیہ میں شعور اور بے شعور کیفیتوں کا موازنہ کیا۔ اداریے میں صرف اور صرف امیدوں پر ہی بھروسا ہے کہ شاید وعدوں کی جو نوید دی جاتی ہے وہ ایفا ہو جائیں مگر اے بسا آرزو خاک شد۔ محفل میں رضوان تنولی سرفہرست نظر آ رہے تھے۔ اپنا نام ناقابل اشاعت کی فہرست میں نظر آیا۔ پہلی کہانی الیاس سیتاپوری کی حساب دوستاں تھی۔ الیاس سیتاپوری کا قلم جس کی تحریر کا ہر لفظ منہ سے بولتا محسوس ہوتا ہے۔ بلاشبہ بہترین لکھنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔ پس زنداں یکایک ختم شد ہو گئی۔ غیر متوقع طور پر کہانی کا اختتام بہت جلد کر دیا گیا جس سے بہت زیادہ تشنگی کا احساس باقی ہے (کوئی بات نہیں ــــ تشنگی رہ جائے تو خواہش بھی ہوتی ہے لہٰذا ستاروں پر کمند حاضر ہے) دوسری کہانی ماروی تھی جو چوٹ لگنے کے سبب کوما میں چلی گئی تھی۔ پھر ہوش میں آ کر اس کی یادداشت ہی کھو گئی۔ اب پتا نہیں یہ ڈرامائی پوزیشن کب تک چلے۔ برف کے جذبے مہارت سے لکھی ہوئی اچھی کہانی تھی۔ دھچکا میں چور کے سامنے عورت نے بڑی کامیاب اداکاری کی۔ جس کی وجہ سے چور بیچارا بھی دھوکا کھا گیا۔ خود اپنے ہی دام میں صیاد آ گیا۔ نیکی برباد تنویر ریاض کی کہانی بھی سبق آموز رہی۔ محفل شعر و سخن میں بھی منتخب اشعار پڑھ کر مزہ آیا۔ ثمر عباس کی خون کا رشتہ میں یہ تاثر ملا کہ مغربی معاشرے میں اب بڑی عام سی بات ہو گئی ہے کہ بچے کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ اس کا اصل باپ کون ہے۔ نسخہ منظر امام کی خوب صورت کہانی تھی۔ واقعی یہ نسخہ لاجواب ہے کیونکہ شادی شدہ زندگی میں زندگی ایک ہی محور پر چلتی رہتی ہے۔ اگر اتفاق سے میاں بیوی دونوں آتش مزاج ہوں تو جمود زدہ زندگی سے بڑی جلدی اوب جاتے ہیں جس کا نتیجہ علیحدگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ولی اللہ سید عبداللہ ولی پڑھ کر روح و قلب کی بالیدگی کا سبب بنی۔ موڑ بھی اچھی کہانی تھی۔ محبت کے انداز نرالے ہیں۔ داسو دور پانڈے کی بدقسمتی تھی کہ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ مگر شاید یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو شاید آگہی کا وہ درد نہیں ہوتا جو اس کے نہ پڑھا لکھا ہونے سے ہوا۔ نظریہ حیات بھی آخری صفحات کی بہترین کہانی تھی۔"

✠ **متین سلطان، کراچی** سے تشریف لائے ہیں "جون کے سرورق کی بلوری آنکھوں والی دوشیزہ دلنواز لالی لب و رخسار شش تازہ سرخ گلاب آنکھوں کے رستے دل میں سما گئی۔ لائق صد احترام جون ایلیا کے انشائیہ 'شعور' کے سچے موتیوں کے سحر سے فیض یاب ہوا۔ سسپنس سے محبت میٹھے سروں میں، یوں ہی تو نہیں عشق میں سرمست ہوا ہوں، اک روح میری روح میں تحلیل ہوئی ہے۔ اداریے میں آپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کروں گا۔ شہر کراچی کے اکثر مقامات پر نعمت خداوندی پانی سے محروم عوام الناس کو کرب و بلا کی یاد تازہ کرواتی ہے۔ محمد عزیز سے قبل ایکشن میں عمدہ تبصرہ کے ساتھ نمایاں نظر آئے۔ وسیم احمد خان کا پہلا نیو تبصرہ محفل کی زینت کو چار چاند لگا گیا۔ آغا فرید خان میری آنکھوں کی پلکوں پہ قدم رکھتے ہوئے محفل میں آ جاؤ۔ پیارے دوست قریشی اور احسان سحر سے محفل میں شامل ہونے کی درخواست۔ کہانیوں کی ابتدا نم آنکھوں کے ساتھ پس زنداں کی الوداعی قسط سے کی۔

الیاس سیتاپوری اپنے قلم کے سحر سے قاری کو ماضی کے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔ حساب دوستاں تھیں تحریر پسند آئی۔ کاشف زبیر کی برف کے جذبے میں ہم قاتل دو بیر کو سمجھ رہے تھے لیکن اصل مجرم ڈاکٹر میسن نکلا۔ تنویر ریاض کی نیکی برباد میں ایرس نے نینسی سے خوب انتقام لیا۔ حلیم انور کی دھچکا میں ولیمن نے پیٹر کی مکمل تباہی کا سامان کیا۔ ثمر عباس کی خون کا رشتہ مغربی معاشرے کی بے راہ روی کی داستان، جہاں بچے اپنی شناخت کے سلسلے میں تذبذب کا شکار رہتے ہیں۔ ماروی مکمل بور کہانی۔ منظر امام کا نسخہ بھی خوب رہا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر سید عبداللہ والی سسپنس کی اعزازی تحریر ثابت ہوئی۔ آخری صفحات کا خصوصی تحفہ بشور ہادی نے نظریہ حیات کے حسین دلکش روپ میں دیا۔ تحریر نے سسپنس کے آخری صفحات کا حق ادا کر کے شمارہ یادگار کر دیا۔ محفل شعر و سخن میں قدرت نیازی، صفدر معاویہ، سید اکبر شاہ، محمد عزیز سے، داؤد اشفاق کا انتخاب پسند آیا۔ مجموعی طور پر جون کا سسپنس شاہکار ثابت ہوا۔"

✠ **ایکسٹو فرام پاکیشیا** محفل میں شرکت کر رہے ہیں "زندگی میں پہلی بار فرصت کے لمحات میسر آئے کیونکہ علی عمران پوری ٹیم کے ساتھ ایک مشن پر ملک سے باہر تھا تو سوچا کہ فارغ رہنے سے بہتر ہے کہ کچھ کیا جائے چونکہ سسپنس سے ایک عرصے سے وابستہ ہوں تو پہلی فرصت میں محفل میں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

حاضر ہونے کا سوچا اور خط لکھنے بیٹھ گیا۔ (خوش آمدید) جون کے شمارے کے سرورق کی لڑکی ہمیں اپنے حسن کے جال میں پھنسانے میں ناکام رہی۔ اسے نظرانداز کر کے انشائیہ شعور سے انصاف کیا اور اگلا قدم رکھ دیا محفل دوستاں میں۔ منشی محمد عزیز اور بلیک کیٹ کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ اعجاز احمد راحیل صاحب بھی اچھا لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے حساب دوستاں پڑھی۔ اچھی کہانی تھی۔ یونس اور لیث کی دشمنی کا اگلے ماہ پتا چلے گا۔ برف کے جذبے حقیقت میں لہو کی گردش تیز کر گئی۔ پس زنداں میں ہادی نے سب کچھ کھو کر بھی سب کچھ پالیا اور جلالی اپنے انجام سے دوچار ہوا۔ نگی برباد ایک عام سی کہانی لگی۔ زنگ آلود میں چودھری بشارت کی خاص راز رہ گئی اور تعویذوں کا اصل چکر بھی سامنے آ گیا۔ خون کا رشتہ بھی کئی حقائق عیاں کر گیا۔ ماروی کا کھن چکر ابھی تک جاری ہے۔ کبھی ایک دوسرے کا تعاقب تو کبھی قیدیوں کا ادل بدل اور اب ایک بار پھر قیدی بدل گئے۔ شادی شدہ افراد نسخے سے استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سید عبداللہ شاہ کے واقعات دل کی آنکھوں سے پڑھے۔ موڑ ایک فضول سی کہانی لگی۔ نظریہ حیات ایک بہترین کہانی تھی۔ ایسی غلط فہمیاں ہی ہنستے بستے گھروں کو اجاڑ دیتی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں اچھا انتخاب پڑھنے کو ملا۔ مراسلات اس بار بہت ہی کم رہے۔“

✼ **باوا امتیاز شاہ عاصم جسپال**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے حاضر ہیں ”اس ماہ کا سسپنس 22 تاریخ کو ملا۔ حسینہ اپنی آنکھوں اور ہونٹ کی جیسے نمائش کر رہی تھی۔ بی بی بشریٰ افضل بہاول پور سے بہت اچھا تبصرہ کیا اور اعجاز راحیل کی تو کیا بات ہے۔ کہانیوں میں ماروی، پس زنداں دونوں بہت اچھی جا رہی ہیں، دونوں میں خوب مقابلہ ہوگا۔ دونوں اسٹوری اچھی ہیں۔ باقی تمام قارئین اور سسپنس اسٹاف کو ہم سب سزائے موت کے قیدیوں کی طرف سے بہت بہت سلام۔ شعر سارے خوب صورت تھے خاص طور پر سوہا جی لاہور کا شعر بہت پسند آیا۔ ماہین فاطمہ کراچی، طالب حسین طلحہ کا انتخاب پسند آیا۔“

✼ **قیصر اقبال گچہ**، بکول، ضلع بھکر سے تبصرہ کر رہے ہیں ”زندگی ایک سفر ہے اس سفر میں کئی لوگ ہم سفر بنتے ہیں۔ کچھ زندگی کی بھیڑ میں گم ہو جاتے ہیں تو کچھ راستے میں ہی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ بہرحال اپنی تو یہی دعا ہے کہ ”رت بدلے چاہے موسم بدلتا رہے، سسپنس سے ہمارے پیار کا دیا یوں ہی جلتا رہے۔ (اس محبت کا شکریہ) گرمیوں کی نوید سناتا جون کا سسپنس 16 مئی کو ملا۔ سرورق کی حسینہ کو ملنگ کے ساتھ اس کے حال پر چھوڑا اور انشائیہ شعور سے استفادہ حاصل کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم بے شک وقت کا ایک مشغول پن اور تاریخ کی بڑ بونگ ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا پس زنداں سے کی۔ گو کہ حجاب ہادی کو ابدی جدائی دے گئی مگر حجاب ہادی کے دل میں اور کہانی قارئین کے دل میں ہمیشہ رہے گی۔ نواب صاحب نے ماروی کو ایک چکر بلکہ گھن چکر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسے اتفاقات نواب صاحب کی کہانیوں میں ہی ہوتے ہیں۔ جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ نظریہ حیات میں نشوہ ہادی نے ایک معمولی سی غلط فہمی کو اتنی بڑی کہانی کا روپ دے دیا۔ اگر عادل پوری کوشش کرتا تو فہمی کو اصل بات بتا سکتا تھا۔ پہلی کہانی حساب دوستاں لیث، یونس، خنسا اور دعنان کے گرد گھومتی تاریخی کہانی جس میں دوست دشمن کا اصل فیصلہ اگلے ماہ ہوگا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی سید عبداللہ شاہ کے واقعات اور بچپن سے اللہ کے راستے میں سفر اور کرامات دل پر اثر کر گئے۔ زنگ آلود میں ملک صفدر حیات نے تعویذوں کا بھانڈا پھوڑا اور اپنی حکمت عملی سے محسن شاہ اور خالدہ کو قابو کر کے چودھری بشارت کی زنگ آلودگی کو چھپالیا۔ کاشف زبیر کی برف کے جذبے میں ڈاکٹر میسن کا منصوبہ تو ٹھیک ہی تھا مگر جیف اور شیری کے سامنے ناکام ہو گیا۔ ثمر عباس کی خون کا رشتہ میں آخر کار داسٹیفورڈ، جیکسن اسٹیفورڈ سوم کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ منظر امام کی نسخہ میں رضوان کی بدولت لوید نے ایک نیا تجربہ سیکھا۔ نگی برباد میں نیلسی کے انجام سے ایرس کے بے چین دل کو سکون ملا۔ سلیم انور کی دھچی میں پڑی کی ہمدردی اس کے گلے کی ہڈی بن گئی۔ محفل شعر و سخن میں اعجاز احمد راحیل اور قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہترین رہا۔ مجموعی طور پر جون کا سسپنس گرمیوں کا بہترین تحفہ رہا۔“ (بہت شکریہ)

✼ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے چلے آ رہے ہیں ”سسپنس کا تازہ شمارے کا گیٹ اپ بہت عمدہ تھا۔ اس بار فہرست میں کوئی جدت نہیں تھی۔ انشائیہ سچ سے بھرپور تھا اور اتنا ہی کڑوا بھی۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے رضوان تنولی صاحب کو مبارک باد، دیگر تبصروں میں منشی محمد عزیز، بلیک کیٹ، ماہا ایمان اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کے تبصرے بہت پسند آئے۔ اشعار کی محفل میں محمد حنیف آصف، اویس احمد خان، ماہین فاطمہ کے اشعار بہت پسند آئے۔ برف کے جذبے غیر ملکی کہانیوں میں سب سے بہترین کہانی تھی۔ پس زنداں آپ کی فرمائش یا حکم پر مغل صاحب نے جلدی سمیٹ لیا۔ نگی برباد پسند نہیں آئی۔ معذرت! زنگ آلود، یہ تو پرانے زمانے کے مرد کا قصہ تھا، ماہرین کہتے ہیں موجودہ دور میں ایسے زنگ آلود مردوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ خون کا رشتہ یورپ اور امریکا میں تو یہ ایک عام سی بات ہے کہ بیٹا جائز ہے اور وہ حقیقی اولاد ہے۔ ماروی کی یہ قسط بڑی تہلکہ خیز رہی، بڑی اٹھا پٹخ اور دوڑیں پیاس ہو گئیں، مزہ آ گیا۔ منظر امام کا نسخہ بہت عمدہ تھا، بڑی ہنسی آئی۔ بھارتی کہانی موڑ اچھی نہیں لگی۔ محترمہ نشوہ ہادی کی کہانی نظریہ حیات ایک ناقابل فراموش کہانی تھی، کافی عرصہ یاد رہے گی۔“

✼ **ناہید شبیر**، ڈیرہ غازی خان سے تشریف لائی ہیں ”سسپنس عرصہ 2 سال سے میرے مطالعے میں ہے۔ خط لکھنے کی ہمت پہلی بار کی ہے (خوش آمدید) مئی کی ہلکی پھلکی گرمی میں جون کا سسپنس ملا۔ سرورق کی حسینہ اچھی لگی۔ فہرست کو ایک نظر دیکھ کر انشائیہ شعور پڑھا۔ محفل میں رضوان تنولی کو اول آنے پر مبارک باد۔ محمد جاوید کھلے منہ اور بند آنکھوں سے ہوائی جہاز دیکھتے نظر آئے۔ پس زنداں ختم ہوئی اور ختم ہونے والی یادیں دے گئی۔ ماروی کا ہم کیا کہیں۔ بس نواب انکل کہانی کو گھمائے جا رہے ہیں۔ حساب دوستاں میں دوستوں کا حساب کتاب ابھی باقی ہے۔ زنگ آلود میں ملک صاحب نے اندر ہی اندر سارا مسئلہ حل کر لیا، برف کے جذبے میں ڈاکٹر میسن کا ہیرے چرانے کا منصوبہ ناکام رہا۔ نظریہ حیات ایک اچھی کہانی رہی



رامین کا کردار بیسٹ رہا۔ سید عبداللہ شاہ کے ایمان افروز واقعات نے دل کو ایمان کی جلا بخشی۔ خون کا رشتہ مغربی معاشرے کی ایک اٹل سچائی ہے۔ دھچکا میں سیر کو سوا سیر مل گیا۔ نگی برباد میں ایرس نے اپنے لیے سکون کا سامان کر لیا۔ نسخہ گزارے لائق لگی۔ شعر و سخن میں ماہا ایمان، ایم افضل، توصیف احمد اور رضوان تنولی کا انتخاب اچھا لگا۔“

✼ **عادل خان سردار یاب خٹک**، فرام چارسدہ حاضر محفل ہیں ”اس دفعہ کا سرورق کا ڈیزائن دیدہ زیب تھا خاص طور پر دوشیزہ اور رنگ کہانی کا۔ جلدی سے جون ایلیا صاحب کی شعور پڑھی جو کہ ہمارے معاشرے میں شاید کہیں بھی نہیں ہے۔ میرے پیپرز ہو رہے تھے اس لیے محفل میں نہیں آ سکا حالانکہ پوچھا تو کسی نے بھی نہیں۔ ابرار وارث بھائی اس دفعہ غائب کیوں؟ پس زنداں کی آخری قسط دیکھ کر میں تو حیرت زدہ رہ گیا۔ میرے خیال میں ابھی تو کہانی نے Start لیا تھا اور ختم بھی ہو گئی۔ زیادتی ہے مغل انکل جی..... ویسے آخری قسط تک بڑی خوب صورتی سے طاہر صاحب کا قلم موتی بکھیرتا رہا۔ حجاب کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔ ستاروں پر کمند نام ہی بہت زبردست ہے۔ لکھاری کا بھی اور کہانی کا بھی..... زنگ آلود، ملک صفدر حیات کی دلچسپ تحریر رہی۔ نسخہ منظر امام کی مختصر کہانی تھی۔ نظریہ حیات کچھ عجیب سی لگی ایک مسلمان عورت ہر دن شراب پیتی ہے ذرا سی غلط فہمی پر طلاق لے لی۔ ویسے غلط فہمی واقعی غلط تو نہیں تھی۔ ماروی بڑی طوفانی رفتار سے جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی برف والی کہانی بالکل رہ گئی۔ سوری دینے والی کہانی ہے آپ کی جو مجھے پسند نہیں آئی۔ کرنیں اور لطیفے زبردست تھے۔ اکبر شاہ اور ابرار وارث کو سلام۔“

✼ **مہرین ناز**، حیدرآباد سے خوب صورت تبصرہ لیے حاضر ہیں ”ماہنامہ سسپنس برائے جون 16 مئی کو مجنوں کا سندیسہ لیے حاضر ہوا۔ ہم ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کو سسپنس ہمیشہ وقت پر مل جاتا ہے۔ سرورق، ستاروں پر کمند کی عکاسی کرتا ہوا جھلستی گرمی میں ٹھنڈی چھاؤں جیسا لگا۔ انشائیہ میں جون صاحب کی باتیں بڑی گہری اور حقیقت کے قریب ترین دکھائی دیتی ہیں۔ اداریہ کے پیغام پر صدق دل سے عمل پیرا ہونے کا عزم کرتے ہوئے چلتے ہیں اپنی بزم میں اور دیکھتے ہیں، اس شدید گرم موسم میں وہاں کا درجہ حرارت کتنا ہے۔ بلیک کیٹ، شوکت شہریار میرے بھائی ہیں۔ ماہا ایمان جی آپ بھی کاٹ دار تحریر کی مالک ہیں۔ الیاس سیتا پوری کی حساب دوستاں سے اسٹارٹ لیا۔ واقعی حساب دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا میزان کھری ہونا ضروری ہے۔ لیث ایک سادہ لوح انسان تھا۔ یونس جیسا چرب زبان اور لالچی انسان اس سے ٹکرا گیا۔ اس شاطر بندے خنسا جیسی لڑکی کے ذریعے لیث پر قابو پانے کی کوشش میں لگا رہا۔ ہر دلعزیز مصنف طاہر جاوید مغل صاحب کے قلم کا دلکش انداز ہر من کو بھاتا ہے۔ پس زنداں ایک ایسی داستان ختم تھی جس میں محبت اور عقیدہ کا کھیل پیش کیا گیا۔ واقعی انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ حجاب کی موت سے دل بہت دکھی ہو گیا۔ اب ستاروں پر کمند کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ماروی جناب نواب صاحب کی پُرکشش و دلکش موتیوں سے پُر ایک ایسی مالا ہے جو رسالے میں جگمگا رہی ہے، لیکن ہر قسط میں نئے نئے کرداروں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ آخری صفحات ہمیشہ سسپنس کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں۔ اس بار نشوہ ہادی نظریہ حیات لے کر حاضر ہیں۔ ہر انسان کا اپنا اپنا نظریہ زندگی ہوتا ہے۔ کچھ لوگ خوش گمانیوں میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔ جس طرح اس اسٹوری میں فہمی نے اپنے ساتھ کیا، جو دیکھا اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کیا۔ ثمر عباس کی خون کا رشتہ خاصی اچھی رہی۔“

✼ **عمران علی**، تحصیل شورکوٹ، ضلع جھنگ سے محفل میں تشریف لائے ہیں ”ہاں جی آ گئے ہیں ہم بھی اس رنگ برنگی اور پھولوں سے اور قہقہوں سے سجی محفل میں، امید ہے میری طویل غیر حاضری کو معاف کیا جائے گا۔ بہت کوشش کی محفل میں آنے کی بس ہر بار کوئی نہ کوئی مصروفیات بن جاتی۔ اس دفعہ

## محبتوں کے سفیر

طاہر جاوید مغل جی!

”سدا سلامت رہو، تاقیامت رہو، آنکھوں کے نور میرے حضور آپ کی یاد آئی، قلم نے ساتھ دیا، کاغذ نے سینہ حاضر کیا۔ ذہن نے آپ کی یاد میں پھول برسائے پھر دل نے گلدستہ سخن تحریر کیا پھر میں نے لکھا جناب القدر، خورشید نظر، الفت کے پیکر، محبت کے نقیب میرے حبیب، باخلوص، انیق، بلند و رفیق فن، خون قلب، گلدستہ نزاکت، تاجدار شرافت اور آپ کے لیے کیا لکھوں کہ آپ کو میری چاہت کا اندازہ ہو جائے۔ بس مختصر سا قصہ، ملاقات کا بہانہ دوستی کا نذرانہ، وادی محبت کی راہگزر سے خوشبوؤں کو سمیٹے آپ کی خدمت میں میرا محبت بھرا خط حاضر ہے۔ میں ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں، جو آپ جیسا عظیم قلم کار ہمارے ادبی ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے ادب کے آکاش سے ڈھونڈ کے لائے۔ اللہ تعالیٰ انکل معراج رسول کی عمر دراز کرے جنہوں نے ہم کو آپ سے متعارف کروایا۔ بلاشبہ آپ ہر دلعزیز مصنف ہیں، آپ کی تحریریں جادو اثر رکھتی ہیں۔ بندے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ منظر نگاری میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے میں آپ کے خوب صورت ہاتھوں کو چوم لوں۔ میرے دل سے آپ کے لیے اور انکل معراج رسول کے لیے ہر پل دعائیں نکلتی ہیں۔ میں اک عام سا شاعر ہوں آپ کے لفظوں کی کسک محسوس کرنے کی جستجو کرتا رہتا ہوں۔ مجھے آپ کے لکھے ہوئے الفاظ بہت اچھے لگتے ہیں، مجھے غزل لکھنے میں سپورٹ کرتے ہیں آپ کی موجودہ تحریر پس زنداں کا دلدوز، المناک کبھی نہ فراموش ہونے والا انجام مجھے خون کے آنسو رلا گیا ہے۔ مغل جی ہم نے بھی ایک درد کا دریا عبور کیا ہے اور اس کے پار آج ہم اکیلے نوحہ کناں ہیں۔ ستاروں پر کمند بھی ہمیں کبھی مایوس نہیں کرے گی۔ بس یہی سوچ کر ہم پس زنداں کو الوداع کہنے کے بعد آپ سے آس رکھتے ہیں کہ آپ کا قلم اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھے گا۔ آخر میں انکل معراج رسول کی صحت یابی ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کی کامیابی اور آپ کے لیے آپ سب کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں۔“

شاعر اعجاز احمد راحیل ساہیوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

شمارہ 19 تاریخ کو ملا اور ساتھ یہ بھی خبر ملی کہ بس زنداں کی آخری قسط ہے۔ بالکل یقین نہ آیا۔ بس پھر نہ پوچھو جو حال ہوا۔۔۔ ٹائٹل بس عجیب سا لگا۔ اک اداس اور معصوم سی لڑکی۔ پہلے نمبر پر رضوان تنولی اور دوسرے نمبر پر توصیف صاحب بیٹھے تھے جو میری طرح کافی غیر حاضری کر کے حاضری لگوانے آئے تھے۔ کل مروت اللہ آپ کو صحت دے۔ آمین۔ مہرین ناز ہماری دعا ہے اللہ آپ کو اپنے گھر کی بار بار حاضری نصیب فرمائے، آمین۔ ہمیں بھی اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے بہت بے صبرے پن سے بس زنداں پڑھی، آخری قسط دیکھ کر اعتبار نہ آیا کہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گی۔ طاہر صاحب سے امید تھی کہ کوئی لمبی اسٹوری لائیں گے۔ نشور ہادی کی کہانی نظریہ حیات بہت اچھی اسٹوری تھی، واقعی ہر انسان اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ ماروی بھی بڑی تیزی سے جاری ہے، اس بار تو ساری کہانی مرینہ اور مراد کے اردگرد گھومتی رہی۔ ملک صفدر حیات صاحب کی کہانی زنگ آلود اچھی سبق آموز کہانی ثابت ہوئی۔ تاریخ اور ماضی کے آئینوں سے جھانکتی ہوئی الیاس سیتاپوری کی کہانی حساب دوستاں اگر ایک سادہ لوح انسان کے ساتھ چالاک انسان نہ ہو تو سادہ لوح بھی خود میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ سید عبداللہ دلی کی حیات کا مطالعہ کر کے دل کو بہت سکون ملا۔ کترنیں بہت اچھی تھیں۔ اشعار تقریباً سب اچھے اور معیاری تھے۔"

⌘ **فوزیہ تبسم**، خانیوال سے جلوہ افروز ہیں "جون کا سسپنس 19 مئی کو ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں آیا۔ شعور کو جگاتا انشائیہ شعور سے ہو کر محفل میں حاضری دی تو محفل کے ہر دلعزیز قیصر اقبال کی کمی محسوس ہوئی۔ سب سے پہلے بس زنداں پڑھی۔ حجاب کا انجام بہت دکھی کر گیا۔ ماروی میں پھر مراد اور محبوب ایک دوسرے کی جگہ لے رہے ہیں۔ زنگ آلود میں ملک صفدر حیات کی کوششیں رنگ لائیں اور محسن شاہ اور ملک صاحب کا فیصلہ پسند آیا۔ حساب دوستاں میں یونس اور لیث کا مکمل کرتا سامنا اگلے حصے میں ہوگا۔ آخری کہانی نظریہ حیات کچھ خاص نہیں تھی۔ سید عبداللہ دلی کا اللہ کے راستے میں سفر اور واقعات بہت پسند آئے۔ لسوتیلیوں پر بنسی بکھیر گئی۔ کاشف زبیر کی برف کے جذبے ایک بہترین تحریر تھی۔ دھچکا اور خون کا رشتہ بھی پسند آئیں۔ اس دفعہ کترنیں بہت کم تھیں جبکہ محفل شعر و سخن میں روا انجکاری کا انتخاب پسند آیا۔"

⌘ **اشوک کمار**، میر پور خاص سے تبصرہ کر رہے ہیں "ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ٹائٹل گرل بھی اپنے محبوب کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش فہمیوں میں مبتلا ہو رہی ہے، جون صاحب کا سبق آمیز انشائیہ پڑھ کر ہماری روح تک لرز اٹھی۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح لاجواب رہا، ایڈیٹر صاحب کے خیالات قابل غور و عمل ہیں۔ ماہا ایمان کہاں غائب تھیں اتنے دن؟ بہت دنوں بعد درشن کروایا آپ نے۔ اس دفعہ سسپنس میں بڑی دلگداز کہانیاں ہیں جو دلوں کو گرما گئیں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل صاحب کی بس زنداں پڑھی۔ یہ بھی ان کی مخصوص طرز تحریر ہے جو کبھی بھی قاری کو بور نہیں ہونے دیتی۔ حجاب کی موت اور ہادی کی محبت بہت رنجیدہ کر گئے۔ تاریخی کہانی حساب دوستاں بھی بہت معلوماتی رہی۔ الیاس سیتاپوری صاحب نے دوست نما دشمن کی پہچان کروائی ، لیث بھی یونس کی چال بازیوں سے بہت کچھ سیکھ گیا۔ نظریہ حیات نشور ہادی صاحب کی بہترین کاوش ثابت ہوئی۔ تنگ نظری ہمارے معاشرے کا خاصہ بن چکی ہے۔ محی الدین نواب کی ماروی اوسط درجہ پر رہی۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے زنگ آلود، معاشرے کی خرابی کی تصویر ہے جہاں عورت کی حیثیت کچھ نہیں اس میں عورت، عورت پر ظلم ڈھاتی ہے اور دوسرے کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ سسپنس کی ٹیم کے لیے نیک خواہشات اور مزید کامیابیوں کی دعا۔" (بہت شکریہ)

⌘ **یمنیٰ راجپوت**، چکوال سے تشریف لا رہی ہیں "سسپنس سے ملاقات محض اتفاق ہی ہے۔ مارچ میں اپنی ایک کزن کے پاس راولپنڈی جانا ہوا تو وہاں سسپنس سے جان پہچان ہوئی۔ میں نے سرسری طور پر ایک اسٹوری پڑھنا شروع کی تو مجھ پر لفظوں کے جادو نے ایسا اثر کیا کہ میں کھو سی گئی۔ طاہر جاوید مغل نے اس ماہ کہانی کا اینڈ بھی کر دیا۔ مغل صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں حجاب اور ہادی صاحب کی محبت کی داستان دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی مگر حجاب کی موت نے ہمیں رلا دیا، برف کے جذبے میں ایک باہمت عورت کی جدوجہد نے کافی متاثر کیا۔ نیکی برباد میں پڑھ کر یقین ہوا کہ عورت، عورت سے بہت جیلس ہوتی ہے۔ دھچکا میں ایک ذہین عورت سے سامنا ہوا، زنگ آلود بھی اچھی لگی۔ خون کا رشتہ نے کافی متاثر کیا کہ دولت بہت ظالم شے ہے، رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔ نواب صاحب کی ماروی گزارے لائق ہے۔ منظر امام کی کہانی نسخہ پڑھ کر ہم بہت دیر تک انجوائے کرتے رہے۔ نظریہ حیات میں نشور ہادی نے واضح بتا دیا کہ غلط فہمیاں ہماری زندگی کو تباہ کرتی ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے سید عبداللہ دلی جیسے اللہ کے نیک بندے کی زندگی کے بارے میں کافی معلومات دی ہیں۔ سرورق کی حسینہ کا شاداب چہرہ بہت بھلا لگا۔ آپ کے خط پڑھنے کا مزہ ہی کچھ الگ ہے۔ بشریٰ افضل کا تبصرہ بہت اچھا لگا۔ محفل شعر و سخن کے سب اشعار بہت اچھے لگے ہیں۔" (شکریہ۔۔۔ مگر آپ کا خط پڑھ کر ایسا نہیں لگا کہ آپ نے پہلی بار سسپنس کو پڑھا ہے۔۔۔ گویا۔۔۔ خیر بہت اچھی بات ہے)

⌘ **ملک سعید**، چکوال سے چلے آ رہے ہیں "19 مئی کو اپنا پہلا پیپر دے کر واپس آ رہا تھا جب سسپنس کو ایک بک اسٹال پر اپنے انتظار میں بے چین و بے قرار پایا۔ ہاشم ندیم صاحب نے یہ فقرہ اس دفعہ کی ٹائٹل گرل کے لیے ہی کہا تھا کہ "ایسا نہیں ہے کہ میں حسن سے آشنا نہیں ہوں لیکن کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو حسن کو بالکل نئی تعریف دے دیتے ہیں۔ بس زنداں کے اتنے جلدی اختتام کی توقع تو ہرگز نہیں تھی لیکن کچھ کام خلاف توقع بھی ہو جاتے ہیں۔ کل دوسرا پیپر ہے لیکن پھر بھی خط لکھنے کے لیے وقت نکال لیا ہے تو پلیز اب بلیک لسٹ کی نذر مت کیجیے گا۔ تمام دوستوں کو خصوصاً تنسیر عباس بابر بھائی کو سلام رضوان تنولی کو بھی دلی ۔۔۔۔ مبارک باد۔" (شکریہ)

⌘ **محمد قدرت اللہ نیازی**، بکھیم ٹاؤن، خانیوال سے بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کر رہے ہیں "15 مئی کو اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا تو



معلوم ہوا کہ یار لوگوں نے جون کے شمارے کا ٹائٹل اپ لوڈ کر دیا ہے یعنی سسپنس مارکیٹ میں آ چکا ہے۔ سرورق کی حسینہ بھی عوام کی طرح سوچوں میں گم نظر آئی کہ بجٹ آنے والا ہے کیا بنے گا۔ جون ایلیا انسانی شعور کو موضوع بنائے کڑھ رہے تھے۔ اداریہ حکومتی وعدوں اور دعوؤں کی قلعی کھولتا نظر آیا۔ بجلی کی فراہمی کا وعدہ موجودہ حکومت نے انتخاب میں نعرہ کے طور پر استعمال کیا لیکن اب اس وعدہ کو پورا کرنا اپنے بس سے باہر کی چیز بتا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں کئی حکومتی اداروں کی بجلی نادہندگی کی وجہ سے کاٹ دی گئی، حکومتی اداروں کا یہ حال ہے تو عوام کیا کرے گی؟ مبارک قبول ہو۔ توصیف احمد! سسپنس کی محبت واقعی کمال کی ہے کہیں جانے نہیں دیتی۔ عبدالغفور خان! آپ شاید خطوں کی تعداد بتانے ہی آئے تھے؟ کبھی کوئی کہانیوں پر تبصرہ، کوئی دوستوں سے چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ اپنے خط کو دیکھا تو پتا چلا بہت کچھ ایڈٹ کر کے شائع کیا گیا۔ بہر حال پھر بھی قبول ہے۔ (شکریہ) احمد خان توحیدی! آپ بے فکر رہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں آلو ہائے ہائے، آلو ہائے ہائے! بس زنداں کا اختتام حسب توقع ہوا۔ ہادی کے پرخلوص جذبات حجاب کی رہائی کا سبب بنے تاہم کسی طرح فیصل اور اس کے والد نے بھی اس میں بڑا حصہ ڈالا یہ اور بات کہ "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" بس زنداں کے اختتام کے ساتھ ہی ستاروں پر کمند کی خوش خبری دی گئی اچھے سلسلے کی امید رکھتے ہوئے انتظار رہے گا۔ ملک صفدر حیات کی زنگ آلود میں گھریلو چپقلش کارفرما نظر آئی۔ سلیم انور کی دھچکا حقیقتاً کیر ولین کا پیٹر کے لیے دھچکا ثابت ہوئی یہ تو وہی بات ہوگئی "چوروں کو پڑ گئے مور"۔ تحریر ریاض کی نیکی برباد میں نینسی کا رویہ ایرس کے لیے تازیانہ ثابت ہوا اور وہ نینسی کی جان تک لینے پر خود کو حق بجانب سمجھنے لگی۔ ثمر عباس کی خون کا رشتہ مغربی معاشرے کی تلخ حقیقتوں سے آگاہی دیتی شمارے کی زینت بنی۔ منظر امام کا نسخہ حقیقتاً مجرب محسوس ہوا۔ سید عبداللہ دلی کے حالات زندگی پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ محفل شعر و سخن میں قیصر اعوان سرگودھا کا انتخاب بہترین لگا، کترنوں کی تعداد کافی کم تھی۔"

⌘ **مہر اختر عباس**، خانیوال سے تشریف لائے ہیں "ایک سال کی طویل غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر اپنی محفل میں حاضر ہیں گرہم نے سسپنس سے علیحدگی بالکل نہیں کی تھی۔ (شکریہ) اصل میں والد محترم کی ڈیتھ کے بعد غم نکالنا بہت مشکل ہو گیا تھا مگر اب بس زنداں کا اینڈ پڑھ کر بے اختیار قلم کا سہارا لیا۔ مغل صاحب کو اتنی خوب صورت تحریر لکھنے پر دلی مبارک باد۔ ماروی بھی بہت خوب جا رہی ہے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری ایک عمدہ تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ آخری صفحات پر بھی نشور ہادی نے ایک اعلیٰ تحریر پیش کی۔ زندگی میں جلد بازی میں اتنے بڑے فیصلے کرنے والے ہمیشہ پچھتاوے کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ زنگ آلود بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل میں سب کے تبصرے اچھے تھے۔ توصیف احمد کا تبصرہ زبردست تھا۔ بشریٰ افضل کے خوب صورت الفاظ پسند آئے۔ خشی محمد عزیز سے، اعجاز احمد راحیل بہت اچھے انسان ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ رمضان پاشا انکل حوصلہ رکھو اور سے والے ہمارے ساتھ زیادتی نہیں کرتے بس جگہ کی کمی آڑے آ جاتی ہے۔ مہرین ناز باجی مجھے آپ کی عمرہ پر جانے والی بات پر بہت خوشی ہوئی۔ محفل میں بھائی تنسیر عباس، عادل خان اور حکیم رضا شاہ کی کمی محسوس ہوئی۔" (آپ کے والد کے انتقال پر افسوس ہوا)

⌘ **عاطقہ شاہین**، اڈا روتی سے شریک محفل ہیں "سسپنس اس بار ایک معجزے کی طرح 19 تاریخ کو مل گیا، ورنہ ہمیں تو ایک مدت تک انتظار رہتا ہے۔ ایک نگاہ ٹائٹل گرل پر ڈالی اور یوں لگا کہ ڈاکر انکل نے خود کہیں سوچوں میں گم ہو کر اسے بنایا ہے۔ لگتا ہے کسی کے ہجر میں تڑپ رہے ہیں جو ہر بار اداسی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ جون ایلیا کا شعور پڑھا۔ جون ایلیا سارا دل تو آپ کے انشائیہ پر فدا ہو جاتا ہے۔ شعور خدا کی ایک لازوال نعمت ہے۔ پھر اداریہ میں قدم رکھا تو یہاں لوڈشیڈنگ کا وہ رونا رو رہے ہیں جو شاید ہماری ساری زندگی وقت نزاع تک ہماری قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آج کل آپ کا موڈ آف ہے خیر تو ہے؟ مہرین ناز واقعی آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے رکن جناب اطہر صدیقی کو اللہ تعالیٰ جنت میں اعلیٰ درجہ عطا فرمائے۔ آمین۔ کہانیوں کی طرف آتے ہیں، سب سے پہلے طاہر جاوید صاحب کی بس زنداں پڑھی جس کے لیے انتظار کی گھڑیاں بہت مشکل سے گزاری تھیں، کیا کہنے ہیں طاہر صاحب! کس انداز سے کہانی پایۂ تکمیل کو پہنچی، برسوں یاد رہے گی۔ ہادی تیری محبت کو سلام! ماریوں کی طرف بڑھتے گئے تو بس زنداں نے دل کو ایسے جکڑا کہ پھر آزاد ہو ہی نہیں پائے پڑھواں دار قسط تھی ماروی کی بھی۔"

⌘ **حوریہ علی اینڈ مقدس**، نورنگ سے چلی آ رہی ہیں "امتحانات کے باوجود ہم جون کا سسپنس لینا نہیں بھولے اور ساتھ ساتھ خط لکھنا بھی یاد رہا۔ انشائیہ شعور کے حقائق سے اتفاق کرتے ہوئے محفل میں آئے۔ رضوان تنولی کا تبصرہ جامع تھا۔ مبارک باد قبول کریں۔ بس زنداں ختم ہوئی اور حجاب کی موت ہادی کے دل پر یادوں کے زخم رقم کر گئی۔ ماروی میں قیدیوں کے ایک دوسرے کی جگہ لینے کا سلسلہ بھی جاری ہے اور شاید آگے بھی رہے گا۔ حساب دوستاں میں اگلے حصے میں سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ زنگ آلود میں گھروں میں پیدا ہونے والے مسائل اور تعویذوں کی حقیقت بیان کی گئی۔ معمولی غلط فہمی سے رشتے کیسے ٹوٹ جاتے ہیں، یہ بات آخری کہانی نظریہ حیات پڑھ کر پتا چلی۔ سید عبداللہ دلی بچپن سے ہی ولی اللہ ثابت ہوئے۔ خون کا رشتہ بھی خوب رہی۔ نسخہ ہنستی مسکراتی تحریر ثابت ہوئی۔ برف کے جذبے میں ڈاکٹر میسن کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ دھچکا میں پیٹر کو خوب دھچکا لگا۔ محفل شعر و سخن بھی خوب رہی۔ ساتھ میں کترنیں بھی مزہ کر گئیں۔"

⌘ **ابرار وارث**، سدھیلیا نوالی سے تشریف لائے ہیں "سسپنس کا شمارہ جون اپنی آب و تاب کے ساتھ 18 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ جون ایلیا جی کو پڑھا جو کہیں دور سوئے ہوئے مردہ ضمیر کو جھنجوڑنے اور شعور بیدار کرنے کی پوری تگ و دو میں مصروف تھے۔ اے کاش کہ انسان اپنے انسان ہونے کا ثبوت بھی دے۔ شعور سے بات چلی ہے تو ایک عرض کرتا ہوں ہاتھ جوڑ کے کہ خدارا اپنی پہچان، اپنی آن بان، اپنی شان و شوکت کو نہ مٹائیے۔ میں آپ سب قارئین سے مؤدبانہ گزارش کرتا ہوں کہ ہلکی پھلکی نوک جھوک تو چلتی رہتی ہے لیکن خدا کے واسطے طنز کے نشتر نہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

چلاؤ ایک دوسرے پر۔ سسپنس کی محفل میں ایک دوسرے سے محبت کی راہیں ہموار کرو۔۔۔ ہمارا ملک پہلے ہی بیرونی واندرونی سازشوں میں گھرا ہوا ہے تم لوگ کیوں ڈائجسٹ کے توسط سے ایک دوسرے کے خلاف غلط پروپیگنڈا اچھال رہے ہو۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس زنداں پڑھی۔ بہت افسردہ اور غمگین کر گیا حجاب کا بچھڑنا۔۔۔ شاید تلخ حقیقت ایسی ہی ہوتی ہے جسے قبول کرنا پڑتا ہے ہمارے تو وہم میں بھی نہیں تھا کہ حجاب مر جائے گی وہ بھی یوں 3 دن کے اندر اندر۔۔۔ میں بہت رویا شاید ہادی سے بھی زیادہ بس ایک بات کا سکون ہے کہ ہادی کو اس کی محبت مل تو گئی چاہے مختصر عرصے کے لیے ہی سہی۔ حجاب نے مشرقی بیوی ہونے کا بھرپور ثبوت دیا۔ پلیز طاہر جاوید جی ستاروں پر کمند میں ہیروئن شادی شدہ نہیں ہونی چاہیے۔ پس زنداں کا اختتام بہت جلدی میں ہو گیا ہے یہ افسوس رہے گا۔ ستاروں پر کمند کی پرومو دیکھی پلیز ٹائٹل بھی جولائی کا ستاروں پر کمند والا دیں۔ جو سسپنس میں پس زنداں کے آخر میں شائع ہوا تھا۔ ماروی بھی زبردست رہی۔ خود کو بچاتے بچاتے ماروی کوما میں چلی گئی، عاشق بچارے اپنی اپنی جگہ ہاتھ پاؤں مار تو رہے ہیں لیکن ہاتھ کچھ نہیں آ رہا۔ مرینہ کے ساتھ بہت اچھا ہوا۔ نشور ہادی کی نظریہ حیات بالکل بکواس لگی Sorry نشور ہادی جی یہ کیا بات ہے کہ بہن بھائی بھی کہتے ہیں خود کو اور صرف زیر جامہ میں نیرا کی سکھائی جارہی ہے۔ کہیں بھی شراب کی تباہ کاری نہیں دکھائی گئی حالانکہ شمی نے کتنی بار پی۔‘‘

✠ **سوبیہ اقبال**، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہی ہیں ’’جون کا سسپنس مقررہ وقت پر ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ کو دیکھ کر ڈراکر اکل کے شاہکار کی تعریف کی۔ انشائیہ شعور کا لفظ لفظ حقیقت آشکار کرتا نظر آیا۔ خطوط کی محفل کا جوش وجذبہ ذرا ماٹھا لگا۔ پس زنداں کا ایک خوب صورت اختتام ہوا۔ حجاب کا انجام ہمیں بھی رلا گیا۔ ماروی بھی بس صفحات پورا کرنے کی ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ نظریہ حیات عادل اور شمی کی غلط فہمی کے گرد گھومتی تحریر پسند آئی۔ سید عبداللہ ولی کے واقعات نے ایمان کی پختگی میں اضافہ کیا۔ حساب دوستاں میں یونس اور لیث کے درمیان رسا کشی ابھی جاری ہے۔ زنگ آلود میں معاشرے کی ایک تلخ حقیقت سامنے آئی کہ تعویذ گنڈے ہمیشہ بربادی لاتے ہیں۔ خون کا رشتہ میں اسٹیفورڈ کی کوششیں رنگ لائیں۔ برف کے جذبے میں آخر کا ہیروں کی گمشدگی کا راز کھل ہی گیا۔ دیچکا میں کیرولین نے چور کے ساتھ خوب ہاتھ کھیلا۔ نیکی برباد موڑ اور نسخہ بھی ٹھیک رہیں۔ اشعار کی محفل میں سب انتخابات اچھے لگے۔ مگر فشی محمد عزیز کا انتخاب بہت اچھا لگا۔‘‘

✠ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں ’’بہت ہی خوب صورت اور اسٹائلش ماڈل کے ساتھ ایک جوگی بابا سرورق کو خوب صورت بناتے نظر آئے، عجب لگا کہ انشائیہ میں آئے تو جون ایلیا شعور سکھاتے نظر آئے بہت ہی قیمتی باتیں تھیں لیکن ہمارے عقل وفہم سے کہیں بڑھ کر۔ بانو کچھ سمجھ آئی تو کچھ نہ آئی۔ آپ کا اداریہ پڑھا آپ حکمرانوں کی کارکردگی جو کہ صفر ہے بتاتے نظر آئے ایک ہی جملہ جی جیسی عوام ویسے حکمران۔ وسیم احمد خانیوال سے ویلکم گھبرانا نہیں میرا یہ گیارہواں خط ہے دو شائع 8 بلیک لسٹ ہوئے پھر بھی ہمت مرداں مدد خدا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پس زنداں پڑھی، بہت ہی دکھی کر گئی۔ طاہر جاوید مغل کا کیا جاتا اگر ان دونوں کو ملا دیتا تو حجاب کے ساتھ ہادی کو کچھ سال رہنے ہی دیتے۔ ستاروں پر کمند طاہر جاوید صاحب کی اگلی کہانی بھی امید کرتے ہیں، بیسٹ ہوگی۔ پھر ماروی پڑھی ہر قسط دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتی جا رہی ہے۔ حساب دوستاں الیاس سیتاپوری بہت ہی زبردست کہانی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ برف کے جذبے شیری آخرکار مجرم تک پہنچ ہی گئی۔ زنگ آلود میں ملک صاحب نے مجرم تک پہنچ کر بھی کسی کی پردہ پوشی کا معاہدہ کر لیا، گریٹ ملک صاحب۔ محفل شعر وسخن میں سارے اشعار ہی بیسٹ تھے۔ سید عبداللہ ولی کے بارے میں پڑھنے کو ملا اللہ کے نیک لوگوں کے بارے میں جان کر اور پڑھ کر دل ودماغ روشن ہو جاتا ہے۔ نظریہ حیات، نشور ہادی کے قلم سے لکھی گئی ایک منفرد تحریر تھی۔ شمی کو شک کا زہر کھا گیا۔ اپنی خوب صورت زندگی کو خود ہی ٹھوکر ماردی۔ نیکی برباد، دیچکا، خون کا رشتہ اور باقی کہانیاں اچھی تھیں نتیجہ کہ جون کا شمارہ بیسٹ رہا۔‘‘ (بہت شکریہ)

✠ **نادر سیال**، سینٹرل جیل میانوالی سے محفل کی زینت بنے ہیں ’’پیارا سسپنس ڈائجسٹ مجھے 17 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے خطوط پر نظر ماری لیکن افسوس کا منہ دیکھنے کو ملا۔ اس بار پھر میرا خط ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور پھر قلم اٹھا لیا (اچھا کیا) کہانی ماروی اچھی جارہی ہے۔ مرینہ کو ماروی مل گئی وہ اب اسے جام تمارو میں قید رکھے گی۔ ادھر محبوب صاحب جیل میں سڑ رہا ہے بالکل میری طرح محی الدین نواب صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ ہمیں اتنی خوب صورت کہانی پڑھنے کو دے رہے ہو۔ پس زنداں یہ کہانی میں جب بھی پڑھتا ہوں پتا نہیں میں اداس کیوں ہو جاتا ہوں۔ اس کہانی میں کچھ اپنا سا لگتا ہے۔ بہرحال بہت اچھی جارہی ہے۔ اشوک کمار کا تبصرہ پڑھا بہت ہی اچھا لکھا لیکن بھائی جان پڑھائی پر بھی دھیان دینا۔ لیلیٰ جی آپ بھی بہت اچھا لکھتی ہو۔ زویا اعجاز جی آپ نے ٹھیک فرمایا تمر کی پکار نے واقعی ہمارا دل دکھایا۔ نگران اعلیٰ معراج رسول صاحب جی آپ تو کم از کم ہمارا خیال کیا کریں، ہم سسپنس کے ذریعے تو جیل میں جی رہے ہیں۔ دوستوں کے میٹھے میٹھے الفاظ پڑھ کر۔ (اب تو آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔۔۔ خوش) محفل شعر وسخن میں، مس زرینہ نواز، مہرین ناز، الیلیٰ، کراچی، شفیق اور زاہد چودھری کے اشعار اچھے لگے۔‘‘

✠ **زاہد احمد خان داد**، ناگن چورنگی، کراچی سے تشریف لائے ہیں ’’ایک بہت ہی طویل رفاقت ہے میری سسپنس سے محفل کے تمام دوستوں، وہاں سے بیٹھنے والے دوستوں کو آداب۔ ٹائٹل پر نظر گئی تو ہائے اک پرانا زخم گہرا ہو گیا وہ ایسی ہی تو تھی۔ خیر چھوڑیں میں بھی کیا قصہ لے بیٹھا۔ ٹائٹل سے فوراً نظریں ہٹا کر اپنے پیارے محبوب سلسلے پس زنداں میں داخل ہوئے جس میں مغل صاحب محبت کرنے والوں کے دل کی دھڑکنوں کو زیروزبر کرتے



اور رلاتے ہوئے نظر آئے، ہم تو بڑے طرم خان اور پتھر دل بنتے تھے اپنے آپ کو مغل صاحب نے تو سب کچھ تہس نہس کر دیا۔ ہادی از دی گریٹ سب کچھ لٹا کر اور قدم قدم پر قربانیاں دے کر اس نے کوئی صلہ نہ چاہا۔ سید عبداللہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے ایمان افروز واقعات پڑھتے جس سے روح کو تازگی ملی۔ بے شک اولیا کرام نے اپنی زندگیاں عام عوام اور رشد وہدایات کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ حساب دوستاں کرنے کے لیے بیٹھے بے شک لیث زانی اور گناہ گار ہے لیکن عثمان کے سلسلے میں وہ حق پر ہے۔ ماروی میں بھی محبوب صاحب نے حد کر دی اس قدر دیوانے ہو رہے ہیں ماروی کے عشق میں۔ زنگ آلود میں ملک صاحب نے بہت فہم وتدبر سے کام لیا۔ اگر کوئی عام تھانیدار ہوتا تو بے چارے شاکر کو جو کہ کچھ نفسیاتی مریض بھی تھا کو ظلم کی چکی میں پیس دیتا۔ برف کے جذبے کچھ ایسے تھے، ڈاکٹر حسین نے ہیروں کے لالچ میں کئی قتل کرا دیے۔ دیچکا میں پیٹر جیسے چوروں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے۔ نیکی برباد میں ایرس کی واقعی ساری نیکیاں برباد ہو گئیں۔ خون کا رشتہ میں اسٹیفورڈ جیکسن اسٹیفورڈ کا بیٹا نہیں تھا لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا بھی بیٹا نہ ہو۔ منظر امام صاحب خوب نسخہ لائے، لگتا ہے کلینک میں بیٹھ کر لکھتے ہیں۔ موڑ کا نام دراصل بھوک ہونا چاہیے تھا کیونکہ واسو ور پانڈے جیسے لوگوں کا پیدا ہونے کے بعد مرنے تک ایک ہی شغل شوق اور ضرورت کھانا اور صرف کھانا ہوتا ہے۔ نظریہ حیات بھی مناسب ہی تھی شمی سے ایسی غیر معاملہ فہمی اور غیر تدبر فہمی کی توقع نہیں تھی ہم تو ان کو مظلوم سمجھ رہے تھے کہ ان کی ازدواجی زندگی ان کے شوہر اور ان کی بہن نے تباہ کر دی وہ تو پوری کہانی پڑھ کے پتا چلا کہ بے چارے عادل اور معصوم نجمہ کو بہن بھائی بننے کی سزا ملی ہے۔ کتر نیں اس بار کم ہیں۔ پولٹری فارم کے چوزوں کا لطیفہ پسند آیا۔ اشعار بھی مناسب اور معیاری تھے۔ اس کے بعد جون ایلیا مرحوم انشائیہ میں اپنی قوم کا شعور بیدار کرتے ہوئے نظر آئے۔ مرحوم کے دل میں قوم کا بہت درد تھا اور محبت تھی، بہرحال آپ کے انشائیے اب بھی ہر ماہ اپنی قوم کی اصلاح کرتے رہیں گے۔ اداریہ بھی کافی جاندار اور اچھا تھا۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔‘‘

✠ **ایم افضل کھرل**، گاؤں عظیم والا سے تشریف لائے ہیں ’’اس بار سرورق بہت دلکش تھا۔ کم عمر ماڈل کسی گہری سوچ میں مگن تھی۔ انشائیہ جون ایلیا کی تحریر نے دل موہ لیا۔ خطوط کی محفل میں داخل ہوا۔ روشنی رشید بڑی مدت بعد نظر آئی ہے، ویلکم۔ اپنا شہرہ دیکھ کر مرجھایا ہوا قلب خوشیوں کی تاب نہ لا سکا۔ ہمارا تبصرہ نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں۔ آغاز پس زنداں سے کیا۔ ہادی کی بے لوث محبت کو سلیوٹ کرتا ہوں، حجاب کی موت کا بیان پڑھ کر اشک آنکھوں سے رواں ہو گئے، آخری صفحات پر نشور ہادی کی کہانی نظریہ حیات نے بہت متاثر کیا۔ شک کی بنیاد بھی انسان کس کس چوراہے پر لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ عادل نعیمہ کو اپنی بہن سمجھتا رہا اور شمی کسی اور نظر سے دیکھتی رہی۔ محفل شعر وسخن میں محمد صفدر معاویہ، طالب حسین طلحہٰ، جبران احمد اور ماہا ایمان کا انتخاب اچھا لگا۔ سعدیہ بخاری آپ کی بہت زیادہ کمی محسوس ہو رہی ہے۔‘‘

✠ **ناصر رومیو**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہیں ’’اپنے پیارے سسپنس کو پہلی مرتبہ خط لکھ رہا ہوں۔ لہٰذا دل نہ توڑیے گا۔ میں ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا میں تقریباً 8 ماہ سے بے گناہ قید وبند کی سختیاں جھیل رہا ہوں۔ جیل میں قید کے دوران ہی سسپنس ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا، ہر بار سسپنس کو منفرد پایا کبھی یکسانیت کا شکار نہیں ہوئے۔ خطوط کی محفل میں خاص طور پر بلیک کیٹ کو میرا اسلام دینا۔ جون کا سسپنس 17 تاریخ کو اپنے احاطہ کے حوالدار (ہیڈ وارڈر) سے وصول کیا۔ سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کے قلم سے لکھی پس زنداں کی آخری قسط پڑھی۔ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ہادی کو حجاب ملی بھی تو بستر مرگ پر۔ دوسری طرف جلال کا ارم سے جھگڑا ہونا۔ واقعی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ماروی کہانی پڑھی، ماروی کا مراد کے ہاتھ لگنا۔ ماروی کا اسپتال پہنچنا۔ جیل میں محبوب چانڈیو کو ماروی کی اسپتال میں موجودگی کا پتا چلنا۔ دوسری طرف مراد کا جیل واپس جانا اور چانڈیو کی رہائی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کی آنکھوں میں دھول جھونک دینا اچھا لگا۔‘‘

زویا اعجاز، لاہور سے چلی آرہی ہیں ’’سال رواں کا چھٹا شمارہ 17 مئی کی شام اس وقت موصول ہوا جب مئی کے شمارے کا مطالعہ سے ہم ابھی فارغ ہوئے ہی تھے۔ حسینہ سسپنس کی خاموش ومتورم آنکھیں اور ساکت لب کسی ایسے سمندر کا پتا دے رہے تھے جس کی گہرائی میں ان گنت طوفان موجزن ہوں۔ جون ایلیا اس مرتبہ انسانیت وآدمیت سے نالاں نظر آئے۔ اداریہ بہترین تھا۔ ماہا ایمان جی! ویلکم بیگ اور نگرنانٹ ڈیئر۔ اب ذکر ہو جائے پس زنداں کا جس کا اختتام ہماری توقعات کے عین مطابق ہوا۔ ذہنی آمادگی کے باوجود حجاب کی موت نے بے حد طول کیا اس کے آخری لمحات نے آنکھیں بے اختیار نم کر دیں۔ مغل اعظم! آپ کا جواب نہیں۔ نظریہ حیات اوسط سے بھی نچلے درجے کی تحریر ثابت ہوئی۔ پلاٹ موضوع کردار نگاری کسی نے بھی متاثر نہیں کیا۔ ملک صفدر حیات اس بار کافی نازک نوعیت کے کیس سے نبرد آزما نظر آئے۔ ویسے قسمت کہیں یا مسلسل اتفاق ان کی ہر پوسٹنگ میں انہیں ایک فرض شناس ماتحت ضرور میسر آتا ہے۔ نواب صاحب جس قسم کے حسن وعشق کی داستاں بیان فرما رہے ہیں اسے ایکسپائر ہوئے کئی دہائیاں بیت چکی ہیں۔ کاشف زبیر نے چلچلاتی گرمیوں میں برف زاروں کی خوب سیر کروائی۔ شاندار کہانی رہی۔ منظر امام نے ازدواجیات کی اصلاح کے لیے بہت زبردست نسخہ بیان کیا۔ نیکی برباد اور دیچکا بھی خوب تھیں۔ سید عبداللہ ولی کے بعد اب شاہ ولی اللہ کے حالات پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ حساب دوستاں سے اگلے ماہ حساب کتاب کرنے کا ارادہ ہے۔ محفل شعر وسخن میں راجہ افتخار علی اور حافظ گل محمد کا انتخاب بہت خوب صورت تھا۔‘‘

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

محمد جاوید، علی پور۔ محمد اسحاق انجم، کنگن پور، قصور۔ عبدالغفور خان ساغری، جھنگ۔ مجیب، ضلع اٹک۔ تقسیر عباس بابر، اوکاڑہ۔ رانا محمد ظہیر، ملتان۔ الیلیٰ، کراچی۔ غزالہ وقار، ملتان۔ ہارون رشید، مردان۔ اللہ نواز افق، کلاچی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ صائمہ کنور، شازیہ کنور، میانوالی۔ ماریہ فاروق، چمن۔ اشفاق شاہین، کراچی۔ منظر علیم، رحیم یار خان۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

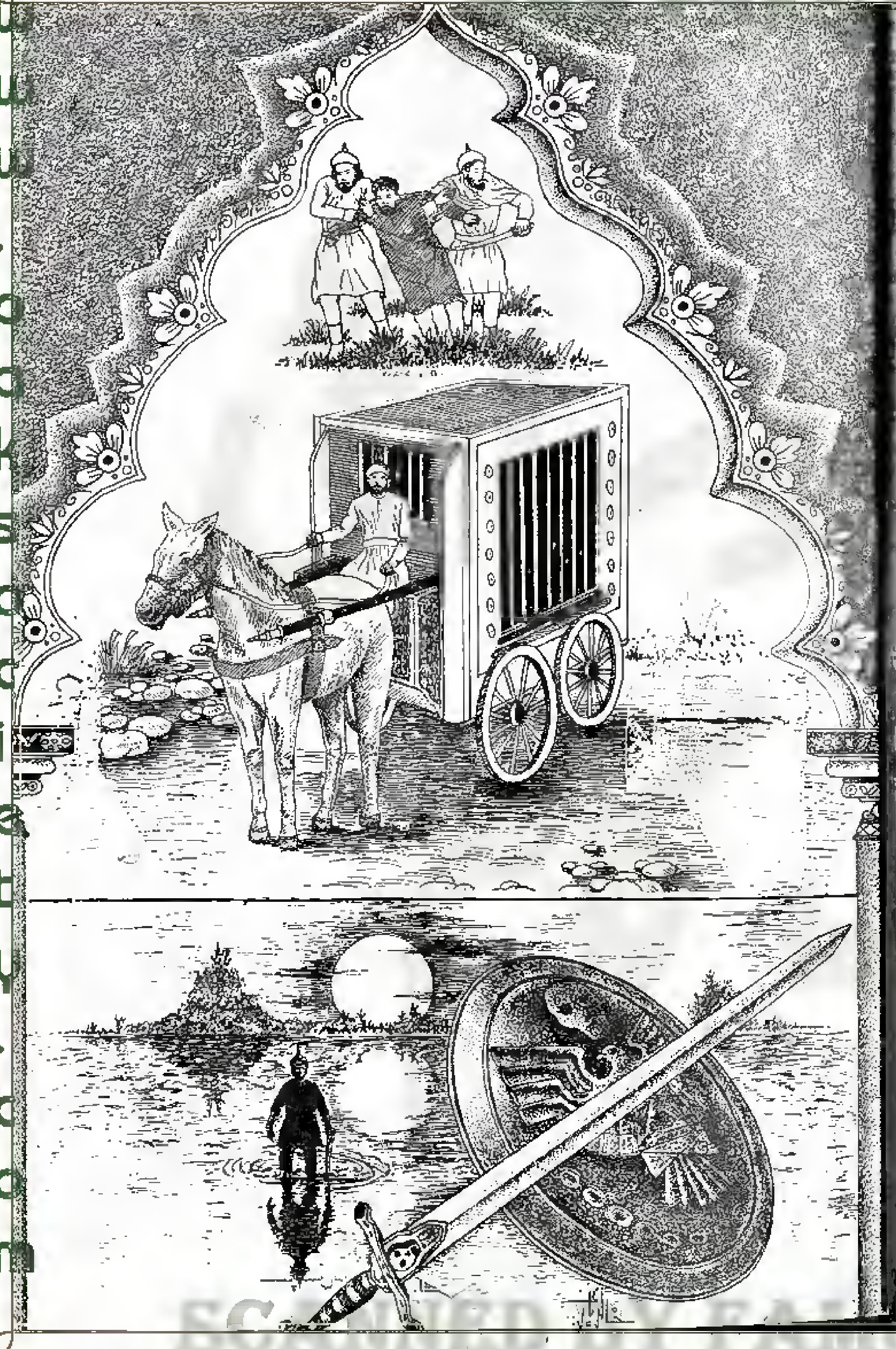

# حساب دوستاں

الیاس سیتاپوری | دوسرا اور آخری حصہ

حساب دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا... میزان کھری ہو تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتے دیر نہیں لگتی... اور اگر یہ حساب کتاب وقت کے ہاتھوں میں آجائے تو لمحوں کا شمار جذبات واحساسات اور حیرت انگیز واقعات کے حصار میں قید کرکے ہر پل کی پڑتال ہونے لگتی ہے اور رفتہ رفتہ یہی جانچ پڑتال تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہ ہر دور کی حقیقت ہے کہ جب تک بے وقوف زندہ ہیں عقلمندوں کا کاروبار چمکتا رہے گا... اس کی سادہ لوحی اور بے شمار دولت بھی اس کے لیے وبال بن گئی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی ہمدم، کوئی غمگسار بھی ساتھ نہ ہو تو شعور کے تمام دروازوں پر قفل لگ جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس کسی سلطنت کی بادشاہت نہ تھی... نہ دربار میں دریادلی کی مثالیں تھیں... اس کے باوجود ایک دنیا اس کے پیچھے تھی اور وہ محوِ سفر تھا... مگر اسے شاید یہ ادراک ہی نہ تھا کہ سفر میں اگر زادِ سفر ساتھ نہ ہو تو ہوائیں بھی مخالف ہوجاتی ہیں۔ جنگ کوئی بھی ہو تدبیروں سے لڑی جاتی ہے، طاقت اور دولت کے بل پر تو حکمرانی کی جاتی ہے... لیکن اس کی سادہ لوحی اسے ہر موڑ پر زندگی کا ایک الگ ہی رخ دکھاتی رہی اور وہ سمجھوتوں کے ہجوم میں خود کو ڈھونڈتا رہا... اس بار تاریخ ایک اور ہی انداز میں اوراق پلٹ رہی تھی۔

## ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

لیث نے قاضی لبیب بغدی کا شاندار استقبال کیا اور اس کے ساتھ ساتھ چل کر سب سے بہتر جگہ پر بٹھا کر خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔ محفل کے دوسرے مہمان بھی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ قاضی نے محفل کا طائرانہ جائزہ لیا اور شراب اور آلات شراب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"لیث! میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن یہ سب کیا ہے؟ جشن طرب یا جشن ناؤنوش؟"

لیث نے جواب دیا۔ "دونوں ہی، جشن طرب بھی اور جشن ناؤنوش بھی۔"

قاضی نے منہ بنا کر کہا۔ "استغفراللہ...... تجھے اپنی ماں کی صحت یابی کے شکرانے میں خدا کو یاد کرنا چاہیے تھا۔ میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن جلدی ہی واپس چلا جاؤں گا۔"

لیث نے آہستہ سے عرض کیا۔ "جناب! میں نے آپ کو جس لیے زحمت دی ہے، آپ واقف ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس جشن کا مہتمم میں نہیں آپ کا بیٹا یونس ہے۔"

قاضی نے پھر منہ بنایا۔ "میرا بیٹا یونس؟ کون میرا بیٹا؟"

یونس ان دونوں کو کھسر پھسر کرتے دیکھ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔ قاضی نے کن انکھیوں سے یونس کو دیکھا اور لیث سے پوچھا۔ "جشن طرب کے آغاز میں کیا دیر ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "جناب! اس محفل کا مہتمم میں نہیں، یونس ہے۔ وہی اس کا جواب دے سکتا ہے۔"

قاضی نے لاتعلقی سے کہا۔ "بہرحال میں گانا تو سن لوں گا لیکن کھانے پینے میں نہیں شریک ہوں گا۔"

محفل کے دوسرے شرکا قاضی کے احترام میں بے تکلف نہیں ہوسکتے تھے اس لیے انہیں قاضی کی موجودگی گراں گزر رہی تھی۔ خود یونس اس لیے پریشان تھا کہ وہ اپنے معزز باپ کی موجودگی میں میزبانی کے فرائض شاندار طریقے سے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ خود بھی گانا چاہتا تھا محض اس لیے کہ وہ اس سے عنان کا دل جیت لے مگر باپ کی موجودگی میں وہ گا بھی نہیں سکتا تھا۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

یونس کچھ دیر تک تو ان کے پاس کھڑا رہا، اس کے بعد وہ عنان کی ماں کے پاس چلا گیا اور بڑی مایوسی سے کہا۔ "ماں! میرے خلاف زبردست سازش کی گئی ہے۔"

عنان کی ماں قاضی سے بہت متاثر اور مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "یونس! تو خوش قسمت ہے جو تیرا باپ بھی اس جشن میں شریک ہے جس میں تیرے اور عنان کے رشتے کا اعلان ہونے والا ہے۔ میرا خیال ہے تیرا باپ اس اعلان سے بہت خوش ہوگا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ اپنا عاق نامہ واپس لے لے اور تجھے پھر سے اپنا بیٹا بنا لے۔"

دوسری طرف لیث قاضی کی خوشامد کر رہا تھا کہ وہ اس جشن میں شروع سے آخر تک موجود رہے لیکن قاضی زیادہ وقت دینے کو تیار نہیں تھا۔ وہ لوگوں کے بے صبرے اور ندیدے پن پر حیران تھا۔ ہر شخص بلانوشی میں لگا ہوا تھا۔ کافی دیر بعد جب جوش و خروش کم ہوا تو جشن طرب کے آغاز کا اعلان کر دیا گیا۔ پہلی گانے والی ایک نوعمر لڑکی تھی۔ اس لڑکی کی آواز میں رس ضرور تھا لیکن کلام کمزور تھا۔ قاضی نے تبصرہ کیا۔ "ذرا سی راہنمائی اسے بام عروج تک لے جا سکتی ہے۔"

محفل وجد میں آئی ہوئی تھی۔ لیث، قاضی کے قدموں میں بیٹھا ادب و احترام اور فرماں برداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ قاضی اس سے خوش ہو گیا تھا۔ قاضی کے مصاحبین، قاضی کے آس پاس کھڑے تھے۔

قاضی نے لیث سے پوچھا۔ "کیا اس خاتون سے تُو واقف ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "بدقسمتی سے یہی میری سوتیلی ماں ہے۔"

دوسری طرف عنان کی ماں اعلان کر رہی تھی۔ "حضرات! اس خوشی کے موقع پر میں یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہوں کہ قاضی لبیب بغدی کا بیٹا یونس عنقریب میری فرزندگی میں آنے والا ہے اور میں نے اپنی بیٹی عنان کو اس سے منسوب کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یونس کا باپ قاضی لبیب بغدی اسی محفل میں موجود ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ اس اعلان سے خوشی محسوس کر رہا ہوگا۔"

قاضی فوراً اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اعلان کیا۔ "حضرات! جیسا کہ تاجر حمدون مغیث کی بیوہ نے اعلان کیا کہ قاضی لبیب بغدی اس محفل میں موجود ہے، یہ درست ہے لیکن یہ غلط ہے کہ یونس میرا بیٹا ہے اور میں اس اعلان سے خوش ہو رہا ہوں گا۔"

یونس کے پورے جسم میں آتش سیال دوڑنے لگی۔ وہ دور ہی سے چیخا۔ "بابا جان! اپنی بکواس بند کرو۔"

قاضی نے مزید کہا۔ "میں یونس کو عاق کر چکا ہوں اور میں اس کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ یہ اپنے مکر و فریب میں اپنے ساتھ میرا نام لیتا پھرے۔ کبھی میں اس کا باپ تھا لیکن اب نہیں ہوں کیونکہ میں نے اسے عاق کر دیا ہے۔"

یونس غصے میں باپ کی طرف دوڑا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ لیث اور قاضی اس کا ارادہ بھانپ چکے تھے۔ قاضی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

"اس مردود کو سنبھالنا۔"

قاضی کے آدمیوں نے یونس کو راستے ہی میں روک لیا۔ یونس نے ان پر بھی وار کیا۔ وہ خنجر چلا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ "میں اس جھگڑے ہی کو ختم کر دوں گا۔ میں قاضی، اپنے باپ اور لیث دونوں ہی کو مار دوں گا۔"

لیکن قاضی کے طاقت ور آدمیوں نے بڑی ہوشیاری سے یونس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ یونس بدستور چیخ رہا تھا۔ "مجھے چھوڑ دو، میں ہر اس شخص کو مار دوں گا جو میری راہ میں حائل ہوگا۔"

محفل درہم برہم ہو گئی۔ لوگ یونس کی طرف دوڑے لیکن قاضی نے ان سب کو دور رہنے کا حکم دے دیا۔

"حضرات! آپ لوگ دور رہیں کیونکہ یہ معاملہ آپ سے تعلق نہیں رکھتا۔ آپ لوگ یونس کو نہیں جانتے لیکن میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بدطینت، ناخلف، نالائق، گستاخ اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے عاق کیا گیا تھا۔ میں آج اس جشن میں ہرگز نہ آتا اگر مجھے یہ نہ بتایا گیا ہوتا کہ یونس میرے نام کو اپنے مفاد کے لیے اب بھی استعمال کر رہا ہے۔ مجھے حیرت تو تاجر حمدون مغیث کی بیوہ پر ہے کہ جب اس کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ میں، یونس کا باپ بغداد ہی میں موجود ہوں تو اپنی بیٹی کے رشتے کی منظوری یا اطلاع مجھ سے کیوں......"

یونس برابر اچھل کود رہا تھا۔ اس کا ایک ہی نعرہ تھا۔ "مجھے چھوڑ دو، میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا۔"

قاضی نے لیث سے کہا۔ "تو کس بات کا منتظر ہے، محفل برخاست کیوں نہیں کرتا؟"

لیث نے اعلان کر دیا۔ "حضرات! اب محفل طرب اپنے اختتام کو پہنچی اس لیے شب بخیر کہتا ہوں۔"

محفل بہت بری طرح، بڑی بدمزگی سے درہم برہم ہو گئی۔ قاضی نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "یونس کو اپنے



ساتھ لے جاؤ۔ گو کہ اس نے کسی کو زخمی یا قتل نہیں کیا لیکن اس کی نیت یہی تھی۔ اس پر مقدمہ چلے گا اور یہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔"

یونس پھر چیخا۔ "میں نہیں جاؤں گا، مجھ پر مقدمہ نہیں چلے گا۔"

لیکن قاضی کے آدمیوں نے اسے باندھ دیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ قاضی نے لیث سے کہا۔ "نوجوان! ذرا اپنی سوتیلی ماں سے میری بات تو کرواؤ۔ میں بھی تو اس سے پوچھوں کہ وہ یہ کیسی فاش غلطی کر رہی تھی۔"

لیث اپنی سوتیلی ماں کے پاس گیا اور اسے مطلع کیا۔ "قاضی آپ سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

ماں نے افسردگی سے جواب دیا۔ "بلاؤ، دیکھتی ہوں وہ کیا بات کرتا ہے۔"

لیث، قاضی کو ماں کے قریب لے گیا۔ قاضی نے ایک بار پھر بیوہ کو بڑے غور سے دیکھا۔ قاضی نے کہا۔ "حمدون کی بیوہ! کیا میں تجھ سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تجھ کو یہ ناکارہ اور آوارہ نوجوان کیوں پسند آیا؟"

ماں نے جواب دیا۔ "میں نے اس کو اس کے شجرۂ نسب سے پہچانا تھا۔"

قاضی نے کہا۔ "خاتون! یہ میں پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تو یونس کو اپنا داماد بنا لے گی تو تیری جائداد اور مال و زر کا حساب کتاب بہت جلد برابر ہو جائے گا۔ میں تیری ہمدردی میں آ گیا۔"

لیکن عنان کی ماں یونس کو برا سمجھنے پر بالکل تیار نہیں تھی، بولی۔ "اس نے میری بیماری میں بڑی تیمارداری کی تھی اور عضدالدولہ کے طبیب خاص سے میرا علاج کروایا تھا۔ کیا خلوص اور محبت کی کوئی قیمت نہیں؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "خاتون! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ خلوص اور محبت اس کے پاس تھی ہی کب؟ آپ اس کو مجھ سے زیادہ تو نہیں جانتیں؟"

اب ماں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ قاضی سے کہا۔ "اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "بے شک، میں آپ کے پاس واپس جانے ہی کے لیے آیا تھا۔ اللہ نے چاہا تو پھر کسی وقت آپ سے ملوں گا اور اس آوارہ اور لچے لفنگے کی بابت بہت ساری باتیں کروں گا۔" چلتے چلتے لیث سے کہا۔ "نوجوان! میرے پاس آنا ضرور، ایک کام ہے تجھ سے۔"

اب قاضی بھی چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی عنان، خنسا اور لیث نے ماں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں ہر کوئی خوش تھا لیکن خود ماں بہت اداس تھی۔

خنسا نے کہا۔ "برے کام کا برا انجام۔"

ماں نے ڈانٹا۔ "چپ رہ، اپنی زبان بند رکھ۔"

لیث نے عنان کی خاطر خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

یونس قید خانے میں جذباتی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ وہ اپنے ہی بالوں کو نوچنے لگا۔ وہ اپنے باپ قاضی اور لیث کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ پہرے داروں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کے جذباتی طوفان کا مقابلہ کرتے۔ انہوں نے قاضی کو اس کی خطرناک صورت حال سے مطلع کیا۔ قاضی نے حکم دیا کہ اسے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ حکم پر فوری عمل ہوا اور یونس کو زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔

کئی دن بعد اس کا مقدمہ قاضی کے روبرو پیش ہوا۔ باپ نے بیٹے کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھا، دل پر کچھ اثر ہوا مگر اسے فوراً ہی اپنے باوقار منصب کا احساس ہوا اور اس نے سختی سے سوال کیا۔ "اے بدترین انسان! اگر اس رات تیرا بس چل جاتا تو تو کیا کرتا؟"

یونس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اس نے بے باکی سے جواب دیا۔ "میں تیرے ساتھ لیث کو بھی ہلاک کر دیتا۔"

قاضی نے کہا۔ "لیث کے ساتھ ہی مجھے بھی...... کیا میں تیرا باپ نہیں ہوں؟ کیا تو نے اپنی زندگی کے بدترین گناہ کا ارادہ نہیں کیا تھا؟ کیا اپنے باپ کو ہلاک کر کے تو جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنا لیتا؟"

یونس نے جواب دیا۔ "تو نے مجھے عاق کر کے اس مقدس رشتے کو پہلے ہی ختم کر دیا ہے۔ اب میں جب بھی تجھے قتل کروں گا تو اپنے باپ کو نہیں بلکہ قاضی لبیب بغدی نامی ایک شخص کو قتل کروں گا۔"

قاضی نے حکم دیا کہ لیث کو بھی حاضر کیا جائے۔

لیث پہلے ہی سے آیا بیٹھا تھا وہ فوراً ہی حاضر کر دیا گیا۔ یونس اور لیث کی نظریں جو ملیں تو دونوں پر اس کا متضاد اثر ہوا۔ یونس کو اشتعال کا دورہ پڑا اور اس نے لیث کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا لیکن لیث کو اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ یونس کا زخمی سر، سوجا ہوا چہرہ، متورم آنکھیں، خفقانی حالت، ان تمام کیفیات نے لیث کے دل کو مسل ڈالا۔

قاضی نے لیث سے کہا۔ "نوجوان! یونس اپنے ارادے کا اقرار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر اس رات میرا بس چلتا تو میں تم



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

دونوں کو ہلاک کر دیتا، تو اس اقراری مجرم کو سزا دینے کے حق میں ہے یا کچھ لے دے کر معاف کر دینے کے حق میں؟"

لیث نے جواب دیا۔ "جناب محترم! میں قاضی نہیں ہوں اور نہیں جانتا کہ فقہ کسی ایسے شخص کو مجرم مانتی بھی ہے یا نہیں، جس نے جرم کا ارادہ تو کیا ہو لیکن ارتکاب نہ کیا ہو۔"

قاضی اس خلاف توقع جواب پر چونک گیا، بولا۔ "میں تجھ سے جو سوال کر رہا ہوں تو بس اس کا جواب دے دے۔ فقہ کیا کہتی ہے اور کیا نہیں کہتی، یہ میرا دردِ سر ہے۔ تو تو مجھے یہ بتا کہ اسے سزا دینا پسند کرے گا، معاف کر دے گا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ میں فوراً ہی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

قاضی نے کچھ سوچ کر یونس کو دوبارہ قید خانے بھیج دیا اور بعد میں لیث کی بڑی دلجوئی کی اور کہا کہ "تیرا باپ میرا دوست تھا۔ اگر درمیان میں یونس نہ آ جاتا تو میں تجھ سے ملنے آتا یا تجھے اپنے پاس بلوا لیتا۔"

قاضی کی طرف سے یہ انکشاف بڑا مزیدار تھا، پھر بھی قاضی... کی دل جوئی سے بڑی ڈھارس بندھی، بولا۔ "اگر آپ واقعی میرے والد مرحوم کے دوستوں میں سے ہیں تو آپ اب بھی میری مدد کر سکتے ہیں۔"

قاضی نے پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

لیث نے جواب دیا۔ "وہ اس طرح کہ آپ میرے بزرگ کا کردار ادا کریں اور میری سوتیلی ماں سے دوبارہ ملیں اور اس پر یہ دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنی بیٹی عتان کی شادی مجھ سے کر دیں۔"

قاضی نے خوشی کو چھپانے کی کوشش کی، بولا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے۔ تیرا یہ کام میں ضرور کروں گا اور آج کے تیسرے دن تیری حویلی پر آ رہا ہوں، بس اسی دن تیری یہ بات ہو جائے گی تو فکر نہ کر۔"

اس دن قاضی نے کھانا لیث ہی کے ساتھ کھایا۔

لیث واپسی میں سیدھا یونس کے پاس قید خانے پہنچا اور پہرے داروں سے کہا۔ "میں یونس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پہرے داروں نے منع کیا مگر جب ان کی ہتھیلی پر دینار آئے تو انہوں نے لیث کی ملاقات یونس سے کرا دی۔ یونس اسے دیکھتے ہی اس پر جھپٹ پڑا مگر لیث کے نرم رویے اور پُرفکر گفتگو نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا اور وہ بہت دل گرفتہ انداز میں بولا۔ "جتنا ابھرنے اور نکلنے کی کوشش کرتا ہوں، دھنستا چلا جا رہا ہوں۔"

لیث نے کہا۔ "تجھے خوش حالی اور عزت کی زندگی اب بھی مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے تجھے مجھ سے ایک معاہدہ کرنا پڑے گا۔"

یونس نے حسرت سے پوچھا۔ "اگر یہ دونوں چیزیں مجھے مل جائیں تو بتا وہ معاہدہ کیا ہے۔"

لیث نے رک رک کر کہا۔ "میں تیرے باپ سے کہہ کر تجھے رہا کروا دوں گا۔ میں تجھے اپنے مال سے بھی کچھ دے دوں گا اور اتنا کچھ دے دوں گا کہ تو باعزت زندگی بسر کر سکے گا اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ میں تجھے اپنے کاروبار میں بھی شریک کر لوں لیکن یہ ساری باتیں اسی وقت ممکن ہوں گی جب تو میرے حق میں عتان سے دست بردار ہو جائے گا۔"

یونس اس طرح چونکا جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ کر جاگ پڑا ہو، بولا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟"

لیث نے کہا۔ "یہی وہ بات ہے جس نے ہم دونوں کو الگ کر دیا ہے۔ اگر تو چالاکی سے عتان پر قبضہ جمانے کی کوشش نہ کرتا تو میں بھی تیرے خلاف نہ ہوتا اور یہ عین ممکن تھا کہ میں اپنے مال و زر سے تیرا حصہ تیرے حوالے کر دیتا۔"

ایسا محسوس ہوا جیسے یونس کسی سوچ میں پڑ گیا تھا، کچھ دیر بعد پوچھا۔ "اچھا اب یہ بات کس طرح بن سکتی ہے؟"

لیث مفید نتیجہ نکلتے دیکھ کر بہت خوش ہوا، بولا۔ "بس تجھے میری سوتیلی ماں سے یہ کہنا پڑے گا کہ میں عتان سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ اس پر لیث کا حق زیادہ ہے۔"

یونس ہنس دیا، بولا۔ "لیث! تو کیسی بے وقوفی کی بات مجھ سے کہلوانا چاہتا ہے۔ اب تو میں درمیان سے نکل ہی گیا ہوں، تو با آسانی عتان سے شادی کر سکتا ہے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "وہ تو تو سچ کہہ رہا ہے لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو میرا ضمیر مجھے زندگی بھر کچوکے لگائے گا۔ میں یہ کام بالا ہی بالا اپنے طور پر نہیں کرنا چاہتا۔ تیری اجازت اور منظوری سے کرنا چاہتا ہوں۔"

یونس ایک بار پھر لیث کی سدھائی، شرافت اور بھولے پن کا قائل ہو گیا حالانکہ لیث کی تجویز میں کئی ایسی باتیں شامل تھیں جن کا وہ اظہار یا اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ لیث جانتا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں اب بھی یونس ہی کا دم بھرتی ہے اور یہ تاثر یونس ہی ختم کر سکتا ہے۔

یونس نے مجبوری سے کہا۔ "اچھا اگر میں تیری خاطر عتان کی ماں سے یہ سب کہہ دوں گا تو اس کے عوض قطعی طور پر مجھے کیا ملے گا؟"

لیث نے چالاک تاجر کی طرح جواب دیا۔ "وہ سب کچھ، جس کا ابھی ابھی میں نے وعدہ کیا تھا۔"

یونس نے کہا۔ "اب جبکہ تو اپنے باپ کی طرح کاروبار ہی پر تل گیا ہے تو میں بھی تھوڑی بہت کاروباری باتیں کر لوں، اجازت ہے؟"

لیث نے کہا۔ "اول تو یہی غلط ہے کہ میں تجھ سے کاروبار کر رہا ہوں، میں کاروبار نہیں کر رہا، اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہوں۔"

یونس نے کہا۔ "چل یہی سہی، میں تیری ہی بات مانے لیتا ہوں لیکن میں عتان کو دے کر خنسا کو لے لوں گا۔"

لیث مسکرایا۔ "واہ، یہ کیسے ممکن ہے، اگر خنسا خود تیرے ساتھ نہ جانا چاہے تو؟"

یونس نے جواب دیا۔ "میں اسے راضی کر لوں گا۔"

لیث نے کہا۔ "اگر تو اسے راضی کر لے گا تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں کروں گا لیکن خنسا کی واپسی میں ایک بداخلاقی کا پہلو باقی رہتا ہے، اس کا خیال ضرور رکھنا۔"

یونس نے پوچھا۔ "کون سی بداخلاقی؟"

لیث نے جواب دیا۔ "خنسا تیرا نذرانہ ہے، اب اگر تو خنسا کو مجھ سے لے لے گا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تو نے اپنا نذرانہ دے کر واپس لے لیا۔"

یونس پر جذباتی دباؤ بڑھنے لگا، بولا۔ "خدایا! یہ کیا ہے کہ میں کاروبارِ حیات میں ہر جگہ خسارہ اٹھا رہا ہوں، معرکۂ زیست میں ہر جگہ شکست کا منہ دیکھ رہا ہوں۔"

لیث نے تسلی دی۔ "خسارہ نہیں، نفع ہی نفع، شکست نہیں ہر جگہ فتح ہی فتح۔ تو اپنے باپ سے کیا لایا تھا؟ تو نے جب مجھ سے دوستی کی ہے اس وقت تیرے پاس کتنی رقم تھی؟ شاید کچھ بھی نہیں لیکن اب جب تو مجھ سے علیحدہ ہوگا یا میرے کاروبار میں شرکت کرے گا تو تیرے پاس مال ہی مال ہوگا، دولت ہی دولت ہوگی۔ اب تو ہی بتا کہ یہ فتح نہیں ہے؟ کیا یہ نفع نہیں ہے؟" لیث نے یونس کو ایک بار پھر قائل کر لیا تھا۔

یونس نے کہا۔ "لیث! میں تیری شرافت اور رحم دلی کا قائل ہو گیا لیکن خنسا کے عوض میں عتان سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔ اگر تو خنسا کو میرا پیش کیا ہوا نذرانہ سمجھتا ہے تو افسوس کہ میں وہ نذرانہ واپس مانگ رہا ہوں۔"

لیث نے بے تامل جواب دیا۔ "اگر خنسا اپنی مرضی سے تیرے پاس جانے پر آمادہ ہو جائے گی تو میں اسے نہیں روکوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔"

یونس نے پوچھا۔ "چل، یہ باتیں تو طے ہو گئیں، اب بتا کہ یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "میں تیرے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔"

یونس اندھیرے میں لیث کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو یونس اندھیرے میں دل کر پکڑ پکڑ کر رونے لگا۔

☆☆☆

قاضی، یونس کو بند کر کے گویا بھول ہی گیا تھا۔ اسے یونس سے ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں وہ آزاد ہوتے ہی اسے قتل نہ کر دے۔ اس اندیشے کے پیش نظر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ یونس قید خانے میں ہی پڑا رہے۔ اب قاضی کی مہربانیاں لیث پر تھیں۔ وہ جب چاہے لیث سے ملنے کے بہانے قصر حمدون پہنچ جاتا تھا۔ وہ لیث سے باتیں کرتے کرتے عتان کی ماں سے مخاطب ہو جاتا اور اس سے ایسی باتیں کرتا جس سے وہ یونس سے نفرت کرنے لگے۔ وہ لیث کی بڑی تعریفیں کرتا لیکن عتان کی ماں پر ان باتوں کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا۔ وہ ہر بار یہی کہتی کہ "یونس مظلوم ہے، اس پر ظلم ہوا ہے لیکن میں اس پر ظلم نہیں کر سکتی۔"

لیث کو ماں کی ضد پر غصہ آتا۔ وہ عتان سے کہتا کہ "تو ماں کو سمجھاتی کیوں نہیں؟ یونس حریص ہے، لالچی ہے حد تو یہ ہے کہ وہ مال و زر کے عوض تجھ سے میرے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گیا ہے۔"

عتان نے جواب دیا۔ "لیث! میں تجھ سے محبت کرتی ہوں لیکن پھر بھی میں اپنی ماں کا دل نہیں دکھا سکتی۔"

خنسا کہتی۔ "اس لڑکی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔"

لیث جواب دیتا۔ "عتان کا دماغ خراب ہے تو ہونے دے۔ میں جب تک اس کو حاصل نہیں کر لوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

خنسا مایوسی سے بولی۔ "میری بھی ایک خواہش ہے، میں لونڈی کے بجائے آزاد بیوی بن کر رہنا چاہتی ہوں لیکن یہ خواہش شاید ہی پوری ہو۔"

اس کے بعد اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

لیث نے جواب دیا۔ "تیری یہ خواہش ایسی نہیں جو پوری نہ ہو۔ بہت آسان ہے۔ میں عتان سے شادی کرنے کے بعد تجھے آزاد کر دوں گا اور اپنے گھر میں دوسری بیوی بنا کر رکھوں گا۔"

خنسا نے بدستور مایوسی سے کہا۔ "مجھے اس کا یقین نہیں ہے کیونکہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ عتان اس کو پسند نہیں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

کرے گی اور یہ ناممکن ہے کہ عنان جو چاہے وہ نہ ہو۔"

لیث نے سوچا۔"چلو اس طرح غنسا کا دل کیوں نہ ٹٹول لیا جائے۔" پوچھا۔"تیری کیا خواہش ہے ذرا پھر تو بتا؟"

غنسا نے جواب دیا۔"یہ کہ میں لونڈی کے بجائے آزاد بیوی کہلواؤں۔"

لیث نے پوچھا۔"کس کی بیوی، میری یا کسی کی بھی؟"

غنسا نے ناگواری سے لیث کو دیکھا، بولی۔"یہ کیا بات ہوئی؟ میری یا کسی کی بھی سے تیرا کیا مطلب ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔"غنسا! تو فرض کرلے کہ میں تجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تیری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری کردینا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اگر میں اپنے دل پر پتھر... رکھ کر تجھے آزاد کردوں اور کسی اور سے تیری شادی کردوں تو کیسا رہے گا؟"

غنسا نے بے زاری سے کہا۔"معلوم نہیں، تو اس وقت اپنے ہوش وحواس میں بھی ہے یا نہیں۔ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہا ہے تو۔ میں محبت تو کروں تجھ سے اور شادی کسی اور سے کرلوں؟ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

لیث نے آہستہ سے کہا۔"لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو یونس میں بھی بڑی دلچسپی لے چکی ہے۔ اگر میں تجھے آزاد کرکے یونس سے تیری شادی کروادوں تو کیسا رہے گا؟"

غنسا نے جواب دیا۔"لیث! وہ دل کا چھوٹا ہے، چالاک ہے، عیار ہے، لالچی بھی ہے اور اس سے بھی بڑی اور بُری بات یہ کہ وہ مصاحب ہے، تن تنہا کچھ بھی نہیں۔ جب تک کوئی بڑا آدمی اس کے بس میں نہ ہو وہ کچھ بھی نہیں رہتا۔"

لیث دنگ رہ گیا کیونکہ اس نے یونس کا مرض واقعی پکڑ لیا تھا پھر بھی لیث نے کہا۔"غنسا! میں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ایک دن زندان میں یونس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ عنان سے میرے حق میں دست بردار ہوسکتا ہے اگر میں اس کے عوض تجھے اس کے حوالے کردوں۔"

غنسا نے تیوریوں پر بل ڈال لیے، بولی۔"پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

لیث نے کہا۔"میں نے یہ جواب دیا کہ اگر غنسا کو کوئی اعتراض نہ ہوا اور وہ اپنی مرضی سے اس پر آمادہ ہوگئی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

غنسا کچھ دیر کے لیے اداس ہوگئی، اس کے گلاب جیسے رخساروں پر موتیوں جیسے آنسوؤں کے قطرات جھلملانے لگے۔ لیث اسے روتا ہوا دیکھتا رہا۔ لیث کی بے بسی پر غنسا کو غصہ بھی آرہا تھا اور رونا بھی۔ غنسا کی مایوسی اور ملال سے کچھ دیر لطف اندوز ہونے کے بعد لیث نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بولا۔"واللہ! تو روتی ہے تو اور زیادہ حسین ہوجاتی ہے۔"

غنسا نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اپنے حسن کی تعریف میں وہ مسحور ہوچکی تھی۔

یونس قید خانے میں لیث کا انتظار کرتا رہا لیکن یہ نہیں پہنچا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر جذباتی دباؤ کم ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کیے پر شرمندگی محسوس... کرنے لگا۔ تنگ وتاریک کوٹھری میں اس کا برا حال ہوگیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دن کیا ہوتا ہے اور رات کسے کہتے ہیں۔

لیث قصداً تاخیر برت رہا تھا۔ آخر یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اب یونس کا کیا حال ہے، وہ قید خانے پہنچ گیا۔

اب یونس کی صحت زیادہ خراب ہوچکی تھی اور پچھتاوا اس کے چہرے سے جھلکنے لگا تھا۔ لیث کا خیال تھا کہ یونس اس کی شکل دیکھتے ہی شکوہ وشکایت شروع کردے گا لیکن وہ خاموش رہا۔ بس چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلکی اور دونوں ہونٹ ذرا سا ہلے، بولا۔"بہت دن بعد آیا تو؟"

لیث نے جواب دیا۔"ہاں لیکن اس دوران میں برابر اسی کوشش میں رہا کہ کسی طرح تجھے رہا کروالوں۔ اللہ اللہ کرکے اب کام بنتا نظر آرہا ہے۔ شاید تیرا باپ تیری رہائی پر آمادہ ہوجائے گا۔"

یونس کے ہونٹوں پر طنز اور پچھتاوے کی ملی جلی مسکراہٹ زیادہ گہری ہوگئی، بولا۔"اب میں قید خانے کی زندگی کا عادی ہوچلا ہوں اور خود کو یہاں تک تو آمادہ کرلیا ہے کہ اگر مجھے نہ بھی چھوڑا گیا اور کسی قسم کی سزا دے دی گئی تب بھی مجھے دکھ یا افسوس نہیں ہوگا۔"

لیث نے جواب دیا۔"یونس! ہم دونوں میں جو ایک زبانی معاہدہ ہوا تھا، وہ یاد بھی ہے یا نہیں؟"

یونس نے کہا۔"یاد ہے۔"

لیث نے پوچھا۔"ہم میں کیا معاہدہ ہوا تھا؟"

یونس نے جواب دیا۔"یہ کہ اگر عنان کی ماں کے سامنے تیرے حق میں عنان سے دست برداری کا اعلان کردوں تو، تو اس کے عوض اپنے مال وزر میں سے میرا حصہ دے دے گا اور غنسا بھی میرے حوالے کردی جائے گی اور یہ بھی کہا تھا کہ شاید کاروبار میں بھی کسی طرح شامل کرلیا جاؤں گا۔"

لیث نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔"خوب، خوب لیکن اس میں اب بھی ذرا سی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ غنسا کی بابت





ہم دونوں میں یہ طے پایا تھا کہ اگر وہ اپنی مرضی سے تیرے پاس جانے پر آمادہ ہوگئی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

یونس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔"ہاں یہی طے پایا تھا۔"

لیث نے کہا۔"تب پھر اب اس معاہدے پر عمل درآمد کا وقت آگیا ہے۔ میں عنان کی ماں کو یہیں تیرے پاس بھیج دوں گا۔ تجھے جو کچھ کہنا ہے، وہیں کہہ سن لے کیونکہ معاہدے کے اس حصے پر رہائی سے پہلے ہی عمل درآمد ہوجانا چاہیے۔"

یونس نے بے یقینی سے لیث کو دیکھا۔"لیکن مجھے رہائی کب ملے گی؟"

لیث نے جواب دیا۔"اس کے فوراً بعد، کیونکہ تیرے باپ نے مجھ سے یہ کہہ رکھا ہے کہ اگر میں چاہوں تو یونس پر مقدمہ چلے گا اور اگر میں مقدمہ نہیں چلانا چاہتا تو وہ تجھے رہا کردے گا۔"

یونس نے کہا۔"تب پھر جلد ہی عنان کی ماں کو میرے پاس بھیج دے، جلد از جلد رہا ہونا چاہتا ہوں۔"

لیث کافی دیر رکنے کے بعد یونس کی ہمت اور حوصلے کا معترف ہوگیا کیونکہ اس تنگ وتاریک کوٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا اور یہ فرض کرکے بہت پریشان ہوا کہ اگر خدانخواستہ اسے یہاں رہنا پڑے تو اس کا کیا حال ہوگا۔

لیث نے واپس جاکر ماں کو یونس سے ملاقات پر آمادہ کیا جس کے دل میں اب بھی یونس کی محبت باقی تھی۔ لیث ماں سے مختصراً باتیں کرکے قاضی سے ملنے کے بارے میں سوچنے لگا کہ یونس کی رہائی کے بارے میں قاضی سے ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ قاضی کے گھر پہنچا تو اسی وقت قاضی لیث کی حویلی میں داخل ہورہا تھا۔ قاضی نے لیث کی ماں کو مطلع کیا..."قاضی لبیب بجری تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔"

عنان کی ماں کو شبہ گزرا کہ شاید قاضی کے دل میں شفقت پدری بیدار ہوگئی ہے اور وہ اپنے بیٹے یونس کے رشتے کی بات کرنے آگیا ہے وہ قاضی سے بات کرنے پر رضامند ہوگئی... قاضی نے آس پاس کا جائزہ لیا اور پوچھا۔"تیری بیٹی عنان کہاں ہے؟"

ماں نے جواب دیا۔"وہ اندر کہیں ہوگی، کیا میں اسے بلوالوں؟"

قاضی نے کہا۔"نہیں، میں عنان ہی کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ماں نے جواب دیا۔"عنان یہاں نہیں ہے اور جب تک میں نہیں بلاؤں گی، نہیں آئے گی۔ تجھے جو بات بھی کرنا ہو، بلا پس وپیش کر ڈال۔"

قاضی نے پھر پوچھا۔"یہاں کوئی اور بھی ہے یا مکمل تخلیہ ہے؟"

ماں نے جواب دیا۔"مکمل تخلیہ ہے۔ تو پریشان نہ ہو اور میں اس بات کا وعدہ کرتی ہوں کہ تو مجھ سے جو باتیں کرے گا، میں اسے راز میں رکھوں گی۔"

قاضی نے اٹک اٹک کر خوشامدانہ کہا۔"خاتون! پہلی بات تو میں عنان اور لیث کی کروں گا۔ میں حیران ہوں کہ تو نے میرے لفنگے بیٹے یونس کو لیث پر کیوں ترجیح دی حالانکہ لیث تیرے شوہر کا شریف ترین بیٹا ہے۔"

ماں کو سخت غصہ آیا کہ یہ کیسا احمق قاضی ہے جو اپنے بیٹے پر لیث کو ترجیح دے رہا تھا۔ بولی۔"یہی بات کرنا ہے یا کچھ اور بھی؟"

قاضی نے جواب دیا۔"خاتون! تو یقین کر، میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پہلے میری پہلی بات کا جواب دے دے۔ اس کے بعد میں دوسری بات کروں گا۔"

ماں نے درشت لہجے میں کہا۔"میں نہیں جانتی کہ تو کس طرح معزز اور سمجھدار قاضی سمجھا جانے لگا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عنان کے سلسلے میں تو یونس کی سفارش کرتا کیونکہ یونس تیرا اپنا بیٹا بھی ہے لیکن تو بات کررہا ہے لیث کی۔ مجھے تیری یہ بات ماننے میں پس وپیش ہے۔"

"معزز خاتون! پہلے میری بات تو سن لیجیے اس کے بعد میں کوئی اور بات کروں گا۔ اگر یونس تیرا داماد بن گیا تو میں ابھی اسی وقت یہ پیش گوئی کرسکتا ہوں کہ وہ تجھے اور تیرے کاروبار کو تباہ برباد کردے گا۔ اس لیے یونس کا تو اپنے ساتھ رکھنے کا دل میں خیال ہی نہ لا۔"

ماں نے جواب دیا۔"تو خوامخواہ الجھ رہا ہے۔ میں تجھ سے ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ میں تیرے بیٹے یونس کو زبان دے چکی ہوں اور اب اس فیصلے میں اسی وقت کوئی تبدیلی ہوسکتی ہے جب یونس خود انکار کردے۔"

قاضی نے حویلی کے درودیوار کو للچائی نظروں سے دیکھا اور گلا صاف کرکے بولا۔"نیک بخت! میری باتیں ذرا غور سے سن اور جب تک بات پوری نہ ہوجائے، درمیان میں دخل مت دینا۔"

عنان کی ماں نے بے مروتی سے کہا۔"کہہ، میرا وعدہ ہے میں بیچ میں دخل نہیں دوں گی۔"

قاضی نے کہا۔"خاتون! جیسا کہ میں نے تجھے بتایا

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ میں ایک معزز شخص ہوں۔ آل بویہ کا سلطان عضد الدولہ مجھ پر سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہے اور اس کے اس اعتماد کے پیچھے میری نیک نامی، عدل و انصاف اور دیانت داری کام کر رہی ہے۔ جب میں تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ تو عثان کا ہاتھ اپنے سوتیلے بیٹے لیث کے ہاتھ میں دے دے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں لیث کو نیک نوجوان سمجھتا ہوں اور بفرض محال اگر یہ اندیشہ ہو کہ لیث تجھے خوش نہیں رکھے گا اور شادی کے بعد تجھے پریشان کرے گا تو میرے پاس اس اندیشے اور اس پریشانی کا حل بھی ہے۔“

اس کے بعد قاضی نے سکوت اختیار کیا اور عثان کی ماں کے چہرے سے اس کے اندر کی حالت کا اندازہ لگانے لگا۔

اسی وقت خنسا آگئی اور ماں سے پوچھا۔ ”کیا آپ جانتی ہیں کہ لیث کہاں چلا گیا؟“

لیکن ماں کے جواب سے پہلے ہی قاضی نے خنسا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی! شاید تو وہی ہے جسے میں پہلی بار اہواز میں لیث کی حویلی میں دیکھ چکا ہوں؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں وہی ہوں اور شاید تو قاضی لبیب بخدی ہے، یونس کا سخت دل باپ؟“

قاضی نے کہا۔ ”ہاں بے شک میں وہی ہوں لیکن تیرا یہ خیال غلط ہے کہ میں کوئی سخت دل انسان ہوں۔“

عثان کی ماں ان فضول باتوں سے الجھ رہی تھی، خنسا سے کہا۔ ”ہاں لیث کہیں گیا ہوا ہے، اس سے کوئی کام؟“

خنسا نے جواب دیا۔ ”اہواز سے لیث کا غلام آگیا ہے اس کو میں کالا شیطان کہتی ہوں......“

ماں نے بات کاٹ دی۔ ”اگر غلام آگیا ہے تو حویلی کے خدام سے کہہ دے کہ اسے اپنے ساتھ ٹھہرا لیں، لیث بھی آجائے گا۔ آخر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

خنسا چلی گئی لیکن قاضی اور عثان کی ماں کے بیٹھنے کے انداز سے وہ سمجھ گئی کہ اس وقت ان دونوں میں کچھ اہم باتیں ہو رہی ہیں۔ اس کے جاتے ہی عثان کی ماں نے کہا۔ ”یہ لڑکی لیث کی لونڈی ہے، اسی لیث کی جس کی تو سفارش کر رہا ہے اور جس کی نیکی اور شرافت کا تیرے دل پر رعب بیٹھ گیا ہے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اگر یہ لڑکی لیث کی لونڈی ہے تو اس سے اس کی نیکی، شرافت پر کون سا حرف آیا جاتا ہے۔ لونڈیاں تو خوش حال گھرانوں کا جزو ہیں اور ان سے کسی شخص یا خاندان کی عزت بڑھتی ہے۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”میں تجھ سے بحث نہیں کرنا چاہتی، اب اپنی بات مکمل کر۔“

قاضی نے پرشوق نظروں سے بیوہ کے سراپے کا جائزہ لیا، بولا۔ ”خاتون! بات غیر متعلق سہی لیکن کیا تو اپنی عمر بتانا پسند کرے گی؟“

عثان کی ماں نے ترش لہجے میں کہا۔ ”قاضی! یہ تو بہک کیوں رہا ہے؟ کہیں تو پی کر تو نہیں آیا؟“

قاضی نے اس کی بات کو ہنسی میں ٹال دیا، بولا۔ ”میرا خیال ہے تیری عمر بمشکل پینتیس چالیس کی ہوگی، اس عمر میں بیوگی اچھی نہیں لگتی۔“

عثان کی ماں اٹھنے لگی، بولی۔ ”اگر اب اصل باتیں باقی نہیں رہیں اور یہی فضول باتیں رہ گئی ہیں تو مجھے چلے جانا چاہیے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”خاتون! اگر تو میری پوری بات سنے بغیر ہی چلی گئی تو زندگی بھر پچھتائے گی۔ میں تیرے بالوں میں سیاہی اور تیری جلد میں شباب کا تناؤ اور چمک محسوس کر رہا ہوں۔ اگر لیث کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو تو میں تجھ سے شادی کرنے پر تیار ہوں۔ اس طرح تجھ کو ایک مضبوط سہارا مل جائے گا اور لیث تو لیث کوئی بھی شخص تجھے اپنے دغا و فریب اور ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنا سکے گا۔“

عثان کی ماں خلاف توقع مزید برہم نہیں ہوئی۔ قاضی کو غور سے دیکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، بولی۔ ”کچھ اور یا بس؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اور کچھ یہ کہ مجھ سے شادی کرکے تو اس معاشرے کی معزز خاتون میں شمار کی جانے لگے گی۔“

عثان کی ماں نے کچھ سوچتے ہوئے بے خیالی میں پوچھا۔ ”تو تو مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک کیونکہ مجھ سے شادی کرکے تو احساس تحفظ حاصل کرے گی۔“

عثان کی ماں ایک دم جوش و خروش سے کھڑی ہوگئی اور ڈانٹتی ہوئی بولی۔ ”او ذلیل انسان! اب تو یہاں سے چلا جا ورنہ میں اپنے انجام کی پروا کیے بغیر تجھے دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔“

قاضی حیران رہ گیا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا، بولا۔ ”میری پیشکش پر ٹھنڈے دل سے غور تو کر، مجھے جلدی نہیں ہے۔“

عثان کی ماں نے کسی غلام کو آواز دی۔ ”ارے کوئی ہے جو اس دیوانے کو نکال باہر کرے۔“

قاضی خود ہی کھڑا ہوگیا، کہا۔ ”خاتون! تو میری وجہ



سے پریشان نہ ہو اور میں تیری تیغ کلامی سے نہیں گھبرا رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میری یہ پیشکش اس وقت کتنی ہی شاندار کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کی افادیت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا جب خاتون تجھ پر کوئی خطرناک وقت آ پڑے گا اور تجھے سرکار دربار سے واسطہ پڑے گا۔ تب میں تجھ سے پوچھوں گا کہ خاتون! اب تو کیسی ہے؟ تو اس وقت تیرے پاس رونے کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا اور میں بہت یاد آؤں گا۔“

اتنے میں حویلی کا غلام بھی آگیا، اس نے پوچھا۔ ”مجھ سے کوئی کام؟“

عثان کی ماں نے کہا۔ ”اسے باہر جانے کا راستہ بتا دے۔“ یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔ قاضی حیران اور پریشان اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

غلام کو اچانک یاد آگیا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے جشن طرب میں یونس کو گرفتار کرکے قید خانے بھیج دیا تھا، ڈر گیا بولا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ اگر آپ واقعی باہر جانے کا راستہ نہیں جانتے تو میں اسی وقت آپ کو باہر تک لے جا سکتا ہوں۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں راستے کسی سے پوچھ کر نہیں طے کرتا بلکہ میں اپنے راستے خود ہی نکال لیا کرتا ہوں۔ تیری مہربانی جو تو اسی وقت ذرا سی دیر کے لیے اپنی آقا کو بلوا لے۔“

اندر جب عثان کی ماں کو یہ معلوم ہوا کہ قاضی اس سے چند باتیں اور کرنا چاہتا ہے اور اپنی بات پوری کیے بغیر وہ یہاں سے نہیں ٹلے گا تو وہ مجبوراً واپس آگئی، بولی۔ ”میں نے سنا ہے کہ تو کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے؟“

قاضی نے خوش ہوکر جواب دیا۔ ”ہاں واقعی ایک ضروری بات تو رہ ہی گئی تھی۔ اگر اجازت دے تو عرض کر دوں؟“

عثان کی ماں نے جواب دیا۔ ”جب اندر سے بلوا ہی لیا ہے تو جو کچھ مزید کہنا چاہتا ہے، کہہ کر میرا پیچھا چھوڑ۔“

قاضی نے اپنے پاس کھڑے ہوئے غلام کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔ ”یہ تو میرے سر پہ کیوں کھڑا ہے؟ جا، بھاگ جا ورنہ ایک ایسا ہاتھ رسید کروں گا کہ وجود تک کا پتا نہ چلے گا۔“

غلام ڈر کر چلا گیا۔ قاضی نے عثان کی ماں سے کہا۔ ”ابھی ہم دونوں میں جو باتیں ہوئی ہیں انہیں اپنے سینے میں قیمتی اور خطرناک راز کی طرح محفوظ رکھنا۔ کسی اور پہ ہرگز نہ ظاہر کرنا۔ ورنہ ہم دونوں رسوا ہو جائیں گے اور اس رسوائی سے تجھ ہی کو نقصان پہنچے گا۔“

عثان کی ماں نے پوچھا۔ ”بس کچھ اور؟ اب تو میں جا سکتی ہوں اور جاتے جاتے یہ کہتی جاؤں گی کہ تیری یہ عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے، رنگینیوں اور عیاشیوں کے لیے نہیں ہے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”اب تو میں واپس جاؤں گا اور ایک ہفتہ بعد پھر آؤں گا۔ امید ہے کہ اس وقت تک تو کسی نہ کسی نتیجے پر ضرور پہنچ جائے گی۔“

☆☆☆

عثان کی ماں قید خانے میں یونس سے ملنے گئی تو معلوم ہوا کہ قاضی کی اجازت کے بغیر یہ ملاقات نہیں ہو سکتی لیکن عثان کی ماں، قاضی کے نام تک سے بیزار تھی۔ لیث نے کہا۔ ”یہ اجازت میں حاصل کر لوں گا۔“

ماں نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا نام نہ آئے۔“

لیث نے کہا۔ ”نام تو لینا ہی پڑے گا کیونکہ اس کے بغیر قید خانے کا نگران آپ کو اندر نہیں جانے دے گا۔“

لیث بھاگا بھاگا قاضی کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”میری ماں قید خانے میں یونس سے ملنا چاہتی ہے، کیا ملنے کی اجازت دے دی جائے گی؟“

قاضی نے مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ یونس نے تیری ماں پر کون سا جادو کر دیا ہے جو وہ قید خانے تک پہنچ گئی؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں لیکن وہ یونس کو بہت پسند کرتی ہے۔“

قاضی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”تیری کیا رائے ہے؟ کیا اسے ملنے کی اجازت دے دی جائے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے، دے دی جائے۔“

”اس کا یونس سے ملنا تیرے خلاف تو نہیں جائے گا؟“

”نہیں شاید نہیں، میرا خیال ہے اس کی یہ ملاقات میرے حق میں رہے گی۔“

قاضی کو یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ کہیں اس کی ماں نے قاضی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ذکر لیث سے کر تو نہیں دیا، پوچھا۔ ”ایک دن شاید پرسوں میں تیری ماں سے ملا تھا اور اس نے تیری اور عثان کی شادی کا ذکر کیا تھا، کیا اس نے تجھے کچھ بتایا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

قاضی نے لیث سے بے ساختہ جواب اور تجسس چہرے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ سچ بچ لاعلم ہے۔ ”میں ملنے کی اجازت تو دیے دیتا ہوں لیکن تیری ماں سے میں خود بھی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک بار اور ملوں گا۔''

لیث ملاقات کا اجازت نامہ لے کر چلا گیا۔ اس نے ماں کو یونس کے روبرو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ یونس ان دونوں کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ذرا سی دیر کے لیے بوکھلا گیا۔

لیث نے ماں سے پوچھا۔ ''کیا میں باہر چلا جاؤں؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''نہیں، باہر جانے کی ضرورت نہیں، یہیں موجود رہو۔''

لیکن ماں نے کہا۔ ''اگر تجھے برا نہ لگے تو ذرا سی دیر کے لیے باہر چلا جا۔''

لیث بے چون چرا باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک دم خاموشی طاری ہو گئی۔ گویا دونوں کے پاس بات کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ ماں دیر تک یونس کا مدقوق چہرہ دیکھتی رہی، بولی۔ ''یہاں یہ تیرا کیا حال ہو گیا؟''

کوٹھری میں ایک شمع روشن تھی۔ یونس نے اس شمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''خوش قسمتی سے آج تو یہ شمع بھی روشن ہے ورنہ شب و روز کا بیشتر وقت اندھیرے میں ہی گزرتا ہے۔ میں یہاں دھوپ، ہوا اور روشنی سے یکسر محروم ہوں۔ ہاضمہ بھی بگڑ گیا ہے، کھانا بھی صحیح نہیں ملتا پھر صحت کس طرح برقرار رہے گی۔''

ماں نے افسوس سے کہا۔ ''میں تیری ماں نہیں ہوں لیکن تیری مصیبتوں پر ماں جیسی اذیت محسوس کر رہی ہوں جبکہ تجھے قید میں ڈالنے والا تیرا باپ ہے اور اس پر اس کا کوئی اثر نہیں۔''

یونس نے کہا۔ ''اب چھوڑیے ان باتوں کو اور یہ بتایئے، آپ کا آنا کیونکر ہوا؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''میں نے تو یہ سنا تھا کہ تو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔''

یونس بے بسی سے مسکرا دیا۔ ''ہاں، میں نے ہی آپ سے ملنے کی خواہش کی تھی اور اب خود ہی آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ کیوں زحمت فرمائی۔''

ماں نے کہا۔ ''یونس! میں نے بیوگی کے دوران عجیب عجیب تجربے کیے۔ انسانوں کو ان کے اصل روپ میں دیکھا اور اس سے اتنی مایوس ہوئی کہ بعض اوقات مر جانے یا تارک الدنیا ہو جانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔''

یونس نے سرد آہ بھری، بولا۔ ''آپ نے تو خاص عمر گزار لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا، میں تو ہوش سنبھالنے کے بعد سے مسلسل ان ہی تجربوں سے گزر رہا ہوں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کیا تیرا باپ بھی کبھی تجھ سے ملنے آیا؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''ایک بار بھی نہیں۔''

ماں نے پوچھا۔ ''تجھے بھی بلوایا؟''

''نہیں بلوایا، ابھی تک تو مجھ پر مقدمہ بھی نہیں چلا۔''

ماں نے ہول کر پوچھا۔ ''تو اب ہوگا کیا؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''کچھ پتا نہیں، میں نے تو یہ سوچنا ہی ترک کر دیا ہے کہ اب کیا ہوگا۔''

ماں نے کہا۔ ''میری مستقل مزاجی دیکھ کہ مجھے تیرے خلاف بہت زیادہ ورغلایا گیا اور ان ورغلانے والوں میں تیرا باپ بھی شامل ہے لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور میں اب بھی تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ میں ہر ایک سے یہی کہتی ہوں کہ عنان یونس کی ہے اور یونس ہی کو دی جائے گی۔''

یونس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور شاید آپ کی ذات میری زندگی کی پہلی وہ ذات ہے جس نے مجھے محبت اور خلوص دیا ورنہ ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ ہر کوئی مطلبی ہے، خود غرض ہے، اپنا کام نکال کر بھول جاتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ ایسی باتوں نے میرے دل سے انسان کا اعتبار اٹھا دیا ہے۔''

ماں نے پوچھا۔ ''پھر اب کیا ہوگا؟ اب کیا کیا جائے معاملے کو کس طرح سلجھایا جائے؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''ماں! میں نے اس لیے آپ سے ملنے کی خواہش کی تھی، میں بڑے دکھ اور اذیت سے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ آپ مجھے بھلا دیں اور وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ عنان کو لیث سے وابستہ کر دیا جائے۔''

ماں نے گھبرا کر یونس کی طرف دیکھا، اس نے جو کچھ سنا تھا، اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، بولی۔ ''یہ تو کیا کہہ گیا ہے؟ کیا تو اس حد تک مایوس ہو گیا ہے کہ خدا کی رحمتوں کا بھی خیال نہیں رہا؟''

یونس نے اسی طرح مایوسی سے کہا۔ ''بات یہ نہیں ہے بلکہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں جیسی قسمت لے کر آیا ہوں اس کے زیر اثر عنان بھی ہمیشہ پریشان اور مصیبت زدہ رہ سکتی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ عنان میری وجہ سے مصیبتیں جھیلے۔''

ماں نے ہمت بندھائی، کہا۔ ''ہمت نہ ہار، حوصلہ رکھ کبھی تو قسمت پلٹا کھائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تیری قسمت عنان پر اثر انداز ہونے کے بجائے عنان کی قسمت تجھ پر اثر انداز ہو اور تیری قسمت ہی بدل جائے۔''

یونس کھوکھلا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''شاید عنان کی قسمت میری قسمت سے مختلف نہیں ہے۔ اس کے اپنے باپ کی موت پھر سوتیلے باپ حمدون مغیث کا انتقال اور شادی سے پہلے یہ ہنگامہ آرائیاں۔ کیا اس کی بدقسمتی کی غماز نہیں ہیں؟''

ماں بھی کسی حد تک یونس کی دلیلوں کی قائل ہو گئی لیکن اس کا دل عنان کو بدقسمت سمجھنے پر آمادہ نہیں تھا پھر وہی سوال کیا۔ ''اب میں کیا کروں؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''میرا کہنا مانیے اور عنان کی شادی لیث سے کر دیجیے۔''

ماں نے پوچھا۔ ''کیا تو یہ فیصلہ خلوص دل سے کر رہا ہے؟''

''ہاں کیونکہ میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ عنان کی خوشیوں کی پروا کیے بغیر اپنی فضول خواہش پر اڑا رہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کی رفاقت ایک دوسرے کو راس نہیں آئے گی۔ اس لیے ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کا خیال اپنے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال دیں۔''

ماں نے کسی حد تک یونس کی بات مان لی لیکن اب بھی پورے دل سے وہ اس پر تیار نہیں تھی کہ عنان کو لیث سے وابستہ کیا جائے۔

آخر رخصت ہوتے ہوئے ماں نے کہا۔ ''یونس! میں تیری مایوسی پر افسوس کر رہی ہوں۔ میں تیرا انتظار کروں گی۔ زیادہ نہیں کم از کم چھ ماہ ضرور کروں گی، اس کے بعد عنان کا مسئلہ حل کروں گی۔''

ماں باہر نکلی اور لیث کو ساتھ لے کر اپنے قصر کی طرف چل پڑی۔ واپسی میں وہ بہت چپ چپ تھی۔ لیث اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ماں اور یونس میں کیا طے پایا لیکن ماں نے کوئی بات نہیں کی لیکن چند دنوں میں یہ فرق ظاہر ہوا کہ ماں لیث سے خوش دلی سے باتیں کرنے لگی تھی اور عنان بھی لیث کے گرد چکر لگانے لگی تھی۔ لیث نے عنان سے پوچھا۔

''عنان! کیا بات ہے آج کل تو بہت خوش نظر آ رہی ہے اور مجھ پر بھی توجہ دینے لگی ہے؟''

عنان نے جواب دیا۔ ''میں نے تجھ پر کب توجہ نہیں دی؟ کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے کہ میں نے تجھ سے محبت نہیں کی؟''

لیث نے کہا۔ ''لیکن چند دنوں پہلے تک تو مجھ سے ذرا دور دور رہتی تھی مگر اب تو مجھ سے زیادہ قریب رہنے لگی ہے۔''

''ہاں، تو نے بالکل صحیح محسوس کیا۔ پہلے ماں یہ کہا کرتی تھی کہ میں تجھ سے زیادہ ربط و ضبط نہ رکھوں کیونکہ اس طرح یونس کو غلط فہمی ہو سکتی تھی لیکن اب ماں نے مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں تجھ سے مل جل سکتی ہوں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

لیث کو عنان کی باتیں اچھی نہیں لگیں کیونکہ عنان معاملات عشق و محبت میں بھی ماں کی اجازت کی قائل اور پابند تھی۔ لیث نے سوچا اگر کاروبار اور مال و زر کو عنان اور اس کی ماں کے ذکر سے حذف کر دیا جائے تو عنان میں حسن کے علاوہ کوئی بات ایسی نہیں ملے گی جو لیث کی دلچسپی کا باعث بنتی۔ اس نے عنان سے پوچھا۔

''عنان! عشق و محبت میں تو انسان باغی اور سرکش ہو جاتا ہے لیکن تو اس میں بھی کم ہمتی کا مظاہرہ کر رہی ہے، آخر کیوں؟''

عنان نے جواب دیا۔ ''لیث! میں بزدل یا کم ہمت نہیں ہوں لیکن ماں کا احترام اور محبت کرتی ہوں اور یہ نہیں چاہتی کہ اپنی محبت اور شوق سے اپنی ماں کو دکھ پہنچاؤں۔''

ان دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ خنسا بھی ان دونوں کے پاس پہنچ گئی اور ہنس کر پوچھا۔ ''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''خنسا! تو بھی شریک گفتگو ہو جا، بڑی کام کی باتیں ہو رہی ہیں۔''

خنسا نے کہا۔ ''تم دونوں میں کام کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ عنان میری طرح آزادی سے بات نہیں کر سکتی۔ یہ تو اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کی پابند ہے۔''

عنان نے جل کر جواب دیا۔ ''ہم دونوں کی حیثیتوں میں بڑا فرق ہے۔ تو لونڈی ہے، غلام۔ اس لیے تو ہر معاملے میں لیث کی مرضی اور خواہش کی پابند ہے لیکن میں آزاد ہوں اور اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کی پابند نہیں، اس کا احترام ضرور کرتی ہوں۔''

خنسا نے بڑے کرب سے عنان کی طرف دیکھا پھر لیث سے مخاطب ہوئی۔ ''لیث! تو میری اس بات کی تائید کرے گا کہ میں پیدا تو آزاد ہوئی تھی لیکن انسانوں نے مجھے کنیز بنا دیا، اب میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کا میں شکوہ کس سے کروں؟''

لیث نے عنان کو سمجھایا۔ ''عنان! تجھے خنسا سے اتنی تلخ بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ کسی انسان کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ میرا خیال ہے اگر تو خنسا سے اپنی بات پر معذرت کر لے تو اس کی دلجوئی ہو جائے گی۔''

عنان نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''اب میں اتنی گئی گزری بھی نہیں کہ ایک کنیز سے معافی مانگوں۔ معذرت یا معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

خنسا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''عنان! برے وقت سے ڈر، عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

www.paksociety.com

www.paksociety.com

عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ اس میں انسان کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تو نے میری دل آزاری کی ہے اس لیے میں اپنے خدا سے صبر اور برداشت کی ہمت چاہوں گی۔ وہی مجھے تحمل اور تجھے اس کا بدل دے گا۔"

عثمان، خنسا سے چڑتی تھی۔ لیث سے بولی۔ "لیث! اس زرخرید کو سمجھا لے، یہ مجھے بددعا دے رہی ہے۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر یہ درمیان میں نہ ہوتی تو میں کب کا وہ فیصلہ کر چکی ہوتی جس کا تو منتظر ہے۔"

لیث نے خنسا کو سمجھایا۔ "خنسا! تو احتیاط سے کام لے۔ اس حویلی کی فضا بڑی سوگوار ہے۔ یہاں کا ہر شخص دکھی ہے۔" پھر عثمان سے کہا۔ "اور عثمان! میں تجھ سے بھی یہی کہوں گا کہ تو خنسا کے معاملے میں فراخ دلی سے کام لے۔"

عثمان جواب دیے بغیر روتی ہوئی چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی لیث نے خنسا کو آغوش میں لے لیا اور اس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ "نہ رو میری جان۔ عثمان نادان ہے۔ ماں پر ناز کرتی ہے لیکن اس غریب کو نہیں معلوم کہ عنقریب اسے مجھ سے وابستہ کر دیا جائے گا کیونکہ یونس نے اپنی ہار مان لی ہے۔"

خنسا نے آغوش سے نکلنے کی کوشش کی، بولی۔ "اگر بات یہاں تک پہنچ چکی ہے تو میں تجھ سے صاف صاف کہوں گی کہ اب تامل اور انتظار کا وقت نہیں رہا۔ تو مجھے فوراً آزاد کر کے اپنی بیوی بنا لے کیونکہ اگر عثمان مجھ سے پہلے تیری بیوی بن گئی تو وہ میری راہ میں کانٹے بچھانے سے باز نہیں رہے گی۔"

لیث نے بوسوں کی بوچھاڑ کر دی، بولا۔ "خنسا! اگر میں عثمان سے پہلے تجھے اپنی دلہن بنا لوں گا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا اس لیے جہاں تو نے اتنا صبر کیا ہے کچھ اور کر لے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں نے تجھ سے جو عہد کیا ہے اس سے پھروں گا نہیں۔"

خنسا نے مایوسی سے کہا۔ "میں کس طرح یقین کر لوں کہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے درست ہے۔ اگر عثمان سے شادی کرنے کے بعد تو نے اپنا یہ عہد پورا بھی کر دیا تو مجھے زندگی بھر یہ ملال رہے گا کہ میں نے تجھ سے ایک خواہش کی تھی اور تو نے اس کی پروا کیے بغیر وہی کیا جس پر تو عمل کرنا چاہتا تھا یعنی عثمان کو مجھ پر ترجیح دی۔"

لیث نے جواب دیا۔ "تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ عثمان بہرحال میری سوتیلی ماں کی بیٹی ہے اور میں اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوں پھر بھی جہاں تک تیری ذات کا تعلق ہے، میرے لیے تو بھی بہت اہم ہے۔ تو فکر مند نہ ہو اور یہ سمجھ لے کہ زندگی میں اس قسم کے سانحے آتے ہی رہتے ہیں۔"

خنسا نے جواب دیا۔ "میں تو تیری طفل تسلیوں پر یقین کرنے پر مجبور ہوں ورنہ میرا دل اندر سے یہی کہتا رہتا ہے کہ کوئی بھی انسان اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ میں نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے ایک مثل سنی تھی آج اس کی صداقت پر غور کرتی ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔"

لیث نے اشتیاق سے پوچھا۔ "کون سی مثل؟ میں بھی تو سنوں۔"

خنسا نے جواب دیا۔ "ہسپانیہ کی مثل ہے کہ اعتبار کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن نہ اعتبار کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔ کہیے کیسی مزے کی بات اس مثل میں کہی گئی ہے۔"

لیث نے کہا۔ "بات تو بڑی اچھی کہی گئی ہے اس مثل میں، میں بھی اس پر عمل کروں گا۔" خنسا خاموش رہی۔

عثمان نے ساری باتیں ماں سے جا کر کہہ دیں جس سے پورے قصر میں بڑی بدمزگی اور کشیدگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ ماں کے رویے میں پھر فرق آ گیا۔ وہ لیث سے پھر کھنچ گئیں۔ ایک دن رات کو نصف شب کے بعد اس نے اپنی ماں کو سجدے میں پڑا دیکھا۔ وہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھی۔

"اے اللہ! تو یونس کو رہا کروا دے تاکہ میں اپنی عثمان کو اس سے وابستہ کر دوں۔ لیث مجھے پسند نہیں گو کہ یہ میرے شوہر اور میری سوت کا بیٹا ہے۔ اگر لیث ہی سے میری عثمان کا رشتہ مقدر ہو چکا ہے تو اس کا خنسا سے پیچھا چھڑا دے۔ اگر میری دعا قبول ہو گئی، تو نے میری سن لی تو شکرانے میں، میں پہلے حج بیت اللہ کو جاؤں گی۔ اس کے بعد واپس آ کر عثمان کی شادی کروں گی۔" جب یہ دعا لیث کے کانوں تک پہنچی تو لیث لرز گیا کیونکہ اس دعا کی قبولیابی میں اس کا نقصان تھا۔ اگر یونس رہا ہوتا تھا تو وہ عثمان سے محروم ہو جاتا اور اگر یونس رہا نہیں ہوتا اور عثمان، لیث ہی کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی تو وہ خنسا سے محروم ہو جاتا اور خنسا سے جدائی اس کے لیے سوہان روح بن سکتی تھی لیکن اسے یونس کے سلسلے میں پورا پورا یقین تھا کہ اس کی رہائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اس رات کے بعد صبح ہی صبح ماں نے بڑی قوت ارادی سے لیث پر یہ واضح کر دیا کہ اگر عثمان سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خنسا سے پیچھا چھڑا لے کیونکہ وہ خنسا کی موجودگی میں عثمان کی شادی لیث





سے نہیں کر سکتی۔

لیث نے دل شکستگی سے جواب دیا۔ "ماں! میں نے یہ بات عثمان سے بھی کہی تھی اور اب آپ سے بھی کہہ رہا ہوں کہ دل آزاری بدترین گناہ ہے۔ انسان کو اس سے بچنا چاہیے۔ خنسا مجھ سے محبت کرتی ہے پھر میں کس طرح اسے الگ کر سکتا ہوں۔ قصر کے کسی گوشے میں اگر خنسا بھی پڑی رہے تو اس میں آپ کا یا عثمان کا کیا نقصان ہے؟"

ماں نے کہا۔ "یہ بات صرف میں ہی نہیں عثمان بھی کہتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ خنسا کی موجودگی میں وہ تجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ رہی یہ بات کہ خنسا تجھ سے محبت کرتی ہے تو تجھے یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ عثمان بھی تجھ سے محبت کرتی ہے۔ دل آزاری اگر بدترین گناہ ہے تو تو لاعلمی میں اس گناہ کا برابر کا ارتکاب کر رہا ہے۔ خنسا کی موجودگی اور اس سے گہرے روابط اور رشتہ ہم دونوں ہی کی دل آزاری کا سبب بن گیا ہے۔ اگر تو دو دلوں کے آزار سے بچنا چاہتا ہے تو خنسا کو جلد از جلد رخصت کر دے۔"

لیث نے سختی سے جواب دیا۔ "تب پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں خنسا کو جدا کر دوں۔ میں خنسا کو کسی بھی قیمت پر اپنے سے جدا نہیں کروں گا۔"

ماں نے مایوسی سے کہا۔ "تیری مرضی میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ میں اپنے رب سے مایوس نہیں ہوں، وہ ان گہرے بادلوں میں سے امید کا سورج طلوع کر سکتا ہے۔ رات کی گہری سیاہیاں یہ اشارہ کرتی ہیں کہ صبح قریب ہے۔ میرا دل بار بار مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ مت گھبرا، اب صبح زیادہ دور نہیں، بالکل قریب ہے۔"

لیث ماں کی باتوں سے بیزار ہو کر خنسا کے پاس چلا گیا اور اس سے کہا۔ "خنسا! اس قصر میں مایوسیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آ، میرے ساتھ چل۔ میں تیرے ساتھ دجلہ کے کنارے گھومنا چاہتا ہوں۔ چاندنی راتوں میں بڑا مزہ آئے گا۔"

خنسا نے مایوسی سے کہا۔ "میں تیرے ساتھ چل تو سکتی ہوں لیکن ذرا ایک بار سوچ لے، اس مکدر فضا میں میرا تیرے ساتھ گھومنا پھرنا بالکل اچھی بات نہیں۔"

لیث نے جواب دیا۔ "کیا اچھا ہے اور کیا برا، مجھ سے زیادہ تو نہیں جانتی۔ عثمان مجھے ملے یا نہ ملے لیکن میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ میں تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں اور عزت بھی۔"

خنسا پھولی نہیں سما رہی تھی۔ بے اختیار لیث سے چمٹ گئی اور فرط جوش میں بولی۔ "لیث! تو ایک عظیم انسان ہے۔"

خنسا اور لیث دونوں دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں ہاتھ میں ہاتھ لے کر لیث بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ آسمان پر تیرہ تاریخ کا چاند بھی چودھویں کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لیث سے کہا۔ "کبھی کبھی اس چاند کو بھی دیکھ لیا کر، یہ قدرتی مناظر ہمیں بڑی فرحت اور تازگی بخشتے ہیں۔ میں اس وقت کی خوشی کو لفظوں میں کس طرح بیان کروں، یہ بات میرے اختیار اور قابو میں نہیں رہی۔"

لیث بھی قدرتی مناظر میں گم تھا۔ ان کی جنت دجلہ کے کنارے اتر آئی تھی۔

☆☆☆

یہیں دجلہ کے کنارے آل بویہ کے نامور فرزند عضدالدولہ کا محل بھی تھا۔ عضدالدولہ عباسی خلیفہ پر اس حد تک حاوی آ گیا تھا کہ بغداد اور اس کے نواح میں حکم عضدالدولہ ہی کا چلتا تھا۔ اس وقت قاضی عضدالدولہ کے پاس آیا ہوا تھا اور اسے کسی شخص نے آ کر چپکے سے کان میں یہ بتا دیا تھا کہ لیث اور اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے، دونوں دجلہ کے کنارے محوِ خرام ہیں۔

قاضی نے جلدی جلدی گفتگو کر کے عضدالدولہ سے گھر جانے کی اجازت لے لی اور اپنے قصر سے فوراً عثمان کی ماں کے پاس روانہ ہو گیا۔ جب اس کی سواری قصر کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوئی تو پہرے داروں اور دربانوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

قاضی نے ایک دربان سے کہا۔ "دربان! جا اندر جا کر اپنی مالکہ سے کہہ دے کہ قاضی جلدی میں ہے اور اس سے جلدی سے ملاقات کر لے تاکہ وہ فوراً ہی واپس بھی چلا جائے۔"

دربان عثمان کی ماں کے پاس سے جواب لایا کہ "آج میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ قاضی کسی اور دن ملاقات کر سکتا ہے۔"

قاضی نے دربان سے کہا۔ "جا اپنی مالکہ سے کہہ دے کہ قاضی کہتا ہے، میری آنکھوں نے بعض تماشے دیکھے ہیں اس لیے ملاقات کر لی جائے تو چند کارآمد اور مفید باتوں کے علم سے دل خوشی محسوس کرے گا۔"

ماں نے دربان سے کہہ دیا۔ "اچھا قاضی کو بٹھا، میں آتی ہوں۔"

قاضی کو بٹھا دیا گیا۔ کچھ دیر بعد عثمان کی ماں بھی اس کے پاس پہنچ گئی اور پوچھا۔ "خاتون! میں اپنے وعدے کے مطابق نہیں آ سکا۔ اس کی معافی چاہتا ہوں اور معذرت



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیش کرتا ہوں۔‘‘

عنان کی ماں نے جواب دیا۔’’ قاضی! تو کام کی باتیں کر فضول باتوں میں وقت نہ گنوا، بتا کس لیے آنا ہوا؟‘‘

قاضی نے کہا۔’’ تجھے یاد ہوگا کہ پچھلے دنوں میں نے ایک پیش کش کی تھی اور اس پر غور کرنے کے لیے میں نے تجھے سات دن کی مہلت دی تھی۔ اب بتا تو نے کیا فیصلہ کیا؟ بخدا میں اس وقت عضدالدولہ کے پاس سے آرہا ہوں اور عضدالدولہ نے مجھے اپنا معتمد بنا کر وہ عزت بخشی ہے کہ میرے ہزاروں حاسد پیدا ہوگئے ہیں۔ اگر تو مجھ سے شادی کرلے گی تو اس سے تیری عزت، دولت اور شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوجائے گا۔‘‘

عنان کی ماں نے بددلی سے جواب دیا۔’’ قاضی! تو بڑا جھکی ہے۔ آخر یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ تو تو میرے پیچھے ہی پڑگیا ہے۔ میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کروں گی، نہیں کروں گی، نہیں کروں گی تو تنگ نہ کر۔‘‘

’’ دیکھ اگر تو مجھ سے شادی کرلے تو میں تجھے عراق، ایران اور ترکی کی سیر کرواسکتا ہوں۔ رومیوں کے ملکوں کی تفریح بھی کرواسکتا ہوں۔ بس تو ہاں کردے۔ بقیہ سارے کام میں خود کرلوں گا۔‘‘

عنان کی ماں نے بہت زیادہ سختی سے کہا۔’’ قاضی! میں جانتی ہوں تو اس طرح نہیں مانے گا۔ اب میں عضدالدولہ کے پاس جاؤں گی اور تیرے کرتوت بیان کر کے تجھے اس کی سزا دلواؤں گی۔‘‘

قاضی اس دھمکی سے واقعی ڈر گیا پھر بھی اپنی اکڑ قائم رکھی، بولا۔ قاضی نے بڑے افسوس سے کہا۔’’ خاتون! اب تک میں جو نہیں کرنا چاہتا تھا اب کرنے پر مجبور ہوں۔ میرا جمال تو اچھی طرح دیکھ لیا ہے، یہاں کے لوگوں کو پہلی بار میں اپنے جلال کا بھی مشاہدہ کروادوں گا کیونکہ مجھ میں مومن کی فراست بھی ہے اور غیرت مند کی ذہانت اور شجاعت بھی۔‘‘

عنان کی ماں نے بڑی فراخ دلی سے جواب دیا۔’’میں نہیں ڈرتی جو جی میں آئے کر اور اب مجھے اجازت دے۔‘‘

قاضی کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اچانک اٹھا اور عنان کی ماں کو مخاطب کیا۔’’ اے عورت! معلوم نہیں تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے، بہرحال کل میں اپنا انتہائی قدم اٹھادوں گا اور دیکھوں گا کہ اس سے تو کس طرح محفوظ رہے گی۔ میں تیرے سر پر ایک فتنہ چھوڑ دوں گا جو زندگی بھر کے لیے کافی ہوگا۔‘‘

عنان کی ماں نے جواب دیا۔’’میں نے کہہ تو دیا کہ تیری جو سمجھ میں آئے کر۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے اگر اعتراض ہے تو اس پر کہ تو مجھے دوسری شادی پر مجبور نہ کر۔‘‘

قاضی نے جواب دیا۔’’ تو اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ میں تیرا پیچھا چھوڑ دوں گا۔ میرا تعاقب جاری رہے گا اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ میں تمہیں تباہ برباد نہیں کردوں گا۔‘‘

عنان کی ماں نے منہ پھیر کر کہا۔’’ اب میں کسی بات سے بھی خوف زدہ نہیں، جا اور جو جی میں آئے کر۔‘‘

قاضی قصر سے نکلا اور اپنے گھر پہنچا۔ وہ بڑی دیر تک مضطرب اور پریشان ٹہلتا رہا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ یونس کو حاضر کیا جائے۔

یونس کو اسی وقت حاضر کیا گیا۔ قاضی مدقوق بیٹے کی شکل دیکھ کر کانپ گیا۔ اسے سینے سے لگالیا، بولا۔’’ یونس! مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تجھے دکھ دیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔‘‘

یونس بھی جذباتی ہورہا تھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

قاضی نے اسے غسل کروایا، پہننے کو کپڑے دیے اور ایک اچھے سے طبیب کو بلوا کر اس کا معائنہ کروایا اور اس کا علاج شروع کردیا اور اس کی رہائی کو دوسروں سے خفیہ رکھا۔ یونس باپ کی مہربانیوں پر حیران تھا۔ اس دوران لیث کئی بار قید خانے گیا اور وہاں سے یہی جواب ملا کہ یونس کو کہیں اور منتقل کردیا گیا ہے۔ لیث یونس کی گمشدگی سے پریشان ہوگیا۔

قاضی نے یونس کو ایک ہفتے میں بدل کر رکھ دیا۔ اسے کھانے پینے کا آرام تھا۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے کا سکھ حاصل تھا لیکن وہ یہاں بھی قیدیوں ہی کی طرح بند تھا۔ اپنی مرضی سے کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ صبح شام، دوپہر کسی بھی وقت وہ قاضی سے ملاقات بھی کرسکتا تھا اور باپ جس وقت بھی ملتا بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتا، شفقت پدری کا اظہار کرتا لیکن یونس ان مہربانیوں اور کرم فرمائیوں پر خوش ہونے کے بجائے فکرمند تھا اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کا باپ اچانک اتنا نرم اور مہربان کیوں ہوگیا ہے؟

آخر ایک ایسی شب بھی آگئی جب قاضی نے یونس کو اپنے سامنے بٹھا کر اس موضوع پر گفتگو شروع کردی۔

قاضی نے کہا۔’’یونس! وہ عاق نامہ کہاں ہے؟‘‘

یونس نے جواب دیا۔’’لیث کے پاس۔ میں نے اس کے پاس رکھوا دیا تھا۔‘‘

قاضی نے کہا۔’’جب تو وہاں جائے تو عاق نامہ لیتے

SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے لے کر مجھے واپس کر دینا۔"

یونس نے کہا۔"باداجان! میں آپ کی نفرتوں اور سختیوں کا تو عادی ہوں لیکن ان مہربانیوں نے مجھے چکر میں ڈال دیا ہے۔ آخر آپ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہو گئے ہیں؟"

قاضی نے جواب دیا۔"یونس میری ناراضگی کا بھی کوئی سبب تھا۔ تو نے میرا نام لے لے کر ناجائز فائدے اٹھائے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ میں خود بھی بدنام ہونے لگا۔ اگر تیرے پاس ضمیر نام کی کوئی شے ہے تو اس سے پوچھ کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ۔ تیرے کرتوتوں سے میں اتنا عاجز آ گیا تھا کہ جب میں بغداد آنے لگا اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو بھی عازمِ بغداد ہے تو میں بہت پریشان ہو گیا اور میں نے اس پریشانی اور عجلت میں یہ فیصلہ کر لیا کہ تجھے عاق کر دوں چنانچہ میں نے عاق کر دیا۔ مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ تیرے معاملے میں لوگوں کی چغلیوں کا بھی بڑا حصہ ہے پھر جب بغداد میں آ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو نے تاجر حمدون مغیث کی بیوہ کو میرا نام لے کر بے وقوف بنایا ہے اور وہ تیرے جھانسے میں آ کر اپنی بیٹی کی شادی تجھ سے کیے دے رہی ہے تو میں مشتعل ہو گیا اور جب مجھے جشنِ طرب میں مدعو کیا گیا تو مجھے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ آ گیا پھر جیسے ہی تاجر حمدون کی بیوہ نے اپنی بیٹی کے ساتھ تیری نسبت کا اعلان کیا میں نے حالتِ اشتعال میں وہ اعلان کر دیا جس پر تو مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے بڑھا اور مجھے اور لیث کو قتل کر دینا چاہا اور گرفتار کر لیا گیا۔"

یونس نے پوچھا۔"پھر اچانک آپ نے مجھے بے گناہ کس طرح سمجھ لیا؟"

قاضی نے جواب دیا۔"اس دوران میں تحقیقات کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تو بے گناہ ہے اور میں نے تیرے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ اب کل سے تو تاجر حمدون کی بیوہ کے پاس جا کر رہ سکتا ہے اور اس کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے۔"

قاضی کا یہ اعلان حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھا۔ یونس کو یہ سب کچھ خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ قاضی نے مزید کہا۔"وہ عاق نامہ مجھے واپس مل جانا چاہیے۔ شادی میں، میں خود شریک نہیں ہوں گا لیکن تیرے سرپرست کی حیثیت سے میرا ہی نام رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ لیث سے مت جھگڑنا۔ وہ برا نوجوان نہیں ہے۔ اس کو میں سنبھال لوں گا۔ حمدون مرحوم کی بیوہ مجھ سے خوش نہیں ہے اس لیے اس کے سامنے میرا ذکر کبھی نہ کرنا۔"

یونس باپ کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا اور وعدہ کر لیا کہ باپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ اس کے خلاف نہیں کرے گا۔ قاضی نے آخر میں کہا۔"اگر تو اپنی اس مہم میں کامیاب ہو گیا تو میں تیرے اور تیرے مستقبل کے لیے ایک اور منصوبہ رکھتا ہوں۔"

یونس نے حیرت سے پوچھا۔"وہ کیا ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔"بغداد کا ایک دوسرا متمول شخص اپنی بیٹی کی شادی میرے بیٹے سے کرنا چاہتا ہے۔ تیری دوسری شادی اس کی بیٹی سے کروا دوں گا لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ہونا چاہیے۔ متمول تاجر قریب المرگ ہے۔ وہ اپنا سب کچھ اپنے داماد کے نام کر دے گا۔ اس طرح تجھے دو حسین بیویاں مل جائیں گی اور ان کے ساتھ ہی دولت اور جائداد بھی۔"

یونس کی رگِ طمع پھڑکی، بہت خوش ہوا بولا۔ "باداجان! آپ کتنے اچھے ہیں۔"

قاضی نے کہا۔"یونس! آخر کو میں تیرا باپ ہوں۔ میں جو کچھ بھی تیرے ساتھ کروں گا، اگر تو مناسب سمجھے تو اس کا ذرا سا معاوضہ بھی ادا کر دینا حالانکہ وہ معاوضہ نہیں ہے لیکن میں مکافاتِ عمل کے ذیل میں اسے معاوضہ ہی کہوں گا۔"

یونس نے بڑے جوش سے جواب دیا۔"باداجان اگر مجھ کو آپ کی شفقت مل جائے تو میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔"

قاضی نے کہا۔"اب تو مطمئن رہ تجھ کو ہمیشہ میری شفقت حاصل رہے گی۔"

یونس نے بے چینی سے کہا۔"اب آپ وہ بتائیے جس کو آپ مکافاتِ عمل کے ذیل میں معاوضہ کہہ رہے ہیں؟"

قاضی نے کہا۔"یونس! میں تیری عدم موجودگی میں کئی بار حمدون کی بیوہ کے پاس گیا۔ میں تیرے معاملے میں تحقیق و تفتیش کر رہا تھا لیکن اس خبیث عورت نے مجھے ہر بار ذلیل و خوار کیا۔ میں اس کو اس کے کیے سزا دینا چاہتا ہوں چنانچہ جب تیری شادی ہو جائے تو تو پہلا کام یہ کرے گا کہ اپنی دلہن کو یہاں میرے پاس لے آئے گا اور اس قصر کو بکوا دے گا، لازمی طور پر وہ بھی یہیں آ جائے گی، اس وقت میں اس کو بتاؤں گا کہ ایک شریف اور معزز قاضی کی اہانت کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

یونس کو باپ کی بات مانتے ہوئے ذرا سا تامل ہوا



لیکن پھر یہ سوچ کر کہ بڑی مشکل سے تو باپ سے تعلقات استوار ہوئے ہیں اور اب بحالی تعلقات کے بعد باپ سے بہت زیادہ فائدے پہنچنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے چنانچہ ان مالی اور مادی فائدوں کے مقابلوں میں ادھیڑ عمر عورت کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ باپ سے کہا۔

"باداجان! اگر اس عورت نے آپ کی اہانت کی ہے تو قاضی کی حیثیت سے آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اس کی سزا دیں۔ میں آپ کے مشورے پر پوری فرماں برداری سے عمل کروں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔"

قاضی کا تیر نشانے پر بیٹھا تھا کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے کہا۔"اور یونس! تجھے ایک خاص بات کا خیال رکھنا ہے۔ جب تک تیری شادی نہ ہو جائے تو بیوہ حمدون کے سامنے میرا ذکر نہیں کرے گا اور اگر وہ میرا ذکر لے بیٹھے تو اس کو سختی سے منع کر دے گا کہ میرا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔"

یونس نے جواب دیا۔"آپ اطمینان رکھیں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس پر اسی طرح عمل ہوگا۔"

اب قاضی کو ذہنی سکون حاصل ہوا تھا کہ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب تھا اور وہ دن دور نہیں تھا جب وہ حمدون کی سرکش اور مغرور بیوہ کو بہت زیادہ ذلیل و خوار کر سکے گا۔ اس نے دوسرے دن یونس کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

یونس خلافِ توقع شان سے قصر میں داخل ہوا تو قصر کا ہر شخص اس پر بہت حیران ہوا کہ یونس کی صحت، لباس اور مزاجی کیفیت کسی چیز سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ قید میں تھا۔ لیث، خنسا، عنان اور اس کی ماں۔ ان سب نے یونس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سب سے زیادہ خوشی لیث کو تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب یونس عنان کو ہنسی خوشی اور اپنی موجودگی میں لیث کے حوالے کروا دے گا لیکن یونس نے عنان کی ماں کے علاوہ کسی سے کوئی بات ہی نہ کی۔ اس نے عنان کی ماں سے کہا۔"خاتون! اب میں آ گیا ہوں اور یہ جاننا چاہتا ہوں کہ عنان کو مجھ سے کب وابستہ کیا جا رہا ہے؟ اگر یہ معلوم ہو جائے تو میں اپنی شادی کی تیاریاں کروں۔"

یونس کے طرزِ تخاطب نے سب کو حیران کر دیا۔ عنان کی ماں سوچ رہی تھی کہ یونس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ وہ عنان کو حکماً طلب کر رہا تھا۔ لیث یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ یونس سے جو کچھ طے پایا تھا شاید وہ سب بھول چکا تھا اور بظاہر یہ کوئی دوسرا یونس نظر آ رہا تھا۔ خنسا اور عنان اپنی جگہ حیران تھیں۔

لیث نے پوچھا۔"یونس! تو کہاں تھا، میں تو کئی بار قید خانے گیا اور وہاں یہی معلوم ہوا کہ تجھے کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔"

یونس نے جواب دیا۔"ایک لمبی داستان ہے جسے پھر کبھی سناؤں گا۔ کیا وہ عاق نامہ مجھے واپس کر دے گا۔ جسے تو نے بلاوجہ اپنے پاس دبا رکھا ہے؟"

لیث نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ "یونس! آ، ہم دونوں کچھ دیر ضروری باتیں کر لیں۔ میں تیری روداد سننے کے لیے بے چین ہوں۔"

یونس نے جواب دیا۔"چل، کہاں چلنا ہے، میں چلتا ہوں۔"

لیث اس کو ساتھ لے کر اپنے خاص کمرے میں چلا گیا۔ اب یونس کے ہر ہر انداز اور ایک ایک طریقے سے لگتا تھا گویا وہ اس قصر میں مہمان اور اجنبی ہے، وہ بے دلی سے لیث کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ لیث نے اسے خوش کرنے کے لیے عاق نامہ اس کے حوالے کر دیا۔ یونس نے اس کو پڑھا اور پھر اس کو چاک کر دیا۔"اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

لیث نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔"یونس کہیں تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ تو تو یہاں آ کر ہم سب کے لیے معما بن گیا ہے۔"

یونس نے جواب دیا۔"میں بالکل صحیح الدماغ ہوں لیث۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

لیث نے کہا۔"اگر تو واقعی صحیح الدماغ ہے تو تجھے یہ بات بھی یاد ہونی چاہیے کہ قید خانے میں ہم دونوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا؟"

یونس نے جواب دیا۔"ہاں، مجھے یاد ہے اور خوب اچھی طرح یاد ہے لیکن وہ ایک طاقت ور اور آزاد نے دوسرے مجبور قیدی سے من مانا معاہدہ کر لیا تھا۔ اب بدلتے ہوئے حالات میں، میں اس معاہدے سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔"

لیث کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگی، بولا۔"یونس! خدا کے لیے یہ سب کیا ہے اور وہ بدلے ہوئے حالات کیا ہیں، ساری تفصیل بتا دے ورنہ میرا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔"

یونس نے بے نیازی سے کہا۔"لیث! اب تفصیل میں کہاں جاؤں گا اور کس کس کو سناؤں گا بس یہ سمجھ لے کہ اب



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں وہ پریشان حال اور لاوارث شخص نہیں ہوں، اب میں بھی کچھ ہوں اور اس کچھ ہونے نے میری سوئی ہوئی انا کو بیدار کر دیا ہے۔"

لیث نے کہا۔ "تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔"

یونس نے جواب دیا۔ "میری کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تیری یا کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔"

لیث نے بھی فیصلہ کن انداز اختیار کیا، پوچھا۔ "مجھے تو تو بس ایک بات صاف صاف بتا دے کہ تو اپنا حصہ لے کر عنان سے دست بردار ہونے کو تیار ہے؟"

یونس نے جواب دیا۔ "نہیں، میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ میں عنان سے شادی کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا اور رہا یہ قصر تو اس کو فروخت کر دیا جائے گا اور عنان کی ماں، جہاں میں رہوں گا وہ بھی رہے گی۔"

لیث کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اب وہ یونس سے سخت لہجے میں بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔

یونس نے اور زیادہ سخت رویہ اختیار کیا، کہا۔ "لیث! میرا تجھ سے کوئی جھگڑا نہیں۔ میں خوامخواہ تجھ سے الجھوں گا بھی نہیں لیکن اب میں یہ بھی برداشت نہیں کروں گا کہ تو مجھ پر حکم چلائے یا میرے معاملات میں دخل دے۔"

لیث خاموش ہوگیا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یونس کو اب کس طرح قابو میں لایا جائے۔

یونس، لیث کے پاس سے اٹھ کر عنان کی ماں کے پاس چلا گیا۔ وہ یونس سے شاکی تھی کہ اس نے اس کا ادب نہیں کیا۔ یونس کو اپنے سامنے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یونس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، منہ کیوں پھیر لیا؟"

ماں نے جواب دیا۔ "میں نے منہ یوں ہی پھیر لیا ہے۔ اول تو تجھے اب عنان کی رشتے کی بات ہی نہیں کرنا چاہیے۔ تو تو میرا بہت ادب کرتا تھا، خیال رکھتا تھا مگر یہ تو آج کس طرح مجھ سے مخاطب ہے؟"

یونس نے کہا۔ "ماں! یہ بات ہے کہ پچھلے دنوں اس قصر میں میری حیثیت ایک فالتو انسان جیسی تھی لیکن اب حالات بدل چکے ہیں اور اب اگر میں عنان سے شادی کروں گا تو مجھ میں اتنی سکت ہے کہ میں کچھ اپنا بھی خرچ کرسکوں گا۔ میں عنان کو اس قصر کے علاوہ بھی رکھ سکوں گا اور آپ بھی میرے ساتھ ہی رہ سکیں گی۔"

لیکن عنان کی ماں نے جواب دیا۔ "مگر قید خانے میں تیرے انکار پر میں نے لیث سے بات پکی کردی ہے اور اب عنان کی شادی لیث سے ہوگی اس لیے اس بارے میں مزید گفتگو فضول ہے۔"

یونس نے سختی سے کہا۔ "لیکن ماں! ایسا نہیں ہو[گا]۔ عنان کی شادی مجھ سے ہوگی۔"

ماں نے طنزیہ کہا۔ "ماں نہیں مجھے خاتون کہہ کر پکار۔ اب لفظ ماں تیرے منہ سے اچھا نہیں لگ رہا۔"

یونس نے جواب دیا۔ "ماں، خاتون یا کچھ اور، میں ان فضول الفاظ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو شادی کی تاریخ مقرر کرنے آیا ہوں اور میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اب مجھ سے عنان کی شادی آپ کے لیے زیادہ خوشی کا باعث بن جائے گی۔ اس سے پہلے میں آپ کے رحم و کرم پر تھا اور شادی کے بارے میں یوں اعتماد سے بات نہیں کرسکتا تھا مگر اب ان بدلے ہوئے حالات میں، میں اس لائق ہو چکا ہوں کہ آپ سے پوری خود اعتمادی سے بات کروں۔ میں آپ کو سوچنے کا موقع دے رہا ہوں دو چار دن سوچ لیجیے۔ غور کر لیجیے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ عنان کی شادی مجھ سے ہونی ہے اور مجھ سے ہی ہوگی۔ لیث یا کسی اور کا اب ذکر نہیں ہوگا۔"

ماں نے سختی سے کہا۔ "یونس! میں بھی یہی کہتی ہوں کہ حالات بدل چکے ہیں اور ان بدلے ہوئے حالات میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ عنان کی شادی تجھ سے ہو۔ بات لیث سے طے ہو چکی ہے اور اب یہ بات توڑی نہیں جاسکتی۔"

یونس ایک طرف جاتے ہوئے بولا۔ "یہ فضول بات ہے۔ شادی تو مجھی سے ہوگی۔ لیث سے نہیں ہوسکتی اور اگر اس معاملے میں من مانی کی گئی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔"

ماں نے جواب دیا۔ "مروت کی بات ہی کچھ اور ہے لیکن دباؤ میں تو میں کسی کے آتی نہیں۔"

یونس یہاں سے بھی چلا گیا اور سیدھا عنان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ "عنان! میں تجھ سے شادی کرنے آیا ہوں لیکن تیری ماں مکر رہی ہے، کہتی ہے کہ میں نے لیث سے بات پکی کردی ہے۔"

عنان نے جواب دیا۔ "یونس! پہلے بھی میری شادی میری مرضی سے نہیں ہو رہی تھی اور میں نے اپنا معاملہ اپنی ماں پر چھوڑ دیا تھا اور اب بھی میں اپنی ماں کا حکم مانوں گی وہ میرا ہاتھ لیث کے ہاتھ دے۔ میں ماں سے اختلاف نہیں کروں گی۔"

یونس نے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میرے جاتے ہی معاملات بگڑ گئے اور ہوا میرے خلاف ہوگئی۔ تم سب میرے خلاف ہو چکے ہو اور ایسا لگتا ہے گویا میں اس گھر میں ایک اجنبی ہوں۔"

عنان زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یونس کا کچھ حال ہی عجیب تھا۔ وہ سیدھا خنسا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ لیث سے مصروف گفتگو تھی۔ لیث اسے دوبارہ اپنے سامنے دیکھ کر کھڑا ہوگیا، پوچھا۔ "یہ کیا بات ہے یونس؟ مجھ سے کوئی کام ہے؟"

یونس نے بے رخی سے جواب دیا۔ "نہیں، تجھ سے کوئی کام نہیں میں خنسا سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اگر تو ذرا سی دیر کے لیے اس کو میرے حوالے کردے تو مہربانی ہوگی۔"

لیث نے سوالیہ نظروں سے خنسا کو دیکھا، پوچھا۔ "کیا تو جانے کو رضامند ہے؟"

خنسا نے پس و پیش سے کہہ دیا۔ "تیرا کیا خیال ہے، جاؤں یا نہ جاؤں؟"

لیث نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تو اگر یونس سے بات کرنا چاہتی ہے تو کرلے، میں کیوں بولوں گا۔"

یونس نے کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم سب مجھ سے خوف زدہ کیوں ہو؟ ہر شخص مجھے اجنبیوں کی طرح دیکھتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟"

خنسا نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تیرا فریب نظر ہے چونکہ تو خود ہمیں اجنبیوں جیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور بیگانوں کی طرح ہمکلام ہے۔ اس لیے تجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اجنبیت کا اظہار ہماری طرف سے ہو رہا ہے۔"

یونس نے جواب دیا۔ "اچھا تو ذرا سی دیر کے لیے میرے پاس آجا۔ میں اس فضول بحث میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔"

خنسا، یونس کے ساتھ خاموشی سے اس کمرے میں چلی گئی، جہاں پہلے یونس رہا کرتا تھا اور اب خالی پڑا رہتا تھا۔

یونس اپنے تخت پر بیٹھ گیا اور خنسا کو بیٹھنے کا حکم دیا۔ خنسا اس کے مقابل ایک دوسری چھوٹی سی چوکی پر بیٹھ گئی۔

یونس کچھ دیر تک خنسا کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ "خنسا! اگر میں تجھ سے یہ کہوں کہ تو میرے ساتھ چل، میں تجھے لیث سے زیادہ خوش رکھوں گا تو تو کیا جواب دے گی؟"

خنسا نے جواب دیا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ تیری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی اور جب بات سمجھ میں نہیں آئے گی تو تیری بات کس طرح مان لوں؟"

یونس نے اپنی صحت اور خوشنما لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میری اچھی صحت، اچھا لباس تمہیں یہ سوچنے پر مجبور نہیں کرتے کہ اب میں وہ پہلے والا یونس نہیں ہوں۔"

خنسا نے جواب دیا۔ "بے شک ہمیں اس پر حیرت ہے لیکن تیری ہر بات معمائی ہوئی ہے اور ہماری سمجھ میں کسی بھی طرح یہ بات نہیں آرہی کہ تو ایک دم سے بدل کیسے گیا۔ تیرے حالات میں اچانک یہ تبدیلی کس طرح آگئی اور تو اس طرح اکڑ کر باتیں کس برتے پر کر رہا ہے؟"

یونس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "بہرحال تو یہ سمجھ لے کہ خدا مجھ پر مہربان ہوگیا ہے اور مجھے ایک ایسے شخص کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے جو لائق رشک ہے اور اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں کسی سے دب کر بات نہ کروں کیونکہ اس میں آدمی کی عزت چلی جاتی ہے۔"

خنسا نے حیرت سے کہا۔ "تیری ہر بات تعجب انگیز ہے۔ بہرحال اب میں تیرے ساتھ نہیں جاسکتی۔ میں لیث کے پاس ہی رہوں گی۔"

یونس نے گرم ہو کر کہا۔ "لیث، لیث، لیث۔ ہر کوئی لیث کی ہی رٹ لگا رہا ہے۔ اگر مجھے یہ ہدایت نہیں کی گئی ہوتی کہ میں لیث کے معاملے میں سختی نہ کروں تو اس وقت لیث کا کام تمام کر دیتا۔"

خنسا نے پوچھا۔ "تو اب میں جاسکتی ہوں یا کچھ اور باتیں بھی کرنا ہے تجھے؟"

یونس نے سختی سے کہا۔ "بہرحال اس وقت تجھ سے بھی ایک ہی بات کہنی ہے، وہ یہ کہ تو لیث کے بجائے میرے پاس رہے گی۔ میں نے تجھے بطور نذرانہ لیث کے حوالے کیا تھا لیکن اب میں اپنے نذرانے کو واپس لینا چاہتا ہوں کیونکہ میں تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں لوٹ مار مچی ہوئی ہے اور اس لوٹ مار میں کوئی کسی کا پاس لحاظ اور ادب نہیں کرتا۔ یہاں اگر کوئی چیز کارآمد ہے تو یہ کہ آدمی کو چالاکی اور عیاری کتنی ملی ہے۔ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ لوگوں بے وقوف بنا کر اپنا کام کس طرح نکال سکتا ہے۔ چنانچہ میں ایسے ہی انسانوں کے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہا لیکن اب میں خود بے وقوف بنانا چاہتا ہوں اور اس لیے میں تجھے واپس لینا چاہتا ہوں۔"

خنسا نے جواب دیا۔ "لیکن یونس میں تیرے ساتھ نہیں جاسکتی؟"

یونس نے کہا۔ "تو میرے ساتھ جائے گی تھوڑی۔ میں خود تجھے لے جاؤں گا، اپنی مرضی سے زبردستی۔"

خنسا کو یونس سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر ہی بھاگ کھڑی ہوئی اور لیث کے پاس بے دم ہو کر گر گئی،




SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بولی۔ ''لیث! خدا کے لیے تو اپنے کمرے کے دروازے بند کرلے کیونکہ یونس مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن میں اس دیوانے اور سنکی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اس کو معلوم نہیں کیا ہوگیا ہے کہ وہ غیر معمولی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔''

لیث نے تسلی دی، بولا۔ ''خنسا! تو مت گھبرا۔ اگر یونس نے اس قصر میں کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں قصر کے دربانوں کو بلوا کر اس کی مرمت کروادوں گا اور اس کے بعد یہ ایک بار پھر قید خانے میں چلا جائے گا۔''

کمرے کا دروازہ کھلا رہا لیکن یونس ان دونوں کے پاس نہیں پہنچا۔ لیث نے شیخی میں کہا۔ ''یونس مجھ سے ڈرتا ہے وہ میرے پاس آہی نہیں سکتا۔ اگر آئے گا تو پچھتائے گا۔''

لیکن یونس اب دونوں کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو کمرے کو ہر طرف سے بند کرکے منصوبے بنانے میں مشغول تھا۔ ایک جامع منصوبہ جس سے اس کا مطلب بھی حل ہوجائے اور کسی کو کوئی نقصان بھی نہ پہنچے۔ یونس کا مجرمانہ ذہن جو پہلے کسی حد تک ناسازگار حالات کے دباؤ میں بے کار ہوگیا تھا۔ اب وہ تن تنہا اپنے سارے ہی حریفوں کو دنداں شکن جواب دے سکتا تھا۔ اس میں بلا کی خوداعتمادی اور طمانیت آگئی تھی اور اس کو یقین تھا کہ اب وہ یونس نہیں رہا جو دوستوں پر اپنی جان چھڑکا کرتا تھا اب وہ بلا کا چالاک آدمی نظر آتا تھا۔

☆☆☆

اب حالات اتنے مختلف تھے کہ یونس کو قابو میں رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔ یونس بڑی شان سے قصر میں رہ رہا تھا۔ نہ وہ کسی سے بولتا تھا نہ کوئی اس سے بولتا تھا۔ انہیں جب بھی موقع ملتا آپس میں صلاح مشورے کرنے بیٹھ جاتے کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔ عنان کی ماں لیث سے کہتی۔

''تو کسی طرح یہ پتا چلا کہ یونس کو کس کی پشت پناہی حاصل ہوگئی ہے تاکہ اس کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے ورنہ یوں لاعلمی کے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے۔''

لیث نے پتا لگانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس طرح دس بارہ دن گزر گئے۔ لیث نے ماں سے کہا۔ ''اگر آپ عنان کی شادی میرے ساتھ کردیں تو جھگڑا ہی ختم ہوجائے اور میں فوراً ہی یونس کو نکال باہر کروں۔''

لیکن ماں کا خیال تھا کہ اب یونس کی موجودگی میں عنان کی شادی کرنا مشکل کام ہے کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ کس قسم کا ہنگامہ کھڑا کردے، بولی۔ ''لیث! مجھے کوئی اعتراض نہیں، تو آج ہی شادی کرلے عنان سے۔ لیکن اگر شادی سے پہلے یونس کا انتظام نہ کردیا گیا تو معلوم نہیں کس قسم کا ہنگامہ برپا ہوجائے کیونکہ یونس کی خاموشی میں کوئی طوفان چھپا ہوا ہے۔'' دونوں میں یہ باتیں ہورہی تھیں کہ یونس بھی آدھمکا۔

لیث نے یونس کی پروا کیے بغیر کہا۔ ''ماں آج آپ بتادیجیے کہ عنان کی شادی کب تک کررہی ہیں کیونکہ میں اب اپنی پوری توجہ اپنے کاروبار پر دینا چاہتا ہوں۔ اگر عنان کا مسئلہ حل ہوجائے تو میں پوری یکسوئی سے اپنے دوسرے کام کرسکوں گا۔''

ماں نے یونس کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جب یہ بات طے پاگئی ہے کہ عنان کی شادی تجھی سے ہونا ہے تو تجھے مطمئن اور یکسو ہوجانا چاہیے۔''

یونس نے ماں سے کہا۔ ''خاتون! مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کیجیے۔ یہ کیا کہ کن انکھیوں سے دیکھتی تو مجھ کو ہیں اور جواب لیث کو دے رہی ہیں۔ میں خود بھی یہی مسئلہ طے کرتا آیا ہوں۔ میں نے شادی کی بارہ تاریخ مقرر کردی ہے، گویا کہ آج سے چھٹے دن۔ میں شادی کی تیاریاں کرنے جارہا ہوں اور آپ بھی تیاری کیجیے۔'' پھر لیث کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تو اگر چاہے تو یہ معاملہ اس طرح طے پاسکتا ہے کہ اپنا آدھا زرومال اور خنسا کو میرے حوالے کردے۔ میں عنان سے اسی وقت دست بردار ہوا جاتا ہوں۔''

لیث نے جواب دیا۔ ''اس طرح اکڑ کر یا دھونس دے کر تو، تو ایک درم بھی نہیں پاسکتا۔ ہاں بھائی چارہ میں اس سے زیادہ حاصل کرسکتا تھا۔''

یونس قہقہہ مار کر ہنس دیا، بولا۔ ''بھائی چارہ، خوب گویا میں کبھی تیرا بھائی نہیں تھا۔ میں نے بھائی بننے کی خواہش نہیں کی تھی، تو نے خود ہی بھائی بنالیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ تو نے مجھے اپنے بڑے بھائی یعقوب کی جگہ دے دی ہے، تو نے مال وزر کا نصف دینے کا وعدہ کیا تھا مگر تیرے وعدے، وعدے ہی رہے۔ میں اپنے حق اور حصے کو چند قسطوں میں وصول کرلوں گا اور میں نہیں جانتا کہ ان قسطوں کی وصول یابی میں کون کون مزاحم ہوگا۔ بہرحال جو بھی مزاحمت یا مداخلت کرے گا، میں اس سے نپٹ لوں گا۔''

ماں نے اپنا فیصلہ سنادیا۔ ''اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ اب تو اس قصر میں نہیں رہے گا۔''

یونس نے نرمی سے جواب دیا۔ ''خاتون! اس وقت میں لیث سے مخاطب ہوں، آپ سے باتیں بعد میں ہوجائیں گی، پہلے لیث سے اپنا حساب صاف کرلوں۔''

ماں نے کہا۔ ''لیث میرا بیٹا ہے اس لیے اس کا معاملہ میرا معاملہ ہے اور میرا معاملہ لیث کا معاملہ۔ ہمیں الگ الگ مت تصور کر۔''

یونس پھر ہنسا۔ ''خوب لیکن خاتون! پہلے تو تم دونوں الگ الگ تھے۔''

لیث نے کہا۔ ''ان فضول باتوں سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا، اب تو اس قصر کو خالی کردے۔''

یونس نے کہا۔ ''ہاں تو میں حساب کتاب اور قسطوں کی بات کررہا تھا۔ میں آج پہلی قسط وصول کرلینا چاہتا ہوں۔''

لیث نے پوچھا۔ ''کیسی پہلی قسط، کون سی قسط؟''

یونس نے جواب دیا۔ ''میں خنسا کو اپنے ساتھ رکھوں گا، اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔''

لیث گھبرا گیا، بولا۔ ''لیکن خنسا تیرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہے۔''

یونس نے بھاری آواز میں کہا۔ ''وہ تیرے پاس میری امانت ہے، اب یہ امانت شرافت کے ساتھ مجھے واپس کردے۔''

لیث نے سختی سے کہا۔ ''تو جاتا ہے یا دربانوں کو بلواؤں؟''

یونس پھر ہنسا۔ ''دربان کیا کریں گے؟ میں اپنا مقدمہ عضدالدولہ کے دربار میں لے جاؤں گا کیونکہ وہ انصاف میں مروت اور رعایت سے کام نہیں لیتا اور وہاں تیری جو خواری ہوگی، خود ہی سوچ لے۔''

لیث نے جواب دیا۔ ''مجھے عضدالدولہ سے کوئی خوف نہیں۔ جا کردے مقدمہ، خنسا واپس نہیں ملے گی۔''

یونس تن کر کھڑا ہوگیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں خنسا کو اسی وقت اپنے ساتھ لے جاؤں گا، اگر تو روک سکتا ہے تو روک لے۔''

لیث کھڑا ہوگیا، بولا۔ ''اگر لے جاسکتا ہے تو لے جا کر دیکھ، آج میں تیری طاقت آزماؤں گا۔''

یونس نے خلاف امید ماں کو مخاطب کیا۔ ''خاتون! میں پہلے آپ سے چند باتیں کروں گا اس کے بعد کوئی قدم اٹھاؤں گا۔''

ماں نے پوچھا۔ ''مجھ سے کیا باتیں کرے گا؟''

یونس نے بدستور نرمی سے کہا۔ ''آپ مجھ سے ڈریے نہیں کیونکہ میں وہی یونس ہوں جس نے دوران علالت آپ کی بڑی خدمت کی تھی اور جس کو آپ لیث سے زیادہ چاہتی تھیں۔''

ماں نے کہا۔ ''کر باتیں۔''

لیث نے موقع غنیمت جانا فوراً خنسا کے پاس چلا گیا تاکہ اسے کہیں چھپادے۔

اس کے جاتے ہی یونس نے کہا۔ ''خاتون! آپ میرے لیے اب بھی بمنزلہ ماں ہیں اور میں اب بھی آپ کا احترام کرتا ہوں۔''

ماں، یونس کی ایک ایک بات پر حیرت زدہ تھیں اب وہ نرمی سے عاجزانہ باتیں کررہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟

یونس نے کہا۔ ''خاتون! میں جانتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں؟ آپ میری مزاجی کیفیت اور گفتگو کے بدلتے ہوئے انداز کے بارے میں سوچ رہی ہیں کہ یہ کیا بات ہے اور کیوں ہے؟ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ میں زمانے کا ٹھکرایا ہوا انسان ہوں۔ میرا کردار، میری شخصیت مسخ ہوگئی ہے اور بعض اوقات مجھ سے جو سرزد ہوجاتا ہے اس پر دوسروں سے زیادہ میں خود حیران رہ جاتا ہوں۔''

ماں نے بات کاٹ دی، بولی۔ ''بات مختصر کر۔ مجھے پریشان نہ کر۔''

یونس نے جواب دیا۔ ''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ ذرا تحمل اور صبر سے کام لیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ عنان کی شادی اگر مجھ سے کردیں گی تو خسارے میں نہیں رہیں گی۔''

ماں نے کہا۔ ''اب عنان کی تو بات ہی نہ کر، وہ تو مسئلہ ہی ختم ہوگیا۔''

یونس نے درخواست کی۔ ''آپ اس پر نظر ثانی کیجیے۔ عجلت سے کام نہ لیجیے۔ میں نے بارہ تاریخ مقرر کردی ہے اور آپ کو یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ اب میں کوئی بے سہارا اور لاوارث شخص نہیں ہوں۔''

ماں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تیری باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں، اگر تو صاف صاف باتیں کرے تو میں کچھ غور بھی کروں۔''

یونس نے جواب دیا۔ ''حالانکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو اصل واقعہ نہ بتایا جائے لیکن اگر آپ وعدہ کریں کہ میری باتوں کو اپنے ہی تک رکھیں گی تو میں سب کچھ سچ سچ بتادوں گا۔''

ماں نے وعدہ کیا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں اور یوں بھی ادھر کی ادھر نہیں کرتی۔''

یونس نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ''آپ حیرت کریں گی خاتون کہ میرے والد نے اپنا




SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

عاق نامہ منسوخ کر دیا ہے اور انہوں نے ہی مجھے قید خانے سے نکال کر اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں عنان سے شادی کرلوں۔"

ماں کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا، بولی۔ "تو یہ بات ہے۔ وہی تو میں کہوں کہ تیرے مزاج اور انداز میں یہ اتنی بڑی تبدیلی کیونکر آ گئی۔ اس کی خواہش ہے کہ عنان کی شادی تجھ سے کر دی جائے، کیوں ہے ناں یہی بات؟"

یونس نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "میرے باپ کی بھی یہی خواہش ہے کہ میں عنان سے شادی کرلوں۔"

ماں ایک دم بگڑ کر کھڑی ہو گئی۔ کہا۔ "اگر یہ تیرے باپ کی خواہش ہے تو جا اور اپنے باپ سے کہہ دے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

یونس نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر کیوں؟"

ماں نے سختی سے کہا۔ "یہ شادی اس لیے نہیں ہو سکتی کہ میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تیرا باپ قاضی ہے تو کیا ہوا، میں اس کو خبیث سمجھتی ہوں، اس نے میرا دل دکھایا ہے اور میں نے بھی اسے خوب ذلیل کیا ہے۔ اب وہ اپنی ذلت کا یوں بدلہ لینا چاہتا ہے کہ تجھ کو اپنے گھر میں رکھ کر اور اپنی سرپرستی میں لے کر عنان کو بہو بنائے اور پھر مجھ سے بدلے لے۔"

یونس بھی ایک دم گرم ہو گیا، بولا۔ "خاتون! میرے باپ کو گالیاں نہ دے، وہ ایک شریف انسان ہے۔"

ماں نے جواب دیا۔ "ہاں، وہ جتنا شریف انسان ہے تو بھی جانتا ہے اور تجھ سے زیادہ میں جانتی ہوں۔"

یونس نے اور زیادہ گرمی دکھائی۔ "میرے باپ کو تو کیا جانے گی، عضد الدولہ سے پوچھ، خلافت عباسیہ کے کسی امیر سے پوچھ، وہ بغداد کے معتبر ترین لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ تیری اور تیری بیٹی کی خوش قسمتی ہوگی اگر عنان کی شادی مجھ سے ہو جائے اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اگر میں چاہوں گا تو عنان سے جبراً شادی کرلوں گا اور بغداد میں کوئی بھی شخص تیری حمایت اور میری مخالفت کی ہمت نہیں کرے گا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ پورا بغداد تیرا اور تیرے باپ کا حامی ہے تو جا اور انہیں اپنی حمایت میں بلا کیونکہ میں نے ابھی ابھی یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ عنان کی شادی لیث سے ہو یا کسی اور سے لیکن تجھ سے نہیں ہو سکتی کیونکہ تو جس خبیث باپ کا بیٹا ہے وہ میری بیٹی کا خسر نہیں بن سکتا۔"

یونس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ "اے ذلیل عورت! اپنی زبان کو لگام دے۔ اب میں تیری زبان سے اپنے باپ کی شان میں اہانت آمیز ایک لفظ نہ سنوں گا۔"

ماں نے جاتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو، تو اسی وقت اس قصر سے دفع ہو جا، یہ میرا قصر ہے اور تو میرا کچھ بھی نہیں۔ تو اسی وقت یہاں سے چلا جا۔"

یونس نے جواب دیا۔ "میں یہیں رہوں گا، اسی قصر میں رہوں گا اور دیکھتا ہوں کہ مجھے کون نکالتا ہے اس قصر سے۔"

ماں نے جاتے جاتے کہا۔ "اور میں بھی یہ دیکھوں گی کہ اب تو یہاں کس طرح رہے گا۔"

ماں نے باہر جاتے ہی قصر کے دربانوں کو حکم دیا کہ یونس کو زبردستی نکال باہر کیا جائے اور اسے دوبارہ اندر نہ آنے دیا جائے۔ طاقت ور تابعدار دربان تیزی سے اندر آئے اور یونس کو پکڑ لیا، اسے زبردستی کھینچتے ہوئے بولے۔ "نکل یہاں سے، ورنہ تیری ہڈیاں توڑ دی جائیں گی۔"

یونس نے چیختے ہوئے کہا۔ "کم بختو! مجھے چھوڑ دو۔ میں قاضی کا بیٹا ہوں۔ میری بے عزتی کا نتیجہ بہت خطرناک نکلے گا۔"

ایک دربان نے جواب دیا۔ "دفعان ہو یہاں سے۔ یہ قصر تیرا یا تیرے باپ کا تو نہیں۔"

دربانوں نے یونس کو قصر سے نکال کر دروازے بند کر دیے۔

اس کے ذرا دیر بعد ماں نے لیث کو اپنے پاس بلایا اور بڑی تشویش سے کہا۔ "لیث! میں نے یونس کو قصر سے نکلوا تو دیا ہے لیکن میں اشارۃً یہ بتائے دے رہی ہوں کہ یونس کو کمزور نہ سمجھ۔ اس کا وار کئی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کے جوابی حملوں سے خبردار اور چوکنا رہنا چاہیے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "وہ بے نوا اور بے سہارا انسان ہے۔ وہ کیا حملہ کرے گا۔"

ماں نے کہا۔ "یہ بات نہیں لیث، وہ بہت طاقت ور ہے۔ اگر اس کی باتوں پر یقین کر لیا جائے اور وہ درست بھی ہوں لیکن اگر اس نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا گپ تھی تو پھر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

لیث نے ماں سے اس کی وضاحت نہیں چاہی لیکن یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا کہ یونس بہت لسان، چرب زبان انسان ہے اور اس کے ساتھ شری بھی۔ وہ اپنی باتوں سے بہتوں کو یا جس کو چاہے دوست بنا لے اور جب چاہے پیدا کر دے۔ وہ یونس سے خوف زدہ تھا چنانچہ یونس کے جانے کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، خوف اور اندیشوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔





☆☆☆

اس واقعے کو کئی دن گزر گئے مگر کوئی خاص بات رونما نہیں ہوئی لیکن لیث کا دل بار بار یہی کہتا تھا کہ یونس خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہے، کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی وقت کوئی ہنگامہ ضرور کرے گا اور لیث ان ہنگاموں سے نمٹنے یا انہیں ٹال دینے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اسے ابھی تک اس پر حیرت تھی کہ یونس رہا کیونکر ہو گیا۔ اس دوران اسے یاد آ گیا کہ ایک دن عنان کی ماں نے گڑگڑا کر یونس کی رہائی کی دعا مانگی تھی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے یونس کی رہائی اسی دعا کے زیرِ اثر ہوئی ہو۔ اس اندھیرے میں دعا اور مناجات کے علاوہ کوئی ایسی تجویز اور تدبیر نہیں تھی جس پر دل پوری طرح مطمئن ہوتا ہو۔ آخر اس نے بھی خاموشی سے وضو کیا۔ اس وقت رات کے پہلے پہر کا آغاز ہو چکا تھا اور دنیا محوِ خواب تھی۔ زاہدان شب بیدار بھی شاید اونگھ رہے ہوں گے۔ وہ وضو کرنے کے بعد خنسا کے پاس گیا جو گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے سرہانے کھڑا اسے دیکھتا اور سوچتا رہا۔ وہ خنسا کو یونس کے حوالے کس طرح کر دیتا اس نے خنسا کے قریب ہی جائے نماز بچھائی اور دو رکعت نفل ادا کر کے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا۔

"اے رب العالمین! مجھے یونس کے شر سے نجات دلا اور محفوظ رکھ۔ میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ اگر تو نے اس فتنے کو ختم کر دیا اور میں اس کے شر سے محفوظ رہا تو میں عنان سے شادی بعد میں کروں گا، پہلے حج شکرانہ ادا کروں گا اور دو سو فقرا اور مساکین کو کھانا کھلاؤں گا۔ اے اللہ! عنان کی ماں کے دل کو مجھ پر مائل رکھ تاکہ عنان کی حصولیابی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔"

وہ یہ چند جملے سجدے میں گر کر بڑی دیر تک دہراتا رہا۔ اس کا دل بھر آیا اور وہ واقعی زار و قطار رونے لگا۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو رخساروں اور ڈاڑھی کے بالوں پر جمع ہوتے رہے جیسے جیسے آنسو بہہ رہے تھے لیث کا دل ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ آخر میں بڑے جوش و خروش سے کہا۔

"اے اللہ! تو میری دعا اپنے حبیب نبی آخر محمد رسول اللہ صلعم کے صدقے میں قبول فرما۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو میں تجھ سے عہد کرتا ہوں کہ حجِ شکرانہ کے ساتھ ہی مدینے میں رسول اللہ ﷺ کے مزار اقدس پر حاضری بھی دوں گا۔"

اس دعا کے بعد اس کو اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا۔ مناجات کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سو گیا۔ صبح جب بیدار ہوا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس کا دل یونس کے شر اور اس کے خوف یا اندیشے سے بالکل خالی تھا۔ اس نے خنسا سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور عنان کو یونس کا نام لے لے کر خوب چھیڑتا رہا۔ اپنی ماں کے پاس بھی گیا اور اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ قاضی کے پاس جا کر یونس کی شکایت کرے گا۔ وہ ابھی اس کے پاس جانے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ چند گھڑسوار دوڑتے قصر کے اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت عنان اور خنسا کسی مسئلے پر بحث مباحثہ کر رہی تھیں۔ لیث نے ان دونوں سے کہا۔ "تم دونوں فوراً قصر کی چھت پر چلی جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں، نہ بولنا نہ نیچے اترنا۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

دونوں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور قصر کی چھت پر چلی گئیں۔ لیث بھاگ کر قصر کے درختوں والے حصے میں چلا گیا اور وہاں جھاڑی میں روپوش ہو گیا۔ عنان کی ماں جہاں تھی وہیں بیٹھی رہ گئی۔

گھڑسوار دربانوں کو دھکا دے کر اندر داخل ہوئے تھے۔ یہ چار تھے ان میں یونس تین سے آگے تھا۔ اس نے عنان کی ماں سے عجلت میں پوچھا۔ "لیث کہاں ہے؟"

ماں نے جواب دیا۔ "وہ شاید تیرے باپ کے پاس گیا ہوا ہے کیونکہ جانے سے پہلے اس نے یہی بتایا تھا۔"

یونس نے دانت پیسے، بولا۔ "اس کی خبر تو میں واپسی میں لے لوں گا جا کر۔ عنان اور خنسا کہاں ہیں؟"

ماں نے بڑی عقل مندی سے جواب دیا۔ "ان دونوں کو تو اس قصر سے اسی دن ہٹا دیا گیا تھا جس دن میں نے اپنے دربانوں سے تجھے قصر کے باہر پھنکوایا تھا۔"

اتنی دیر میں ان چاروں کے تعاقب میں قصر کے دربان ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ دربانوں نے انہیں للکارا۔

"خبردار! اگر بھاگنے کی کوشش کی۔"

یونس نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "دوستو! تم ان کتوں کو روکو، میں اس پرکالۂ آفت سے نپٹتا ہوں۔" اس کے بعد عنان کی ماں سے پوچھا۔ "خنسا اور عنان جہاں بھیجی گئی ہیں وہ پتا بتا۔ ورنہ میں آج تجھے معاف نہیں کروں گا۔"

ماں نے سختی سے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتی کہ لیث نے انہیں کہاں پہنچا دیا ہے۔"

یونس نے تلوار کی نوک ماں کے پیٹ پر رکھ دی اور اسے آہستہ سے دباتے ہوئے کہا۔ "وعدہ خلاف خاتون! دیکھ، میں آخری بار تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ خنسا اور عنان کا پتا بتا دے ورنہ یہی تلوار تیرے پیٹ میں اتار دوں گا۔"



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماں نے جواب دیا۔ ”تو اپنی تلوار شوق سے اتار دے میرے پیٹ میں۔ جب مجھے ان دونوں کا پتا معلوم ہی نہیں تو میں خاک بتاؤں گی ان کا پتا۔“

اب دربانوں اور یونس کے ساتھیوں میں بڑا سخت مقابلہ ہو رہا تھا۔ یونس نے غصے میں اپنی تلوار ماں کے پیٹ میں اتار دی اور چیخا۔ ”فنافی النار ستر۔“

ماں نے ایک چیخ ماری اور کہا۔ ”ستر میرے لیے نہیں، تیرے لیے ہے، میں شہید ہوں، مظلوم۔“

چیخ کی آواز لیث نے بھی سنی اور خنسا اور عنان نے بھی لیکن وقت اور موقع کی نزاکت نے انہیں ہلنے بھی نہ دیا۔

اتنی دیر میں دربان تینوں کو بھگا کر یونس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یونس نے اپنے ساتھیوں کو بھاگتے جو دیکھا تو خود بھی بھاگ کھڑا ہوا اور جتنی تیزی سے قصر میں داخل ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے فرار بھی ہو گیا۔ حملہ آوروں کے فرار ہوتے ہی دربانوں نے قصر کو اندر سے بند کر لیا اور چیخنے چلانے لگے۔

لیث بھی بھاگتا ہوا اپنی زخمی ماں کے پاس پہنچا۔ خنسا اور عنان بھی نیچے آ گئیں اور ماں کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ ماں بے ہوش پڑی تھی اور خون بہہ بہہ کر فرش کے پتھر کو سرخ کر رہا تھا۔ اسی پتھر میں ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ یہ گڑھا ماں کے خون سے بھرنے لگا۔ لیث اور دربان خون کو بند کرنے کی تدبیریں کرنے لگے لیکن گھبراہٹ اور پریشانی میں کوئی ترکیب بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ خون کے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ماں نے آخری ہچکی لی اور چل بسیں۔

عنان اور خنسا چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ لیث بھی رو دیا۔ دربانوں نے منہ لٹکا لیا، لیث سے کہا۔ ”رونے سے کام نہیں چلے گا، اس لیے ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ یونس کو اسی وقت گرفتار کروا دیا جائے ورنہ یہ فرار ہو جائے گا۔“

لیث کو یونس کا باپ قاضی یاد آیا۔ دربانوں سے کہا۔ ”تم قصر کا خیال رکھو، میں یونس کو گرفتار کروانے جا رہا ہوں۔“

لیث کی بدحواسی اور شکستہ دلی کا یہ حال تھا کہ وہ پاؤں رکھتا کہیں تھا اور وہ پڑتا کہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کو اب بھی یونس کی طرف سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ جب وہ قاضی کے دروازے پر پہنچا تو دربانوں نے اسے روکا مگر یہ کسی دیوانے کی طرح اندر داخل ہو گیا اور آواز لگائی۔

”قاضی لبیب بخدی! دہائی ہے باہر نکل اور میرا مقدمہ سن اور میری مدد کر۔“

قاضی فوراً نکل آیا اور اپنے سامنے لیث کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ”لیث! کیا بات ہے؟ تجھے کس نے ستایا؟“

لیث نے جلدی جلدی واقعۂ قتل سنا دیا۔ قاضی نے حیرت سے پوچھا۔ ”تاجر حمدون مغیث کی بیوہ کو یونس نے قتل کر دیا؟ یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل درست کہہ رہا ہوں۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”یونس ہے کہاں، وہ اس بیوہ کو قتل کر کے چلا کہاں گیا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”قاضی! یہ تیرا کام ہے کہ تو میری ماں کے قاتل کا پتا لگا کر گرفتار کروا دے۔ میں اسے کہاں تلاش کروں گا۔“

قاضی نے جھک کر رازداری سے پوچھا۔ ”اچھا، اب تو یہ بتا کہ تیری سوتیلی ماں زندہ ہے یا مر گئی؟“

لیث نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”اس کا انتقال ہو گیا۔“

قاضی اچھل پڑا، بیوہ کی موت کا قاضی کو بھی ملال ہوا۔ غصے میں بولا۔ ”یہ بہت برا ہوا۔ یونس! تو نے یہ بہت برا کام کیا۔ تو اپنے کیے کی سزا پائے گا کیونکہ شرع یہی کہتی ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان۔ جان کے بدلے جان۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔“

لیث نے کہا۔ ”میں اپنی مرحومہ ماں کے پاس جا رہا ہوں۔ قاتل کی گرفتاری اور اسے سزا دینا آپ کا کام ہے۔ میں دوبارہ پھر آؤں گا آپ کے پاس۔“

لیث چلا گیا۔ قاضی کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا، پھر آپ ہی آپ بولا۔ ”یونس! یہ تو نے کیا کر دیا؟ تو نے حمدون تاجر کی بیوہ کو ہلاک کیوں کر دیا حالانکہ میں اس کی بیٹی سے تیری شادی ضرور کروا دیتا اور اس کے بعد میں اس سے شادی کر لیتا۔ اس طرح اس کی پوری جائداد اور مال و زر میرے قبضے میں ہوتا۔ یونس! تو نے غلطی کی اور تیری پوری زندگی غلطیوں ہی میں گھری رہی ہے۔ تو نے حمدون تاجر کی بیوہ کو ہلاک کر دیا۔ تجھے اس کی سزا ملنا چاہیے۔ تو میرا بیٹا ہے تو کیا ہوا؟ میں دنیا کو دکھا دوں گا کہ ایک عادل اور منصف قاضی کے لیے سب برابر ہیں اور وہ اپنے بیٹے کو بھی معاف نہیں کرے گا تاریخ میں میرا بھی نام آئے گا لوگ میرے عدل و انصاف کے گن گایا کریں گے۔“

اس کے بعد قاضی اندر چلا گیا۔ وہ قصر میں موجود





یونس کے پاس گیا تھا جو اناج کی کوٹھری میں چھپا ہوا تھا۔ قاضی نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ ”یونس! کیا تو یہاں موجود ہے؟ اگر ہے تو باہر آ اور مجھ سے چند باتیں کر۔“

کچھ دیر بعد یونس باہر آ گیا اور حیرت سے باپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بابا جان! میں نے اس خبیث عورت کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ آپ کو گالیاں دے رہی تھی۔“

قاضی نے پُرجوش آواز میں ڈانٹا۔ ”لیکن میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا کہ تو اس کو قتل کر آ۔ یہ تو نے بہت برا کام کیا، اب میں تجھے بچاؤں گا کس طرح؟“

یونس سر جھکائے فدوی بنا کھڑا رہا۔ قاضی نے اپنا سر پکڑ رکھا تھا۔ ”یونس! تو نے بہت غلط کام کیا۔“

یونس نے سرکشی سے جواب دیا۔ ”میں نے جو کچھ کیا، مجھے یہی کرنا چاہیے تھا اور میں اپنے کیے پر ذرا بھی شرمندہ نہیں۔“

قاضی نے اسے ڈانٹا۔ ”یونس! خاموش رہ۔ تو نہیں جانتا کہ تو نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ تیرا باپ قاضی ہے لیکن یہ بااختیار قاضی قتل کے مقدمے میں تجھے معاف نہیں کر سکے گا کیونکہ اگر میں ایسا کروں گا تو عدل و انصاف کی پیشانی پر سیاہ داغ لگا دوں گا۔“

یونس نے نیم پاگل کی طرح جواب دیا۔ ”میں موت سے نہیں ڈرتا بابا جان۔“

قاضی نے کہا۔ ”اچھا تو یہیں رہ، باہر ہرگز نہ آنا۔ میں کچھ سوچتا ہوں۔“

قاضی یہ کہہ کر چلا گیا اور یونس اپنی ہتھیلیوں پر تھوڑی رکھ کر کچھ سوچنے لگا۔

کچھ دیر بعد تین سپاہیوں نے یونس کو گھیر لیا اور پھر اسے بے بس کر کے گرفتار کر لیا۔ ان تینوں نے یونس کو زنجیروں سے جکڑ دیا۔ یونس عالم یاس میں اپنے قید و بند کی پچھلی صعوبتیں یاد کر کے ہولنے لگا۔

☆☆☆

یونس کی گرفتاری کے بعد قاضی، لیث کے پاس اس کے قصر میں پہنچ گیا۔ یہاں کا منظر ہی بڑا سوگوار اور ہولناک تھا۔ ابھی تک میت قصر ہی میں رکھی تھی۔ آخری رسوم میں شریک ہونے والے جمع ہو رہے تھے۔ انہوں نے قاضی کو دیکھتے ہی کھڑے ہو کر احترام کیا۔ لیث بھی قاضی کو قصر میں آیا ہوا دیکھ کر اس کے پاس چلا گیا اور اسے نہایت ادب و احترام سے ایک کمرے میں بٹھا کر پوچھا۔

”قاضی محترم! کیا قاتل کا کچھ پتا چلا؟“

قاضی نے رقت سے جواب دیا۔ ”قاتل گرفتار کر لیا

جولائی 2014ء کے شمارے کی جھلک

ماہنامہ سرگزشت

رہنما

اس نوجوان کا احوال زیست جس نے نشے میں ڈوبی قوم کو بیدار کیا اور آج وہی قوم عالمی طاقت ہے

تاریکی کا آسیب

اپنے قلم کی قوت سے وہ قارئین کو خوف میں مبتلا کر دیتا تھا۔ عالمی پیمانے پر مشہور مصنف کا احوال

الوداع

تلاش معاش میں ملکوں ملکوں پھرنے والے شخص کا زندگی نامہ، دلچسپ روداد

پھر وہی غلطی

اس کی بیٹی سے ایک بڑی غلطی سرزد ہونے والی تھی کہ ماں نے وہ چال چلی جو شہ مات ثابت ہوئی

اس کے علاوہ

بھی بیس سے زائد سچے قصے، دلچسپ واقعات، سبق آموز سچ بیانیاں، سلسلے وار طویل روداد، فلمی دنیا کے بھولے بسرے واقعات

اور

بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

آپ کو پڑھنا چاہیے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

گیا ہے اور اسے اس کے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔"

لیث اور قاضی کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ قاضی قصر کی مالیت اور قصر میں موجود چیزوں کی قیمت کا اندازہ لگاتا رہا۔ اس کو یونس پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا جس نے اس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اس نے لیث سے کہا۔ "نوجوان! میں بیوہ کی بچی سے تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تو اس سے ملوانا پسند کرے گا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "مجھے کوئی تامل نہیں، ویسے عنان کا برا حال ہے۔"

قاضی کی خواہش پر عنان کو وہیں بلوا لیا گیا۔ قاضی نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "بیٹی! تیرے ساتھ جو کچھ ہوا، میں شرمندہ ہوں۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے لیکن پھر بھی اگر اس کی تلافی ہوسکتی ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

عنان سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ لیث نے تسلیاں دیں لیکن تسلیوں سے اس کے غم میں اور اضافہ ہو رہا تھا۔

قاضی نے لیث سے کہا۔ "تو نے یونس کو اپنا بھائی بنا کر سخت غلطی کی تھی۔ اب میں اس کی تلافی اس طرح کرسکتا ہوں کہ یونس کی جگہ تجھ کو اپنا بیٹا بنالوں۔"

عنان کی سسکیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ لیث نے قاضی کی بات پر خوشی کا اظہار کیا لیکن یہ موقع خوش ہونے کا نہیں تھا، اس نے پوچھا۔ "یونس کا کیا ہوگا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔"

خنسا بھی آگئی، قاضی نے اس حسین و جمیل کنیز کو دیکھا اور پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "میری محبوبہ بھی اور کنیز بھی۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "خوب، ماشاءاللہ، خدا نے کیا چیز بنائی ہے۔"

میت اٹھی تو گھر میں کہرام برپا ہوگیا۔

ماں کی موت کے بعد پہلی رات بڑی افسردہ اور سوگوار محسوس ہوئی۔ اس رات تنہائی میں لیث کو اپنی وہ دعا یاد آئی جس میں اس نے خدا سے یہ دعا کی تھی کہ وہ کسی طرح یونس سے نجات دلا دے اور عنان کو اس سے وابستہ کردے۔ اس کی دعا قبول ہوچکی تھی۔ خدا نے اسے یونس کے شر سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی تھی اور اب اس پر یہ واجب ہوگیا تھا کہ وہ پہلے حج شکرانہ کرے اور دو سو فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائے، اس کے بعد عنان سے شادی کرے۔

لیکن اس منت کا خنسا یا عنان کو کوئی علم نہیں تھا چنانچہ خنسا نے اس رات لیث سے درخواست کی کہ "اب وقت آگیا ہے کہ تو مجھے آزاد کرکے دلہن بنالے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "اب تو راہ میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں رہی، اس لیے میں تجھے دلہن بنالوں گا لیکن اگر تو اجازت دے اور پسند کرے تو یہ کام عنان سے شادی کرلینے کے بعد انجام دوں۔"

خنسا نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ عنان سے شادی کرنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی، جب چاہے کرلے۔"

خنسا اور لیث نے وہ رات بڑے سکون سے گزاری اور صبح ہی صبح قاضی کے پاس چلا گیا کیونکہ قاضی نے اسے بلایا تھا۔

☆☆☆

قاضی کے محل کا طمطراق اور شان و شوکت دیکھ کر لیث پر بڑا اثر ہوا۔ عموماً قاضی سے ملنے کے لیے لوگوں کو زحمتِ انتظار سے دوچار ہونا پڑتا تھا لیکن لیث نے اپنی آمد کی خبر جیسے ہی اندر بھجوائی اسے فوراً ہی بلا لیا گیا۔ اس وقت تک قاضی بستر سے نہیں نکلا تھا۔ لیث کو قاضی کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ قاضی نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ "تو آگیا اچھا کیا، میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

لیث نے جواب دیا۔ "اس سانحے نے کنبے کے ہر فرد کو نیم جان کردیا ہے۔ ابھی میرا دل تو نہیں چاہتا تھا آپ کے پاس آنے کو۔ لیکن میں نے سوچا کہ اس غم کے لیے پوری زندگی پڑی ہے اس لیے جو کام کرنے کے ہیں ان کو التوا میں ڈالنا ٹھیک نہیں۔"

قاضی نے نظریں نیچی رکھیں، بولا۔ "تو بڑا سمجھدار نوجوان ہے۔ اے کاش تو میرا بیٹا ہوتا تو میں بے حد خوش ہوتا لیکن خیر اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

لیث نے پوچھا۔ "یونس کا کیا ہوا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "یونس نے جو کچھ کیا ہے اس کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا ہے۔ عضدالدولہ نے مجھے بلوایا تھا اور مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا تیرے بیٹے نے کسی کو قتل کیا ہے؟ میں نے پوری تفصیل بتادی۔ جس پر عضدالدولہ نے رائے دی کہ یہ مقدمہ میں کروں گا کیونکہ تو یونس کا باپ ہے اس لیے صحیح فیصلہ نہیں کرسکے گا۔ اس پر میں نے یہ جواب دیا کہ اس مقدمے کا صحیح فیصلہ تو میں ہی کروں گا اور بغداد والوں کو دکھادوں گا کہ ایک دیانت دار اور منصف مزاج قاضی کو کیا اور کیسا ہونا چاہیے۔"

لیث نے کہا۔ "مجھے بھی آپ سے یہی امید ہے۔"





قاضی نے پوچھا۔ "تو شادی کب کر رہا ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "قاضی محترم! میں شادی بھی کرلوں گا لیکن ابھی یہ کام نہیں ہوسکے گا۔"

اس کے بعد اس نے اپنی منت کا سرسری طور پر ذکر کیا، کہا۔ "اب جب تک میں دو سو فقرا اور مساکین کو کھانا نہیں کھلاؤں گا اور شکرانے کا حج نہیں کروں گا، شادی نہیں کرسکوں گا۔"

قاضی نے کہا۔ "تو یہ کام مشکل تو نہیں، جیسا کہ میں تجھ سے کہہ چکا ہوں کہ یونس کے بعد میں تجھے اپنا بیٹا بنانے پر تیار ہوں۔ آج سے تو میرا بیٹا ہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو پس و پیش کے بغیر کہہ سکتا ہے۔"

لیث نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک ہی کام آپ اچھی طرح کرسکتے ہیں جس کا اظہار میں چند دنوں بعد کروں گا۔"

قاضی اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ "میں نے تجھ سے کہہ تو دیا کہ تو پس و پیش سے کام نہ لے۔ میں نے تجھے بیٹا یوں ہی نہیں کہہ دیا۔ میں عملاً بھی ثابت کردوں گا کہ میں تیرا باپ ہوں اور تو میرا بیٹا۔"

لیث قاضی کے پرخلوص جذبات اور دل کو موہ لینے والی پیشکش سے بہت متاثر ہوا، بولا۔ "اگر آپ کی یہ پیشکش پرخلوص اور سنجیدہ ہے تو پھر آپ میری واقعی مدد کریں۔"

قاضی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک آچکی تھی۔ جلدی جلدی بولا۔ "میں نے کہہ تو دیا کہ اپنے کسی بھی معاملے میں تو پس و پیش نہ رکھ اور اپنا سارا دکھ درد مجھ سے بیان کردے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "میں حج کرنے جاؤں گا، اپنے ساتھ خنسا کو تو لے جاسکتا ہوں لیکن عنان کو نہیں لے جاسکتا کیونکہ وہ ابھی میری کچھ بھی نہیں ہے۔ میں برابر یہی سوچ رہا ہوں کہ اس کو کس کے پاس چھوڑ کر جاؤں۔ اب ان حالات میں کہ آپ میری سرپرستی پر آمادہ ہوگئے ہیں اور پورے شہر میں امانت اور دیانت میں آپ کا کوئی جواب نہیں اس لیے اگر میں عنان کو آپ کے پاس چھوڑ جاؤں گا تو کوئی حرج نہیں؟"

قاضی نے جلدی جلدی جواب دیا۔ "بالکل، بالکل۔ تو مجھ پر اعتماد کرسکتا ہے۔"

لیث نے مزید کہا۔ "اور یہ کہ میں اپنا مال و زر بھی آپ ہی کے پاس رکھوادوں گا کیونکہ اس کو کہاں اپنے ساتھ لیے لیے پھروں گا۔"

قاضی نے فراخ دلی سے جواب دیا۔ "عزیز از جان! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ میں نے کہہ تو دیا کہ میں تیری سرپرستی قبول کرتا ہوں۔ تو مجھ پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرسکتا ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تو خنسا کو بھی یہیں چھوڑ جا۔ اسے کہاں لیے پھرے گا۔"

لیث نے کہا۔ "نہیں، میں خنسا کو تو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

قاضی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مال و زر اور عنان کے بعد بھی ایک مسئلہ باقی رہتا ہے اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکلنا چاہیے۔"

لیث نے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "مال و زر اور عنان کے بعد تیرے قصر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اس کا بھی بندوبست ہونا چاہیے۔"

لیث نے کہا۔ "آپ نے بالکل صحیح سوچا۔ واقعی اس قصر کا کیا بنے گا، اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "اس کا ایک ہی حل ہے قصر کو بیچ کر مال و زر میں تبدیل کرلیا جائے اور مال و زر کا امین میں بن سکتا ہوں۔"

لیث نے تردد سے کہا۔ "جب واپس آؤں گا تو کہاں رہوں گا؟"

قاضی نے جواب دیا۔ "میرے پاس، میرے قصر میں اور اگر علیحدہ قصر کی ضرورت محسوس ہو تو دوسرا خرید لینا۔"

لیث قاضی سے متفق ہوگیا۔ دونوں میں دوسرے کئی امور پر بھی باتیں ہوئیں اور چند گھنٹوں میں وہ دونوں اتنے بے تکلف اور ایک ہوگئے کہ واقعی دونوں باپ بیٹے معلوم ہونے لگے۔ آخر میں قاضی نے پوچھا۔

"تو تو حج کے لیے کب روانہ ہوگا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ پہلے یونس کے مقدمے کا فیصلہ ہوجائے، اس کے بعد میں حج کے لیے منصوبہ بناؤں گا۔"

قاضی نے کہا۔ "یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اس مقدمے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ خلیفہ کا نائب عضدالدولہ بھی اس میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا کہ یونس باپ کے روبرو قاتل کی حیثیت سے کھڑا کردیا جاتا اور قاضی اس پر نظریں ڈالے بغیر اپنی کارروائی میں مشغول رہتا۔ آخر قاضی نے اپنا فیصلہ سنادیا کہ "اگر مقتول کے ورثا دیت کے عوض قاتل کو چھوڑنے پر آمادہ ہوں تو قاتل اور مقتول کے ورثا معاملات کرسکتے ہیں لیکن اگر دیت سے معاملہ طے نہیں پاتا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

تو پھر قاتل کو سزائے موت دے دی جائے۔"

یونس چیخا۔ "میری دیت کون دے گا؟"

قاضی کوئی جواب دیے بغیر عدالت سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

یونس نے سپاہیوں سے کہا۔ "لوگو! میرے باپ کو بلاؤ تاکہ وہ لیث سے دیت کی رقم طے کر کے ادا کرے اور مجھے رہائی ملے۔"

جب قاضی کو اس کا علم ہوا تو اس نے جواب میں کہلوا دیا۔ "میں اس کو پہلے ہی عاق کر چکا ہوں اس لیے میں دیت کا معاملہ کیوں طے کروں۔"

یونس پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگا۔ "او ظالم انسان! میں نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔ تو قاضی یا میرا باپ نہیں، ایک ظالم اور سفاک انسان ہے اور مکافاتِ عمل میں تو بھی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچے گا۔"

فیصلے کی پورے بغداد میں دھوم مچ گئی۔ عضد الدولہ نے قاضی کے گھر آ کر اس کو داد دی کہ قاضی کو اتنا ہی دیانت دار اور منصف ہونا چاہیے۔ لیث نے سکون کی سانس لی۔ خنسا بھی مطمئن ہوئی اور عنان کے دل سے اپنی ماں کی یاد میں ایک بار پھر ہوک سی نکلی۔

☆☆☆

یونس کو قتل کر دیا گیا اور لیث اس طرف سے مطمئن ہو کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اب اس کا زیادہ وقت قاضی کے پاس اس کے مشوروں میں گزرتا۔ اس نے اپنے ارادوں کا ذکر عنان سے نہیں کیا۔ عنان کو بس اتنا ہی معلوم تھا کہ اب لیث اس سے شادی کرے گا لیکن خنسا کو یہ معلوم تھا کہ شادی، حج اور مدینہ منورہ میں رسول مقبولؐ کے مزارِ اقدس کی زیارت کے بعد واپسی پر ہوگی اور اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ اس کے بعد خنسا کو بھی آزاد کر دیا جائے گا اور وہ بھی عنان کی طرح بلند مرتبہ آزاد بیوی بن جائے گی۔

لیث نے دو سو فقرا اور مساکین کو کھانا کھلایا اور عنان کو اپنے منصوبے سے مطلع کیا۔ وہ شام سے ذرا پہلے عنان کو قصر کے پودوں والے حصے میں لے گیا۔ اس نے بڑی آزادی سے کہا۔ "عنان یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اس وقت میں تجھ سے جس موضوع پر بات کرنے والا ہوں، تیری ماں کی موجودگی میں، میں اس طرح یہاں آنے یا بات کرنے کا خیال تک دل میں نہ لا سکتا تھا۔"

عنان نے تردید کی، بولی۔ "یہ غلط ہے اور میری ماں پر ایک قسم کی تہمت ہے کیونکہ میری ماں کی موجودگی میں یونس اور تم دونوں ہی نے مجھ سے بڑی آزادی سے باتیں کی ہیں۔"

لیث نے جواب دیا۔ "اب یہ بتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

عنان نے کہا۔ "یہ سوال بھی فضول ہے کیونکہ تو خود بھی جانتا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔"

لیث نے منہ بنا کر کہا۔ "عنان! بات کیا ہے، یہ تو اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کر رہی ہے؟"

عنان نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ اب اس قصر میں میری کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ کاروبار، قصر اور قصر کے مال و زر اور سامان کا حقیقی حق دار تو سمجھا جائے گا۔ میں تیری دست نگر ہو گئی ہوں۔ اب تو خود ہی سوچ کہ تیرا مجھ سے یہ پوچھنا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ فضول اور مہمل سوال ہے یا نہیں؟"

لیث نے چڑ کر کہا۔ "عنان! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں تجھے چاہتا ہوں۔ تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں اب تک اس قصر میں نہ ہوتا اور اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہوتا۔ تیری شادی یونس سے ہو چکی ہوتی۔"

عنان سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ لیث نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔ بے چینی سے پوچھا۔

"ارے تو رو رہی ہے! کیوں، یہ رو کیوں رہی ہے؟ بات کیا ہے؟"

عنان نے ایک دم نظریں اٹھائیں اور پوچھا۔ "اگر میں رونے کی وجہ بتا دوں تو کیا تجھ پر اس کا اثر ہوگا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "میں اس پر غور ضرور کروں گا۔"

عنان نے کہا۔ "تو سن! میں چاہتی ہوں کہ تو خنسا کو الگ کر دے۔ میں اپنے حصے میں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتی۔"

لیث نے سختی سے کہا۔ "میں مرد ہوں اور تو عورت۔ تو میرے فیصلوں میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ میرا دوسرا فیصلہ بھی سن لے۔ میں عنقریب حج کرنے چلا جاؤں گا۔ خنسا میرے ساتھ جائے گی لیکن تو بغداد ہی میں رہے گی کیونکہ سرِدست تو میرے لیے غیر ہے۔ میں واپس آ کر شادی کروں گا تجھ سے۔"

عنان نے گھبرا کر پوچھا۔ "آخر میں کس کے ساتھ رہوں گی؟"

لیث نے جواب دیا۔ "تو قاضی کے ساتھ رہے گی۔ قاضی لبیب بخدی کے ساتھ کیونکہ اس شہر میں اس سے زیادہ ایمان دار، اس سے زیادہ منصف مزاج دوسرا نہیں ملے گا۔"

عنان نے کچھ عجیب نظروں سے لیث کی طرف





دیکھا، پوچھا۔ "تو تو مجھے میری ماں کے قاتل کے باپ کے حوالے کر کے جائے گا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "ہاں، اس قاضی کے حوالے کر کے جاؤں گا جس نے تیری ماں کے قاتل کو سزائے موت دی۔"

عنان نے بے بس ہو کر کہا۔ "جو تیری سمجھ میں آئے کر۔ میں خاموش رہوں گی۔"

رات گئے تک یہ بات عام ہو گئی کہ لیث، خنسا کو لے کر حج کرنے چلا جائے گا اور عنان قاضی کے پاس بطور امانت رہے گی۔ یہ خبر سن کر بوڑھا غلام کھانستا ہوا لیث کے پاس چلا گیا۔ لیث، خنسا سے باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں نے بوڑھے کے کھانسنے کی آواز سنی تو اس کا انتظار کرنے لگے۔ بوڑھے نے دروازے پر دستک دی۔ لیث نے کہا۔

"اندر آ جا۔"

جواب کے ملتے ہی بوڑھا اندر داخل ہو گیا اور لیث سے نظریں ملائے بغیر سوال کیا۔ "میں نے سنا ہے کہ میرے آقا تو خنسا کو ساتھ لے کر حج کرنے جا رہا ہے اور عنان کو بطور امانت قاضی کے پاس چھوڑ جائے گا؟"

لیث نے ناگواری سے کہا۔ "ہاں تو نے صحیح سنا ہے۔ میں خنسا کے ساتھ بہت جلد حج کرنے چلا جاؤں گا اور عنان میری عدم موجودگی میں قاضی کے پاس رہے گی۔"

بوڑھے نے بڑے دکھ سے کہا۔ "میرے آقا! تو ایک بار پھر غلطی کر رہا ہے۔"

لیث نے کہا۔ "وہ کس طرح؟ تو ضرورت سے زیادہ شکی ہے حالانکہ قاضی کی امانت اور دیانت کا پورے بغداد میں شہرہ ہے۔"

بوڑھے نے کھانستے ہوئے کہا۔ "میرے آقا! ذرا سوچ تو۔ کیا میں نے اسی طرح یونس کی مخالفت نہیں کی تھی؟"

"ہاں کی تھی مخالفت پھر؟"

بوڑھے غلام نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "یہ قاضی بھی یونس کا باپ ہے اور یہ یونس سے زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔"

لیث نے درشتی سے کہا۔ "کوئی اور بات کر۔ میں اس عادل اور منصف قاضی کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کروں گا۔ جس نے حق و انصاف پر اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔"

غلام پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ کچھ دیر کھانس کر جب اپنے حواس میں آیا تو بولا۔ "میرے آقا! تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اس نے اپنی اس اولاد کو حق و انصاف پر قربان کیا ہے جو سب سے زیادہ ناخلف تھی اور جس کی بابت میں نے یہ بھی سنا ہے کہ قاضی نے اس کو عاق کر دیا تھا ورنہ اس کی چہیتی اولادیں اور بیویاں آج بھی اہواز میں رہ رہی ہیں اور انہیں وہ بغداد میں لانا بھی پسند نہیں کرتا۔"

لیث نے پوچھا۔ "تجھے اس کے علاوہ بھی کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں، کیونکہ اس سے زیادہ اہم کوئی اور بات ہو بھی نہیں سکتی۔"

"تو اب تو اپنی کوٹھری میں چلا جا اور اپنی زبان بند رکھ۔ یہ اہواز نہیں بغداد ہے۔"

غلام نے لیث کے تیور سمجھ کر جاتے ہوئے کہا۔ "اب خدا! آپ کو شرمندہ نہ کرے ورنہ مجھ کو تو ڈر ہی لگ رہا ہے۔" غلام کھانستا ہوا چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی خنسا نے کہا۔ "دیکھ لیث! میں تجھے مشورہ دیتی ہوں کہ تو غلاموں وغیرہ کو زیادہ منہ نہ لگایا کر۔ تو نے دیکھا یہ کیسی باتیں کر رہا تھا تجھ سے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "مجھ میں اور تجھ میں یہی فرق ہے کہ میں مجرم کو معاف کر دیتا ہوں۔ میں انتقام وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑتا۔"

خنسا نے کہا۔ "تب پھر سوچ کس بات میں، جو کچھ کرنا ہے جلد از جلد کر لے۔ یہ وقت دوبارہ نہیں ہاتھ آئے گا۔"

لیث نے جواب دیا۔ "اس وقت تو بس ایک ہی بات سوچتا رہتا ہوں وہ یہ کہ میں کس طرح عنان کو بھی راضی کر لوں۔"

خنسا نے کہا۔ "وہ بڑی سرکش لڑکی ہے لیکن حالات نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔" "وہ جسے بخرے پر آمادہ نہیں ہے حالانکہ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر وہ منفی انداز میں نہ سوچے تو اسے بڑے فائدے پہنچ سکتے ہیں۔"

لیث نے کہا۔ "اب کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔ خنسا! معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ کل رات تو میں اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ معلوم نہیں کیا کیا بڑبڑاتا رہا۔ کیا تو اس پہلو پر نہیں سوچتی کہ میں نے کبھی بھی......"

خنسا نے جواب دیا۔ "میں سب کچھ سوچتی ہوں لیکن اب آج کل میں تیرے ساتھ سفر کو سوچتی رہتی ہوں۔"

لیث نے خوش ہو کر کہا۔ "سفر تو کرنا ہی پڑے گا......"

ابھی اس کا فقرہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ عنان اس کے کمرے میں روتی ہوئی داخل ہوئی۔ لیث نے پوچھا۔ "عنان! کیا بات ہے؟ تو کیوں رو رہی ہے اور اس وقت میرے کمرے میں کس طرح آ گئی؟"

لیکن عنان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ روتی رہی۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

خنسا، عنان کو جلانے کے لیے اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا سیدھا ہاتھ لیث کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ عنان کے رونے کی رفتار تیز ہوگئی اور وہ زور زور سے سسکیاں اور ہچکیاں لینے لگی۔

لیث اپنی جگہ سے اٹھا اور عنان کے برابر جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ ”ہاں، اب بتا بات کیا ہوئی؟“

عنان بڑی جذباتی ہو رہی تھی۔ اٹک اٹک کر بولی۔ ”لیث! تو مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کردے۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔“

لیث نے عنان کو اپنی آغوش میں لے لیا اور بڑی محبت سے کہا۔ ”عنان! تو مت رو۔ تیرا دل بہت دکھا ہوا ہے، کچھ دن تو غموں سے پیچھا چھڑا کر رہ لے۔ گھبرا نہیں، اللہ جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔“

عنان نے بہ رو رو کر کہا۔ ”میں اپنے بستر پر پڑی، بڑی دیر سے کروٹیں بدل رہی تھی، نیند کا کوسوں پتا نہیں تھا کہ اچانک مجھے خوف سا محسوس ہوا اور میں اپنی جان بچا کر یہاں چلی آئی۔“

لیث نے تسلی دی۔ ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں، تیرا کمرا یہاں سے اتنی دور تو نہیں ہے اگر تو آواز دے کر بلائے تو میں بھاگ کر آسکتا ہوں۔ ورنہ یوں بھی راتوں کو تیرے کمرے کی دیکھ بھال کرتا رہوں گا۔“

عنان نے کہا۔ ”لیکن میں اب اس کمرے میں رہوں گی خنسا کے ساتھ۔“

لیث نے خنسا کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا، بولا۔ ”اگر عنان، خنسا کے پاس رات گزارنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس کمرے میں رہ۔“

خنسا نے پس و پیش کیا۔ ”لیکن میرے ہی کمرے میں عنان کا رہنا کیا ضروری ہے۔ یہ میرے برابر والے کمرے میں بھی رہ سکتی ہے جو خالی پڑا ہوا ہے۔“

عنان نے ضد سے کام لیا۔ ”اگر میں تیرے ساتھ رہوں تو اس میں تجھے کیا اعتراض ہے؟“

خنسا نے منہ بنایا۔ ”مجھے کیا اعتراض ہوگا لیکن کیا تو نہیں جانتی کہ میرے ساتھ لیث بھی رہتا ہے۔ کیا تو لیث کے ساتھ بھی رہ سکتی ہے؟“

عنان نے جواب دیا۔ ”لیث کسی اور کمرے میں چلا جائے گا۔“

خنسا نے لیث کو مخاطب کیا۔ ”لیث! میرا خیال ہے عنان خوف زدہ نہیں ہے بلکہ اس کو احساس تنہائی پریشان کرتا ہے۔“

لیث نے آنکھ کے اشارے سے خنسا کو منع کیا کہ وہ بولنے میں احتیاط سے کام لے لیکن خنسا پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ رک کر پھر بولی۔ ”جب عنان بذات خود خیال نہیں کررہی تو میں تکلف اور شرم و حیا سے کیوں کام لوں۔ اس کا مرض میری سمجھ میں آگیا ہے اور اس کا میں ہی علاج بتا سکتی ہوں۔“

عنان خنسا کی صورت دیکھنے لگی۔

خنسا نے کہا۔ ”اس کو تیری ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ مرد کی ضرورت چنانچہ جب تنہائی میں عنان یہ سوچتی ہوگی کہ وہ اکیلی بستر پر کروٹیں بدل رہی ہے اور اس کے برعکس میں تیرے ساتھ محو اختلاط ہوں تو اس کا برا حال ہو جاتا ہوگا۔“

عنان غصے میں کھڑی ہوگئی۔ ”بے شرم، بے غیرت! یہ تو میرے لیے کہہ رہی ہے۔“

لیث نے محسوس کرلیا کہ خنسا شر پر آمادہ ہے اس لیے وہ عنان کا ہاتھ پکڑ کر باہر لیے چلا گیا اور جاتے جاتے خنسا سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“

خنسا نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن عنان کا مزاج برہم تھا۔ ”ماں کے بعد اس نے جارحانہ روش اختیار کررکھی ہے۔ میں جب تک خاموش ہوں خاموش ہوں لیکن جس دن بھی میں نے یہ طے کرلیا کہ اس قصر میں یا تو خنسا رہے گی یا میں، بس اسی دن اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔“

لیث نے اس کو سمجھایا۔ ”عنان! زیادہ غصہ نہ کر، میں اس کو سمجھا دوں گا۔“

عنان لیث کو اپنے کمرے میں لے گئی اور بے اختیار چمٹ گئی، بولی۔ ”لیث! میں خنسا کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ میں ایک بار پھر تجھ پر یہ واضح کیے دے رہی ہوں کہ اگر تجھ کو مجھ سے شادی کرنا ہے تو خنسا کو رخصت کرنا پڑے گا۔ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔“

لیث نے اس کی پشت تھپتھپائی اور اسے تسلیاں دینے لگا۔ ”مت گھبرا عنان۔ یہ تلخیاں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ میں اس کو سمجھا دوں گا اور وہ تیرا ادب کرنے لگے گی۔“

عنان نے لیث کو دھکیل کر دور کردیا اور غور سے اس کی شکل دیکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ میرا ادب کرنے لگے گی؟ وہ جو تیرا ادب نہیں کرتی، میرا کس طرح ادب کرے گی؟“

لیث نے اچھی طرح محسوس کرلیا کہ اس وقت عنان کا دماغی توازن صحیح نہیں ہے، بولا۔ ”اچھا رات بھر آرام کرلو۔ میں تم دونوں سے صبح اس موضوع پر بات کروں گا اور جو کچھ تو چاہتی ہے وہی ہوگا۔“





عنان اپنے بستر پر گر کر زاروقطار رونے لگی۔ لیث اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سمجھانے لگا۔ ”عنان! اگر میں نے منت نہ مانی ہوتی تو تجھ سے فوراً ہی شادی کرلیتا لیکن اب میں عنقریب حج کے لیے روانہ ہو جاؤں گا اور جلد از جلد واپس آکر تجھ سے شادی کرلوں گا۔“ پھر پیچھے گھوم کر دیکھنے لگا کہ کہیں خنسا تو نہیں آگئی۔ مطمئن ہونے کے بعد کہا۔ ”اور اس وقت تو جو کچھ کہے گی میں مان لوں گا یہاں تک کہ خنسا کو بھی الگ کرسکتا ہوں۔“

عنان نے ایک دم اٹھ کر آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تو یہ دل سے کہہ رہا ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یہ دل سے کہہ رہا ہوں۔“

عنان نے پوچھا۔ ”میں تیرا امتحان لوں؟“

”لے امتحان، میں امتحان میں پورا اتروں گا انشاءاللہ۔“

”تیرا امتحان یہ ہے کہ آج کی رات تو میرے ہی کمرے میں رہے گا، خنسا کو اکیلا رہنے دے۔“

لیث نے کہا۔ ”تیری بدنامی تو نہیں ہوگی اس میں؟“

”تو میری بدنامی سے مت ڈر، جب میں خوف زدہ نہیں ہوں۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں رہ جاؤں گا لیکن تو نے جو کچھ کہا ہے اس پر ایک بار پھر غور کرلے کہیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”میں نہیں پچھتاؤں گی بلکہ اس امتحان میں دو اطمینان حاصل کرلوں گی، ایک تو یہ کہ اگر تو نے میری بات مان لی اور پوری رات میرے پاس رہا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تو اپنے قول و قرار میں سچا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا سکون یہ ہوگا کہ میں خنسا کو رات بھر آتش حسرت میں جلاؤں گی اور اسے بھی یہ معلوم ہوسکے کہ رقابت اور حسد کی سوزش کیا ہوتی ہے۔“

لیث سوچ میں پڑ گیا کیونکہ سردست اس پر عمل کرنا بہت مشکل تھا، خنسا ناراض ہو جائے گی۔

عنان نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہا ہے؟ دروازہ اندر سے بند کرکے اس کمرے میں رہ جا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

لیث نے کہا۔ ”اچھا یہ اجازت تو دے گی کہ میں خنسا سے کہہ دوں کہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔ میں عنان کے کمرے میں آرام کروں گا۔“

عنان نے سختی سے کہا۔ ”اس کی بھی ضرورت نہیں۔“

لیث نے عاجزی سے کہا۔ ”عنان میں تیرا ہی حکم مانوں گا لیکن اخلاقاً مجھے خنسا کو بتا ضرور دینا چاہیے تاکہ وہ میرا انتظار نہ کرے۔“

عنان بھاگ کر دروازہ بند کر آئی، بولی۔ ”میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔ آج تو یہیں میرے ہی کمرے میں رہے گا۔“

لیث بے بس ہوگیا۔ عنان نے دوسرے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو اس پر سو جا۔“

لیث حیران پریشان گم صم دوسرے بستر پر جا کر دراز ہوگیا لیکن اس نئی صورت حال نے اسے بہت پریشان کردیا تھا۔

عنان اپنے بستر سے اسے فکر مند دیکھ کر مسکرا رہی تھی وہ خنسا کو ستا کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ بہت یادگار رات تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے دور الگ الگ بستروں پر کروٹیں بدلتے رہے۔ عنان کا حال زیادہ برا تھا۔ لیث کو رہ رہ کر خنسا کا خیال آتا رہا۔ اس نے کئی بار یہ بھی ارادہ کیا کہ جب عنان سو جائے تو وہ اس کے کمرے سے چلا جائے لیکن وہ جب بھی اٹھا عنان نے آواز دی۔ ”کہاں؟“ اور لیث پھر لیٹ گیا۔ اسے شرارت کہا جائے یا امتحان؟ عنان کو اس میں مزہ بہت آیا لیکن خنسا چونک گئی۔

وہ رات بھر لیث کا انتظار کرتی رہی اور جب زیادہ کوفت محسوس کی تو غصے میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور یہ طے کرلیا کہ لیث کتنا ہی چیخے چلائے وہ دروازہ نہیں کھولے گی لیکن پوری رات اس انتظار میں گزر گئی مگر لیث نہیں آیا۔

صبح عنان نے لیث کو کامیاب قرار دیا لیکن خنسا نے منہ سجا لیا۔ لیث اسے دیر تک سمجھاتا رہا اور کہا کہ ”عنان بہت جذباتی ہو رہی تھی اس لیے اس کے پاس رکنا بہت ضروری تھا۔ تیرے ساتھ تو میں رہتا ہی ہوں۔ اس کے علاوہ حج کرنے تو میرے ساتھ ہی جائے گی۔“

خنسا نے جواب دیا۔ ”حاجیوں کے قافلے روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اب تو سفر کی تیاری کر اور اس کے علاوہ جو کچھ کرنا ہے وہ بھی کرلے تاکہ عین وقت پر کوئی امر سفر میں مانع نہ آئے۔“

لیث قصر سے نکلا اور سیدھا قاضی کے پاس پہنچا لیکن قاضی گھر میں موجود نہیں تھا وہ عضدالدولہ کے پاس گیا ہوا تھا۔ ان دنوں عضدالدولہ بھی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا اور اس کے بھائی اور بھتیجے اس فکر میں تھے کہ کسی طرح سازش یا جنگ کے ذریعے عضدالدولہ کو خلیفہ کی نیابت سے معزول کرکے خود اس کی جگہ لے لیں۔ ان نازک لمحوں میں عضدالدولہ کو مخلص مشیروں کی ضرورت تھی اور قاضی لبیب



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بغدادی ان مشیروں میں سرِفہرست تھا۔

☆☆☆

قاضی نے لیث کو وہ پیار دیا کہ اسے زندگی بھر۔۔۔ کہیں سے نہ ملا تھا۔ اس نے قاضی کے مشورے پر قصر خالی کر دیا اور قاضی کے قصر میں منتقل ہو گیا۔ خنسا، عنان اور بوڑھا غلام بھی یہاں آ گئے۔ قاضی نے اس سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے عنان سے چند دنوں ہی میں ایسا برتاؤ کر لیا کہ قاضی کا دم بھرنے لگی لیکن بوڑھا غلام بدستور ناراض تھا۔ اس لیے لیث سے صاف صاف کہہ دیا۔

''آقا! یا تو مجھے اپنے ساتھ لے چل ورنہ میں کہیں اور چلا جاؤں گا کیونکہ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔''

لیث نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''تو ہمیشہ تو بیمار رہتا ہے اس لیے میں تجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ سفر کی صعوبتیں تیرے بس کی نہیں۔ اب رہا سوال کہ تو اس گھر میں نہیں رہے گا تو کہاں رہے گا؟ تو جہاں مناسب سمجھ رہ۔''

☆☆☆

لیث نے اپنا قصر فروخت کر دیا۔ کاروبار قاضی کے سپرد کر دیا کہ واپسی تک نگرانی کرتا رہے۔ اپنا سامان اور مال و زر قاضی کے پاس امانت رکھوا دیا۔ قاضی کے پاس رہتے ہوئے اس نے قاضی کی امانت اور دیانت کا بھی اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تھا۔ اس نے قصر کے ایک بڑے حصے میں لوگوں کی امانتیں رکھی دیکھیں۔ اس کے پاس ہر روز لوگ امانتیں واپس لینے اور جمع کروانے آتے رہتے تھے اور قاضی ہر ایک کو خوش دلی اور خندہ پیشانی سے فارغ کر دیتا۔

حاجیوں کے قافلے جا رہے تھے۔ قاضی نے لیث کو مشورہ دیا کہ وہ حج کرنے تنہا جائے تو بہتر ہے اس طرح وہ جلد ہی واپس آ سکتا ہے اور سفر بھی آسانی سے کر سکتا ہے لیکن لیث، خنسا کو ہر حال میں اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

''نہیں، میں نے خنسا سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کو ساتھ لے جاؤں گا اس لیے خنسا کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' قاضی چپ ہو گیا۔

لیث پڑاؤ پر گیا جہاں قافلے رکا کرتے تھے۔ وہ سفر کی معلومات حاصل کرتا رہا گھر میں قاضی نے خنسا کو سمجھایا۔ ''لڑکی! تو اس سفر میں خواہ مخواہ ہلکان ہونے کیوں جائے گی، یہیں عنان کے ساتھ رہ جا۔''

خنسا نے جواب دیا۔ ''نہیں میں لیث کے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

قاضی نے اس کے سراپے کو بڑے غور سے دیکھا اور جسم کے ایک ایک حصے کا جائزہ لیا پوچھا۔ ''لڑکی! کیا یہ درست ہے کہ تجھے اہواز میں میرے مرحوم بیٹے یونس نے خریدا تھا؟''

خنسا اس سوال پر چونک گئی، آہستہ سے جواب دیا۔ ''ہاں لیکن آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟''

قاضی نے کہا۔ ''اور یہ بھی درست ہے کہ یونس نے تجھے بطور نذرانہ لیث کے حوالے کر دیا تھا؟''

خنسا نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ بھی درست ہے مگر ان سوالوں سے آپ کا مقصد؟''

قاضی نے مسکرا کر کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں اگر چاہوں تو شرعاً تجھے واپس لے سکتا ہوں کیونکہ یونس کی ہر چیز میری ہے اور بیٹے کا مال باپ پر جائز ہے۔''

خنسا گھبرا گئی کہ قاضی یہ کیسی باتیں کر رہا ہے، یہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟

قاضی نے خنسا کو سمجھایا۔ ''لڑکی! اگر تو پسند کرے تو لیث کے ساتھ جانے سے انکار کر دے، میں اس کی عدم موجودگی میں تجھے آزاد کر کے کسی سے نکاح کر دوں گا اور تو کسی کی بیوی بن جائے گی۔''

خنسا اور زیادہ پریشان ہو گئی، بولی۔ ''واپس نہیں رکوں گی، میں لیث کے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

قاضی نے ہنس کر کہا۔ ''اور میں تو یہاں تک تیار ہوں کہ اگر تو عزت اور کوئی مقام چاہے گی تو میں خود بھی تجھ سے شادی کر سکتا ہوں لیکن یہ بھی تیری مرضی پر منحصر ہے، اگر پسند کرے تو ورنہ کوئی بات نہیں۔''

خنسا نے قاضی کے روپ کی یہ جھلک آج پہلی بار دیکھی تھی، بولی۔ ''میں لیث کے ساتھ خوش ہوں اور اس کے ساتھ ہی رہوں گی۔ مجھے شہرت، عزت یا کوئی مقام نہیں چاہیے۔''

قاضی نے افسوس سے کہا۔ ''تیری مرضی، میں تجھے مجبور نہیں کروں گا لیکن ایک بات کا خیال رہے۔ اس وقت ہم دونوں میں جو باتیں ہوئی ہیں انہیں اپنے ہی تک رکھنا۔ کسی اور سے ذکر نہ کرنا کیونکہ یہ سب مذاق تھا اور اگر یہ مذاق نہ بھی ہو تب بھی اگر تو نے میری گفتگو کا ذکر لیث یا کسی اور سے کر دیا تو پھر میں واقعی سنجیدہ ہو جاؤں گا اور شرعاً اور قانوناً میں تجھے حاصل کر لوں گا کیونکہ میں قاضی ہوں اور شرع اور فقہ کو مجھ سے زیادہ دوسرا نہیں جان سکتا۔''

خنسا نے خاموشی اختیار کی کیونکہ وہ قاضی سے الجھنا نہیں چاہتی تھی۔ قاضی نے کچھ دیر تو اس کے جواب کا انتظار





کیا اس کے بعد کہا۔ ''تو چپ کیوں ہو گئی؟ تو اقرار کر کہ میری باتوں کا ذکر لیث یا کسی اور سے نہیں کرے گی۔ میں تیری زبان سے اقرار سننا چاہتا ہوں۔''

خنسا نے بے دلی سے کہا۔ ''جب میں نے خاموشی اختیار کر لی ہے تو اس کا مطلب ہی یہی ہے کہ میں خاموش رہوں گی۔''

قاضی نے سختی سے کہا۔ ''میں ایک بار پھر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یہ سب مذاق تھا ورنہ اگر میں اپنی ان باتوں میں سنجیدگی اختیار کر لوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت تیری حصول یابی سے مجھے نہیں روک سکتی۔''

خنسا نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں۔''

قاضی، خنسا کو دل اور جسم میں اتر جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''اب تو جا سکتی ہے۔''

خنسا، قاضی کی نظروں سے دور ہو گئی لیکن وہ بہت پریشان تھی۔ لیث نے ایک بار پھر دھوکا کھایا تھا۔ اب اگر وہ اس کا ذکر لیث سے کرتی تو معاملہ بگڑ جانے کا احتمال تھا۔ اگر نہیں کرتی تو لٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

سفر کی تیاریاں مکمل تھیں۔ قافلہ بھی تیار تھا۔ قاضی نے لیث کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''خدا تیرا سفر آسان اور کامیاب کرے اور جلد واپس آنا نصیب ہو۔ میں تو باپ کی حیثیت سے تجھے یہی مشورہ دوں گا کہ خنسا کو بھی یہیں میرے پاس چھوڑ جا۔''

خنسا گھبرا گئی، بولی۔ ''لیکن میں یہاں نہیں رکوں گی کیونکہ لیث نے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اگر وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں رک بھی جاتی۔''

لیث نے جواب دیا۔ ''ہاں میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے ورنہ اس کو آپ ہی کے پاس چھوڑ جاتا۔''

عنان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، بولی۔ ''غلافِ کعبہ پکڑ کر میرے لیے دعا ضرور کرنا، میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

لیث نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ''عنان مت گھبرا، میں جلد واپس آؤں گا۔''

قاضی نے کہا۔ ''اب تو قافلے میں شامل ہو جا۔ ورنہ وہ اگر چلا گیا تو دوسرے کا معلوم نہیں کب تک انتظار کرنا پڑے۔''

اس وقت غلام بھی کھانستا ہوا آ گیا۔ ''میرے آقا! کیا تو جا رہا ہے؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''ہاں میں جا رہا ہوں۔''

غلام نے کہا۔ ''خانہ کعبہ میں اپنے لیے دعا مانگنا نہ بھولنا کیونکہ ابھی پوری زندگی پڑی ہے، معلوم نہیں کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔''

قاضی کھنکھا بولا۔ ''او شیطان کے ہم شکل! اپنے آقا کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر۔''

لیث نے ہنس کر کہا۔ ''قاضی محترم! یہ قابلِ معافی ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا ہے میری محبت کے جوش میں کہا ہے۔''

لیث نے ہر ایک سے باری باری معانقہ کیا۔ قاضی نے بڑی گرم جوشی سے لیث کو گلے لگایا۔ لیث کے پیچھے خنسا کھڑی تھی۔ قاضی نے لیث کے کاندھے کے اوپر سے خنسا کو گھورا، وہ نظروں ہی نظروں میں خنسا کو دھمکی دے رہا تھا کہ خبردار جو زبان کھولی۔

☆☆☆

قافلہ منزلیں طے کرتا اور منزلوں پر آدمیوں کا اضافہ کرتا مکہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

جب یہ قافلہ مکہ کے قریب پہنچا تو پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ مقدس شہر انہیں دور سے نظر آیا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ لیث کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ خیموں کا شہر آباد ہو گیا۔ لوگوں کا فرطِ جوش سے برا حال تھا۔ قرین ہی میں لوگوں نے احرام باندھا اور عشاء کے بعد کعبہ کی جانب چل پڑے۔

انہوں نے مقامِ ملتزم پر کھڑے ہو کر خشوع و خضوع سے دعائیں مانگیں کیونکہ یہاں کی دعا بابِ اجابت تک ضرور پہنچتی ہے۔ لیث نے زور زور سے دعا مانگی۔ ''اے اللہ العالمین! تو نے جس طرح مجھے کامیاب و کامران کیا ہے اس طرح میرے دوستوں اور جاننے والوں کے ساتھ کر۔ مجھے واپس بخیریت جانا نصیب کر۔''

لیکن خنسا رو رو کر دوسری ہی دعا مانگ رہی تھی۔ ''اے میرے مولا! تو علیم و بصیر ہے اور خوب جانتا ہے کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہیے۔ اب لیث پر رحم فرما اور اس کو مردم شناسی کی توفیق عطا فرما۔''

لیث نے بھی اس کی دعا سن لی پوچھا۔ ''یہ تو کیسی دعا مانگ رہی تھی۔''

خنسا نے جواب دیا۔ ''وہ جو مجھے مانگنی چاہیے۔ اللہ علیم و بصیر ہے اور خوب جانتا ہے کہ مجھے کیا دعا مانگنی چاہیے۔''

لیث کو دال میں کچھ کالا نظر آیا، اس نے خنسا کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''خنسا! کیا بات ہے؟ تیری تو کیفیت ہی کچھ سے کچھ ہو رہی ہے اور تو پریشان بھی زیادہ دکھائی دے رہی ہے، آخر بات کیا ہے؟''

خنسا نے جواب دیا۔ ''خاص بات تو کوئی بھی نہیں، اگر ہوگی بھی تو چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیث نے کہا۔ ''جب سے میں نے مقام ملتزم پایا ہے، مجھے اپنی ہر مشکل آسان دکھائی دینے لگی ہے۔''

خنسا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''اے میرے رب! مجھ پر، لیث پر اور عنان پر رحم فرما۔ ہمیں تباہی سے بچا۔ مجھ سے زیادہ قاضی لبیب بخدی کی امانت اور دیانت سے تو واقف ہے اگر اس کی نیت صحیح ہے تو اس کی صحیح نیت کو استقامت اور استقلال عطا فرما اور اگر اس کی نیت صحیح نہیں ہے تو اس کی اصلاح فرما۔ میرا رواں رواں کانپ رہا ہے کیونکہ لیث کے غلام کی طرح مجھے بھی قاضی پر اعتبار نہیں ہے۔''

لیث وہاں تو کچھ نہیں بولا لیکن اس کو غصہ ضرور آیا کہ یہ خنسا کو کیا ہو گیا ہے، کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا؟

انہوں نے طواف کیا اور حجر اسود کو بوسہ دیا۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں باب کریم تک جانے کی سعادت مل گئی۔ دروازے کے پاس منبر کے مشابہ ایک کرسی رکھ دی گئی۔ اس میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کرسی میں چار پائے اور ہر پائے میں پہیے لگے تھے جنہیں گاڑی کی طرح کھینچ کر کام میں لایا جاتا تھا۔ اس پر چڑھ کر بیت اللہ کو چابی سے کھولا جاتا تھا۔ بیت اللہ کے کلید بردار نے اسے اس طرح کھولا کہ کعبے کا غلاف خدام نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور کلید بردار اندر داخل ہوا۔ اس نے آستانہ عالیہ کو بوسہ دے کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کے بعد دوسروں کو آنے کی اجازت دی۔ لیث بھی اندر داخل ہوا، اس وقت اس کا دل بھر آیا اور اس نے رو رو کر دعا مانگی۔

لیکن خنسا نے یہاں بھی وہی دعا مانگی۔ ''اے میرے رب! جو لوگ ہمارے اعتبار اور اعتماد سے کھیلیں انہیں اس دنیا میں سزائیں دے تاکہ ہمارے دلوں کو ٹھنڈک میسر آئے۔''

لیث نے خنسا کی طرف دیکھا اور دعا مانگی۔ ''ربِ کعبہ! خنسا سادہ لوح لڑکی ہے اس کے قلب کو ظن و قیاس سے پاک کر۔''

دونوں جب دوبارہ اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو لیث بہت ناراض تھا۔ وہ خیمے میں کھجور کی چٹائی پر لیٹ گیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ خنسا اس کے پاس بیٹھی تھی، جس کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

خنسا نے اس کے بالوں میں کنگھی کے انداز میں انگلیاں پھیریں اور پوچھا۔ ''لیث کیا تکان بہت زیادہ ہے؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''نہیں۔''

خنسا نے کہا۔ ''پھر اٹھ کر بیٹھ جا، یہ لیٹ کیوں گیا؟''

لیث نے کہا۔ ''میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔''

خنسا نے پوچھا۔ ''آخر کیوں، تو میری صورت کیوں نہیں دیکھنا چاہتا؟''

لیث نے کہا۔ ''تو جانتی ہے میں نے قاضی کو پدر معنوی بنایا ہے اس کے مجھ پر احسانات ہیں۔ اس نے میری اور اپنے حق و انصاف کی خاطر اپنے بیٹے یونس کو سزائے موت دے دی۔ اس نے عنان کو اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیا اور میرے مال و زر کا امین بنا۔ یہ ساری باتیں تیرے علم میں ہیں اور اگر اس کے بعد بھی تو قاضی کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔ قاضی کی نیت اور امانت اور دیانت پر شک کرے تو میرا دل نہیں دکھے گا۔''

خنسا منہ پھیر کر بولی۔ ''اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تو میری باتیں سنتے ہی بغداد واپس چلا جائے گا اور جوشِ غضب میں اپنا معاملہ بگاڑ لے گا تو میں تجھ سے وہ باتیں کرتی جو تیرے وہم و گمان میں نہ ہوں گی۔''

لیث نے بدستور نفرت سے کہا۔ ''اچھا خنسا! اس وقت ہم دونوں آپس میں ایک معاہدہ کر لیں اور دوراں حج اس پر سختی سے عمل کریں۔''

''کس قسم کا معاہدہ؟''

''یہی کہ بغداد سے دور کسی بھی جگہ قاضی لبیب بخدی زیر بحث نہیں آئے گا۔''

خنسا نے جواب دیا۔ ''میں معاہدہ کر لوں گی اور اس کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

☆☆☆

چہروں پر طمانیت اور دلوں میں جذبۂ شوق لیے حجاج مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان مقامات کی زیارت کی جو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کی وجہ سے مقامات مقدسہ میں شمار ہونے لگے تھے۔

شام سے ذرا پہلے قافلہ مدینہ منورہ کے باہر خیمہ زن ہوا۔ قافلے کے لوگ اپنے خیمے نصب کرنے لگے لیکن لیث نے روضۂ اقدس کا رخ کیا۔ وہ آنحضرت ﷺ کے روضۂ اقدس کے سامنے کھڑا ہوا ہچکیاں لے لے کر رونے لگا اور درود و سلام پیش کیا۔ منبر اور مزار مبارک کے درمیان میں جو تھوڑی سی جگہ تھی اس کو روضہ کہتے تھے۔ لیث نے اس جگہ تبرکاً نماز پڑھی۔ یہاں سے منبر قدیم کے پاس گیا۔ آنحضرت ﷺ یہیں اپنے قدم رکھا کرتے تھے۔ لیث نے اسے آنکھوں سے لگایا۔





مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ اس نے یہیں نماز ادا کی اور قافلہ میں واپس چلا گیا۔ خنسا لیث کے چلے جانے سے پریشان ہو رہی تھی۔ خنسا کا خیمہ نصب ہو رہا تھا۔

لیث نے کہا۔ ''خنسا! میں تو روضۂ اقدس پر حاضری بھی دے آیا اور یہاں قافلے والے ابھی اپنے کاموں ہی میں مشغول ہیں۔''

خنسا بہت تھکی ہوئی تھی، بولی۔ ''کل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی لیکن اس وقت تکان سے میرا برا حال ہے۔''

☆☆☆

مدینے آنے والوں کے قافلے اتنے زیادہ تھے کہ ان کی کثرت کا ذکر محال تھا۔ لیث خنسا کے ساتھ ایک ایک مزار پر جاتا اور قوت متخیلہ کے سہارے ماضی میں پہنچ کر وہ اہل مقابر کو اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس کرتا۔ وہ ان کی مقدس اور نورانی شکلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا۔

خنسا اس کو ایک بار پھر رسول اللہ ﷺ کے مزار پر لے گئی اور لیث سے کہا۔ ''لیث! یہاں دعا تو اپنی مرضی سے نہیں میری مرضی سے مانگے گا۔ میں جو کچھ کہوں تو اسے دہراتا رہ۔''

لیث نے جواب دیا۔ ''خنسا! میں حیران ہوں کہ تو یہاں بھی کاروبارِ حیات سے نجات نہیں حاصل کر سکی۔''

خنسا نے سختی سے کہا۔ ''دعا کے لیے ہاتھ اٹھا اور میرے ساتھ دعا مانگ۔''

لیث نے کہا۔ ''جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ تو کون سی دعا مانگ رہی ہے۔ میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔''

خنسا نے کہا۔ ''تو سن میں کیا مانگ رہی ہوں۔'' اس کے بعد وہ گڑگڑائی۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! لیث اپنی سادہ لوحی سے مردم شناسی سے قاصر رہتا ہے لیکن میں......''

لیث نے کہا۔ ''وقت کیوں ضائع کر رہی ہو، دعا کیوں نہیں مانگتی۔ یہ تو تو میری شکایت کر رہی ہے۔''

خنسا دعا مانگتی رہی۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! میں قاضی کی بدنیتی اور بد طینتی سے واقف ہو چکی ہوں، لیث نے عنان اور اپنا مال و زر اس کے حوالے کر دیا ہے تو قاضی کے قلب کو بدل دے اور وہ خیانت سے باز رہے ورنہ لیث کہیں کا بھی نہیں رہے گا۔ یا رسول اللہ ﷺ! قاضی کے شر اور فساد کو اسی پر الٹ دیجیے۔''

لیث نے سختی سے انکار کر دیا۔ ''میں یہ فضول دعا نہیں مانگ سکتا ہے۔''

خنسا نے کہا۔ ''یہ فضول دعا نہیں ہے۔ تجھے یہ دعا مانگنی ہوگی۔ اگر تو نے یہ دعا نہیں مانگی تو زندگی بھر پچھتائے گا۔''

''لیکن جب تک قاضی کی بددیانتی ثابت نہ ہو جائے۔ میں اس پر خواہ مخواہ شبہ کیوں کروں؟ مجھے تو اس پر شبہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔''

خنسا نے کہا۔ ''مجھ پر قاضی کی بددیانتی واضح ہو چکی ہے اور مصلحتاً اسے ظاہر کرنا نہیں چاہتی، اگر تو مجھ پر اعتبار کرتا ہے اور کہنے سے یہ دعا مانگ لے، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟''

لیث نے بدرجہ مجبوری دعا مانگی اور خاموش خاموش اپنے خیمے میں آیا اور آنکھیں بند کر کے پڑ رہا۔ خنسا اس کے قریب بیٹھ کر واپسی کا سوچنے لگی۔ لیث نے کن انکھیوں سے فکر مند خنسا کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''خنسا تو جانتی ہے کہ میں نے تیرا کہنا مان لیا ہے۔''

خنسا نے جواب دیا۔ ''ہاں میں بہت خوش ہوں کہ تو نے میری بات نہیں ٹالی۔''

لیث نے کہا۔ ''اب تو میری بات مان لے۔''

خنسا نے کہا۔ ''مان لوں گی، کہہ کیا بات ہے؟''

لیث نے کہا۔ ''تو نے کہا تھا کہ تو نے قاضی کی بددیانتی پکڑ لی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے اس کی کون سی بددیانتی پکڑ لی؟''

خنسا نے جواب دیا۔ ''لیث اب چونکہ تمہاری منتیں پوری ہو چکی ہیں اور عنقریب واپسی کا سفر شروع ہو جائے گا اس لیے اب میں خود بھی اس راز کو راز نہیں رہنے دوں گی۔''

لیث اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خنسا نے قاضی کی گفتگو بالتفصیل لیث کے گوش گزار کر دی اور کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ قاضی کی نیت خراب تھی اور وہ مجھے روک لینا چاہتا تھا۔''

لیث زور زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ ''خوب، خوب تو یہ راز تھا جسے تو اپنے سینے میں چھپائے خواہ مخواہ ہلکان و پریشان ہو رہی تھی۔ یہ فضول اور بے سروپا راز۔''

خنسا نے غصے سے کہا۔ ''لیث تو میری باتوں پر ہنس نہیں۔ یہ میں نے جو کچھ بتایا، تیرے حق میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

لیث نے بے پروائی سے کہا۔ ''قاضی نے تجھ کو نیک نیتی سے روکنا چاہا اور تو اسے بدنیتی پر محمول کر رہی ہے۔''

خنسا نے کہا۔ ''اس نے مجھ کو دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ باتیں تجھے بتائیں تو اس کا بہت برا انجام ہوگا۔''

''یہ مبالغہ ہے، حاشیہ آرائی ہے، قاضی ایسی بات نہیں کر سکتا۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

خنسا نے تنگ آکر کہا۔ ”میری باتیں بغداد پہنچ کر تیری سمجھ میں آئیں گی۔“

لیث نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی اور منہ پھیر کر پڑا رہا۔

☆☆☆

واپسی کا قافلہ بہت بڑا تھا کیونکہ بہت سے قافلے مل ملا کر ایک قافلہ بن گئے تھے۔ اس قافلے میں بعض حکمرانوں کے خاندان بھی تھے اور ان کے وسائل و انتظامات غیر معمولی تھے۔ قافلے کے آگے آگے مشعل بردار تھے جو راتوں کو روشنی کرتے ہوئے چلتے۔ حکمران خاندانوں کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں فوجی چل رہے تھے۔ پانی اور کھانے کی چیزوں کی بھی افراط تھی اور مذکورہ خاندان حجاج اور اہل قافلہ کی دعائیں حاصل کرنے کے لیے مسافروں کو بڑی سہولتیں اور آسانیاں فراہم کر رہا تھا۔

راستے میں حکمران خاندان کسی اور راہ پر چلے گئے اور لیث کا قافلہ پھر مختصر ہو گیا۔

کوفہ سے چھ منزل پہلے قزاقوں نے قافلے پر حملہ کر دیا اور لوٹ مار مچا دی۔ بہت سے مقابلے میں مارے گئے، کچھ پکڑے گئے اور پکڑے جانے والوں میں لیث اور خنسا بھی شامل تھے۔ ڈاکوؤں نے لیث کو خنسا سے جدا کر دیا اور ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر پہاڑوں کے غاروں میں چلے گئے۔ دوسروں کے ساتھ کیا سلوک ہوا لیث کو پتا نہ تھا لیکن لیث کو ستایا نہیں گیا۔ ڈاکو اس کو کھانا پانی بھی خوب پہنچا رہے تھے لیکن خنسا کا کچھ پتا نہیں تھا۔

دو ماہ کچھ دن بعد اسے ڈاکوؤں کے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ سردار کو دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ یہ اس کا اپنا بھائی یعقوب تھا جسے کچھ عرصے پہلے ڈاکو گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ اس کے بھائی یعقوب نے کہا۔ ”میں یہاں نہیں تھا لیکن جب مجھے میرے ساتھیوں نے بتایا کہ گرفتار ہونے والوں میں ایک میرا ہم شکل بھی ہے تو مجھے تیرا خیال آ گیا۔“

لیث نے افسوس سے پوچھا۔ ”لیکن بھائی آپ تو گرفتار ہو گئے تھے، ڈاکوؤں کے ہاتھوں، پھر اسے پیشہ کب سے بنا لیا؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ڈاکوؤں کا سردار مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آیا تھا۔ اس نے مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور مجھ پر اتنے احسان کیے کہ میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا۔“

لیث نے کہا۔ ”بھائی آپ گھر بھی نہیں آئے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”سردار نے بہت دنوں تک تو مجھ پر اعتبار ہی نہیں کیا۔ جب اعتماد قائم ہوا تو سردار چل بسا اور میں اس کا جانشین قرار پایا۔ اس کے بعد میں اہواز گیا تو پتا چلا کہ تو اہواز سے بغداد چلا گیا ہے لیکن بغداد جاتے ہوئے میں ڈرتا تھا۔“

لیث نے بھائی کو اپنی روداد سنائی اور اس پر جو کچھ بیتی تھی پُردرد لہجے میں بیان کر دیا۔ یعقوب نے پوچھا۔ ”پھر اب کیا ارادے ہیں؟ اب تو کہاں جانا چاہتا ہے؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”اب میں بغداد ہی جاؤں گا، ہو سکے تو آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔ میں قاضی لبیب بغدی کو وسیلہ بنا کر آپ کی تمام خطائیں معاف کروا سکتا ہوں۔“

یعقوب نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”نہیں، اب میں تیرے ساتھ نہیں جا سکتا کیونکہ کسی کا بھی وسیلہ مجھے معافی نہیں دلا سکتا اور پھر اب یہ کہ میں اس زندگی کا عادی بھی ہو گیا ہوں۔“

لیث نے کہا۔ ”آپ اپنا حصہ لے سکتے ہیں کیونکہ میں بددیانت نہیں ہوں۔“

یعقوب نے ہنس کر جواب دیا۔ ”لیث! میں اپنا حصہ بھی تجھی کو بخشتا ہوں۔“

اس کے بعد یعقوب نے بھائی کی وہ خاطر مدارت کی کہ لیث کو مزہ آ گیا لیکن خنسا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ خنسا کی بابت کچھ پوچھتے ہوئے تکلف سے کام لے رہا تھا۔

آخر پندرہ سولہ دن خاطر مدارت میں گزر گئے۔ اب یعقوب کو کسی مہم پر روانہ ہونا تھا اس لیے اس نے لیث سے کہا۔ ”لیث! اگر تو رہنا چاہے تو شوق سے رہ، مجھے ایک مہم پر روانہ ہونا ہے۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”نہیں میں نہیں رکوں گا۔ میں جانا چاہتا ہوں۔“

یعقوب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ لیث کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بغداد پہنچا دیا جائے۔ لیث نے رک رک کر کہا۔ ”لیکن میری کنیز کہاں ہے اسے تو میرے حوالے کیا جائے۔“

یعقوب نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ”یہ خنسا کون ہے، یہ کہاں ہے؟“

ساتھیوں نے لاعلمی ظاہر کی، لیث کا دم گھٹنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا، بولا۔ ”بھائی خنسا میری کنیز کا نام ہے اور اس کو تیرے ساتھی زبردستی مجھ سے چھین کر لے گئے تھے۔“





ایک ادھیڑ عمر ساتھی یعقوب کے قریب گیا اور عرض کیا۔ ”سردار! اب اس کو آپ سے چھپانا فضول ہے۔ تیرے بھائی کی کنیز داؤد کو پسند آ گئی تھی۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے اور آج کل وہ دمشق کے آس پاس قزاقی میں مشغول ہے۔ اندازے کے مطابق وہ پانچ چھ ماہ بعد واپس آئے گا۔“

لیث کا دل بیٹھا جا رہا تھا، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بھائی! اگر خنسا نہ ملی تو میں بغداد نہیں جاؤں گا اور یہیں رہوں گا۔“

یعقوب نے اسے تسلی دی، کہا۔ ”لیث! تو زیادہ فکر نہ کر۔ داؤد میرا نائب ہے۔ خنسا جائے گی کہیں نہیں، تجھے واپس ضرور ملے گی لیکن پانچ چھ ماہ بعد تو بغداد چلا جا۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہ جیسے ہی ملے گی، میں اپنے آدمیوں کے ذریعے بغداد میں قاضی لبیب کے گھر بھیج دوں گا۔“

یعقوب کے آدمی اس کو بغداد کے باب الکوفہ کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ سواری کے لیے ایک گھوڑا اور خرچ کے لیے سو دینار بھی دے دیے گئے۔ بغداد میں داخل ہوتے ہی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دلکی چال سے قاضی کے قصر کی طرف بھگائے لیے جا رہا تھا۔ شام سے ذرا پہلے یہ قاضی کے قصر کے دروازے کے سامنے پہنچا اور دربانوں سے قاضی کو مطلع کروایا کہ ”کہہ دو لیث آ گیا ہے۔“

کچھ دیر بعد اندر سے جواب آیا۔ ”قاضی اندر نہیں ہے وہ عضدالدولہ کے پاس گیا ہوا ہے۔“

لیث کو دربانوں کی لاتعلقی گراں گزر رہی تھی۔ اس نے ایک دربان سے کہا۔ ”بھائی! تو تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے پھر یہ تو باتیں کس قسم کی کر رہا ہے؟“

دربان نے لیث کو بڑے غور سے دیکھا اور ہتک آمیز لہجے میں بولا۔ ”تو کون ہے، میں تجھے نہیں جانتا؟“

لیث دربان کی باتوں سے واقعی پاگل ہونے لگا۔

اس وقت قاضی گھوڑے پر سوار اپنے چند مصاحبین کے ساتھ اور دوسرے آدمیوں میں گھرا ہوا اپنے قصر کے دروازے پر آیا۔ دربان نے پھاٹک کھول دیا۔ لیث، قاضی کی طرف بڑھا اور بڑی گرم جوشی سے قاضی کو سلام کیا۔ قاضی نے اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر قصر میں داخل ہو گیا۔ قاضی کے پیچھے لیث بھی دوڑا اور قصر میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن دربانوں نے اسے دھکیل کر قصر کے باہر کر دیا اور پھاٹک کو اندر سے بند کر دیا۔

لیث نے زور زور سے پھاٹک کو تھپتھپایا اور چیخ چیخ کر کہا۔ ”قاضی محترم! میں ممدون مغیث کا بیٹا لیث حج کر کے واپس آ گیا ہوں، مجھے اندر آنے دے۔“

کچھ دیر بعد دربان نے پھاٹک کھولا، لیث فوراً اندر داخل ہو گیا۔ دربان نے اسے گدی سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”یہ تو بغیر اجازت اندر کیسے گھسا چلا آ رہا ہے، پاگل دیوانہ کہیں کا۔“

لیث نے عاجزی سے کہا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں، مجھے دیوانہ نہ کہو۔ میرا نام لیث ہے، مرحوم ممدون مغیث کا بیٹا۔ میں اپنی ہونے والی بیوی عنان اور اپنا سارا سامان مال و زر بطور امانت قاضی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ اب میں ان چیزوں کو واپس لینے آیا ہوں۔“

دربان نے اس کو دوبارہ نکال باہر کیا، بولا۔ ”تو سیدھی طرح نہیں مانے گا۔ بھاگ جا ورنہ میں مار مار کر نیم جان کر دوں گا۔“

لیث نے پوری قوت سے چیخنا شروع کر دیا۔ ”تو مجھے مار مار کر نیم جان یا جان ہی سے مار دے، میں قاضی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ میری عنان، میرا مال و زر، ہائے میری امانتیں۔“

اس کی چیخ و پکار سن کر لوگ جمع ہونے لگے۔ دربان نے اسے اندر کر لیا اور قاضی کے پاس ایک دوسرا آدمی بھیج دیا کہ ایک پاگل آپ سے ملے بغیر واپس جانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے اس کو باریابی کی اجازت دی جائے۔

کچھ دیر بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا۔ ”قاضی نے اس کو اسی وقت یاد فرمایا ہے۔ چل، میرے ساتھ آ۔“

لیث کی جان میں جان آئی اور اس کی امیدیں سرسبز و شاداب ہو گئیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا قاضی کے پاس چل پڑا۔

اس وقت قاضی چند آدمیوں کو ان کی امانتیں واپس کر رہا تھا۔ لیث بے اختیار قاضی کی طرف بڑھا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنا چاہا لیکن قاضی نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا اور لیث سے کہا۔ ”اپنی جگہ بیٹھ جا، تجھ سے ابھی بات کرتا ہوں۔“

قاضی کے لہجے اور انداز میں جو مغائرت پائی جاتی تھی اس نے لیث کو نیم جاں کر دیا۔ قاضی لوگوں کو ان کی امانتیں دے دے کر رخصت کرتا رہا، صرف دو مصاحب رہ گئے اور قاضی بھی اطمینان سے بیٹھ گیا تو لیث نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

”ہاں تو قاضی محترم! میں حج کر کے واپس آ گیا ہوں۔ اس لیے بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میری امانتیں بھی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

واپس فرمادیں۔"

قاضی اپنے مصاحبین سے باتیں کررہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "حکما نے پاگل پنے کی جو قسمیں بتائی ہیں، وہ بڑی حیرت انگیز ہیں اور ان میں مالیخولیا کا مریض سب سے زیادہ عجیب ہوتا ہے......"

لیث نے بڑے بے صبرے پن سے کہا۔ "قاضی محترم! مجھے میری امانتیں واپس فرمادیں، یہ آپ مغائرت کیوں برت رہے ہیں آخر؟"

قاضی نے لیث کو سرسری نظر سے دیکھا اور اپنی بات مکمل کرنے لگا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ مالیخولیا کا مرض شدت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔"

لیث نے غصے میں کہا۔ "قاضی! میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تو میری بات کیوں نہیں سنتا، کیا میں پاگل ہوں؟ میری عنان کہاں ہے؟ میرا مال وزر، میری امانتیں واپس کردے ورنہ میں سہم کر اپنی جان دے دوں گا۔"

قاضی مالیخولیا پر بولے جارہا تھا۔ "اگر مالیخولیا کا مریض اپنے کو تندرست وتوانا کرلے تو یہ مرض آپ ہی آپ رفع ہوجاتا ہے۔"

قاضی نے تالی بجا کر ایک خدمت گار کو طلب کیا جب وہ آگیا تو حکم دیا۔ "اس پاگل نوجوان کو دارالمجانین میں داخل کردیا جائے۔"

لیث نے روتے چلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں پاگل نہیں ہوں۔ مجھے دارالمجانین نہ بھیج۔ میری امانتیں واپس کردے، خدا کے لیے مجھے نہ ستا۔"

قاضی نے مصاحبین کی طرف دیکھ کر لیث کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تو مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے؟"

لیث نے جواب دیا۔ "میری عنان مجھے واپس کردے اور ساتھ ہی میرا مال وزر بھی۔"

قاضی نے اس کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھ میرا دماغ نہ خراب کر۔ تو پاگل ہے اور میں پاگلوں سے زیادہ باتیں نہیں کرتا۔"

لیث نے بے چینی سے کہا۔ "میں اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا بشرطیکہ میری عنان اور میرے مال وزر کو واپس کردیا جائے۔"

قاضی نے اپنے مصاحبین سے پوچھا۔ "صاحبان! میری امانت اور دیانت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

ایک مصاحب نے جواب دیا۔ "آپ کی امانت اور دیانت کا تو عضدالدولہ تک معترف ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "اگر آپ کی امانت اور دیانت بھی مشتبہ ٹھہرے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سچائی اور شرافت تو اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔"

لیث زاروقطار رونے لگا۔ "لوگو! میں لٹ گیا، میں تباہ ہوگیا۔ خنسا کو ڈاکو لے گئے اور جو کچھ بچا رکھا تھا اس کو قاضی ہڑپ کرجانے کی فکر میں ہے۔"

قاضی نے کہا۔ "اچھا تو تو یہ کر کہ اس وقت تو یہاں سے چلا جا۔ کل میں شاہی طبیب کو بلوا کر تیرا معائنہ کروادوں گا، اس کے بعد کچھ اور کروں گا۔" قاضی اکتا گیا اور خدمت گار کو حکم دیا کہ اس کو دارالضیافت میں ٹھہرا دیا جائے۔

خدمت گار لیث کو لے کر جو چلے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ لیث کو دارالمجانین بھیجا جاسکتا تھا لیکن ابھی نہیں کیونکہ قاضی خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ بات کو زیادہ طول دیا جائے۔

لیث کو مہمان سرا میں ٹھہرا دیا گیا لیکن یہ مہمان سرا نہیں تھی، ایک طرح کا تہ خانہ تھا۔

☆☆☆

کئی دن بعد قاضی نے لیث کو طلب کیا اور پوچھا۔ "اب تیرا کیا حال ہے؟ اگر تو اپنے گھر جانا چاہے تو چلا جا، میں اپنے آدمی تیرے ساتھ کردوں گا۔"

لیث نے کہا۔ "لیکن میں جاؤں کہاں؟ میرا گھر کہاں ہے؟"

قاضی نے افسوس کیا۔ "اللہ اللہ، مرض کی شدت کا یہ عالم ہے کہ تجھے اپنا گھر بھی یاد نہیں پھر تو تجھے بیمارستان (اسپتال) بھیجنا پڑے گا۔"

لیث نے بھی سختی سے کہا۔ "قاضی! کان کھول کر سن لے کہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ مجھے یوں ہی چلتا کردے اور میں چلا جاؤں۔ میں عنان اور اپنے مال وزر کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

قاضی غصے میں اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اپنے خدمت گار کو بلا کر حکم دیا۔ "دیکھ یہ ایک مالیخولیا کا مریض ہے، میں اس کو بیمارستان میں داخل کرنا چاہتا ہوں اس لیے تو آج بیمارستان کے نگران کو بلا لا۔"

لیث ایک دم بھڑک اٹھا، غصے میں کہا۔ "تو بہت بے شرم اور بددیانت انسان ہے۔ خنسا نے مجھے بار بار سمجھایا کہ میں تجھ پر اعتماد نہ کروں لیکن میں نے اس کو ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس زمانے میں قاضی جیسا ایمان دار دوسرا نہیں ملے گا لیکن خنسا نے میری اس بات سے کبھی بھی اتفاق نہیں کیا۔"



قاضی نے غصے میں دو طمانچے رسید کردیے۔ لیث بھی جوابی حملے میں قاضی کے جھانپڑ رسید کرسکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس طرح قاضی کے خدمت گار مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیں گے پھر بھی اکڑ کر بولا۔ "قاضی! تو کچھ بھی کرلے لیکن اپنے دل سے یہ خیال نکال دے کہ تو میری امانتیں ہضم کرلے گا۔"

قاضی نے دوسری طرف جا کر خدمت گاروں کو حکم دیا کہ "مالیخولیا کے اس مریض کو قید کردیا جائے۔"

قاضی نے اس دن بیمارستان کے نگراں کو بلا کر لیث کو اس کے حوالے کردیا۔ لیث نے نہایت ٹھنڈے دل سے سوچا کہ اگر وہ قاضی کی ہدایت پر ایک بار بھی بیمارستان میں داخل ہوگیا اور اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے جکڑ دیے گئے تو پھر زندگی بھر رہائی ناممکن ہوجائے گی۔ لیث نے قاضی سے کہا۔ "قاضی! میں آخری بار تخلیے میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

قاضی منہ بنا کر تخلیے میں لے گیا اور ساتھ ہی کہتا گیا۔ "چل تخلیے میں کر باتیں۔ ورنہ مجھے تجھ سے ڈر ہی لگتا ہے۔"

لیث نے عاجزی سے کہا۔ "میں بیمارستان نہیں جاؤں گا اور اپنے دعوے سے درگزرا۔ میں تجھ سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کروں گا اور بغداد چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

قاضی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ بولا۔ "تو مطالبہ کس چیز کا کرسکتا ہے۔ میں تجھے اسی شرط پر چھوڑ سکتا ہوں کہ تو بیمارستان کے نگران اور میرے خدمت گاروں کے روبرو یہ اعلان کردے کہ میں مالیخولیا کا مریض ہوں اور میں نے لالچ میں آکر جھوٹا دعویٰ کردیا تھا۔ اب میں اپنے دعوے سے دست بردار ہوں اس لیے مجھے معاف کردیا جائے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ ابھی اسی وقت اعلان کردوں گا اور میں اسی وقت یہاں سے چلا بھی جاؤں گا۔"

قاضی نے ہنس کر کہا۔ "اب تو ہوش وحواس کی باتیں کررہا ہے ورنہ اگر تو ایک بار بیمارستان میں داخل ہوجاتا تو پھر مر کر ہی نکلتا۔ اب تو چلا جا اور خبردار جو بغداد میں نظر آیا۔"

لیث نے خوشامدانہ کہا۔ "لیکن میں تو تقریباً تہی دست ہوں۔ خدا کے لیے میری کچھ مدد کیجیے تاکہ میں بغداد سے کہیں اور چلا جاؤں۔"

قاضی نے تلخی سے جواب دیا۔ "دیکھ پھر تو نے مجھے تنگ کیا۔ اب تو چلا جا یہاں سے ورنہ میں دوسرا قدم اٹھاؤں گا۔"

لیث بادل ناخواستہ قصر سے نکلا اور باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کہاں جائے۔ یہاں سے اپنا کاروبار یاد آیا۔ وہ دکانوں پر گیا تو پتا چلا۔ ان دکانوں کو حمدون تاجر کی بیٹی نے ختم کردیا۔ اب لیث کے سامنے رات گزارنے کا ایک ہی گھر تھا۔ وہ رات کو مسجد میں چلا گیا اور سجدے میں گر کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ یہیں اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنے بھائی یعقوب کو تلاش کرنے کے بجائے مدینہ منورہ چلا جائے گا اور وہیں بقیہ زندگی گزار دے گا۔

فجر کی نماز کے بعد ایک طرف سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ لیث نے ایک کونے میں اپنے غلام کو دیکھا جو چادر اوڑھے بیٹھا کھانس رہا تھا۔ یہ اٹھ کر اپنے غلام کے پاس گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ "تو یہاں کیا کررہا ہے؟"

غلام نے چونک کر لیث کو دیکھا اور بے اختیار چمٹ گیا، پوچھا۔ "میرے آقا! تو کب آیا؟"

لیث نے جواب دیا۔ "مجھے تو آئے ہوئے کئی دن ہوگئے۔"

غلام نے قاضی کی شکایت کی۔ "لیکن قاضی نے مجھے تو نہیں بتایا کہ تو آگیا ہے بلکہ اس نے تو میرے ساتھ عجیب سا رویہ اختیار کررکھا ہے۔ میں اس سے جب بھی تیری بابت پوچھتا ہوں تو وہ کچھ اس طرح جواب دیتا ہے جیسے آپ کو جانتا ہی نہیں۔ مجھے تو اس کی نیت پر شبہ ہے۔"

لیث نے جواب دیا۔ "تیرا شبہ درست ہے، اس نے تو مجھے پہچاننے سے انکار کردیا ہے۔"

اس کے بعد یہ پردرد داستان بھی سنادی۔ غلام نے ایک سرد آہ بھری۔ "آہ میرے آقا! تجھ پر تو کئی قیامتیں گزر چکی ہیں۔ خدا نے تجھے برداشت کی بڑی ہمت دی ہے ورنہ دوسرا تو مرجاتا۔"

لیث نے کہا۔ "اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں اور وہاں روضۂ اقدس پر بقیہ زندگی گزار دوں۔"

غلام نے کہا۔ "میرے آقا! ہمت نہ ہار اور قاضی سے اپنی امانتیں واپس لینے کی کوشش کر۔"

لیث نے مایوسی سے کہا۔ "نہیں اب میں اس خبیث کے پاس نہیں جاؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے بیمارستان میں داخل کرکے میری زندگی برباد کردے گا۔"

غلام نے کہا۔ "لیکن میرے آقا! تیرے ساتھ میں بھی چلوں گا اور جب تک زندہ ہوں تیری خدمت کروں گا۔"

لیث نے ایک بار پھر غلام کو چمٹا لیا اور سسکیاں لے کر رونے لگا۔ غلام بھی رو رہا تھا۔

☆☆☆



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیث کے لیے خنسا کا مسئلہ بھی بڑا تشویش ناک تھا۔ وہ سوچتا کہ اگر یعقوب نے خنسا کو بغداد روانہ کیا تو قاضی بدیانتی ضرور کرے گا اور اس کو بھی ہضم کر جائے گا۔ اس لیے اس کا بغداد میں چوری چھپے رہنا بہت ضروری تھا۔ غلام نے بغداد کے جنوبی حصے میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کر رکھا تھا۔ وہ لیث کو بھی لے گیا۔ اب غلام کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ قاضی کے قصر کے آس پاس چکر لگائے اور اس ٹوہ میں رہے کہ کہیں قاضی کے پاس خنسا آئی تو نہیں۔

قاضی بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا وہ لیث کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اپنے کئی جاسوس اسی کام پر لگا دیے کہ وہ لیث کی بغداد میں موجودگی کا پتا چلائیں اور کئی آدمی عضدالدولہ کے آس پاس لگا دیے گئے تھے کہ لیث وہاں نہ پہنچے اور قاضی کا یہ انتظام اتنا مضبوط اور جاندار تھا کہ اس کے آدمیوں نے لیث کی قیام گاہ کا پتا چلا لیا۔

قاضی اس کے پاس خود پہنچ گیا۔ لیث قاضی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ قاضی نے سختی سے پوچھا۔ ”مالیخولیا کے مریض، بیمارستان کے لوگ تجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اور تو یہاں چھپا ہوا ہے۔“

لیث نے جواب دیا۔ ”قاضی! مجھے زیادہ نہ ستا میں یہاں خنسا کا انتظار کر رہا ہوں وہ جیسے ہی آئے گی میں بغداد سے چلا جاؤں گا۔“

ایک طرف سے غلام بھی کھانستا ہوا آ گیا۔ اس نے قاضی سے کہا۔ ”کیا بات ہے؟“

قاضی نے لیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ یہ بیمارستان سے بھاگا ہوا مالیخولیا کا خطرناک مریض ہے اور بیمارستان کے لوگ اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں اب میں اس کو بیمارستان میں داخل کروا دینا چاہتا ہوں۔“

غلام نے کہا۔ ”قاضی! میرے آقا کو اتنا نہ ستا۔“

قاضی نے غلام کو گھورا۔ ”اس مریض کو تیری سرپرستی حاصل ہے۔ بیمارستان کے خطرناک مریض کو تو نے اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ تو بھی گرفتار ہو گا تو بھی مجرم ہے۔“

لیث نے غلام سے کہا۔ ”دیکھ تو اس معاملے میں نہ پڑ مجھے بغداد سے چلا جانے دے۔“

قاضی نے کہا۔ ”اوہ ہو... اب تو تیرے ساتھ یہ بھی جائے گا بغداد سے تو تنہا نہیں جائے گا۔“

لیث اور غلام دونوں قاضی کی خوشامدیں کرتے رہے لیکن قاضی نہیں پسیجا اور آخرکار یہ طے پایا کہ دونوں فوراً بغداد چھوڑ کر اصفہان چلے جائیں گے۔

چنانچہ ان دونوں کو اصفہان روانہ کر دیا گیا۔ راستے میں ایک جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا تو ہر آدمی اپنے اپنے کام میں لگ گیا لیکن لیث اداس اداس ایک ٹیلے پر بیٹھ کر ماضی میں گم ہو گیا۔ قافلے کا ایک مسافر اس کے پاس گیا اور پوچھا۔ ”دوست! تو اداس کیوں ہے؟ کیا تیرا کوئی عزیز فوت ہو گیا؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”بھائی میرے تو ایک عزیز کی بات کرتا ہے یہاں تو اپنے سبھی مر گئے اور مال و دولت بھی ضائع ہو گیا۔“

رحم دل مسافر اسے اپنے خیمے میں لے گیا اور اسے بڑی تسلی دی اور اس کی پوری روداد سنی۔ اس کو لیث پر رحم آ گیا، بولا۔ ”تو اب کیا ارادے ہیں؟“

لیث نے جواب دیا۔ ”ان حالات میں، میں کیا اور میرے ارادے کیا لیکن جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ ظلم و زیادتی کی سرزمین ہے تو میں اس سرزمین کو چھوڑ کر دنیا کے کسی ایسے ملک میں چلا جانا چاہتا ہوں، جہاں عدل ہو، انصاف ہو اور حکمران اپنی رعایا کے معاملات سے باخبر ہوں۔“

مسافر نے جواب دیا۔ ”نوجوان! میں ایک سیاح ہوں جو تجارت بھی کرتا ہے اور سیاحت بھی۔ اصفہان میں میرا گھر ہے، میں اصفہان میں دو دن رہ کر سمرقند چلا جاؤں گا۔ وہاں سے کتنے دن بعد واپسی ہو گی کچھ پتا نہیں لیکن یہ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ سمرقند سے واپس آنے کے بعد میں تیرے لیے کسی ایک ملک کی نشاندہی ضرور کر سکوں گا جہاں عدل و انصاف ہو گا اور وہاں کا حکمران اپنی رعایا کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہو گا۔“

لیث نے کہا۔ ”لیکن بھائی میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ میں اصفہان میں کہاں رہوں گا اور کہاں سے کھاؤں پیوں گا یہ بھی تو ایک مسئلہ ہے۔“

مسافر نے جواب دیا۔ ”میں اس کی ذمے داری بھی قبول کر لوں گا۔ تجھے کسی کے ساتھ کام پر بھی لگا دوں گا، قیام کے لیے میرا اپنا مکان ہے۔ دو وقت کا کھانا بھی میرے گھر سے مل جائے گا تو جو کچھ کمائے گا اپنے مستقبل کے لیے جمع کرتا رہے گا۔“

لیث حیران تھا کہ دنیا میں قاضی جیسے لوگ بھی ہیں اور اس مسافر جیسے بھی۔ اس مسافر نے اس کے ذہن کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

اصفہان پہنچنے پر مسافر نے لیث کو چند دن اپنے گھر میں رکھ کر ایک تجارتی قافلے کے ساتھ سمرقند روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

شاید قاضی کا نصیب زوروں پر تھا کیونکہ ان دونوں کے



اصفہان جاتے ہی عضدالدولہ مصیبتوں کا شکار ہو گیا۔ قاضی عضدالدولہ کا بہت چہیتا تھا۔ عضدالدولہ کے زوال کا مطلب تھا قاضی کا زوال، چنانچہ لیث اور غلام کے چلے جانے کے بعد بھی وہ سکون سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ عضدالدولہ کا آدمی آ گیا۔

”آپ کو یاد فرمایا گیا ہے۔“

قاضی اسی وقت عضدالدولہ کے پاس روانہ ہو گیا۔

بغداد میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا کہ عضدالدولہ کا اپنے چچا زاد بھائی عزالدولہ سے مقابلے کا معلوم نہیں کیا نتیجہ نکلے۔ عضدالدولہ کا چچا زاد بھائی خلیفہ کی نیابت حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ عضدالدولہ کو شکست دے۔ وہ بہت بڑے لشکر کے ساتھ عضدالدولہ کے خلاف صف آرا ہونے والا تھا۔ عضدالدولہ ذہنی طور پر بہت پریشان تھا۔ اس نے قاضی کو ایک خاص مقصد کے لیے طلب کیا تھا۔

دجلہ کے کنارے عظیم الشان محل میں قاضی کو ایک ایسے حصے میں پہنچایا گیا جہاں اس سے پہلے اس کا گزر نہیں ہوا تھا۔ محل کے اس حصے میں محل سے الگ تھلگ ایک اور چھوٹا سا محل بنا ہوا تھا... عضدالدولہ اس چھوٹے سے محل میں خوف زدہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے قاضی کو نہایت احترام سے استقبال کیا۔ قاضی نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔

عضدالدولہ نے قاضی کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور کہا۔ ”قاضی محترم! افسوس کہ اس دنیا میں ثبات کسی کو شے کو بھی نہیں۔“

قاضی نے عضدالدولہ کے چہرے پر غموں کی ایسی پرچھائیاں کبھی پہلے نہ دیکھی تھیں، پوچھا۔ ”نصیب دشمناں خیریت تو ہے؟ آج میں آپ کو بہت پریشان دیکھ رہا ہوں۔“

عضدالدولہ نے جواب دیا۔ ”قاضی محترم! میرے چچا کا بیٹا عزالدولہ اگر مقابلے میں کامیاب ہوا تو میرا معلوم نہیں کیا انجام ہو۔ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں اپنے بچوں کی فکر ہے۔“

قاضی نے عرض کیا۔ ”میں سلطان کی خدمت کو حاضر ہوں کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ مجھے بغداد میں جو کچھ بھی حاصل ہے سلطان ہی کی بدولت حاصل ہے اگر آپ ہی نہ ہوں گے تو میں کہاں جاؤں گا۔“

عضدالدولہ نے قاضی سے بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور آخر میں اس نے قاضی سے درخواست کی کہ اگر میں میدان جنگ میں کام آ جاؤں تو میری آپ سے درخواست ہے کہ اپنے گھر میں میرے بچوں کو چھپا لیجیے گا کیونکہ میرے بعد ان کا حشر برا کر دیا جائے گا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں ہر وقت سلطان کی خدمت کو حاضر ہوں۔“

قاضی واپس آ گیا، اس دن رات کو چند آدمی خنسا کو لے کر آ گئے انہوں نے لیث کو پوچھا تو قاضی نے کہہ دیا کہ ”ہاں وہ یہیں رہتا ہے اور کچھ دنوں کے لیے اہواز گیا ہوا ہے۔“

خنسا، قاضی کے حوالے کر دی گئی۔ قاضی بہت خوش ہوا لیکن اس نے خنسا کو لیث کی بابت اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا کہ وہ چند دنوں کے لیے اہواز گیا ہے اور عنان اس کے ساتھ ہی ہے۔ خنسا، قاضی کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئی۔ عنان قصر کے اندر ہی موجود تھی اس کو خنسا سے دور رکھا گیا تھا۔ اب دونوں کو ایک ہی قصر میں رکھنا دشوار ہو گیا تھا۔

چنانچہ ایک دن اس نے عنان کو سمجھایا۔ ”عنان بیٹی! لیث ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں بہت پریشان ہوں میرا خیال ہے کہ اس کی واپسی بہت دشوار ہے۔“

عنان نے کہا۔ ”لیکن اس کا سارا مال و زر تو آپ ہی کے پاس رکھا ہوا ہے۔“

قاضی نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس تو اس بات کا ہے پچھلے ہفتے اس کا غلام یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ لیث نے اپنی امانت واپس منگوائی ہے کیونکہ اس نے خنسا کو آزاد کر کے شادی کر لی ہے اور اب وہ دونوں مدینے میں ہی رہیں گے۔“

عنان نے کہا۔ ”لیکن اس میں میرا حصہ بھی تھا۔“

قاضی نے عنان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ”عنان تو میری بیٹی ہے، میں ہوں تو تجھے مال و زر کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور پھر اگر تو پسند کرے تو میں تجھے ایک ایسے شخص سے وابستہ کر دوں جو امیرالمومنین کے بعد سب سے بڑا آدمی ہے۔ میں تجھے اس کے حوالے اپنی بیٹی کی طرح کروں گا۔“

عنان نے جواب دیا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی، امیرالمومنین کے بعد سب سے بڑا آدمی کون ہے؟“

قاضی نے کہا۔ ”عضدالدولہ جو میرا محسن بھی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو بہت خوش رہے گی اور یوں بھی تیری کہیں نہ کہیں شادی تو کرنا ہی پڑے گی۔“

عنان دکھوں اور مصیبتوں سے عاجز آ چکی تھی اور لیث کی بے وفائی نے اس کو بالکل مایوس کر دیا تھا جواب دیا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

قاضی اپنے ہر ارادے اور ہر منصوبے میں کامیاب جا رہا تھا۔ اس کا دوسرا شکار خنسا تھی، خنسا کو وہ خود رکھنا چاہتا تھا لیکن جب تک قصر میں عنان بھی موجود تھی خنسا کو چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ اب اس کو عضدالدولہ سے دوسری ملاقات کا انتظار تھا۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

بغداد کے باہر عضدالدولہ کا چچا زاد بھائی آچکا تھا اور اس نے عضدالدولہ کو پیغام بھیجا تھا کہ بغداد کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ خلیفہ میں اتنا دم نہیں تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی مرضی کی پروا ہوتی۔ عضدالدولہ گفتگو کو طول دے رہا تھا۔ اسی روز اس نے قاضی کو پھر طلب کر لیا۔ اس بار قاضی تنہا نہیں گیا اپنے ساتھ عنان کو بھی لے گیا۔ عضدالدولہ نے محل کے اس حصے میں ملاقات کی اور عنان کو دیکھ کر پوچھا۔ ”قاضی محترم! یہ لڑکی کون ہے اور آپ کے ساتھ کیوں آئی ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بندہ پرور، یہ میری بھتیجی ہے آپ کی خدمت کے لیے لایا ہوں، قبول کیجیے۔“ پھر عنان سے کہا۔ ”عنان بیٹی! بادشاہ کو سلام کر۔ میں نے تجھ سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں تجھے اس شخص سے ملواؤں گا جو امیرالمومنین کے بعد سب سے بڑا آدمی ہے۔“

عضدالدولہ مسکرایا، بولا۔ ”امیرالمومنین کے بعد کیا معنی؟ امیرالمومنین کی مرضی کے خلاف میں جو چاہوں کروں وہ مجھے منع نہیں کر سکتے لیکن امیرالمومنین میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اب قاضی محترم! آپ ہی فیصلہ کریں کہ بڑا میں ہوں یا امیرالمومنین؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میرے محسن! بڑے تو آپ ہیں لیکن آپ دونوں میں دنیا کی نظروں میں جو فرق پایا جاتا ہے میں نے اس کا اظہار کیا تھا ورنہ اس سے آپ کا مرتبہ گھٹانا مقصود نہیں تھا۔“

عضدالدولہ نے عنان کی طرف دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا۔

عضدالدولہ نے عنان کو اسی وقت حرم میں بھیج دیا اور اس کے بعد دروازے اندر سے بند کر لیے اور کہا۔ ”قاضی محترم! میں کچھ دنوں سے اپنے چچا کے بیٹے سے خط کتابت کر رہا ہوں اور میری کوشش تھی کہ خون خرابہ نہ ہو لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معاملات خط کتابت سے نہیں میدان جنگ میں تلوار ہی سے طے پائیں گے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا نتیجہ میرے حق میں ہی نکلے۔“

قاضی نے عرض کیا۔ ”لیکن فتح تو حق ہی کی ہوتی ہے اور زمانہ جانتا ہے کہ آپ حق پر ہیں۔“

عضدالدولہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”قاضی محترم! مجھے اپنے لڑکوں کی ذرا بھی فکر نہیں، فکر ہے تو لڑکیوں کی۔ لڑکے پرندوں کے مثل ہوتے ہیں کہ یہ ایک ملک سے دوسرے ملک پرواز کر سکتے ہیں۔ مصیبت تو لڑکیوں کی ہے۔ جب سے آپ نے اپنے نالائق بیٹے کو حق و انصاف پر قربان کیا ہے میرے دل میں آپ کی عزت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔“

قاضی نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”یہ بھی میرے محسن کی عزت افزائی اور ذرہ نوازی ہے ورنہ دوسرے حکمران باتوں کی قدر کہاں کرتے ہیں؟“

عضدالدولہ نے کہا۔ ”جیسا کہ میں اپنی پہلی ملاقات میں عرض کر چکا ہوں کہ میں چند دنوں کے اندر ہی اپنی بیٹیاں آپ کی تحویل میں دے دوں گا آپ انہیں اپنی بیٹیوں کی طرح رکھیں گے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، وہ میری محسن زادیاں ہیں۔“

عضدالدولہ نے کہا۔ ”میں آپ کو دو سو دینار اسی وقت دوں گا۔ اس سے آپ اپنے قصر میں ایک خفیہ تہ خانہ تعمیر کروائیں۔“

قاضی، عضدالدولہ کی صورت دیکھنا چاہتا تھا لیکن نظر ملانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ آہستہ سے کہا۔ ”مزید ارشاد۔“

عضدالدولہ نے کہا۔ ”اس تہ خانے میں اپنی بیٹیوں کی امانتیں رکھواؤں گا۔ دینار، ہیرے جواہرات اور دوسری قیمتی چیزیں ان میں میری بیٹیوں کا جہیز بھی شامل ہوگا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں ہر طرح حاضر ہوں۔ تہ خانے کی تعمیر کا کام آج ہی شروع کروا دوں گا۔“

عضدالدولہ نے مزید کہا۔ ”اگر میں میدان جنگ میں مارا جاؤں یا گرفتار ہو جاؤں تو آپ میری بیٹیوں کا بطور خاص خیال رکھیں گے اور ان کی مناسب جگہوں پر شادیاں کروا کے زر و مال مساوی ان میں تقسیم کر دیں گے۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”جیسا آپ فرما رہے ہیں اس پر اسی طرح عمل ہوگا۔“

پھر عضدالدولہ کا دل بھر آیا، آواز بھرا گئی اور رقت زدہ لہجے میں کہا۔ ”قاضی محترم! آپ اس کام کی اہمیت اور قدر و قیمت کو تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میری بیٹیاں بہت ناز و نعم سے پلی ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں آپ کے پاس جو کچھ رکھواؤں گا اس کی کوئی رسید بھی نہیں لوں گا اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس راز سے ہم دونوں کے علاوہ بس علام الغیوب ہی واقف ہوگا اور کوئی نہیں۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔“

عضدالدولہ نے کہا۔ ”اس لیے یہ آپ کے ایمان اور انصاف کی آزمائش کا سب سے نازک اور اہم واقعہ ہوگا۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔“



بادشاہ نے کہا۔ ”اگر آپ نے اس میں کسی قسم کی کوتاہی برتی تو قیامت کے دن آپ کا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ اور وہاں کی پکڑ بڑی خطرناک ہوگی۔“

قاضی نے جواب دیا۔ ”بے شک، بے شک۔ خدا اس سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔“

عضدالدولہ نے اسی وقت دو سو دینار قاضی کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ”یہ تہ خانے کی تعمیر جلد از جلد ہو جانی چاہیے کیونکہ میں اتنے دنوں اپنے چچا کے بیٹے کو خط کتابت میں الجھائے رکھوں گا۔“

قاضی نے پوچھا۔ ”اور امانتوں اور شہزادیوں کی منتقلی کب تک عمل میں آئے گی؟“

عضدالدولہ نے جواب دیا۔ ”تہ خانے کے مکمل ہوتے ہی دونوں چیزیں خاموشی سے پہنچا دی جائیں گی لیکن قاضی محترم! میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ ان باتوں کا علم کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے۔“

قاضی نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں میرے محسن۔“

عضدالدولہ نے کہا۔ ”تب پھر آپ اسی وقت تشریف لے جائیں اور تہ خانے کی تعمیر کا کام شروع کروا دیں۔“

قاضی کا خوشی سے عجب حال ہو رہا تھا۔ قصر سے نکل کر وہ پاؤں کہیں رکھتا تھا اور وہ پڑتے کہیں تھے۔ وہ شرابیوں کی طرح چل رہا تھا۔

اس نے اپنے قصر میں داخل ہوتے ہی بازار سے راج مزدور بلوائے اور خفیہ تہ خانے کی تعمیر کا کام شروع کروا دیا۔

☆☆☆

عضدالدولہ اپنے چچا کے بیٹے سے خط و کتابت کو طول دے رہا تھا اور قاضی سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھا۔ تہ خانے کی تعمیر کا کام حیرت انگیز طور پر بہت جلد مکمل ہو گیا۔ ادھر خنسا بار بار لیث کو پوچھ رہی تھی اور قاضی اس معاملے کو اس وقت تک ٹالنا چاہتا تھا جب تک کہ عضدالدولہ اپنی امانتیں تہ خانے میں منتقل نہیں کر دیتا۔

لیکن خنسا کے لیے اب صبر مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے قاضی سے کہا۔ ”اگر لیث اہواز گیا ہوا ہے تو میں بھی اہواز چلی جاؤں گی اور اس کو تلاش کر لوں گی۔“

قاضی نے تیوری بدل کر جواب دیا۔ ”میں دیکھوں گا کہ تو میری اجازت کے بغیر کیسے چلی جائے گی۔“

”تب مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ لیث اہواز کیوں گیا ہے اور کب آئے گا؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں کسی لیث کو نہیں جانتا، اس لیے میں کیا جانوں کہ وہ کہاں گیا ہے، کیوں گیا ہے اور کب آئے گا؟“

خنسا حیران و پریشان قاضی کی صورت دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”میں مطلب نہیں سمجھی؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”میں کہہ رہا ہوں کہ میں کسی لیث سے واقف نہیں اور تجھ کو میرے ایک دوست نے میرے پاس تحفے کے طور پر بھیجا ہے اور اس طرح میں تجھ پر پورا پورا حق تصرف رکھتا ہوں۔“

خنسا نے چیخ کر کہا۔ ”یہ جھوٹ ہے، مجھے ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا اور ڈاکوؤں کا سردار لیث کا بھائی تھا۔ میں لیث کی کنیز ہوں چنانچہ ڈاکوؤں کے سردار نے مجھے اپنے بھائی کی امانت کے طور پر واپس بھیج دیا۔“

قاضی نے فوراً کہا۔ ”تو ڈاکوؤں کے پاس سے میرے پاس آئی ہے تاکہ میری مخبری کر کے میرے محل میں ڈاکا ڈلوا دے۔“

خنسا نے بھی اکڑ برقرار رکھی۔ ”میں تیری باتوں میں نہیں

Alternative & Integrated medicine

جڑی بوٹیوں اور قدرتی اجزا سے تیار کردہ ہربل میڈیسن اب آپ گھر بیٹھے منگوا سکتے ہیں

فرٹیلٹی کورس برائے مرد حضرات

مردوں میں جرثوموں کی کمی اور کمزوری کو دور کر کے اولاد پیدا کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقوی و مولد ہے

شادی کورس

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لیے زائل شدہ توانائی کی بحالی کا مستقل اور مکمل کورس۔ انشاء اللہ کسی قسم کی کمی اور محرومی محسوس نہ ہوگی

ازدواجی کورس

شادی شدہ حضرات کے لیے بحالی قوت کا فوری اور مستقل علاج۔ کامیاب اور ازدواجی زندگی کے لیے موثر ترین کورس

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
(ایم بی بی ایس (پی ایم ڈی سی آنرز))
معالج تصنیفی اور ازدواجی مسائل ہوا مجھ بن
زرد غیب سے کراسنگ گوجرہ روڈ جھنگ صدر
03216528001, 03008652456
email: b2ctcleshop@gmail.com



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آؤں گی تو کچھ بھی کرنے، میں باہر نکل کر شور مچادوں گی۔"

قاضی نے جواب دیا۔"میں تجھے نکلنے ہی کب دوں گا۔"

اس کے بعد قاضی نے خنسا کو پکڑلیا، بولا۔"اب میں وقت کا انتظار نہیں کروں گا اور خنسا میں تجھے کس طرح سمجھاؤں گا کہ تو میرے پاس بہت خوش رہے گی۔ مال و دولت بھی میرے پاس بہتوں سے زیادہ ہے اور عقل و فراست بھی سب سے زیادہ۔"

خنسا نے جواب دیا۔" مجھے مال و دولت اور عقل و فراست نہیں لیث درکار ہے جس کو تو نے کسی نہ کسی طرح ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔"

قاضی نے کہا۔"اب وہ تجھے نہیں مل سکتا اور بحالت مجبوری اب تجھے پوری زندگی میری ہی آغوش میں گزارنی ہوگی۔"

خنسا چیخی۔"ایسا نہیں ہوسکتا، ایسا نہیں ہوسکتا۔"

قاضی نے جواب دیا۔"اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا، ایسا ہی ہوگا۔"

اس کے بعد قاضی نے خنسا کو زبردستی قابو میں لینا چاہا لیکن خنسا بدک کر دوسری طرف چلی گئی۔ قاضی پھر جھپٹا مگر خنسا نے اس کو دھکا دے کر ایک طرف گرادیا۔ قاضی نے غصے میں کہا۔"اگر یہ بات ہے تو یہی سہی۔ میں تجھے معاف نہیں کروں گا اور جس طرح بھی بن پڑے گا میں اپنا مطلب حاصل کرکے رہوں گا۔ تجھ کو ان حالات سے سمجھوتا کرلینا چاہیے کیونکہ اب انہی حالات اور ماحول میں تجھے اپنی زندگی بسر کرنا ہے۔"

خنسا نے جواب دیا۔"خودکشی حرام ہے اور میں اس حرام پر اس حرام کو ترجیح دوں گی۔"

قاضی کو جوش آیا ہوا تھا اور اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ آج کچھ نہ کچھ کر گزرنا ہے لیکن اس وقت اس کو مطلع کیا گیا کہ عضدالدولہ نے یاد فرمایا ہے۔

قاضی نے خنسا کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور کہا۔"آج تو مجھ سے بچ تو نہیں سکتی تھی لیکن تیری خوش قسمتی کہ بادشاہ کا بلاوا آگیا۔ تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بادشاہ میرے کہنے میں ہے اور وہ میری بہت سنتا ہے۔"

خنسا نے جواب دیا۔"جا جا، اپنا راستہ لے، بادشاہ تیری سنتا ہے تو سنتا رہے۔ بس خدا تیری نہ سنے، بادشاہ کا کیا ہے آج وہ ہے کل کوئی دوسرا آجائے گا۔"

قاضی اسی وقت عضدالدولہ کے پاس چلا گیا۔ اس دن عضدالدولہ ہمیشہ سے زیادہ پریشان تھا۔ قاضی کو دیکھتے ہی بولا۔"اب بات بگڑ چکی ہے اور جنگ کے علاوہ چارہ نہیں رہا۔ سنتا ہوں کہ تہ خانہ بھی مکمل ہو چکا ہے۔"

قاضی نے جواب دیا۔" وہ تو دو دن پہلے ہی تیار ہوگیا تھا میں آپ کی طرف سے طلبی کا منتظر تھا۔"

عضدالدولہ نے پوچھا۔"آج کیا دن ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔"اتوار۔"

عضدالدولہ نے کہا۔"میں پرسوں منگل کو رات کی تاریکی میں اپنا خزانہ اس تہ خانے میں منتقل کروادوں گا۔"

قاضی نے پوچھا۔"اس کے لیے مجھے آپ کے پاس آنا پڑے گا یا حضور نے کوئی اور انتظام کر رکھا ہے؟"

عضدالدولہ نے جواب دیا۔"رات کی تاریکی میں میں اپنی نگرانی میں یہ خزانہ آپ کے گھر پہنچاؤں گا کیونکہ اس معاملے میں کسی اور پر اعتبار نہیں کرسکتا۔"

اس کے بعد عضدالدولہ نے قاضی کو ایک طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ قاضی کو کمرے کے آخری حصے میں لے گیا جہاں ایک دروازہ لگا تھا۔ عضدالدولہ نے اس کو کھولا تو پتا چلا یہ ایک تہ خانہ ہے۔ عضدالدولہ، قاضی کے ساتھ تہ خانے میں اتر گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں ایک خزانے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہاں شمعیں روشن تھیں اور ان کے سامنے زر و جواہر اور ہیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک سو چالیس آفتابے، تین ڈبے اور یاقوت لعل اور فیروزے سے لبریز پندرہ پیالے رکھے ہوئے تھے۔

قاضی نے آفتابوں کی طرف اشارہ کیا، پوچھا۔"حضور والا! ان آفتابوں میں کیا ہے؟"

عضدالدولہ نے جواب دیا۔"دینار۔"

قاضی نے ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔"اور ان میں؟"

جواب ملا۔"مروارید۔"

قاضی اس مال کو دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ شادیِ مرگ سی طاری ہونے لگی۔ عضدالدولہ نے کہا۔"آج رات میں آپ کے تہ خانے کا معائنہ کروں گا۔"

قاضی نے جواب دیا۔"بسر و چشم، میں آپ کا انتظار کروں گا۔"

رات کو عضدالدولہ، قاضی کے قصر میں پہنچ گیا اور تہ خانے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ موقع غنیمت دیکھ کر قاضی نے خنسا کی شکایت کردی کہ۔"حضور والا! ان دنوں میں ایک مصیبت میں گرفتار ہوں اور آپ کی مدد چاہتا ہوں۔"

عضدالدولہ نے جواب دیا۔" قاضی محترم! آپ اپنی مصیبتوں کا ذکر فرمائیں ابھی میں بادشاہ ہوں آپ کے حق میں جو کچھ کرسکتا ہوں، ضرور کروں گا۔"

قاضی نے کہا۔"مجھے ایک شخص نے نذرانے میں ایک کنیز بھیجی ہے وہ کنیز مجھے پسند آگئی ہے لیکن اب یہ انکشاف





ہوا ہے کہ کنیز کا تعلق ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے ہے اس لیے اب میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟"

عضدالدولہ نے سختی سے جواب دیا۔"کنیز سے تمتع جائز ہے۔ پہلے آپ اس کو یوں ہی سمجھایے کہ وہ اپنے دل سے یہ نکال دے کہ ڈاکو اس کی کوئی مدد کرسکیں گے اور اگر وہ زیادہ تنگ کرے تو آپ کو اس کا اختیار ہے کہ اس سے جیسا سلوک چاہیں کریں، میں کچھ بھی نہیں بولوں گا۔"

قاضی نے شکریہ ادا کیا۔"میں بادشاہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے اتنی عزت بخشی۔"

عضدالدولہ نے کہا۔"ہوسکتا ہے کہ بدھ سے جنگ شروع ہوجائے۔ جنگ کے چھڑتے ہی میری لڑکیاں آپ کے پاس آجائیں گی آپ انہیں چھپا کر رکھیے گا اور جب حالات معمول پر آجائیں تو آپ دور اندیشی سے اہواز منتقل ہوجایے گا اور یہ خزانہ بھی وہیں لیتے جایے گا اور میری لڑکیوں کی شادیاں مناسب جگہوں پر کردیجیے گا۔"

قاضی نے انکساری سے عرض کیا۔"حضور والا جس طرح فرما رہے ہیں بالکل اسی طرح اس پر عمل ہوگا۔"

عضدالدولہ نے کہا۔"منگل کی رات آپ جاگتے رہیے گا کیونکہ میں رات کو کسی بھی وقت خزانے کے ساتھ حاضر ہوجاؤں گا۔"

قاضی نے جواب دیا۔"میں پوری رات جاگ کر آپ کا انتظار کروں گا۔"

عضدالدولہ اپنے محل واپس گیا اور قاضی، قصر کے باہر تک عضدالدولہ کو چھوڑ کر سیدھا خنسا کے پاس پہنچا اور کہا۔"خنسا میں نے تیرا ذکر عضدالدولہ سے کردیا ہے اور اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ میں تجھ سے تمتع کرسکتا ہوں اور اگر تیرا تعلق ڈاکوؤں سے ہے تو تجھ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ڈاکو تیری کوئی مدد نہ کرسکیں گے۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے مجھ کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ میں تجھ پر سختیاں بھی کرسکتا ہوں۔"

خنسا نے پھر وہی جواب دیا۔"میں خودکشی کرلوں گی اور اس حرام پر اس حرام کو ترجیح دوں گی۔"

قاضی ہنسنے لگا، بولا۔"میری جان! خودکشی کریں تیرے دشمن۔ میں تجھے اپنے قصر کی ملکہ بنا کر رکھوں گا کیونکہ عنقریب مجھے ایسا خزانہ ملنے والا ہے جو صرف بادشاہوں کے پاس ہوسکتا ہے۔"

قاضی نے مارے خوشی کے خنسا کو بھی نہیں ستایا۔

☆☆☆

دوسرے دن پیر کو دوپہر کے بعد اصفہان سے قاضی

## حسبِ حال

دو لڑکیاں پانی بھرنے کنویں پر گئیں تو آپس میں لڑ پڑیں۔

ایک دوسری سے۔"اللہ کرے تمہیں اندھا شوہر ملے۔"

دوسری چلا کر۔"اللہ کرے تمہیں لنگڑا خاوند ملے۔"

اتنے میں دو افراد جن میں ایک اندھا اور دوسرا لنگڑا تھا، قریب آئے اور بولے۔

"ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ ہم یہاں رکیں یا چلے جائیں؟"

مرسلہ: ریاض بٹ از حسن ابدال

کا ایک آدمی بھاگا ہوا آیا اور یہ منحوس خبر سنائی کہ لیث اصفہان سے کہیں چلا گیا ہے مگر کہاں گیا ہے اس کا کسی کو علم نہیں لیکن سہ پہر کے بعد لیث، قاضی کے قصر کے دروازے پر دربانوں سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ بضد تھا کہ قاضی سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔

قاضی نے اس کو فوراً ہی اندر بلالیا اور کہا۔"نوجوان! تو اصفہان سے کیوں آیا؟ میرا تیرا کیا طے ہوا تھا؟"

لیث نے جواب دیا۔"میں یہ نہیں جانتا کہ میرا تیرا کیا طے ہوا تھا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تیرے پاس میری امانتیں ہیں اور وہ مجھے واپس ملنی چاہیے۔ اب مزید صبر میرے بس کا نہیں۔"

قاضی نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔"دیکھ نوجوان تو زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کر۔"

لیث نے جواب دیا۔"قاضی پہلے میری پوری بات سن لے، اس کے بعد کچھ کہنا۔ میں نے اپنے غلام کو جدا کردیا ہے اور یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ پہلے میں تجھ سے بات کروں گا، اگر تو مان جائے تو خیر ورنہ پرآشوب حالات میں، میں عضدالدولہ کا در کھٹکھٹاؤں گا کیونکہ میں عام دنوں کی بہ نسبت آج کل عضدالدولہ سے بآسانی رابطہ قائم کرسکوں گا۔ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ آج کل عدل و انصاف پر بہت زیادہ مائل ہے۔"

قاضی نے دانت بھینچ کر کہا۔"میں تجھے اس قصر سے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

نکلنے ہی نہیں دوں گا۔"

لیث نے جواب دیا۔"اگر تو مجھے اس قصر سے نہیں نکلنے دے گا تو کیا ہوا، یہ کام میرا غلام انجام دے گا اور عضدالدولہ کو یہ بھی بتا دے گا کہ میں تجھ سے ملنے گیا تھا مگر واپس نہیں آیا۔"

قاضی کو فکر لاحق ہوگئی۔ منگل کی شب کو عضدالدولہ اس کے قصر میں اپنا خزانہ منتقل کرنے والا تھا۔ اس نے سوچا، ان حالات میں اگر یہ خبر کسی طرح عضدالدولہ تک پہنچ گئی تو اس کا اعتبار مشتبہ ضرور ہو جائے گا۔ اس نے لیث کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔"لیث میرے بیٹے! ادھر آ، میرے ساتھ۔"

لیث نے سر سے پاؤں تک قاضی کو دیکھا اور اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

قاضی نے کہا۔"ارے تو میری شکل کیا دیکھ رہا ہے ادھر آ۔"

لیث اس کے ساتھ چلا گیا۔ قاضی اس کو اس گودام میں لے گیا جہاں لوگوں کی امانتیں رکھی جاتی تھیں۔ وہاں قاضی نے لیث کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولا۔"لیث! میرے بیٹے، یہ جو کچھ میں نے تیرے ساتھ کیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ تو مال و زر اور عورت کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرے گا اب چونکہ تو خاصا پریشان ہو چکا ہے اس لیے کہیں مار نہیں کھائے گا۔ تیری امانتیں میرے پاس جوں کی توں موجود ہیں مزدور بلا اور اٹھوا لے۔"

اس کے بعد اس نے ان آفتابوں کی طرف اشارہ کیا جو درہم و دینار سے بھرے رکھے تھے۔

لیث نے اسی وقت مزدوروں کو بلا لیا اور اپنے آفتابے اٹھوا لیے۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا۔ اس نے پوچھا۔"اور عنان، عنان کہاں ہے؟"

قاضی نے جواب دیا۔"وہ اہل خانہ کے ساتھ اہواز گئی ہوئی ہے، دو تین ہفتے کے بعد آجائے گی تو اسے بھی تیرے حوالے کر دوں گا۔"

لیث نے کہا۔"مجھے اہواز کا پتا بتا تاکہ میں اسے لے آؤں۔"

قاضی نے کہا۔"اب تو اتنا بے صبرا پن بھی نہ دکھا۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ تجھے عنان واپس مل جائے گی تو خوامخواہ کیوں پریشان ہو رہا ہے۔ اس دوران تو کوئی حویلی وغیرہ بھی خرید لے۔"

لیث نے مجبوری سے کہا۔"اچھا میں تین ہفتے اس کا انتظار کرلوں گا اور اسی دوران حویلی بھی خرید لوں گا۔ اب رہی خنسا تو خنسا آئی تو نہیں؟"

قاضی نے جواب دیا۔"ابھی تک وہ آئی نہیں جیسے ہی آئے گی تیرے حوالے کر دی جائے گی۔ تو اطمینان رکھ۔"

لیث نے کہا۔"اچھا میں اس کا بھی انتظار کرلوں گا لیکن قاضی اگر تو نے خنسا کی آمد سے مجھے مطلع نہیں کیا تو میں اس کا تجھ سے خطرناک انتقام لوں گا۔"

قاضی کو اس کی باتوں پر غصہ تو بہت آرہا تھا لیکن حالات ایسے نازک تھے کہ وہ ضبط سے کام لے رہا تھا۔

لیث اپنے آفتابے لے کر چلا گیا۔ اس نے قاضی کو شکست دے دی تھی اور اس کو یقین تھا کہ وہ عنان کو بھی حاصل کرلے گا اور خنسا کے آجانے پر اسے بھی۔

لیث کے چلے جانے کے بعد قاضی نے سکون کی سانس لی کیونکہ اس کے سر سے ایک بہت بڑا خطرہ ٹل گیا تھا۔

منگل کی شب آگئی۔ قاضی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں، وہ قصر کے پھاٹک پر دربانوں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اس کو عضدالدولہ کے آدمی کا انتظار تھا۔ ہر ہر آہٹ پر وہ چونک جاتا اور پھاٹک کے باہر نکل جاتا اور مایوس واپس آتا۔ خدا خدا کر کے رات کے پچھلے پہر عضدالدولہ کا آدمی آگیا اور اس نے یہ خفیہ پیغام دیا۔"بادشاہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے اور کہا ہے کہ جو کچھ اٹھوانا ہے آپ اپنی نگرانی میں اٹھوا لیجیے۔"

قاضی اس وقت اس آدمی کے ساتھ عضدالدولہ کے پاس روانہ ہوگیا۔ قاضی کو عضدالدولہ کے اس چھوٹے محل میں لے جایا گیا جہاں وہ کئی بار آچکا تھا۔ عضدالدولہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ عضدالدولہ اٹھا اور قاضی کو لے کر تہ خانے کی طرف چلا گیا۔ کمرا فانوسوں سے روشن تھا اور تیز روشنی میں کمرے کی ایک ایک چیز دیکھی جا سکتی تھی۔ عضدالدولہ نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور قاضی سے کہا۔"قاضی محترم! تہ خانے کے آفتابے، ڈبے اور پیالے ہم دونوں کو مل کر کمرے سے نکالنے ہوں گے۔ اس چھوٹے سے محل کے عقبی دروازے پر گاڑی کھڑی ہے۔ جتنا مال ہم دونوں منتقل کرسکیں گے آج کردیں گے بقیہ کل منتقل ہو جائے گا کیونکہ میں اپنے اس معاملے میں کسی اور پر اعتبار نہیں کرسکتا۔"

قاضی نے خوشی سے جواب دیا۔"حضور والا! آپ کو بھی زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میں اکیلا ہی یہ کام کرلوں گا۔ بوڑھا ہوں تو کیا ہوا میری قوت ایمانی مجھ سے بڑے سے بڑا کام کروا سکتی ہے۔"

عضدالدولہ نے کہا۔"نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"



دونوں باتیں کرتے ہوئے تہ خانے میں داخل ہوگئے۔ وہاں بھی غیر معمولی روشنی تھی۔ قاضی اور عضدالدولہ مال و زر کے انبار کے سامنے جا کھڑے ہوئے یہاں ایک طرف سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ عضدالدولہ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"یہاں مزید آفتابے رکھ دیے گئے ہیں۔"

قاضی خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ خلافِ توقع عضدالدولہ نے تالی بجائی اور اسی وقت سیاہ پردے کے پیچھے سے لیث نمودار ہو کر ان دونوں کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

قاضی، لیث کو دیکھتے ہی مدہوشی محسوس کرنے لگا۔ اس نے نیم مدہوشی میں عضدالدولہ کی طرف دیکھا، سلطان کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور مسکراہٹ بھی۔ قاضی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ عضدالدولہ نے کہا۔"قاضی محترم! کیا بات ہے، میری جگہ یہ نوجوان تیری مدد کرے گا اٹھا آفتابے اور لے چل باہر۔"

قاضی نے گھگیائی ہوئی آواز میں کہا۔"سلطان معظم رحم۔"

عضدالدولہ نے طنزاً پوچھا۔"قاضی محترم! کس بات پر رحم؟" پھر پوچھا۔"پردے کے پیچھے تیری بھتیجی عنان بھی موجود ہے۔" اس نے پردے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"قاضی کی بھتیجی عنان۔ تو وہاں کیا کر رہی ہے آجا۔"

عنان بھی پردے کے پیچھے سے باہر آگئی۔ قاضی گڑگڑایا۔"سلطان محترم رحم۔"

عضدالدولہ نے پوچھا۔"قاضی محترم! تو میری بیٹیوں کو بھی اسی طرح کسی سلطان کے حوالے کر دیتا۔ بالکل اپنی بھتیجی کی عنان کی طرح۔"

قاضی پھر چیخا۔"سلطان محترم! رحم۔"

لیث اور عنان، عضدالدولہ کے روبرو سر جھکائے کھڑے تھے۔

عضدالدولہ نے لیث سے کہا۔"حمدون تاجر کے بیٹے خدا گواہ ہے کہ میرے محل میں عنان بیٹی بن کر رہی ہے۔ یہ تیری امانت تھی جو تیرے حوالے کی جا رہی ہے۔"

لیث نے رقت سے کہا۔"میں سلطان کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟"

عضدالدولہ نے کہا۔"اب تو، تو میری سلطنت سے دور جانے کا ارادہ نہیں رکھتا؟"

لیث نے جواب دیا۔"نہیں حضور والا! میں نے انصاف پالیا۔"

عضدالدولہ نے قاضی سے پوچھا۔"خنسا کہاں ہے؟"

قاضی پر بے ہوشی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس نے عضدالدولہ کا سوال اچھی طرح نہیں سنا اور دھڑام سے گر گیا۔

## اقوال زریں

☆ دنیا کا سب سے خوب صورت پودا محبت کا ہوتا ہے، جو زمین میں نہیں دلوں میں اگتا ہے۔

☆ اگر تم اپنے روزگار میں ناقابل یقین اضافہ چاہتے ہو تو کبھی بھی دسترخوان پر رکھے کھانے میں عیب نہ نکالو اور شکر کر کے کھاؤ، اس سے تمہیں 2 فائدے ہوں گے۔

(1) تمہارے حلال رزق میں اضافہ ہوگا۔

(2) تم پر آنے والی 70 بیماریوں سے اللہ پاک تم کو محفوظ رکھے گا۔

☆ دل شیشے سے نہیں بنا، اگر بنا تو ٹوٹنے کی آواز آتی۔

☆ دل پتھر سے نہیں بنا اگر بنا، تو گرنے کی آواز آتی۔

☆ دل مٹی سے نہیں بنا اگر بنا، تو بکھرنے کی آواز آتی۔

☆ دل اگر بنا ہے تو کسی کی محبت سے بنا ہے اگر ٹوٹ بھی جائے، بکھر بھی جائے، گر بھی جائے تو آواز نہیں آتی صرف خاموش آنسو بہتے ہیں۔

☆ سکون کے لیے وضو کا پانی۔

☆ جگر کے لیے قرآن کریم کی تلاوت۔

☆ صحت کے لیے نماز۔

☆ اور خوش رہنے کے لیے اللہ پاک کا ذکر کیا کرو۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ پھول بیچنے والے کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

☆ مخلص دوست کے اندر اتنا پیار چھپا ہوتا ہے، جیسے ایک چھوٹے سے بیج کے اندر پورا درخت چھپا ہوتا ہے۔

☆ اچھے الفاظ اور اچھے خیالات ہی خوب صورتیاں تخلیق کرتے ہیں، جس چہرے کے ساتھ ہم پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارا انتخاب نہیں ہوتا مگر جس چہرے کے ساتھ ہم مرتے ہیں اسے تراشنے کے ذمہ دار ہم خود ہیں وہ ہمارے لفظوں، خیالوں اور دعاؤں کا عکس ہوتا ہے۔

مرسلہ: رضوان تنولی گریزوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

قاضی کی آنکھ کھلی تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ عضدالدولہ نے قاضی کو کوئی سزا نہیں دی، معزول کر کے بغداد خالی کر دینے کا حکم دے دیا۔ قاضی کا قصر لیث کے حوالے کر دیا گیا۔ عضدالدولہ نے اپنے چچا کے بیٹے کو شکست دے دی اور فتح کی خوشی میں جشن منایا تو اس میں لیث، عنان اور خنسا کو بھی مدعو کیا۔ یہ تینوں عضدالدولہ کے خاص مہمان تھے۔ یہ تینوں عضدالدولہ کی خدمت میں پہنچے تو اس نے لیث سے کہا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ تو نے کسی سے یہ کہا تھا کہ میں بغداد اور اصفہان سے کہیں دور اس لیے چلا جاؤں گا کہ یہاں انصاف نہیں ہے؟''

لیث خوف زدہ تھا پھر بھی سچ بولا۔ ''ہاں میں نے یہ بات اصفہان جاتے ہوئے اپنے ایک ہم سفر سے کہی تھی۔''

عضدالدولہ نے جواب دیا۔ ''تیرا وہ ہم سفر میرا وقائع نویس تھا۔ جس نے تیری پوری داستان مجھے لکھ کر بھیجی اور مجھے اس کے لیے اتنا بڑا تماشا کرنا پڑا۔'' پھر شوخی سے پوچھا۔ ''اب تو، تو بغداد ہی میں رہے گا؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''اب مجھے انصاف مل گیا اس لیے اس سرزمین انصاف کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔''

عضدالدولہ نے پوچھا۔ ''تیرا غلام کہاں ہے؟''

لیث نے جواب دیا۔ ''وہ بھی باہر کہیں موجود ہوگا۔ چونکہ وہ ہر وقت کھانستا رہتا ہے اس لیے اسے بزم میں بلا کر میں حضور والا کی طبع نازک کو......''

عضدالدولہ نے بات کاٹ دی بولا۔ ''ارے اس کو اسی وقت بلوا۔'' اس کے بعد بادشاہ نے تالی بجائی۔ ایک غلام حاضر ہوا۔ عضدالدولہ نے حکم دیا۔ ''قصر کے باہر اس کا غلام کھڑا ہے، اسے اندر بلا لے۔''

لیث نے بات پوری کر دی۔ ''اور اس کی پہچان یہ ہے کہ بار بار کھانس رہا ہوگا۔''

عضدالدولہ مسکرایا۔ ''خوب خوب، نام سے زیادہ بہتر تعارف اس کی کھانسی ہے، خوب۔''

بادشاہ اچانک خنسا اور عنان کی طرف متوجہ ہوا۔ پوچھا۔ ''تم دونوں کو کچھ کہنا ہے؟''

عنان نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔ ''ان مہربانیوں کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی۔''

لیکن خنسا نے بادشاہ کو دیکھ کر فوراً نظریں جھکا لیں۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ خنسا کچھ کہنا چاہتی ہے، پوچھا۔ ''خنسا تو کچھ کہنا چاہتی ہے شاید؟''

خنسا نے جواب دیا۔ ''جی کنیز پرور۔''

''پھر کہہ، ڈر کس بات کا؟''

خنسا نے رک رک کر کہا۔ ''حضور والا! لیث سے کہیے یہ مجھے آزاد کر کے بیوی بنا لے۔''

عنان نے تڑپ کر خنسا کی طرف دیکھا۔ عضدالدولہ نے لیث کے بجائے عنان سے پوچھا۔ ''بیٹی! تو لیث سے کہہ کر خنسا کی خواہش پوری کرا دے۔''

عنان نے جواب دیا۔ ''آپ کی ایما ہی ہم سب کے لیے حکم ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

کچھ دیر بعد غلام بھی کھانستا ہوا آ گیا۔ وہ بادشاہ کو دیکھ کر جھجکا لیکن بادشاہ نے قریب آنے کا حکم دیا۔ ''تو ایک مثالی انسان ہے تیری وفاداری اس لائق ہے کہ تجھے بادشاہ کے برابر بٹھایا جائے۔''

عضدالدولہ نے غلام کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا اور پوچھا۔ ''تجھ کو کچھ پتا ہے کہ قاضی کہاں ہے؟''

غلام نے کہا۔ ''سننے میں آیا ہے کہ وہ اہواز جانے کی تیاری کر رہا ہے۔''

عضدالدولہ نے پوچھا۔ ''اس کے دوستوں کا اس کے ساتھ کیا رویہ ہے؟''

غلام نے جواب دیا۔ ''جب وہ قاضی القضاۃ کے عہدے پر تھا تو اس کا کوئی دشمن نہیں تھا اور اب معزولی کے بعد کوئی اس کا دوست نہیں۔''

غلام کے جواب نے سبھی کو پھڑکا دیا۔ عضدالدولہ بے اختیار ہنس دیا لیکن اس ہنسی میں غلام کے کھانسنے کی آواز بھی شامل ہوگئی۔ بادشاہ نے ہنسی پر قابو پاتے ہوئے غلام سے کہا۔ ''اب مجھے ایک کام اور کرنا ہے اور وہ ہے شاہی طبیب سے تیری کھانسی کا تیر بہدف علاج کروانا ہے۔''

**ماخذات**

تاریخ طبری، ابن جریر الطبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ فتوح البلدان، بلاذری۔ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ، ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن۔ تاریخ الخلفا، جلال الدین سیوطی۔ تاریخ اسلام، معین الدین ندوی۔

# معاہدہ

کاشف زبیر

اگر انسان کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو تو وہ تمام مشکلات سے بآسانی گزر جاتا ہے کیونکہ اس کی استقامت جو یکسوئی عطا کرتی ہے اس کے ذریعے وہ بہترین منصوبے ترتیب دے لیتا ہے، قطع نظر اس کا نکتۂ نظر درست ہے یا غلط، بہرحال وہ بھی ایک عجیب معاہدے کا پابند تھا جس کے خلاف اگر جاتا تو گویا جان سے جاتا... لہٰذا اس معاہدے کی پاسداری اس کی زندگی کی ضمانت سے مشروط تھی۔ ایسے میں وہ بھلا کیسے وعدہ خلافی کا مرتکب ہوتا۔

موت کی سرگوشیوں اور زندگی کے تلاطم کا

حیرت انگیز قصہ

ریڈی ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں شیرف کارلائل کی حکومت تھی اور اسے مجرموں سے سخت نفرت تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں ٹیکساس سچ مچ وحشی تھا۔ صرف مجرم اور عوام ہی نہیں قانون کے رکھوالے بھی کم نہیں تھے۔ شیرف کارلائل ہر مہینے قصبے کے میدان میں ایک تقریب منعقد کرتا تھا جس میں مجرموں کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہاں کئی افراد کو پھانسی دینے کی تیاری کی جارہی تھی اور ان میں مشہور ترین مجرم



www.paksociety.com
SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

اورڈکیت جیول بھی شامل تھا۔ اسے ایک جج نے ان جرائم پر پھانسی کی سزا سنائی تھی جو اس نے کیے تھے۔ جیول تقریباً چالیس سالہ خوفناک شکل اور تاثرات والا مضبوط جسامت کا سخت جان شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی تھی۔

جیول سمیت چار افراد کو پلیٹ فارم پر لایا گیا اور ان کے گلوں میں رسی ڈال دی گئی تھی۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے البتہ پاؤں آزاد تھے۔ شیرف کا ڈپٹی ان کی سزا کا لکھا ہوا حکم نامہ وہاں تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہونے والی عوام کو پڑھ کر سنا رہا تھا۔ وہ بے تابی سے منتظر تھے کہ کب ان چاروں افراد کو سولی پر لٹکایا جاتا ہے۔ انہیں ڈپٹی کی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے حکم نامہ سنا دیا تو جلاد نے شیرف کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلایا اور جلاد لیور کھینچنے والا تھا کہ بریڈی کے داخلی دروازے پر خوفناک دھماکا ہوا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ مجرموں کی پھانسی کے وقت دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ دروازے کے اڑتے ہی چھ سات گھڑ سوار اندھا دھند گولیاں برساتے اندر داخل ہوئے۔ وہ بلا امتیاز ہر شخص پر گولیاں برسا رہے تھے اور اس میں مسلح یا غیر مسلح اور عورت و بچے کی تمیز بھی نہیں کر رہے تھے۔ شیرف کا رلائل چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو حملہ آوروں کو بھون ڈالنے کا حکم دے رہا تھا۔ مگر اس کے آدمیوں کو اپنی جانوں کے لالے پڑے تھے۔ وہ جیول کے گروہ کے آدمی تھے جو اسے چھڑانے آئے تھے۔ شیرف کارلائل دانت پیس رہا تھا۔ جلاد لیور والی جگہ سے غائب تھا۔ شیرف خود اس طرف بڑھا اور اس نے لیور تھام کر جیول کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ شیرف نے لیور کھینچتے ہوئے غرا کر کہا۔

"جہنم میں جاؤ۔"

☆☆☆

جیول کو ہوش آیا تو وہ ایک فولادی کرسی پر بندھا پڑا تھا اور اس کے جسم پر صرف ایک تار بھی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں فولادی کلپ سے بندھے ہوئے تھے۔ وہاں بلا کی گرمی تھی اس کے باوجود اس کے سامنے ایک بڑے سے کڑاہے میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ میں کہاں ہوں؟ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ کرسی ایک گنبد نما جگہ تھی جس پر جا بہ جا زنجیریں اور لوہے کے حلقے لٹک رہے تھے۔ گنبد چاروں طرف سے ستونوں پر کھڑا ہوا تھا اور ستونوں کے درمیان محرابیں تھیں۔ اس گنبد کے باہر بھی شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے باوجود وہاں تاریکی تھی۔ دور اور پاس سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہو۔ اس کے ذہن میں بے اختیار خیال آیا کہ وہ جہنم میں ہے۔

"تم نے ٹھیک سوچا۔" عقب سے ایک غراتی ہوئی آواز آئی۔ پھر ایک تومند چوغہ پوش عقب سے گھومتا ہوا اس کے سامنے آیا۔ وہ کڑاہے کے دوسری طرف جا کھڑا ہوا اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ "جہنم میں... خوش آمدید۔"

"یہ بکواس ہے۔" جیول چلایا۔

چوغہ پوش غراتی آواز میں ہنسا۔ یوں لگا جیسے کسی درندے نے ہنسنے کی کوشش کی ہو۔ "جلد تمہیں یقین آجائے گا میرے دوست۔"

چوغہ پوش نے کڑاہے سے ایک سلاخ اٹھائی اس کے سرے پر آٹھ کا نشان بنا ہوا تھا اور وہ سرخ ہو کر دہک رہا تھا۔ وہ جیول کے پاس آیا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ "نہیں... نہیں..." اس نے کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی چوغہ پوش نے دہکتا ہوا حصہ اس کے عریاں سینے پر چسپاں کر دیا۔ جیول کے حلق سے چیخ نکلی اور اس نے اپنا ہی گوشت جلنے کی بو سونگھی۔ اذیت بہت شدید تھی، جیول گہری سانسیں لے رہا تھا۔ "میرا خیال ہے اب تمہیں یقین آ گیا ہو گا صرف آغاز ہے، بہت جلد تمہیں بہت سے عذاب سے گزرنا پڑے گا۔"

"مگر کیوں؟" جیول چلایا۔

"کیوں؟" چوغہ پوش نے حیرت سے کہا۔ "تم جہنم میں یہ سوال کر رہے ہو۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔" جیول پھر چلایا۔ اس کی تکلیف حیرت انگیز طور پر کم ہو گئی تھی اور پھر اس نے اپنے سینے کی طرف دیکھا تو وہاں سے جلنے کا نشان بھی غائب تھا۔ اگر جیول اذیت برداشت کرنے کا عادی نہ ہوتا تو شاید اس تکلیف سے مر جاتا۔ اسے کئی بار گولیاں لگی تھیں۔ ایک بار اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ مگر اس نے کبھی ایسی اذیت برداشت نہیں کی تھی۔ مگر اب وہ حیرت سے اپنے سینے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے چوغہ پوش سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"میں نے بتایا نا یہ آغاز ہے جلد تمہیں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ "لل... لیکن کیوں؟"

چوغہ پوش نے کڑاہے سے ایک اور سلاخ اٹھائی اس پر دو کا ہندسہ چسپاں تھا۔ "کیونکہ تم جہنم میں ہو اور تم یہاں آنے کے لیے مناسب ترین امیدوار ہو۔"

چوغہ پوش نے دہکتا ہوا دو اس کے سینے پر بائیں جانب لگایا تو اس کی چیخ سے گنبد گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

جیول کورزڈ بچپن سے ناپسندیدہ ترین شخصیت تھا۔ وہ دو سال کا تھا جب اس نے ایک پڑوسی بچے کی ران میں چھری گھونپ دی تھی۔ اسے چار ٹانکے لگے تھے۔ وحشی ٹیکساس کے اس وحشی ترین قصبے میں ویسے تو تمام ہی ایسے لوگ آباد تھے جن کے نزدیک سوائے اپنی جان کے اور کسی کی اہمیت نہیں تھی مگر جیول ان سب سے آگے تھا۔ اس پہلے کارنامے کے بعد اس کا ہاتھ رکا نہیں تھا۔ چھ سال کی عمر میں جب اسے اسکول میں داخل کرایا گیا تو اس کا شہرہ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا تھا اور بچے تو بچے ٹیچر تک اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ یہاں پہلے دن اس نے اپنی پانی کی چھاگل مار کر ایک بچے کی بھوں پھاڑ دی، جس نے بغیر پوچھے اس کی چھاگل سے پانی پی لیا تھا۔ جیول کو سزا ملی مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا البتہ دو دن بعد اس ٹیچر کا گھوڑا پاؤں میں رسی آجانے سے گرا اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا، جس نے جیول کو سزا دی تھی۔

بارہ سال کی عمر میں اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ اسے تعلیم سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے جواری باپ نے اسے گھر سے نکال دیا لیکن اس نے پروا نہیں کی۔ وہ پہلے ہی چوروں کے ایک گروہ میں جگہ حاصل کر چکا تھا۔ کسی کو تعجب نہیں ہوا کیونکہ سب کا خیال تھا جیول آنے والے دنوں میں سوائے جرم کے اور کچھ نہیں کرے گا۔ چوروں کا یہ گروہ آس پاس معروف گزرگاہوں سے گزرنے والے قافلوں کا سامان چرا لیتا تھا۔ قافلوں پر ہاتھ کی صفائی کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مقامی پولیس ان کے واویلے پر توجہ نہیں دیتی تھی۔ اگر وہ قصبے میں چوریاں کرتے تو لوگ ان کے خلاف ہو جاتے۔

☆☆☆

جیول کی جان نکل رہی تھی، اس بار اذیت پہلے سے زیادہ تھی اور اسے سانس بھی مشکل سے آ رہی تھی۔ چوغہ پوش اپنا کام کر کے آرام سے اس کے آس پاس ٹہل رہا تھا۔ اب جیول کو کسی حد تک یقین آ گیا تھا کہ وہ واقعی جہنم جہنم میں ہے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "تم جہنم کے فرشتے ہو؟"

"فرشتہ؟" چوغہ پوش نے تعجب سے کہا۔ "یہاں کسی فرشتے کا کیا کام... میں شیطان ہوں اور تمہیں میرے سپرد کیا گیا ہے۔ دنیا میں تم میرے پیچھے چلتے تھے۔ اب یہاں میں تمہیں اس کا صلہ دے رہا ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

چوغہ پوش ہنسا۔ "ایک شیطان سے تم توقع بھی کیا کر سکتے ہو۔ لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں شیطان ہوں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے چہرے سے چوغہ ہٹا دیا۔ جیول کے خیال میں وہ سنگ دل شخص تھا اس پر کوئی چیز اثر نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس وقت جو چہرہ اس کے سامنے تھا اسے دیکھ کر اس کا رواں رواں لرز اٹھا تھا۔ چٹخی اور جھلسی ہوئی کھال جس پر جگہ جگہ کٹ لگے تھے اور اس سے سرخ گوشت جھلک رہا تھا۔ ناک کی جگہ ایک تڑا مڑا ٹیلا سا تھا اور گڑھوں میں وحشی آنکھوں سے سرخی کے ساتھ درندگی جھلک رہی تھی۔ جیول ہکلایا۔

"تم... تم سچ مچ شیطان ہو؟"

"وہ والا نہیں جو تم لوگ سمجھتے ہو۔" اس نے کہا۔ "میں صرف مقرر کیا گیا ہوں۔ دنیا میں بھی تمہارے ساتھ تھا اور اب یہاں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔"

جیول سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "میں تمہاری ذمے داری ہوں؟"

"صرف تم ہی نہیں یہاں اور بھی ہیں جو میری ذمے داری ہیں اور میں ان کے ساتھ بھی ہوتا ہوں۔"

"ایک ہی وقت میں؟"

"ہاں ایک ہی وقت میں... میں شیطان ہوں اس لیے میری طاقت بہت زیادہ ہے۔"

"اتنے لوگ کیوں؟"

"یہ میری ڈیوٹی ہے۔" شیطان نے کہتے ہوئے اس بار سات کا ہندسہ اس کے سینے پر لگا دیا۔ جیول چلا رہا تھا مگر جب تک دہکتا ہوا انگارہ بجھ نہیں گیا شیطان نے سلاخ نہیں ہٹائی۔

"اف میرے خدا... اس اذیت سے تو موت اچھی ہے۔"

"خدا کا نام مت لو... زندگی میں تم نے اسے یاد نہیں کیا اس لیے اب تم اس کا نام نہیں لے سکتے۔" شیطان نے اسے جھڑک دیا۔ "تم ایک بار مر چکے ہو اس لیے اب دوبارہ موت طلب نہیں کر سکتے۔"

"میں مر چکا ہوں۔" جیول نے اذیت برداشت کرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں مر چکا ہوں تو یہ تکلیف کیوں ہے؟"

"یہ تمہارا مقدر ہے کیا تم کو یاد ہے تم کیسے مرے تھے؟"

جیول سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اسے یاد آنے لگا۔

☆☆☆





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

حملہ آوروں کی قیادت کوپر کر رہا تھا۔ کوپر گینگ، جیول کا نائب تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور چہرے سے نرم خو نظر آنے والا انسان تھا لیکن جیول اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کتنا سفاک ہے۔ وہ رحم و مروت کا قائل ہی نہیں تھا اور جس کا دشمن ہو جاتا اس کے خلاف آخری حد تک چلا جاتا تھا۔ جیول کو یاد تھا، ایک بار کوپر نے ذاتی جھگڑے میں گینگ کو استعمال کیا۔ جیول اس وقت وہاں نہیں تھا ورنہ وہ شاید کوپر کو روک دیتا۔ میٹ جین نامی شخص سے کوپر کا ایک جوا خانے میں جھگڑا ہوا۔ میٹ جین نے ماہر کے باز ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کوپر کے چہرے پر نشان ڈال دیے تھے اور اسے اپنا پستول استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگلی رات کوپر گینگ کے چار افراد کو لے کر میٹ کے مکان پر پہنچا۔ اس نے وہاں دھوکے سے میٹ کو قابو کیا اور پھر اسے باندھ کر اس کے سامنے اس کی بیوی اور بیٹی کی اجتماعی آبرو ریزی کی۔ آخر میں اس نے خاندان کے پانچ افراد کو شوٹ کیا اور وہاں آگ لگا کر نکل آیا۔

جیول کو غصہ آیا تھا۔ اگر کوپر کو میٹ پر غصہ تھا تو وہ اس پر نکال لیتا پورے خاندان کو ختم کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ بہرحال جیول کو کوپر سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا اور دو دن بعد وہ ایک واردات کے دوران گرفتار ہو گیا۔ شیرف کارلائل، جیول اور اس کے گینگ کا جانی دشمن تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ان کے خلاف کارروائیاں کرتا رہا تھا۔ جیول ہاتھ آیا تو اس کی باچھیں کھل اٹھی تھیں اور اس نے ریکارڈ دو ہفتے میں اس کے خلاف مقدمہ چلا کر اسے پھانسی کی سزا سنوا دی۔ جج اس کا اپنا آدمی تھا۔ جیول کے ساتھ اس کے تین آدمی اور پکڑے گئے تھے۔ وہ تینوں بھی پھانسی کے تختے پر تھے۔ جب کوپر اور اس کے آدمیوں نے حملہ کیا تو جلاد اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا۔ ایسے میں شیرف کارلائل نے خود جلاد کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بھاگ کر لیور کھینچ لیا اور وہ چاروں جھٹکے سے خلا میں جا گرے تھے۔

جیول نے گردن سخت کر لی تھی اس لیے وہ ٹوٹنے سے بچ گئی لیکن رسا سخت ہونے سے اس کی سانس رک رہی تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے اس کی آنکھیں باہر آ گئیں اور جسم سے جان نکلنے لگی تھی مگر اسی لمحے ایک فائر نے وہ رسی کاٹ دی جس سے وہ لٹکا ہوا تھا۔ جیول جھٹکے سے نیچے گرا۔ اس کے گروہ کا ایک نوجوان بھاگ کر اس کے باقی ساتھیوں کی رسیاں کاٹ رہا تھا پھر اس نے نیچے آ کر جیول کے ہاتھوں کی رسی کاٹ دی۔ جیول نے دیکھا، اس کے دو ساتھی گردن ٹوٹنے سے پہلے ہی زندگی ہار چکے تھے اور تیسرا بھی کچھ دیر کا مہمان لگ رہا تھا۔ جیول نے رسی کاٹنے والے سے پستول لے کر اس کی اذیت کا خاتمہ کر دیا۔ کوپر اور اس کے آدمیوں نے شیرف کارلائل کے بیشتر آدمیوں کا صفایا کر دیا تھا ان کے علاوہ بھی کوئی درجن لاشیں وہاں پڑی تھیں۔ اب وہ لوگ جگہ جگہ آگ لگا رہے تھے۔ آگ لگانے کا مقصد شیرف اور اس کے بچے کھچے آدمیوں کو تعاقب میں آنے سے روکنا تھا۔ دس منٹ بعد وہ سب وہاں سے جا رہے تھے۔

ساری رات سفر کے بعد انہوں نے ایک وادی میں پڑاؤ ڈالا۔ سخت سردی تھی اور یہاں ہر طرف برف پڑی تھی صرف ایک چشمہ بہہ رہا تھا، اس کا پانی برف نہیں بنا تھا۔ انہوں نے آگ جلائی اور گھوڑے ایک جگہ باندھ کر کھانے کی تیاری میں لگ گئے۔ کوپر جیول کو بتا رہا تھا کہ جیسے ہی اسے پتا چلا اس نے جیول اور ساتھیوں کو آزاد کرانے کی پلاننگ شروع کر دی تھی۔ جیول جن کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کا بیان سن رہا تھا۔ جب کوپر خاموش ہوا تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم نے دیر کی اور تقریباً ناکام رہے تھے۔ ہمارے تین ساتھی اسی دیر کی وجہ سے مارے گئے۔ تمہیں پہلے ہی حملہ کر کے ہمیں رہا کرا لینا چاہیے تھا۔“

اس تنقید پر کوپر کا منہ بن گیا۔ ”اس صورت میں ہمیں قصبے کے اندر پولیس اسٹیشن پر حملہ کرنا پڑتا۔ ہمیں بہت جانی نقصان ہوتا لیکن اب ہم ایک بھی آدمی گنوائے بغیر تمہیں آزاد کرا لائے ہیں۔“

”تم ان تینوں کو بھول رہے ہو؟“

”وہ تینوں پہلے ہی مردہ تھے۔“ کوپر نے بے پروائی سے کہا۔ ”اصل اہمیت تمہاری ہے اور تم زندہ ہو۔“

جیول کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوپر سے متفق نہیں ہے۔ اس نے فکرمندی سے کہا۔ ”اس حملے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے خلاف فوج حرکت میں آ جائے گی۔“

”ہم فوج سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔“ کوپر نے کہا۔

جیول نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”میرا تو خیال ہے ہمیں کچھ عرصے کے لیے منتشر ہو جانا چاہیے۔“

”اس کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔“ کوپر نے کہا۔ ”ہم سب تقریباً خالی ہاتھ ہیں پچھلے کچھ عرصے سے کوئی بڑا ہاتھ نہیں مارا ہے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ جیول نے کہا۔

”ایک منٹ میری ایک بات سنو۔“ کوپر اسے ندی کے کنارے لے آیا۔ ”ایک بار تم نے کہا تھا کہ تم سونے کے ایک بڑے ذخیرے سے واقف ہو جو کہیں حفاظت سے رکھا ہوا ہے؟“

جیول نے سر ہلایا۔ ”لیکن وہاں حملہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔“

کوپر نے ترغیب دی۔ ”ہم مشکل کام کرتے رہے ہیں۔“

”تم نے کرسل ریو کا نام سنا ہے۔“

کوپر نے ذہن پر زور دیا۔ ”وہی صحرائی قصبہ جو میکسیکو کی سرحد کے پاس ہے؟“

”بالکل وہی۔“ جیول نے سر ہلایا۔ ”سونا وہیں ہے۔“

کوپر نے بے یقینی سے کہا۔ ”وہ تو ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور راستوں سے ہٹ کر ہے۔“

”ایک چھوٹی سی وادی ہے، وہاں زیادہ تر کسان بستے ہیں۔“ جیول بولا۔ ”لیکن کسی زمانے میں اس سے کچھ دور ہونے کی ایک چھوٹی کان بھی تھی۔ اس کے مالک ہنری رسل نے کان سے سونا نکال لیا تھا۔ کان کنوں کی کمی کی وجہ سے کان بند کرنا پڑی تھی۔ پھر بھی اس نے خاصا سونا نکال لیا تھا مگر اسے فروخت نہیں کیا۔ اب وہ سونا اس کے بیٹے کے پاس ہے۔“

”سونا کہاں ہے... بینک میں یا اس کے گھر میں؟“

”سونا پولیس اسٹیشن میں ہے اور کان کے مالک کا بیٹا وہاں کا شیرف ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ وہاں حملہ کرنا کیوں اتنا مشکل کام ہے۔“

کوپر کی آنکھیں لالچ سے چمکنے لگی تھیں۔ ”اس کے باوجود کوشش کی جا سکتی ہے، دور دراز ہونے کی وجہ سے باہر سے کوئی مدد بھی نہیں آئے گی۔“

جیول سوچ میں پڑ گیا۔ ”کچی بات ہے میں نے بھی سنا ہے، یہ تصدیق شدہ کہانی نہیں ہے۔“

”ہم تصدیق کر سکتے ہیں۔“ کوپر عیاری سے بولا۔ ”وہیں چل کر... اگر سونا نہ بھی ہوا تو وہاں بینک اور لوگوں کے پاس مال تو ہوگا۔“

جیول نے اپنے چھ آدمیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ہم صرف آٹھ ہیں۔“

”باقی کی ہم وہاں سے پوری کر لیں گے۔ بکاؤ لوگ کہاں نہیں ہوتے ہیں۔“

جیول خود بھی سوچ رہا تھا کہ انہیں روپوشی کے لیے بھی دولت چاہیے ہوگی۔ اس نے سر ہلایا تو کوپر خوش ہو گیا۔ اس نے اسی وقت جا کر سب کے سامنے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ کرسل ریو یہاں سے کوئی تین سو میل کے فاصلے پر تھا۔

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
دہکتے جنون کی سنگینیاں
مہکتے جاسوسی کی رنگینیاں
اولین سوغات ● زندگی اور موت کے درمیان جاری خوفناک کھیل کا ماجرا۔ ایچ اقبال کی سحر انگیزی
آوارہ گرد ● دکھ سکھ کے شریک ساتھیوں کی ایک نرالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی تلاش کا سمار درپیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شمولیت
جواری ● احمد اقبال کے شہر بار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز
مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی پرورده ناقابل فراموش کہانیاں
سرورق کی کہانیاں
پہلی کہانی ● ایک بچی کے اغوا کا سنسنی خیز احوال... اسما قادری کا سرورق
دوسری کہانی ● دیوانگی کی حد کو چھو لینے والی چاہ کا دلنشیں قصہ... کاشف زبیر کی پُراثر تحریر
چیلی چٹکتی چیلی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں
اور نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں




SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہوں نے آنے والی رات بھی اسی وادی میں گزاری۔ اگلی صبح وہ تازہ دم ہو کر کرسل ریو کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مسلسل سفر کر کے وہ اگلے دن دوپہر میں کرسل ریو میں داخل ہوئے۔ یہ چھوٹا سا پرامن قصبہ تھا کیونکہ وہاں لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی اپنی عورتوں اور بچوں کو گھروں میں کر کے دروازے بند کر لیے تھے۔ ان لوگوں کے پاس اسلحہ تھا مگر مجموعی طور پر وہ پرامن نظر آرہے تھے۔ وہ سب قصبے کے مرکزی چوک پر واقع بار میں پہنچے۔ یہاں بازار بھی تھا۔ یہیں دو بارز اور ایک ہوٹل تھا۔ مکانات کی خوب صورتی اور حالت سے لگ رہا تھا کہ قصبے کے لوگ خوش حال تھے۔ زرخیز زمین اور زیرِ آب پانی کی موجودگی یہاں کی خوشحالی کی بنیادی وجہ تھی۔ بار میں انہیں نہ صرف اپنے مطلب کے لوگ مل گئے بلکہ معلومات بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ یہاں سچ مچ سونا تھا اور ایک اندازے کے مطابق اس کا وزن دو سو کلوگرام سے زیادہ تھا۔

☆☆☆

شیرف کرس رسل جوان آدمی اور شادی شدہ تھا۔ اس کا عالی شان مکان قصبے کے وسط میں تھا۔ اس کی بیوی مالینا خوب صورت عورت تھی اور دو بچوں کے باوجود اس کی خوبصورتی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس وقت وہ پولیس اسٹیشن آئی ہوئی تھی۔ وہ کرس اور اس کے ساتھیوں کے لیے شام کی چائے لائی تھی۔ ساتھ میں گھر کے بنے ہوئے بسکٹ تھے۔ اس نے کرس کے لیے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ دیر پہلے آٹھ اجنبی افراد جو بہت زیادہ مسلح ہیں قصبے میں آئے ہیں اور اس وقت بنڈی کے بار میں ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ کرس نے بے پروائی سے کہا۔ ”تم فکر مت کرو وہ کتنے ہی مسلح کیوں نہ ہوں میرا اور میرے ساتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔“

مالینا نے غور سے کرس کو دیکھا۔ ”دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”ہے شیرف...“ کرس کے ڈپٹی ایڈم نے پکار کر کہا۔ ”بہتر ہوگا تم دفتر گھر لے جاؤ۔“

اس پر ایک قہقہہ پڑا تھا۔ کرس مسکرانے لگا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے، مالینا بہت سمجھدار خاتون ہے۔“

”عورت کی سمجھ اس کے سر میں نہیں اس کے لباس میں چھپی ہوتی ہے اس لحاظ سے مالینا بہت سمجھدار ہے۔“ ایڈم نے پھر کہا تو ایک قہقہہ اور گونجا۔ کرس یا مالینا نے اس مذاق کا برا نہیں منایا۔ وہ سب ایک خاندان کی طرح تھے۔ کرس نے کہا۔

”بہتر ہوگا اب تم رخصت ہو جاؤ۔“

جس وقت مالینا پولیس اسٹیشن سے نکل رہی تھی سامنے سڑک پار ہوٹل کی اوپری منزل کے ایک کمرے سے کوپر اور جیول جھانک رہے تھے۔ کوپر نے مالینا کو دیکھ کر کہا۔ ”خوب صورت عورت ہے۔“

”ہم یہاں عورتوں کے لیے نہیں سونے کے لیے آئے ہیں۔“ جیول نے اسے یاد دلایا۔ ”جب سونا آجائے گا تو عورتیں خود ہمارے پیچھے آئیں گی۔“

کوپر نے پُرخیال نظروں سے دور تک پھیلے قصبے کا جائزہ لیا۔ ”میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم اس قصبے پر قبضہ کر لیں؟“

جیول نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تمہارا دماغ درست ہے، ہم آٹھ افراد اس قصبے پر کیسے قبضہ کر سکتے ہیں جس میں کم سے کم ڈھائی ہزار لوگ رہتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے ایسا سوچنا بھی مت، ہمیں صرف سونا لینا ہے اور اپنی راہ لینی ہے۔“

کوپر نے پینترا بدلا۔ ”میں نے صرف خیال ظاہر کیا ہے۔“

جیول نے اس دوران میں ایک قابلِ عمل منصوبہ بنا لیا تھا۔ پولیس اسٹیشن کے عقب میں ایک گودام تھا۔ انہیں پہلے پولیس کو سامنے سے الجھانا تھا۔ اس دوران میں وہ خاموشی سے گودام پر قبضہ کر کے اس کی پولیس اسٹیشن سے ملی دیوار ڈائنامائٹ سے اڑا دیتے اور سونا نکال لیتے۔ ان کے آدمی قصبے سے جرائم پیشہ لوگوں کو بھرتی کر رہے تھے۔ ان کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی اور ان میں سے اکثر شیرف کرس کے زخم خوردہ تھے اس لیے وہ خوشی خوشی ان کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ رات آٹھ بجے تک جب کہ سرد ترین برفانی ہواؤں کی وجہ سے پورا قصبہ سنسان ہو گیا تھا وہ اپنے پلان پر عمل درآمد کے لیے نکلے۔ ایک درجن افراد نے چوک کے چاروں طرف مورچے لگا لیے تاکہ کوئی پولیس اسٹیشن نہ جا سکے۔ سات افراد سامنے تھے۔ جیول اور کوپر کے ہمراہ تین افراد عقبی گودام تک پہنچے تھے۔ انہوں نے وہاں موجود دو ملازموں کو خاموشی سے قابو کر کے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر دیوار کے ساتھ ڈائنامائٹ کے بنڈل لگانے لگے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پولیس اسٹیشن کے سامنے موجود افراد نے سڑک پار کی۔ پولیس چوکنا ہوئی تھی۔ دو پولیس والے سامنے ہی ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے جیول کے آدمیوں کو للکارا اور فوراً ہی تصادم شروع ہو گیا۔ کئی اطراف سے ہونے والی فائرنگ نے دونوں پولیس والوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ اس دوران میں کئی افراد دوڑ کر پولیس اسٹیشن کے برآمدے تک پہنچ گئے اور کھڑکی اور دروازوں سے اندر گولیاں برسانے لگے۔ اندر موجود کرس اور ایڈم کے ساتھ نصف درجن پولیس والے محصور ہو گئے تھے۔ وہ جواب دے رہے تھے مگر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اسی اثنا میں فائرنگ کی آواز سن کر چھٹی پر موجود پولیس اہلکار اور کچھ قانون پسند شہری باہر آئے تو وہ گلیوں میں موجود جیول کے ساتھیوں کا نشانہ بننے لگے۔ چند منٹ کے اندر پورا قصبہ میدان جنگ بن گیا تھا۔

جس وقت تصادم عروج پر تھا۔ جیول نے اصطبل کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی دیوار میں نصب ڈائنامائٹس کو آگ دکھا دی اور خوفناک دھماکوں نے پوری دیوار گرا دی تھی۔ کرس اور اس کے ساتھیوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح سے بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ دیواریں گرنے سے تین پولیس والے مارے گئے اور دو زخمی ہوئے تھے۔ ابھی اندر دھواں بھرا ہوا تھا کہ جیول اور اس کے ساتھی اندر داخل ہوئے۔ کوپر نے حکم دیا کہ ہر شخص کو گولی مار دی جائے چاہے وہ ہتھیار پھینک دے۔ جیول کو اس سے اتفاق نہیں تھا مگر یہ وقت اختلاف میں پڑنے کا بھی نہیں تھا۔ کوپر اور اس نے آدمیوں نے سوائے کرس کے سب کو شوٹ کر دیا۔ صرف کرس کو زندہ پکڑا تھا۔ سونا ایک فولادی پنجرے میں لکڑی کی پیٹیوں میں بند تھا۔ دروازے پر کئی مضبوط ترین تالے لگے ہوئے تھے مگر چند گولیوں نے ان تالوں کو آسانی سے کھول دیا۔

ساڑھے آٹھ بجے شروع ہونے والی جنگ ساڑھے نو بجے ختم ہو چکی تھی۔ اس میں تقریباً تین درجن افراد مارے گئے تھے اور ان کے بھی دو ساتھی مارے گئے تھے۔ مگر جیول یا کوپر کو اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے اصل کامیابی حاصل کر لی تھی۔ سونا ان کے قبضے میں آگیا تھا۔ لکڑی کی بیس پیٹیاں تھیں اور ہر ایک میں دس کلوگرام خالص سونا تھا۔ یہ پیٹیاں کوپر کے آدمیوں کی نگرانی میں بنڈی کے بار منتقل کی گئی تھیں، اب بنڈی بھی ان کے ساتھ تھا۔ شیرف کرس نے اسے یہاں جوا خانہ کھولنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ اس طرح یہاں آس پاس سے جرائم پیشہ آجاتے اور قصبے کا پُرسکون ماحول برباد ہو کر رہ جاتا۔ اس لیے بنڈی بھی کرس کا دشمن تھا۔ جیول اور کوپر جام کے ساتھ کامیابی کا جشن منا رہے تھے جبکہ کرس سامنے ایک ستون سے بندھا ہوا تھا۔ کوپر نے کہا۔

”ابھی اس کی بیوی بھی آجائے تو اس کا فیصلہ کرتے ہیں۔“

جیول کی بھوئیں تن گئی تھیں۔ ”اس کی بیوی... اس کا یہاں کیا کام ہے؟“

”میں اس کے سامنے اس کے شوہر کو اس دنیا سے رخصت کروں گا اور پھر اس کے ساتھ رات گزاروں گا۔ صبح سے پہلے اسے بھی اس کے شوہر کے پاس پہنچا دوں گا۔“

جیول نے نفی میں سر ہلایا، گلاس خالی کرتے ہوئے بولا۔ ”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہم ابھی سونا لیں گے اور یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، سورج نکلنے سے پہلے ہم یہاں سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ کل جب کسی محفوظ جگہ پہنچیں گے تو سونا تقسیم کر لیں گے۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ کوپر نے اپنے تمباکو زدہ دانت نکوس کر کہا۔ ”ضروری نہیں ہے میں اس سے اتفاق کروں۔“

یہ صریحاً بغاوت تھی۔ جیول کا ہاتھ تیزی سے پستول کی طرف گیا تھا لیکن اس سے پہلے کوپر نے اپنا پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ جیول کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کیا تم بغاوت کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“ کوپر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بغاوت اس کے خلاف کی جاتی ہے جو کبھی سربراہ ہو، تم سربراہ نہیں تھے۔“

”پھر تم نے مجھے کیوں بچایا؟“

”اس سونے کے لیے۔“ کوپر نے سر کی جنبش سے سونے کی طرف اشارہ کیا مگر اس کی نظریں اور پستول کا رخ جیول کی طرف ہی رہا تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیول کتنا شارپ شوٹر ہے۔ اسے موقع مل گیا تو وہ اسے سیکنڈ کے دوسرے حصے میں ڈھیر کر دے گا۔ ”صرف تم جانتے تھے کہ یہ سونا کہاں ہے۔ اسی لیے ہم نے جان پر کھیل کر تمہیں بچایا اور اب سونا مل گیا ہے اس لیے تمہاری ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ اگر تم نے مجھے مارا تو میرے آدمی تمہیں شوٹ کر دیں گے۔“ جیول کا لہجہ درشت ہو گیا۔

”تمہارے آدمی۔“ کوپر ہنسا اور گروہ کے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ”تم میں سے کون جیول کا ساتھی ہے؟“

”مگر کوئی آگے نہیں آیا۔“

”تم نے سن لیا ان کا جواب۔“ کوپر نے کہا۔ ”کوئی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔“

اسی لمحے دھڑ سے بار کا دروازہ کھلا اور دو آدمی کرس کی حسین بیوی کو بازوؤں سے پکڑتے ہوئے لائے۔ وہ بری طرح مچل رہی





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ اسے دیکھ کر کرس چلا اٹھا۔ "چھوڑ دو اسے۔"

کوپر کی نظر ایک لمحے کے لیے ہٹی تھی اور جیول نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا پستول نکالنا چاہا۔ مگر اس کے ہاتھ نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ بہ مشکل پستول نکال سکا تھا اور پھر وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ کوپر سکون سے اسے دیکھ رہا تھا، اس نے اپنا پستول بھی واپس رکھ لیا۔ جیول کا سر چکرا رہا تھا اور جسم سے جان نکل رہی تھی، اس نے شراب کے خالی گلاس کی طرف دیکھا اور بڑی مشکل سے بولا۔ "تم نے اس میں کچھ ملایا تھا؟"

کوپر مسکرایا۔ "ہاں ورنہ تم آسانی سے قابو میں آنے والے کہاں ہو۔ یہ بہت خطرناک زہر ہے جو تم نے پیا ہے اور اب تمہارے پاس بس چند منٹ اور ہیں۔"

جیول اسٹول سے اتر کر اس کی طرف بڑھا مگر اس کے قدموں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس نے ڈوبتی آنکھوں سے دیکھا، مالینا کو لا کر کرس کے سامنے پھینک دیا گیا۔ وہ چلا رہا تھا، مالینا بھی چلا رہی تھی۔ آخری منظر جو جیول نے دیکھا وہ کرس کی موت کا تھا۔ کوپر نے اچانک پستول نکال کر اسے کرس کے سینے پر خالی کر دیا تھا۔ مالینا نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیول کی آنکھیں بھی بند ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

جیول کو سب یاد آ گیا تھا۔ اس کے سینے کی جلن ٹھیک ہو گئی تھی اور کھال بھی دوبارہ سلامت ہو گئی۔ اب اسے پوری طرح یقین آ گیا کہ وہ جہنم میں ہے۔ چوغہ پوش شیطان نے پھر سلاخ اٹھائی تو وہ جلدی سے بولا۔ "ایک منٹ... ایک منٹ۔"

"کیا؟"

"یہ کب تک چلے گا؟ میرا مطلب ہے مجھے یوں اذیت دینے کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟"

"تمہیں اذیت نہیں سزا دی جا رہی ہے۔" شیطان نے کہا۔ "یہ ہمیشہ جاری رہے گا۔"

"ہمیشہ؟" وہ بے یقینی سے بولا۔ "کوئی کام ہمیشہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا کوئی نہ کوئی انجام تو ہو گا؟"

جواب میں شیطان نے ایک سلاخ اٹھا کر اس کے پیٹ سے لگا دی۔ اس پر تو بنا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر شدید درد و اذیت سے چلا اٹھا۔ شیطان نے اس کی تکلیف سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "اس کا کوئی انجام نہیں ہے تم ہمیشہ اذیتیں سہتے رہو گے۔ یہ دائمی زندگی ہے یہاں خوشی بھی دائمی ہوتی ہے اور اذیت بھی ہمیشہ کی ہوتی ہے۔"

"لعنت ہو۔" جیول چلایا۔ "اس کا کوئی حل تو ہو گا... میرے لیے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔"

"ہو گا۔" شیطان نے بے پروائی سے کہا اور سلاخ واپس بھڑکتی آگ میں ڈال دی۔ جیول گہری سانس لے رہا تھا، اس کا زخم پھر سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"دیکھو میں سانس لے رہا ہوں اس کا مطلب ہے میں زندہ ہوں دوسری صورت میں مجھے سانس لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم عادت کے مطابق سانس لے رہے ہو۔ اگر چاہو تو سانس روک کر دیکھ لو تمہیں کچھ نہیں ہو گا ہاں تکلیف ہو گی۔"

جیول نے سانس روک لی اور بہت دیر تک روکے رکھی، واقعی اسے کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ صرف دم گھٹنے کی کیفیت ہوئی تھی مگر یہ بھی جان لیوا نہیں تھی۔ شیطان درست کہہ رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی شیطان نے کڑاہے کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ جلدی سے بولا۔ "ایک منٹ رک جاؤ میری ایک بات سن لو۔"

"میں سن رہا ہوں۔" شیطان نے کڑاہے سے ایک نمبر والی سلاخ اٹھا کر اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تم شیطان ہو تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو گی تم مجھ سے سودا کر لو۔"

"مجھے صرف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ مجھے ملتے رہتے ہیں۔"

اس بار جیول کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ "تم نے کہا یہاں وہ شیطان اہمیت رکھتا ہے جس کے قبضے میں زیادہ سے زیادہ انسان ہوں۔ تم لوگ انسان کیسے حاصل کرتے ہو؟"

"ہم انسان چنتے ہیں... زندگی میں ان سے غلط کام کراتے ہیں اور جب وہ مرتے ہیں اور اپنے کرتوتوں کی وجہ سے جہنم کے حقدار ہوتے ہیں تو وہ ہمارے حوالے کیے جاتے ہیں۔"

"تم مجھ سے ایک معاہدہ کر لو... میں تمہیں اپنے بدلے چھ آدمی دوں گا۔"

شیطان پہلی بار چونکا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب واضح ہے، تم مجھے چھوڑ دو میں اپنے بدلے تمہیں چھ آدمی دوں گا۔"

شیطان نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے... اگر وہ انسان جہنم کے مستحق نہ ہوئے تو مجھے نہیں ملیں گے اور میں نے آج تک کسی انسان سے معاہدہ نہیں کیا ہے۔"



"حالانکہ شیطان تو مشہور ہی اپنے معاہدوں کے لیے ہے جو وہ انسانوں سے کرتا ہے۔" جیول نے کہا۔ وہ پُر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شیطان نے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ اسے دوبارہ دنیا میں نہیں بھیج سکتا اس نے چھ انسانوں کے جہنمی ہونے پر شک کا اظہار کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اسے دنیا میں بھیج سکتا تھا۔ "میں جن انسانوں کی بات کر رہا ہوں ان میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ جہنم کے سزاوار ہو سکتے ہیں۔"

شیطان نے ایک بار پھر اپنا ہُڈ الٹ دیا اور اس کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "ایک کے بدلے چھ..."

"یہ اچھا سودا ہے۔" جیول نے اسے ترغیب دی۔ "تم طاقتور ہو اگر میں معاہدہ پورا نہ کر سکوں تو تم مجھے دوبارہ جہنم میں لا سکتے ہو۔"

"میں ایسا کر سکتا ہوں۔" شیطان نے غرور سے کہا۔

"تب تمہیں اس سودے کو قبول کر لینا چاہیے۔"

شیطان نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن میری ایک شرط ہو گی۔"

"کیسی شرط؟" جیول نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"تمہیں وہ چھ آدمی چوبیس گھنٹے میں دینا ہوں گے۔"

جیول نے سوچا اور مان گیا۔ "میں انہیں قتل کر دوں گا، اس کے بعد انہیں یہاں لانا تمہاری ذمے داری ہو گی۔"

"تم اس کی فکر مت کرو لیکن تم جسے قتل کرو گے اس کے ماتھے پر چاقو سے کراس کا نشان بناؤ گے۔" شیطان نے کہا۔ "جب تم اسے کسی کے ماتھے پر کراس کا نشان بناؤ گے تو سمجھو اس پر میری مہر لگ جائے گی اور وہ میرے پاس ہی آئے گا۔"

"ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا۔" جیول نے خوش ہو کر کہا۔ "تم مجھے کیسے واپس بھیجو گے؟"

"فکر مت کرو ابھی تمہیں پتا چل جائے گا۔" شیطان نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو۔"

جیول نے دیکھا، ایک گھڑی تھی جس میں سوئیوں نے دو کے ہندسے سے سفر شروع کر دیا تھا۔ شیطان نے کہا۔ "تمہارے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔"

☆☆☆

جیول کو ہوش آیا تو وہ کیچڑ میں پڑا ہوا تھا۔ ہلکی بارش ہو رہی تھی اور اس کا جسم نہایت سرد ہو رہا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھا تو اس نے دیکھا کہ وہ جانوروں کے لیے مخصوص ایک احاطے میں پڑا تھا اس موسم میں جانوروں کو اندر باندھا گیا تھا۔ اس لیے احاطہ خالی تھا۔ اس کا دل متلا رہا تھا اور پیٹ میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے بہ مشکل اٹھا اور اس نے بے ساختہ الٹی کر دی۔ اس کے پیٹ میں جو تھا وہ باہر آ گیا۔ الٹی کرتے ہی اسے سکون محسوس ہوا تھا اس نے جو زہر پیا تھا وہ نکل گیا تھا۔ پھر اسے شیطان اور جہنم کا خیال آیا۔ کیا اس نے بے ہوشی کی حالت میں کوئی خواب دیکھا تھا؟ کوپر کی بات بکواس ثابت ہوئی تھی زہر اتنا پُراثر نہیں تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ وہ بس بے ہوش ہوا تھا مگر پھر اسے وہ تکلیف یاد آئی جو اس نے شیطان کے ہاتھوں برداشت کی تھی تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر یہ کوئی خواب بھی تھا تو وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا اسے بہر صورت ان چھ کو آنے والے چوبیس گھنٹے میں قتل کرنا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ نزدیکی مکانوں کی کھڑکیوں سے جھلکتی روشنیاں ماحول کو کسی قدر روشن کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو اسے کچھ ہی دور چرچ کی عمارت دکھائی دی۔ اس نے پاس پڑا اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چرچ کی طرف بڑھا۔ بارش نے اس کے کپڑوں پر لگا ہوا کیچڑ صاف کر دیا تھا۔ عجیب بات تھی، اسے ٹھنڈ نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ بارش کا پانی قیامت خیز حد تک سرد تھا۔ وہ چرچ کے اندر آیا اور ڈائس کے سامنے ایک بینچ پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اندر سے بوڑھا پادری نمودار ہوا، اس نے نرم لہجے میں جیول سے پوچھا۔

"تم کون ہو میرے بچے؟"

"میں یہاں پناہ کے لیے آیا ہوں۔" جیول نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یہ خدا کا گھر ہے۔" پادری نے ہمدردی سے کہا۔ "تمہارا لباس بھیگا ہوا ہے تمہیں خشک لباس اور گرمائش کی ضرورت ہے۔"

پادری اسے ایک عقبی کمرے میں لایا جہاں آتش دان میں آگ روشن تھی اسے دوسرے کپڑوں کی ضرورت تھی کیونکہ ان میں وہ دور سے پہچانا جاتا۔ پادری نے اسے ایک پتلون، شرٹ اور اس کے سائز کی جیکٹ لا دی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کیا۔ اس کی بیلٹ سے پستول غائب تھا۔ وہ یقیناً اسے اس احاطے میں پھینکنے والوں نے ہتھیا لیا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگا، صرف پستول ہی نہیں اس کی جیبوں سے سب کچھ غائب تھا۔ جیول نے فادر کی طرف دیکھا۔ ''مجھے اسلحے کی ضرورت ہے۔''

پادری نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چرچ میں اسلحے کا کیا کام؟''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو مجھے کہیں اور سے بندوبست کرنا ہوگا۔'' جیول نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''فادر یہ بتاؤ یہاں خالی تابوت ہیں؟''

بوڑھا پادری چونکا۔ ''ہاں مگر تمہیں کیا کرنا ہے میرے بچے؟''

''کچھ لاشوں کے لیے ان کی ضرورت پڑے گی۔ مہربانی کرکے چھ تابوت چرچ کے سامنے والے حصے میں رکھوا دو۔ میں ان کی ادائیگی کروں گا اور تمہیں ان کی آخری رسومات ادا کرنا ہوں گی۔''

☆☆☆

کوپر نے فاتحانہ نظروں سے مالینا کی طرف دیکھا جو بستر پر یوں لیٹی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ بیڈ کے سرہانے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا پھٹا ہوا لباس اور خراش خراش جسم بتا رہا تھا کہ اس پر کیا گزر چکی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ گال اور ہونٹ سرخ اور زخمی تھے۔ کوپر نے اس پر تشدد بھی کیا تھا۔ کوپر اپنے لیے جام بنا رہا تھا۔ اس نے نصف گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر مالینا سے پوچھا۔ ''تم پیو گی؟''

جواب میں اس نے کوپر پر تھوک دیا اور چلائی۔ ''کتے مجھے بھی مار دے۔''

''جلد تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوگی۔'' کوپر نے خالی گلاس دیوار پر دے مارا اور مالینا کی طرف بڑھا۔ ''لیکن پہلے مجھے اپنی حسرت تو پوری کر لینے دو۔''

کوپر کے پانچ ساتھی مختلف جگہوں پر تھے۔ ان میں سے دو گیرٹ اور چارلی، بنڈی کے بار میں بیٹھے تھے اور نشے کی حالت میں مختلف چیزوں پر نشانے بازی کی مشق کر رہے تھے۔ ان کے ذمے سونے کی حفاظت تھی مگر انہوں نے بنڈی کا بار تقریباً تباہ کر دیا تھا اور اب وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے کن شیطانوں کی مدد کی تھی۔ یہ لوگ تو پورے قصبے کو تباہ کر کے جاتے۔ بنڈی بار کے عقبی حصے میں تھا جہاں اس کی شرابیں ذخیرہ تھیں اور اب اسے اپنی تمام عمر کی جمع پونجی بھی خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ ان لوگوں نے کرسل ریو کے تمام اوباشوں کو ساتھ ملا کر ایسے تمام افراد کا خاتمہ کر دیا تھا جو ان کے سامنے مزاحمت کر سکتے تھے۔ اس وقت کرسل ریو کا ہر دوسرا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ جہاں کوئی مرا نہیں تھا وہاں لوگ اپنی آبرو اور مال کو رو رہے تھے۔ اچانک دروازے پر کھٹکا ہوا تو بنڈی بھڑکا اسے لگا شاید کوئی پھر یہاں بھی آن پہنچا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو اسے دھکا لگا اور وہ پیچھے آ گرا۔ یہ دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی کہ دروازے پر جیول کھڑا تھا جس کی شراب میں اس نے خود کوپر کا دیا ہوا زہر ملایا تھا۔ وہ اسے گھورتا ہوا اندر آیا اور دروازہ بند کر لیا۔ بنڈی کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اس نے ہکلا کر کہا۔ ''تم... تم تو مر گئے تھے۔''

''ہاں، میں جہنم سے آیا ہوں کچھ لوگوں کو جہنم بھیجنے کے لیے، اگر تم ان میں شامل نہیں ہونا چاہتے تو میرے حکم پر بلا چوں چرا عمل کرنا۔''

''میں کروں گا۔'' بنڈی نے گڑگڑا کر کہا۔ ''میں نے ان لوگوں کا ساتھ دے کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ کوپر کے دو آدمی میرے بار میں ہیں اور تم سن رہے ہو وہ نشے میں وحشت ہو کر فائرنگ کر رہے ہیں۔''

''یہ اچھی بات ہے وہ نشے میں وحشت ہیں۔'' جیول نے وہاں رکھی شراب کے ڈرم کھولنے والی، آگے سے نوکیلی اور دھار والی سلاخ اٹھائی اور بار کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا کہ کل تک اس کے قدموں میں لوٹنے والے آج اس کی موت کا جشن منا رہے تھے۔ اس بار زیر لب کہا۔ ''تم لوگوں کو یہ جشن مہنگا پڑے گا۔''

ایک منٹ سے پہلے گیرٹ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور چارلی تھر تھر کانپ رہا تھا صرف اس کی گردن سا... جہاں لوہے کی خون آلود سلاخ لگی تھی اور خون گیرٹ کا تھا۔ جیول نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''کوپر اور باقی سب کہاں ہیں؟''

''کوپر ہوٹل والے کمرے میں ہے۔'' چارلی نے جلدی سے جواب دیا۔ ''باردن، جیسن اور ڈیوڈ کا مجھے نہیں معلوم۔ پلیز میرا یقین کرو۔''

''مجھے یقین ہے۔'' جیول نے اسی لہجے میں کہا اور سلاخ چارلی کی گردن میں اتار دی۔ پھر اس نے تیزی سے ان کا اسلحہ سمیٹا اور بنڈی کو بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ دونوں کی لاشیں دیکھ کر بنڈی دل و جان سے اس کے حکم پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ کیونکہ جیول نے کوئی گولی نہیں چلائی تھی اس لیے باہر موجود کوپر کے مقامی زرخریدوں کو پتا نہیں چلا تھا۔ بارش بدستور جاری تھی مگر لیدر جیکٹ




پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کسی حد تک محفوظ تھا اور اگر بھیگ بھی جاتا تو اسے فرق نہیں پڑتا۔ اب چار باقی رہ گئے لیکن وہ کوپر سے پہلے بارون، ڈیوڈ اور جیسن کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔

اسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ اس کے پاس چوبیس گھنٹے ہیں بلکہ اس میں سے بھی تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ گلیوں میں زرخرید بدمعاش مفت کی شرابیں پیتے ہوئے جاگ رہے تھے۔ جیول نے دیکھا ہوٹل کے علاوہ دو مکانوں کے سامنے یہ بڑی تعداد میں جمع تھے اس کا مطلب تھا۔ اس کے مطلوب افراد میں سے کوئی یہاں تھا۔ اس نے مکانات کا جائزہ لیا مگر خاموشی سے اندر گھسنے کی کوئی راہ نظر نہیں آئی تھی۔ ابھی وہ کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا۔ جیول کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ انتظار کرے۔

☆☆☆

مالینا اپنی ذلت کے ساتھ ساتھ کرس کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ اس شخص نے نہایت سفاکی سے اس کے سامنے کرس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو کوپر کا چہرہ بگڑ گیا تھا، اس نے غرّا کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”باس ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ باہر سے بارون کی آواز آئی۔ کوپر ایک جھٹکے سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا، اس نے دروازہ کھولا۔ بارون سامنے متفکر چہرہ لیے کھڑا تھا۔

”باس، گیرٹ اور چارلی بار سے غائب ہیں۔“

”غائب ہیں کیا مطلب؟“

”وہ... وہ بار کے اندر نہیں ہیں۔“ بارون ہکلایا۔ ”باہر موجود آدمیوں کا کہنا ہے وہ باہر نہیں نکلے... اندر نشے میں فائرنگ کر رہے تھے پھر اچانک خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اندر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھے۔“

”سونا موجود ہے؟“

”وہ ہے باس۔“

”بنڈی کہاں ہے؟“ کوپر نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

”وہ بھی غائب ہے شراب خانہ خالی پڑا ہے۔“

”انہیں تلاش کرو، اپنے آدمیوں کو جمع کر لو۔ جیسن اور ڈیوڈ کہاں ہیں؟“

”وہ دو گھروں میں ہیں، انہیں یہاں کی لڑکیاں پسند آ گئی ہیں۔“

”انہیں بھی بلاؤ۔“ کوپر نے دروازہ بند کیا اور کپڑے پہننے لگا، اس نے مالینا کی طرف دیکھا اور دانت نکوس کر بولا۔ ”بے بی میں ابھی آتا ہوں۔ پھر تمہارے ساتھ ایک آخری راؤنڈ ہوگا جو تمہاری زندگی کا آخری راؤنڈ بھی ہوگا۔“

کوپر کے باہر جاتے ہی مالینا جو اب تک بے بسی سے ستم برداشت کر رہی تھی خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اس کی کلائیوں کی بندشیں نہایت سخت تھیں۔

☆☆☆

جیول اب چرچ کی طرف جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا بنڈی نے اپنا کام کر دیا ہوگا اور اس سے پہلے فادر نے چھ تابوتوں کا انتظام کر دیا ہوگا۔ چرچ کے صحن میں دیوار کے ساتھ چھ تابوت پڑے تھے اور ان میں سے دو میں گیرٹ اور چارلی کی لاشیں موجود تھیں۔ جیول نے چاقو نکالا اور پہلے چارلی کے ماتھے پر اس کی نوک سے کراس بنایا۔ پھر وہ گیرٹ کے ماتھے پر کراس بنانے جا رہا تھا کہ رک گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد جیول نے چاقو واپس رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک تہائی کام مکمل کر لیا تھا اور باقی چار کے لیے اس کے پاس تقریباً بیس گھنٹے تھے۔

☆☆☆

وہ چاروں بنڈی کے بار میں جمع تھے کیونکہ سونا یہیں تھا۔ ایک کرگا بارمین کے فرائض انجام دے رہا تھا اور ان کے گلاس خالی ہوتے ہی بھر دیتا تھا۔ کوپر نے کہا۔ ”وہ دونوں غائب نہیں ہوئے، کیے گئے ہیں۔ یہ دیکھو یہاں خون پڑا ہے یہ پہلے نہیں تھا۔“ اس نے فرش پر لگے دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کے ساتھ پہلے کچھ ہوا اور پھر انہیں کھینچ کر یہاں سے لے جایا گیا ہے۔“

فرش پر کھینچنے کے نشانات بھی تھے۔ بارون نے نشانات کا تعاقب کیا اور واپس آکر رپورٹ دی۔ ”یہ عقبی دروازے تک گئے ہیں۔“

کوپر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس کام میں بنڈی ملوث ہے، اسے تلاش کرو۔“

ڈیوڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے وہ بزدل آدمی ہے اسے معلوم ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔“

”اگر یہ کسی اور نے کیا ہے تب بھی وہ شامل ہے اسے تلاش کرو وہی بتائے گا۔“

جیول نے بھیڑ کے اون کا بنا ہوا ایک کھلا سوئیٹر پہنا ہوا تھا۔ اس میں آستینیں نہیں تھیں۔ یہ اس نے ایک احاطے کی دیوار سے اٹھایا تھا۔ پھر اس نے ایک جگہ سے ہیٹ چرایا۔ یہ خاصا بڑا تھا اور اس کا چہرہ اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ وہ اس وقت بنڈی کے بار کے پاس تھا۔ یقیناً گیرٹ اور چارلی کی غیر موجودگی محسوس کر لی گئی تھی اور اب انہیں تلاش کیا جا رہا تھا۔ کوپر کے تمام زرخرید بہت چوکنا انداز میں بار کے آس پاس پھیلے ہوئے تھے اور ان میں سے کچھ ہوٹل کے سامنے پہرا دینے کے انداز میں موجود تھے۔ کوپر بھی وہیں تھا۔ جیول کو شیرف کرس کی بیوی کا خیال آیا۔ شاید کوپر نے اسے ہوٹل میں رکھا ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کے ساتھ والی گلی میں آیا۔ آس پاس کسی کو نہ پا کر وہ ایک پائپ کے سہارے اوپر چھت تک پہنچا اور یہاں ایک کھڑکی سے اندر داخل ہو گیا۔ کھڑکی ایک گیلری میں کھل رہی تھی جس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ وہ اس کمرے تک آیا جو اس نے لیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر آیا تو بستر سے بندھی مالینا اسے دیکھ کر سہم گئی اور جب اس نے چاقو نکالا تو اس کے حلق سے گھٹی سی چیخ نکلنے والی تھی کہ جیول کا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ اس نے چاقو سے مالینا کی بندشیں کاٹ دیں اور آہستہ سے بولا۔

”کپڑے پہنو۔“

مالینا نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے جلدی سے لباس پہنا اور بولی۔ ”تمہیں تو زہر دیا گیا تھا۔“

”ہاں میں مر گیا تھا۔“ اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا، مالینا اس کے پیچھے آئی۔

”تم یہاں کیسے آئے؟“

”تمہیں آزاد کرانے۔“ جیول نے جواب دیا۔ اس نے پہلے مالینا کو نیچے اتارا اور پھر خود بھی نیچے اتر آیا۔ ”یہاں تمہارے پاس کوئی ٹھکانا ہے۔“

”ہاں۔“ مالینا سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بولی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ اسے ایک چھوٹے سے کیبن میں لائی۔ یہ کرسل ریو کے آخری حصے میں تھا۔ بظاہر غیر آباد تھا۔ مگر یہاں ضرورت کی بہت سی چیزیں تھیں۔ مالینا نے ایک صندوق سے پینٹ شرٹ اور جیکٹ نکالی اور ایک پردے کے پیچھے لباس تبدیل کرنے لگی۔ پھر اس نے ایک اور صندوق سے اسلحہ نکالا، اس میں جدید وضع کا ریوالور اور ایک رائفل تھی۔ اس نے جیول سے کہا۔ ”میں نے خود تمہیں گرتے اور دم توڑتے دیکھا تھا۔“

وہ ایک صندوق پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”یہ سچ ہے، میں مر گیا تھا اور جہنم سے ہو کر واپس آیا ہوں۔ ان چھ کو جہنم بھیجنے کے لیے۔“

”تم اپنے ساتھیوں کی بات کر رہے ہو؟“ مالینا اپنی پتلی کمر سے ہولسٹر باندھتے ہوئے بولی۔ ”تمہاری ان سے دشمنی ہو گئی تھی؟“

”ہاں میں چاہتا تھا ہم سونا لے کر یہاں سے نکل جائیں مگر کوپر دوسرے چکر میں تھا۔“

”کوپر۔“ مالینا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”اسے میں اپنے ہاتھ سے ماروں گی۔“

”بالکل نہیں۔“ جیول غرّایا۔ ”ان چھ کو میں نے اپنے ہاتھ سے مارنے کا معاہدہ کیا ہے ورنہ میں واپس جہنم بھیج دیا جاؤں گا۔“

مالینا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”تم نہیں سمجھو گی بس اتنا یاد رکھنا اگر کسی نے ان باقی چار میں سے کسی کو مارا تو میں اسے مار دوں گا۔“

”باقی چار۔“ وہ چونکی۔

”ہاں دو کو میں ٹھکانے لگا چکا ہوں ان کی لاشیں چرچ کے سامنے رکھے تابوتوں میں موجود ہیں۔ اب کوپر سمیت چار باقی ہیں، مجھے رات دو بجے سے پہلے انہیں ٹھکانے لگانا ہے۔“

مالینا کی سمجھ میں اس خوفناک صورت شخص کی بات نہیں آئی تھی مگر وہ خود میں اس سے اختلاف کی ہمت نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

کوپر، بارون، جیسن اور ڈیوڈ چرچ کے سامنے پڑے تابوتوں میں گیرٹ اور چارلی کی لاشیں دیکھ رہے تھے، انہیں پہنچتے ہی اطلاع ملی اور لاشیں دیکھتے ہی کوپر نے جیول کی لاش چیک کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ چاروں سر سے پاؤں تک مسلح تھے اور ان کے ساتھ درجن بھر مسلح افراد بھی تھے۔ کوپر نے تابوتوں کے پاس بیٹھ کر دیکھا اور دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ چارلی کے ماتھے پر کراس بنا ہوا تھا۔ یہ کسی تیز دھار اور نوک والے آلے سے بنایا گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ اسی کی حرکت ہے۔“

چند منٹ بعد اطلاع ملی کہ احاطے سے جیول کی لاش غائب ہے۔ ڈیوڈ نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے... وہ مر چکا ہے۔“

”سارا قصور بنڈی کا ہے اس نے ٹھیک سے زہر نہیں ملایا ہوگا۔“ کوپر غرایا۔ ”اسے اب تک تلاش کیوں نہیں کیا




SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔''

''اتنے بڑے قصبے میں اسے تلاش کرنا ناممکن ہے۔'' جیسن نے کہا۔

''اس کے گھر پر دیکھو۔''

''وہ بار کے اوپر رہتا تھا اور اکیلا آدمی ہے اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' جیسن نے اطلاع دی۔ ''اگر جیول سچ مچ زندہ ہے تو ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے وہ بھیڑیے کی طرح عیار اور سفاک ہے۔''

ڈیوڈ بولا۔ ''میرا تو خیال ہے ہمیں سونا لے کر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

کوپر نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''صرف یہ سونا اصل مقصد نہیں ہے اصل مقصد کان میں موجود باقی سونا ہے ہم یہاں کے لوگوں سے بیگار کرا کے چند ہفتے میں وہ سارا سونا نکال سکتے ہیں اس کے بعد ہم میں سے ہر شخص کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ وہ اس جیسا کوئی بھی قصبہ خرید سکتا ہے۔''

''مگر اب ہم چار رہ گئے ہیں اور ان کی تعداد بھی ایک درجن سے زیادہ نہیں ہے۔'' ڈیوڈ نے کہا اس کا اشارہ مقامی بدمعاشوں کی طرف تھا۔

''جیسے ہی موسم بہتر ہوگا ہم مزید لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کرلیں گے۔''

بارون، ڈیوڈ اور جیسن مطمئن نظر آنے لگے۔ سو افراد کی مدد سے وہ بیچ اس پورے قصبے کو قابو میں رکھ سکتے تھے اور کان سے سونا بھی نکلوا سکتے تھے۔ کوپر نے کہا۔ ''لیکن پہلے جیول کو جہنم رسید کرنا ہوگا۔ اسے تلاش کرو چاہے پورے قصبے کی تلاشی لینی پڑے۔''

وہ چاروں کئی کئی مسلح افراد لے کر چاروں طرف روانہ ہوگئے تھے۔

☆☆☆

''میں تمہاری مدد کروں گی۔'' مالینا نے کہا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' جیول نے کہا۔ ''ہاں تم اپنے لوگوں کی مدد ضرور کرسکتی ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''کوپر اور اس کے آدمیوں نے مقامی بدمعاشوں کو ساتھ ملا کر تمام پولیس والوں اور قصبے کے ایسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا جو لڑنے والے اور قیادت کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے پورے قصبے پر قبضہ کرلیا ہوگا۔ ان کے جشن منانے کے انداز سے ایسا ہی لگ رہا ہے کہ انہیں اب کسی سے خطرہ نہیں ہے۔''

''تب میں کیا کرسکتی ہوں؟'' مالینا مایوسی سے بولی۔ ''میں لڑکر مرسکتی ہوں لیکن مرنے سے پہلے میں کوپر کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں۔''

جیول نے اسے غور سے دیکھا۔ ''جو لوگ لڑکر مرسکتے ہیں وہ بہادر ہوتے ہیں۔ تم شیرف کی بیوی ہو۔ تم میں لیڈ کرنے کی صلاحیت ہے۔ تم ان لوگوں کو تلاش کرو جو تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں اور پھر ان بدمعاشوں کا مقابلہ کرو۔ میں ان چاروں کو ختم کرکے تمہاری مدد کرسکتا ہوں لیکن ایک بار پھر بتادوں وہ چاروں میرا شکار ہیں اگر کسی نے انہیں مارا تو میں اسے ضرور مار دوں گا۔ یہ میرے لیے زندگی اور موت سے بھی بڑا مسئلہ ہے۔''

مالینا نے کچھ سوچا اور سر ہلایا۔ ''تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔''

''روشنی ہوگئی ہے، بہتر ہے اپنا حلیہ بدل لو یا چہرہ چھپا لو۔ وہ لوگ تمہیں اور مجھے تلاش کررہے ہوں گے۔'' جیول کہتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ اس کے پاس دو ریوالور اور ایک رائفل تھی۔ اسلحے کے لحاظ سے صورتِ حال تسلی بخش تھی لیکن وہ اکیلا تھا۔ اس کا مقابلہ صرف ان چار افراد سے نہیں تھا بلکہ ان کے ساتھ ایک درجن لوگ اور بھی تھے۔ اس کے باوجود اسے اپنا کام کرنا تھا اور اس کے پاس اب صرف اٹھارہ گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنا اسلحہ کھلے سوئٹر تلے چھپایا۔ ہیٹ سر پر جھکایا اور باہر نکل آیا۔ اس کا رخ وسط قصبے کی طرف تھا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے جیسن کو تین مسلح آدمیوں کے ہمراہ اسی طرف آتے دیکھا۔ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ اس کا ایک شکار خود دوسروں سے الگ ہوکر اس طرف آرہا تھا۔ یہ اس کے لیے آسانی تھی۔ اگر وہ چاروں ایک ساتھ ہوتے تو انہیں ختم کرنا بہت مشکل ہوجاتا۔ وہ مکانوں کی آڑ لیتا ہوا ان پر نظر رکھنے لگا۔ وہ مکانوں میں گھس گھس کر دیکھ رہے تھے اور جو لوگ مزاحمت کررہے تھے انہیں تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے۔

پھر وقت بچانے کے لیے وہ چاروں الگ الگ گھروں میں گھسنے لگے۔ وہ دو دو کرکے دائیں بائیں کے مکانات میں گھس رہے تھے۔ جس طرف جیسن اور ایک آدمی تھا۔ جیول نے اس کے ایک مکان کو دیکھا اور وہ عقبی سمت سے مکان کے صحن میں داخل ہوا۔ اس نے عقبی برآمدے میں کھلنے والے دروازے کو چیک کیا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ جیول اندر جانے کے بجائے وہیں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مکان کا سامنے والا دروازہ دھڑ سے کھلا۔



جیول نے ایک اجنبی آواز سنی۔ وہ کسی عورت سے پوچھ رہا تھا پھر ایک سہمی ہوئی مردانہ آواز آئی۔ جیسن کا ساتھی بدمعاشی دکھا رہا تھا وہ مرد اور عورت کو تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ جیول نے مداخلت نہیں کی وہ چپ کھڑا رہا۔ اسے انتظار تھا کہ وہ عقبی صحن کی طرف آئے۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ اس نے نہایت بے پروائی سے دروازہ کھولا اور اس کا خمیازہ بھگتا۔ جیول نے رائفل کا دستہ اس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکھڑا کر اندر جا گرا اور جیول نے اندر آتے ہوئے لات مار کر دروازہ بند کرکے اس پر رائفل تان لی۔

''تم وہی ہو۔'' اس نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں وہی ہوں۔'' جیول نے دوسری بار دستہ مارا تو وہ بے ہوش ہوگیا۔ دونوں مرد و عورت سہمے ہوئے ایک گوشے میں دبکے ہوئے تھے، مرد کے چہرے پر زخم کے نشانات تھے۔ جیول نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ڈرو مت... یہاں کوئی محفوظ جگہ ہے؟''

''نہیں۔'' مرد نے کہا۔

''تب تم دونوں یہاں سے نکل جاؤ۔ دوبارہ یہاں مت آنا کم سے کم آج کے دن۔''

مرد اور عورت نے نہایت پھرتی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ان کے جانے کے بعد جیول نے بے ہوش بدمعاش کو کرسی پر یوں بٹھایا جیسے وہ آرام کررہا ہو پھر اس کا ہیٹ بھی اس کے سر پر جھکا دیا۔ اس کے بعد اس نے خود دروازے کے عقب میں پوزیشن لے لی۔ اسے معلوم تھا جلدی یا بدیر دوسرے اسے دیکھنے آئیں گے۔ اس کا اندازہ درست نکلا جب دروازے پر کسی نے دستک دی اور بلند آواز سے کہا۔ ''باہر آؤ۔''

آواز جیسن کی تھی۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو جیسن نے لات مار کر دروازہ کھولا اور جلدی سے آڑ میں ہوگیا پھر اپنے آدمی کو آرام سے کرسی پر براجمان دیکھ کر وہ تیزی سے اندر آیا اور جیول نے اس کی گدی پر وار کیا، وہ اپنے آدمی پر گرا اور اسے لیتا ہوا کرسی سمیت فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اتنی دیر میں جیول دروازہ بند کرچکا تھا۔ وہ آگے بڑھا اس نے جیسن کا جائزہ لیا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ جیول نے اس کے سر پر ایک وار اور کیا۔ اس بار وہ یقینی طور پر بے ہوش ہوگیا تھا۔ جیول نے اسے شانے پر اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ سارا کام بغیر شور شرابے کے ہوگیا تھا اور ایک آدمی اور ہاتھ آیا تھا۔

☆☆☆

کوپر کا غصے سے برا حال تھا۔ پہلے اسے اطلاع ملی کہ مالینا غائب تھی، کسی نے اس کی بندشیں کاٹ کر اسے آزاد کرا دیا تھا پھر اطلاع ملی کہ جیسن غائب تھا اور اس کے ساتھ موجود ایک آدمی بے ہوش ملا تھا۔ اس کے آدمی اب تک جیول یا بنڈی کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اس نے فوری طور پر بارون اور ڈیوڈ کو آدمیوں سمیت واپس بلا لیا تھا۔ اس کے شاطر ذہن نے درست نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس طرح الگ الگ رہ کر وہ جیول کے لیے آسان شکار بن جائیں گے۔ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ ایک جگہ ہوں اور انتظار کریں کہ جیول خود سامنے آئے۔

جیول ان سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ان کے سامنے جیسن کو ایک گھاس گاڑی میں ڈالے گزرا تھا۔ اپنے حلیے سے وہ اسپینش لگ رہا تھا، اس لیے کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جیول آرام سے گزر کر کرسل ریو کے چرچ تک آیا۔ یہاں اس نے بے ہوش جیسن کو ایک خالی تابوت میں ڈالا اور پھر چاقو نکال کر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اتار دیا۔ وہ چند لمحے تک تڑپا اور پھر ساکت ہوگیا۔ جیول نے چاقو اس کے کپڑوں سے صاف کرکے رکھ لیا۔ اس کا آدھا مشن مکمل ہوگیا تھا۔ اب تین باقی رہ گئے تھے۔ اس نے جیسن کے ماتھے پر بھی کراس نہیں بنایا تھا۔ وہ واپس بنڈی کے شراب خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کوپر، ڈیوڈ اور بارون بنڈی کے شراب خانے میں محصور ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنی زرخرید سپاہ چاروں طرف لگا دی تھی۔ سونے کی پیٹیاں بھی وہیں تھیں۔ اب وہ اس کے منتظر تھے کہ وہ آئے تو وہ اسے شکار کریں۔

جیول کو معلوم تھا کہ بنڈی کہاں ہے؟ وہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مویشی گھر تھا۔ کسی زمانے میں یہ بنڈی کی ملکیت ہوتا تھا اور اس کے ساتھ والا گھر بھی اسی کا تھا لیکن پھر اس نے شراب خانہ کے اوپر رہائش کرلی تب سے یہ خالی پڑا تھا۔ بنڈی وہیں جا کر چھپا تھا۔ جیول نے دروازے پر دستک دی تو وہ چونک گیا لیکن جیول کی آواز سن کر وہ پُرسکون ہوگیا۔ اس نے مویشی گھر کا دروازہ کھولا۔ بنڈی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''کیا ہوا تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''وہ سب تمہارے شراب خانے میں جمع ہیں۔ اس کے چاروں طرف اس کے آدمیوں کا پہرا ہے۔''

''تب میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''تم اس قصبے کے رہنے والے ہو... تم جانتے ہو یہاں بارود کہاں سے ملے گا۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ریکس ہارڈ ویئر سے۔" بنڈی نے جواب دیا۔

"میرے ساتھ چلو۔" جیول نے مطالبہ کیا۔

بنڈی خوفزدہ ہو گیا۔ "نہیں اگر ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تو وہ مار دیں گے۔"

"بکو مت۔" جیول غرایا۔ "اگر میرا حکم نہ مانا تو میرے ہاتھوں مارے جاؤ گے۔"

بنڈی منت سماجت کرنے لگا تو جیول کو اس پر ترس آ گیا۔ ویسے بھی وہ اب سوچ رہا تھا کہ کارروائی سورج غروب ہونے کے بعد کی جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اگرچہ سورج ڈوبنے کے بعد اس کے پاس وقت کم رہ جائے گا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ زندہ رہو تو میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اس طرح چھپ کر تم رہ نہیں سکتے کیونکہ یہ لوگ مستقل یہاں رکیں گے۔ تم جب نکلو گے ان کے ہاتھ لگ جاؤ گے اور وہ تمہیں بالکل معاف نہیں کریں گے۔"

بنڈی پریشان ہو گیا۔ "میں لڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"تمہیں لڑنا نہیں ہے تمہیں صرف میرا ساتھ دینا ہے۔" جیول نے اسے تسلی دی۔ وہ ایک طرف سوکھی گھاس پر لیٹ گیا۔ اسے نہ تو بھوک پیاس لگ رہی تھی اور نہ ہی آرام کی طلب ہوئی تھی۔ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ابھی سورج غروب ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ اس نے بنڈی سے سوال کیا۔ "تمہارا شراب کا ذخیرہ کہاں ہے؟"

"تہ خانے میں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے خفیہ تہ خانہ بنایا ہوا ہے اپنی اصل شرابیں وہیں ذخیرہ کرتا ہوں۔ اوپر کا ذخیرہ صرف نمائشی ہے۔"

جیول نے سر ہلایا۔ "یہ تو اچھی بات ہے۔"

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔" جیول نے اسے ٹال دیا۔ دو گھنٹے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ "اب چلو اور مجھے ریکس ہارڈ ویئر دکھاؤ۔"

سورج غروب ہوتے ہی تیزی سے تاریکی چھا گئی تھی۔ بنڈی اسے ریکس ہارڈ ویئر تک لایا، اس کے عقب میں ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں جلانے والی لکڑی رکھی تھی، یہ ریکس کا اضافی بزنس تھا۔ عقبی دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ تالا جیول نے رائفل کے بٹ مار کر توڑ دیا۔ شور سے بنڈی پریشان ہوا مگر جیول پرسکون رہا۔ وہ اندر داخل ہوئے۔

ریکس سورج غروب ہونے سے پہلے اسٹور بند کر دیتا تھا۔ اس لیے اب وہاں کوئی نہیں تھا کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر گلی میں جلنے والے لیمپوں کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور جیول اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنے لگا۔ وہاں صرف ڈائنا مائٹ ہی نہیں بلکہ بہت ساری کارآمد چیزیں بھی تھیں۔ جیول نے اطمینان سے اپنے مطلب کا سامان سمیٹا۔ اس میں ڈائنا مائٹ کی ایک درجن اسٹکس بھی تھیں۔ بنڈی سخت مضطرب تھا۔

"کیا تم پورے قصبے کو تباہ کرنا چاہتے ہو؟"

"ان تینوں کو مارنے کے لیے اگر مجھے پورا قصبہ بھی تباہ کرنا پڑا تو میں کر دوں گا۔" جیول نے کہا۔ "اب چلو یہاں سے۔"

وہ واپس بنڈی کے کیبن تک آئے کیونکہ کیبن کا راستہ سامنے کی طرف سے تھا، اس لیے وہ مویشی گھر میں چھپا ہوا تھا۔ جیول جو اضافی سامان لایا تھا اس میں ایک بڑی کمان اور اس کے تیر بھی شامل تھے۔ اس نے چھ تیر لیے اور ہر تیر کے سرے پر ایک ڈائنا مائٹ اسٹک لگائی اور اسے کس کر ستلی سے باندھ دیا۔ بنڈی اس دوران میں ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں کوئی ڈائنا مائٹ غلطی سے نہ پھٹ جائے۔ اگلے آدھے گھنٹے کے اندر وہ تیروں پر ڈائنا مائٹ لگا چکا تھا۔ اس نے یہ سارا سامان بنڈی پر لادا اور وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جیول شراب خانے کے سامنے والے ہوٹل میں آیا۔ اس بار بھی اس نے اسی پائپ کا سہارا لیا اور دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ خطرہ بھانپ کر ہوٹل کے دوسرے مکین اور عملہ فرار ہو گیا تھا۔ اس لیے ہوٹل تقریباً خالی تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ جیول اسی کمرے میں آیا جہاں اس نے مالیتا کو آزاد کرایا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ سرکا کر دیکھا۔ شراب خانے کے سامنے والے حصے میں چھ افراد ٹہل رہے تھے جبکہ باقی عقب میں تھے۔ جیول نے ایک موم بتی جلا کر اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی کھڑکی سے باہر نہ جائے پھر اس نے پہلا تیر کمان پر چڑھایا اور بنڈی سے کہا۔

"جیسے میں کہوں کھڑکی کھول دینا۔"

بنڈی نے سر ہلایا۔ جیول نے ڈائنا مائٹ کے فیتے کو آگ دکھائی اور بنڈی سے کھڑکی کھولنے کو کہا، اس نے پھرتی سے تعمیل کی اور جیول نے نشانہ لے کر پہلا تیر شراب خانے کی ایک کھڑکی پر مارا۔ وہ شیشہ توڑتا ہوا اندر جا گرا۔ فوراً ہی اس نے دوسرا تیر کمان پر چڑھایا اور اس کے فیتے کو آگ



دکھاتے ہوئے اسے شراب خانے کے دروازے کی طرف پھینکا۔ اس دوران میں اندر ہڑبونگ مچی۔ بارون دروازے سے باہر نکلا تو جیول کا پھینکا تیر اس کے سینے میں اتر گیا۔ ایک دھماکا ہوا اور اندر آگ لگ گئی۔ جب تک دوسرا دھماکا ہوتا جیول نے تیسرا تیر دوسری کھڑکی پر مارا تھا۔ دوسرے دھماکے سے پہلے بارون نے تیر نکال کر پھینک دیا تھا مگر وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ جیول نے اسے فرار ہوتے دیکھا تھا۔ تیسرے دھماکے نے پورے شراب خانے میں آگ لگا دی تھی۔ بنڈی بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو میرا کاروبار تباہ ہو جائے گا۔"

"وہ تباہ ہو چکا ہے۔" جیول نے چوتھے ڈائنا مائٹ کو آگ دکھاتے ہوئے کہا۔ "اب اپنی جان کی فکر کرو، وہ بچ گئی تو دوبارہ بار کھول لو گے۔"

مقامی بدمعاش بھاگ رہے تھے کہ چوتھا دھماکا ان کے پاس ہوا، دو اس کا شکار ہو گئے تھے۔ جیول نے کمان رکھ کر رائفل اٹھا لی۔ جب تک وہ فرار ہوتے جیول نے رائفل سے مزید دو افراد کو مار گرایا تھا۔ اس کے بعد میدان صاف تھا۔ جیول نے تیر کمان وہیں چھوڑا اور باقی ڈائنا مائٹ کے بنڈل اپنی جیکٹ میں رکھے۔ اس نے بنڈی کو کچھ سمجھایا اور کہا۔ "تم یہ کام کرنا اور اگر خطرہ دیکھو تو بھاگ جانا۔"

وہ باہر آیا تو شراب خانے سے دھماکے سنائی دے رہے تھے یقیناً شراب کی بوتلیں اور ڈرم پھٹ رہے تھے۔ جیول سامنے سے جانے کے بجائے سڑک عبور کر کے دوسری طرف آیا۔ اسے یقین تھا کہ کوپر اور ڈیوڈ عقبی راستے سے نکل گئے ہوں گے۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والے نہیں تھے۔ بارون نے سامنے سے نکلنے کی غلطی کی تھی لیکن وہ بھی بچ نکلا تھا۔ عقبی حصے میں تین مقامی بدمعاش موجود تھے۔ دو جیول نے گرائے تو تیسرا بھاگ نکلا۔ جیول نے اس سے تعرض نہیں کیا تھا۔ اسے پیچھے ان تینوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا اس لیے وہ واپس مرکزی سڑک پر آیا۔ یہاں ایک بدمعاش ابھی زندہ تھا۔ جیول نے اس کے زخم پر جوتے کی ایڑی رکھی تو وہ چلا اٹھا۔ جیول نے اس سے سوال کیا۔ "کوپر اور باقی دو کہاں ہیں؟"

"میں نہیں جانتا میں نے ان کو اس طرف جاتے دیکھا تھا۔" زخمی نے اصطبل کی طرف اشارہ کیا۔ جواب میں جیول نے اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا۔ اس کا اندازہ تھا کہ بارون زخمی تھا وہ کسی کام کا نہیں تھا جبکہ کم سے کم چھ مقامی بدمعاش مارے جا چکے تھے اور دو سے تین زخمی تھے اس لیے اب کوپر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پانچ آدمی تھے۔ بشرطیکہ وہ اب بھی اس کے ساتھ ہوتے۔

☆☆☆

پہلا تیر اندر آتے ہی کوپر نے خطرہ بھانپ لیا تھا۔ اس نے چلا کر عقبی دروازے سے نکلنے کو کہا اور خود بھی بھاگا۔ ڈیوڈ نے اس کا ساتھ دیا لیکن بارون بدقسمتی سے سامنے کی طرف نکلا تھا۔ وہ دونوں باہر نکلے تھے کہ پہلا دھماکا ہوا۔ کوپر نے عقب میں موجود چار افراد سے کہا۔ "یہیں رہو اور اگر کوئی آئے تو اسے روکنا۔"

مگر دھماکوں کی آواز سن کر ان بدمعاشوں کی ہوا خراب ہو رہی تھی۔ کوپر اور ڈیوڈ آگے بڑھے تو ڈیوڈ نے کہا۔ "یہ سب بھاگ جائیں گے۔ ہمیں ان پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"ہمیں بھی فی الحال بھاگ جانا چاہیے۔"

کوپر نے مڑ کر شعلے اگلتے شراب خانے کو حسرت سے دیکھا۔ سونا وہیں تھا اور اگر وہ محفوظ ہوتے تو بھی وہ سونا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے ڈیوڈ سے اتفاق کیا۔ وہ تیزی سے اصطبل کی طرف بڑھے جہاں ان کے گھوڑے موجود تھے۔ اس کے لیے مرکزی سڑک پر آنا لازمی تھا۔ وہ ایک گلی سے گزر کر سڑک پر آئے تو انہیں بارون مل گیا۔ وہ شدید زخمی تھا اور بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "وہی حرامزادہ تھا میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ وہ ہوٹل کی کھڑکی سے ڈائنا مائٹ لگے تیر مار رہا تھا۔"

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔" کوپر نے تیزی سے اصطبل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ لیکن ابھی وہ اصطبل سے کچھ دور تھے کہ اچانک اس کا دروازہ کھلا اور فائروں کی آواز کے ساتھ اندر سے بدکے ہوئے گھوڑے نکلے۔ وہ دوڑتے ہوئے ان کی طرف آ رہے تھے۔ کوپر اور ڈیوڈ بھاگ کر ایک برآمدے میں چڑھ گئے لیکن بارون بھاگ نہیں سکا تھا گھوڑے اسے روندتے ہوئے گزر گئے تھے۔ کوپر اور ڈیوڈ اپنے بال نوچ رہے تھے کیونکہ ان میں ان کے گھوڑے بھی شامل تھے۔ اب فوری طور پر یہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ پہلے انہیں گھوڑوں کا انتظام کرنا تھا۔ کوپر نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "یہ اسی کا حرامی پن ہے وہ ہمیں فرار سے روک رہا ہے۔"

"ہمیں دوسروں کے گھوڑے پکڑنا ہوں گے۔"



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

ڈیوڈ نے گھبرائے انداز میں کہا۔

وہ بارون کو نظر انداز کر کے چرچ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے چند لمحے بعد جیول وہاں آگیا۔ اس نے بارون کا معائنہ کیا، وہ ابھی زندہ تھا۔ جیول نے اپنی ایڑی اس کی گردن پر رکھ دی اور اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے جان دے دی۔ جیول نے اسے شانے پر لادا اور چرچ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کوپر اور ڈیوڈ اب کہاں گئے ہوں گے۔ وہ یقیناً چرچ کے پاس موجود چھوٹے اصطبل کی طرف گئے ہوں گے لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک ہجوم نے اصطبل کو گھیر رکھا تھا۔ انہوں نے مشعلیں جلا رکھی تھیں اور سب کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے ان کی قیادت مالینا کر رہی تھی۔ کچھ گولیاں بھی چلی تھیں مگر جیول کو دیکھ کر وہ رک گئے۔ اس نے بارون کی لاش چوتھے تابوت میں ڈالی۔ مالینا نے اسے اطلاع دی۔ ”وہ دونوں اندر ہیں۔“

”وہ میرا شکار ہیں۔“ جیول نے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو گولیاں چلانے سے گریز کریں۔“

”یہ بدلہ لینے کے لیے بے چین ہیں۔“ مالینا نے قصبے والوں کی طرف دیکھا۔

”ان سے کہو اپنے آدمیوں سے بدلہ لیں جو دولت کے لیے ان کے ساتھ مل گئے تھے۔“ جیول نے سخت لہجے میں کہا۔ بچ جانے والے چار مقامی بدمعاشوں کو پکڑ کر یہاں لے آیا گیا تھا۔

”ان کو موت کی سزا ملے گی۔“ مالینا نے کہا۔

”ٹھیک ہے ان سے میں نمٹوں گا۔“ جیول نے کہا اور بلند آواز سے بولا۔ ”کوپر تم میری بات سن رہے ہو؟“

”ہاں اور میں حیران ہوں تم بچ کیسے گئے؟“

”میں بچا نہیں ہوں بلکہ جہنم سے آیا ہوں۔“ جیول نے کہا۔ ”تاکہ تم چھ کو جہنم بھیج سکوں۔“

”جہنم تم جاؤ گے۔“ کوپر زہریلے لہجے میں بولا۔

”تم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہو بچ کر جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک موقع دیتا ہوں تم دونوں باری باری باہر آ کر مجھ سے ڈوئل لڑ لو۔“

”کیا ہمیں اس کی ضرورت ہے؟“

”بالکل دوسری صورت میں، میں ڈائنامائٹ سے اصطبل کو اڑا دوں گا اور تم اندر ہی مارے جاؤ گے چوہوں کی طرح... میں تمہیں عزت سے مرنے کا ایک موقع دے رہا ہوں۔“

چرچ کی گھڑی میں رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے یعنی اس کے پاس ساڑھے چار گھنٹے رہ گئے تھے۔ چند منٹ بعد ڈیوڈ کی آواز آئی۔ ”میں تیار ہوں۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ لوگ ہمیں جانے دیں گے۔“

جیول نے مالینا کی طرف دیکھا تو وہ بلند آواز سے بولی۔ ”اگر تم نے بہادروں کی طرح لڑ کر فتح حاصل کر لی تو میرا وعدہ ہے تم یہاں سے صحیح سلامت جا سکو گے۔ لیکن یہ سلامتی صرف آج رات کے لیے ہوگی اس کے بعد میں تمہاری تلاش کراؤں گی۔“

”تم نے سن لیا۔“ جیول نے بلند آواز سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں باہر آ رہا ہوں۔“

”تمہارا پستول تمہارے ہولسٹر میں ہونا چاہیے اور اس کا بٹن بند ہو۔“ جیول نے کہا۔ کچھ دیر بعد ڈیوڈ اندر سے نکلا تو اس کا پستول ہولسٹر میں تھا اور اس کا بٹن بھی بند تھا۔ اسے دیکھ کر جیول نے اپنی رائفل اور اضافی ریوالور ایک طرف ڈال دیے پھر اس نے ڈائنامائٹ الگ کیے۔ پھر وہ چرچ کے سامنے آ گئے۔ ایک آدمی جج بن کر آگے آیا۔ اس نے ڈوئل کے مقامی رول بیان کیے۔ ”میرے تین تک گنتے ہی تم دونوں گولی چلا سکتے ہو اور ہر شخص تین گولیاں چلا سکتا ہے۔“

دونوں نے سر ہلایا اور تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ہولسٹر اوپر کر لیے تھے۔ جج نے تین تک گنتی گنی اور دونوں نے پھرتی سے اپنے ہتھیار نکالتے ہوئے تقریباً ایک ساتھ فائر کیا تھا۔ ڈیوڈ کے ماتھے پر سوراخ ہو گیا اور وہ گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ جیول اپنی جگہ کھڑا تھا، اچانک وہ لڑکھڑایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پہلو پر ہاتھ رکھا تو وہ خون سے بھر گیا تھا۔ ڈیوڈ کی چلائی گولی اس کے جسم میں اتر گئی تھی۔ زخم بائیں پہلو میں دل سے ذرا نیچے تھا۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ڈیوڈ کی لاش کی طرف بڑھا۔ جیول نے اس کی جیکٹ کا کالر پکڑا اور اسے کھینچ کر ایک خالی تابوت تک لایا اور اس میں دھکیل کر لٹا دیا۔ اب صرف ایک تابوت خالی رہ گیا تھا۔ اب وہ بہ مشکل کھڑا تھا اور پھر وہ پشت کے بل گر پڑا۔ مالینا بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس نے جیول کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ مالینا نے چلّا کر کہا۔

”اسے ڈاکٹر شیپر کے پاس لے چلو۔“

کچھ لوگ آگے آئے اور جیول کو اٹھا لیا۔ مالینا اس کے ساتھ تھی، ڈاکٹر شیپرڈ کا مکان اسی سڑک پر تھا۔ وہ تجربے کار اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس قصبے میں دو ڈاکٹر اور تھے مگر سب ڈاکٹر شیپرڈ پر زیادہ اعتبار کرتے تھے۔ جیول کو وہ لے


# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرڈاکٹر شیپرڈ کے کلینک پہنچے۔ اسے میز پر لٹا کر ڈاکٹر نے قمیص ہٹا کر اس کا زخم دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا۔ ”مہلک زخم ہے اسے مردہ ہی سمجھو۔“

”پلیز ڈاکٹر تم اپنی سی کوشش تو کرو۔“ مالینا نے التجا کی تو ڈاکٹر شیپرڈ گولی نکالنے میں لگ گیا۔

☆☆☆

جیول کو ہوش آیا تو وہ پھر اسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے چوغہ پوش شیطان کرا ہے کے دوسری طرف موجود تھا۔ جیول نے اپنا سینہ دیکھا۔ وہاں زخم کا نشان نہیں تھا، اس نے شیطان کی طرف دیکھا۔ ”مجھے واپس کیوں بلایا؟“

اس نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں نے واپس نہیں بلایا۔ تم پھر مر چکے ہو۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ جیول چلایا۔ ”آدمی ایک بار مرتا ہے۔“

”کیا میں تمہیں یقین دلاؤں۔“ شیطان نے معنی خیز انداز میں کہا تو جیول لرز اٹھا۔

”نہیں... لیکن مجھے اپنا کام پورا کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ دوسرے میں زندہ نہیں تھا مجھے نہ تو سردی لگ رہی تھی، نہ بھوک اور نہ پیاس... اس کا مطلب ہے میں زندہ نہیں تھا تو مجھے زخم کی وجہ سے مرنا بھی نہیں چاہیے۔ تم نے معاہدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کی ہے۔“

”تمہیں گولی میں نے نہیں ماری۔“

”مجھے زہر بھی تم نے نہیں دیا تھا۔“ جیول نے اسے یاد دلایا۔ ”اس کا مطلب ہے مجھے نہیں مرنا چاہیے تھا۔ مجھے صرف ایک شکار اور کرنا ہے اور میں تمہاری شرط پوری کر دوں گا۔“

شیطان ٹہلنے لگا، اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سوچ رہا ہے۔ پھر اس نے جیول کی طرف دیکھا اور عیاری سے بولا۔ ”پانچ بھی کافی ہیں، جیسے تم ہو۔“

”تم شاید جانتے نہیں ہو ان لاشوں کے ماتھے پر کراس کا نشان نہیں ہے۔“ جیول نے جلدی سے کہا۔ ”اس لیے تمہیں ان میں سے ایک ہی ملے گا۔“

شیطان کا چہرہ بگڑ کر مزید مکروہ ہو گیا وہ غرایا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

”تم چاہو تو تصدیق کر لو۔“ جیول نے شانے اچکائے۔

شیطان نے آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر بعد کھولیں تو اس کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے پھنکار کر کہا۔ ”تم نے چالاکی دکھائی۔ تم نے انہیں مار دیا لیکن صرف ایک کے ماتھے پر کراس بنایا۔“

”میں نے سوچا کہ باقی سب کے ماتھے پر ایک ساتھ ہی کراس بناؤں گا۔“ جیول عیاری سے بولا۔ ”بے شک تم شیطان ہو لیکن عقل میرے پاس بھی ہے۔ اب تم مجھے واپس بھیجو تاکہ میں آخری آدمی کا کام تمام کروں اور پھر سب کے ماتھے پر نشان بناؤں گا۔“

شیطان کا سکون اور اطمینان رخصت ہو گیا تھا اور وہ مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے غضب ناک انداز میں جیول کی طرف دیکھا۔ ”دل تو چاہ رہا ہے کہ ان چھ کو بھول جاؤں اور...“

”اور کیا...؟“ جیول نے اضطراب سے کہا۔

”مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ شیطان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تمہیں واپس بھیج رہا ہوں لیکن اب تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔“

جیول نے سامنے دیکھا تو گھڑی کی سوئیاں تیزی سے گزریں اور وہ ڈیڑھ بجے پر پہنچ کر رک گئیں۔ جیول چلایا۔ ”نہیں یہ دھوکا ہے۔“

شیطان نے دانت نکالے۔ ”تم مجھ سے اور کیا توقع کرتے ہو؟“

☆☆☆

ڈاکٹر شیپرڈ نے گولی نکال کر زخم سی دیا تھا اور خون بھی رک گیا تھا مگر جیول کی بے ہوشی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مالینا وہیں تھی۔ وہ اپنے اعتماد کے آدمیوں کو کوپر کی نگرانی پر لگا کر آئی تھی کہ وہ اسے کسی صورت فرار نہ ہونے دیں اور اگر وہ ایسی کوشش کرے تو اسے مارنے کے بجائے صرف زخمی کریں۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ تین گھنٹے گزر گئے تھے اور ابھی تک جیول میں ہوش آنے کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر شیپرڈ نے کہا۔ ”اگر اسے دو گھنٹے میں ہوش نہیں آیا تو اس کا بچنا ممکن نہیں ہوگا۔“

مالینا نے دکھ سے جیول کو دیکھا۔ ”اگرچہ یہ مجرم ہے لیکن ان لوگوں سے جان چھڑانے میں بنیادی کردار اسی کا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو پتا نہیں اس قصبے کا کیا حشر ہوتا۔ کاش کہ یہ بچ جائے اور اس آخری آدمی کو بھی اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔“

اسی لمحے جیول کراہا اور پھر اٹھنے لگا۔ ڈاکٹر شیپرڈ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روکنا چاہا۔ ”نہیں... نہیں... تمہارا ہوش میں آنا ہی معجزہ ہے۔ اٹھو



مت، تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے۔“

جواب میں جیول نے اسے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا۔ جیول مشکل سے اٹھا۔ اس نے سینے پر بندھی پٹی دیکھی اور مالینا سے کہا۔ ”میرے کپڑے اور ہتھیار کہاں ہیں۔“

”ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے...“ مالینا نے کہنا چاہا۔

”کپڑے اور ہتھیار۔“ جیول غرایا۔ ”میرے پاس آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت ہے۔“

اس بار مالینا نے بلا چوں چرا اس کے کپڑے اور ہتھیار اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے کسی قدر مشکل سے جیکٹ پہنی اور ہولسٹر باندھا۔ ڈاکٹر شیپرڈ حیرت زدہ تھا اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ”تم فکر مت کرو میں مروں گا نہیں... باقی علاج کے لیے جلد تمہارے پاس آؤں گا۔“

وہ مالینا کے ساتھ باہر نکلا۔ ”وہ اصطبل میں ہے۔“

دو بجنے میں پچیس منٹ رہ گئے تھے۔ اب اصطبل کے سامنے کم لوگ رہ گئے تھے اور یہ سب مسلح ہو کر چوکسی سے پہرا دے رہے تھے۔ مالینا کے ساتھ جیول کو دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے تھے۔ مالینا نے پوچھا۔ ”وہ اندر ہی ہے نا؟“

”ہاں میڈم۔“ ایک آدمی نے کہا اور اسی لمحے اندر سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی اور اصطبل کا دروازہ دھماکے سے کھلا، ایک گھوڑا تیر کی طرح نکلا اور اس پر کوپر سوار تھا۔ مالینا کے آدمیوں نے بے ساختہ اس پر ہتھیار تانے، اس سے پہلے کہ وہ اس پر گولی چلاتے، جیول چلایا۔ ”نہیں... گولی مت چلانا۔“

وہ لوگ گولی چلاتے چلاتے رک گئے تھے۔ جیول نے شانے سے رائفل اتاری اور کوپر کا نشانہ لینے لگا۔ وہ ذرا سی دیر میں سو گز دور جا چکا تھا اور ہر گزرتے لمحے دور ہوتا جا رہا تھا۔ جیول نے سانس روکی اور گولی چلا دی۔ دھماکا ہوا مگر کوپر بدستور گھوڑے پر موجود رہا۔ جیول پھر نشانہ لینے جا رہا تھا۔ اگرچہ اب وہ دور نکل گیا تھا مگر جیول آخری لمحے تک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا اچانک گھوڑے کی رفتار سست ہوئی اور پھر کوپر اس سے لڑھک گیا۔ وہاں موجود لوگ بے ساختہ اس کی طرف بھاگے۔ جیول لڑکھڑایا تو مالینا نے اسے سنبھال لیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”چرچ کی طرف چلو۔“

وہ چرچ کے پاس آ گئے۔ اس دوران میں کوپر کی لاش بھی وہاں لائی گئی اور اسے آخری تابوت میں ڈال دیا گیا۔ جیول نے چاقو نکالا اور پہلے اس نے ڈیوڈ کے کراس بنایا۔ مالینا اور دوسرے اسے خاموشی سے ایسا کرتے دیکھ رہے تھے۔ جیول باری باری سب کے ماتھے پر چاقو کی نوک سے کراس بنا رہا تھا۔ آخر میں اس نے کوپر کے کراس بنایا اور بلند آواز سے بولا۔ ”میں نے اپنا معاہدہ پورا کر دیا ہے، اپنے بدلے تمہیں چھ آدمی دے دیے ہیں۔“

یہ کام کرتے ہی جیول کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ جھولا اور اپنے پیچھے موجود آدمیوں کے بازوؤں میں جا گرا۔ دو ہفتے بعد جیول گھوڑے پر اپنا سامان لاد رہا تھا۔ موسم کسی قدر بہتر ہو گیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہونے والا تھا کہ مالینا وہاں آ گئی۔ اس نے اداسی سے کہا۔ ”تم جا رہے ہو؟“

جیول نے اس کی طرف دیکھا۔ ان دو ہفتوں میں اس کے جسم اور کسی حد تک روح کے زخم بھر گئے تھے اور وہ پہلے جیسی حسین لگ رہی تھی۔ ”ہاں، میرا جلد از جلد یہاں سے چلے جانا بہتر ہے۔“

مالینا بھی سمجھتی تھی۔ جیول مجرم تھا اگرچہ ان کا محسن بھی تھا۔ مگر وہ یہاں رکتا تو اس کے دشمن بھی یہاں آ جاتے اور پرسکون کرسل ریو پھر بے چین ہو جاتا۔ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے تم نے میری دیکھ بھال اور علاج کر کے شکریہ ادا کر دیا ہے۔“ جیول نے کہا۔ ”مجھے تمہارے شوہر کا افسوس ہے۔“

مالینا کا چہرہ غم زدہ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے شانے پر لٹکا بیگ اتار کر جیول کی طرف بڑھایا۔ ”اس میں تمہارے لیے ایک تحفہ ہے۔“

جیول نے بیگ لے کر اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور پھر اچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اسے بیگ کے وزن سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں سونا ہے۔ اس نے مالینا کی طرف دیکھ کر اپنے ہیٹ کو ہاتھ لگایا اور گھوڑے کو ایڑ دی۔ چند لمحوں بعد وہ قصبے کے باہر وسیع میدان میں جا چکا تھا اور اس کا رخ شمال مغرب کی طرف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے حقیقت کیا تھی۔ یہ کوئی خواب تھا یا کچھ اور...... کس ان دیکھی طاقت نے اس سے یہ کام لیا تھا...... اور اس پرسکون قصبے کو ان بدکاروں سے چھٹکارا دلانے کا ذریعہ جیول کو بنایا تھا۔ جو بھی تھا اب وہ پرسکون تھا کہ وہ اس منجمد ہونے والی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔ ہاں شاید سوتے جاگتے وہ ایک خواب ہی تھا جو اس کو ہدایات دیا کرتا تھا۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

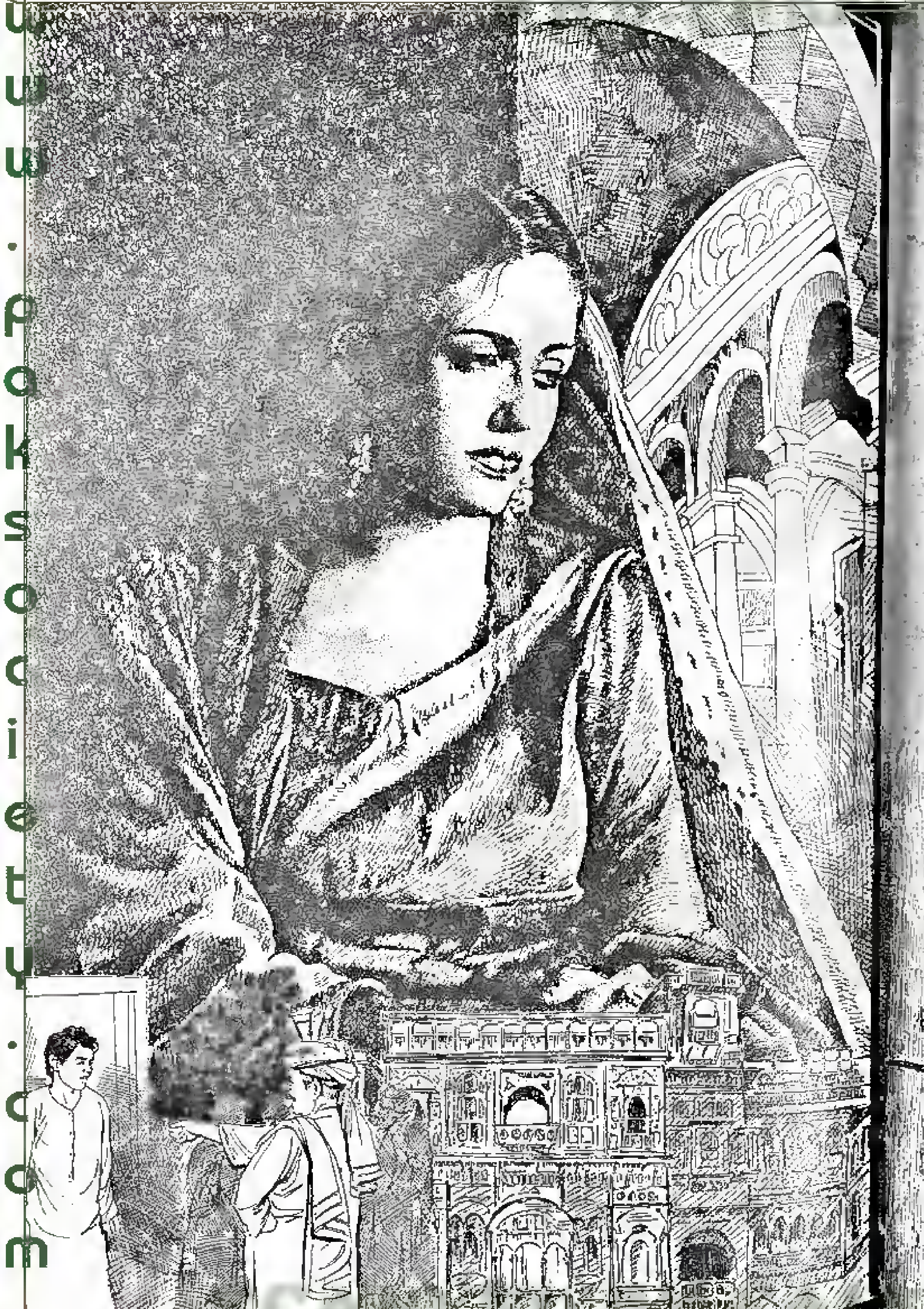

# ستاروں پر کمند

طاہر جاوید مغل

اصول اور انقلاب... ہمیشہ دو مختلف طبقات کے درمیان عمل اور ردِّعمل کی ایسی کُھلی جنگ کا نام جو طاقتور اور کمزور کے درمیان ازل سے جاری ہے۔ چاہتوں کو در و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں... کیونکہ روزن کو کریدنے والے اپنے حوصلے سے اسے دہانہ بنا دیتے ہیں... وہ بھی عجیب دہرے نظام اور مزاج کا شکار تھا جیسے کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں کے جُھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی ہوتے ہیں ایسے ہی وہ بھی سر اٹھا کر جینے کی خواہش میں اپنی جڑیں زمین میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک اس کے بچپن کی دیوار سے ایک کھلونا گر کر ٹوٹ گیا لیکن... اس کی امیدوں کے دیے تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے بھی نہ بجھا سکے... دوسری جانب اس کی چاہت تھی جو سود و زیاں کی حد کھینچے بیٹھی فاصلوں کو سمٹنے ہی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ جو ایک پل کی رفاقت میں قید تھا... ان گنت اندیشوں کے باوجود اسے انہونیوں کی امید تھی اگرچہ برسوں سے اس کے آنگن میں دشت کی ویرانی تھی لیکن دل کی گلیوں میں وہی جل تھل موسم کی کسک لیے وہ ایسی مسافت کے لیے رخت سفر باندھ بیٹھا تھا جس میں اس کے پاس حوصلوں اور عزمِ مصمم کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ جو خوش گمانیوں میں آکر ستاروں پر کمند ڈال چکا تھا... جس کے پیر تو زمین میں دھنسے تھے مگر... آنکھیں آسمانوں کی بلندیوں میں گم تھیں ایسے میں لگنے والی ہر ٹھوکر اسے ایک نئے رمز... اور ہر دکھ اسے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ستارے فلک سے زمین کی طرف نہیں آتے مگر... کمند تو زمین سے فلک کی جانب جاسکتی ہے۔ لہٰذا دور بہت دور اس کے مقدر کا ستارہ بھی اسے روشنی دکھا رہا تھا۔

رقیبوں کی زہریلی چالوں..... پیار کی مدھر تالوں اور بدلتی رُتوں کا

رومان انگیز طویل سلسلہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

عادل بھاگ رہا تھا۔ اس کا جوان جسم ہانپ رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے اور کشادہ سینے میں غم کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ سخت سردی میں کھیتوں کھلیانوں اور پگڈنڈیوں پر بھاگتا چلا گیا...... یہاں تک کہ اس کے پھیپھڑے پھٹنے لگے، اس کی ہمت جواب دینے لگی لیکن وہ خود کو اذیت دینا چاہ رہا تھا۔ ایسی بے پناہ اذیت کہ اس کا دھیان اس جسمانی اذیت کی وجہ سے اپنے جانکاہ غم سے ہٹ جائے۔

وہ بھاگتا ہوا کیکر اور ٹاہلی کے گھنے درختوں میں داخل ہوگیا۔ اس جھنڈ میں کئی جگہ اونچے سرکنڈے بھی تھے جن کے اوپر کے سفید سرے یخ بستہ ہوا میں ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ وہ سرکنڈوں کے اس حصار میں چلا گیا۔ یہاں ٹاہلی یعنی شیشم کا ایک نوخیز لچکدار پودا بھی تھا۔ تنے کا لپیٹ بہ مشکل چودہ پندرہ انچ ہوگا۔ اس تنے کے اوپر ایک بوسیدہ لحاف لپیٹا گیا تھا بلکہ یہ لحاف کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس سفید لحاف کے ٹکڑے پر سیاہ روشنائی سے کسی بندے کا ٹیڑھا میڑھا چہرہ بنایا گیا تھا۔ نیچے لکھا تھا۔ "نوری نت"

عادل نے اپنی سانسیں ذرا درست کیں۔ تب اس نے جبڑے بھینچ لیے اور دونوں مکے کس کر نوری نت پر پل پڑا۔ اس نے اسے اندھا دھند ٹھوکریں، گھونسے اور گھٹنے رسید کیے اس پر جیسے جنون سوار ہوگیا تھا۔ اس کی ضربوں میں تواتر اور تختی تھی۔ دھم دھم کی آوازوں سے ویرانہ گونجنے لگا تھا۔ سردی کے باوجود اس کا خستہ حال لباس پسینے سے تر ہوگیا اور چہرے کی رگیں ابھر آئیں۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے شعلے قدرے ماند نظر آنے لگے۔ وہ لحاف پوش تنے پر مکے برساتے ہوئے بڑبڑایا "...... ڈھائی کروڑ کی حویلی...... ڈھائی کروڑ کی حویلی...... ڈھائی کروڑ اور صرف ڈھائی کروڑ۔ اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا...... کچھ نہیں آتا۔"

بری طرح ہانپنے کے بعد وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی سفید شلوار مٹی میں لتھڑ گئی تھی۔ کرتہ بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا اور ایک تعویز کھلے گریبان میں سے نکل کر ہوا میں جھول رہا تھا وہ پھر بڑبڑایا۔ "ڈھائی کروڑ کی حویلی۔"

اس کے بعد وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ دور کہیں ٹیوب ویل چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ قریب ہی زمیندار مختار کے ڈیرے پر کوئی بھینس ڈکرائی اور اس کی آواز سناٹے میں دور تک گئی۔ اس کے بعد آوارہ کتوں کا شور سنائی دیا اور تب...... ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ عادل کے بس میں ہوتا تو وہ ساری رات یہیں سرکنڈوں کے بیچ بیٹھا رہتا اور اپنے اندر کی آگ کو اس یخ بستہ ہوا کی مار مارتا رہتا لیکن وہ جانتا تھا کہ ماں گھر میں اکیلی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کی نگاہ بار بار دروازے کی طرف اٹھتی ہوگی اور وہ کھدر کے پرانے لحاف کو بار بار اپنے ناتواں جسم کے گرد لپیٹتی ہوگی۔ وہ جیسے ایک نادیدہ ڈور سے اسے باندھ کر رکھتی اور شام ہوتے ہی اپنی طرف کھینچنے لگتی تھی۔ شاید ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

وہ چند گہری سانسیں لینے کے بعد اپنی جگہ سے اٹھا۔ چپل دوبارہ پہنی اور دھیمے قدموں سے گھر کی طرف چل دیا۔ یہ بہاولپور کا ایک دور افتادہ گاؤں تھا۔ پکی سڑک یہاں سے کم وبیش پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا جو چھپروں کے نیچے قائم کیا گیا تھا اور ڈاکٹر واسپتال وغیرہ کا تو یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... ڈاک ہفتے میں ایک بار ماسٹر بشیر کے گھر میں آتی تھی اور لوگ خود اپنے خط دیکھ دیکھ کر وہاں سے لے جاتے تھے۔ سڑک کی طرح بجلی کا تار بھی ابھی اس گاؤں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں کے اردگرد کی زمین سیم اور تھور کا شکار تھی اور یہ مسئلہ اردگرد کے آٹھ دس دیہات میں موجود تھا۔ زمین کے اس مرض نے سڑک اور بجلی کی طرح خوش حالی کو بھی اس گاؤں سے کافی فاصلے پر رکھا ہوا تھا، بس گزر بسر ہوتی تھی۔

عادل گاؤں کی تاریک گلیوں سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے جارکا...... یہ گاؤں کے مختصر ترین گھروں میں سے ایک تھا جہاں عادل اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا...... برآمدے میں تاریکی تھی، اندر کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی زندگی اور حرکت کا احساس دلاتی تھی۔

ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اتنی دیر کردی عادے پتر۔ مجھے تو نیند آنے لگی تھی۔"

"بس ذرا کام پڑ گیا تھا ماں! تجھے اتی واری کہا ہے دیر ہوجائے تو سو جایا کر۔ چولہے کے پاس سے روٹی سالن ڈھونڈنا کون سا مشکل کام ہوتا ہے۔"

"مگر تجھے دیکھے بغیر سوجانا تو میرے لیے مشکل کام ہوتا ہے نا۔ چل اب منہ ہتھ دھولے، میں تیرے لیے کھانا لاتی ہوں۔" ماں نے کہا۔ منہ ہتھ کی بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ عادل کے چہرے پر پڑی اور وہ چونک گئی۔ ایسے معاملے میں ماؤں کی حس تیز ہی ہوا کرتی ہے۔ "کیا بات ہے عادے۔ تو کچھ پریشان سا ہے۔ کہیں پھر اپنے تایے کی طرف تو نہیں چلا گیا تھا؟"

"نہیں ماں! تو بھی ہر ویلے نا بس...... باریکیاں ہی ڈھونڈتی رہتی ہے۔" وہ جھلا کر بولا اور جلدی سے نلکے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد اپنی چادر سے ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا تو ماں نے چارپائی پر کھانے کی چنگیر رکھ دی اور لالٹین کچھ قریب کھسکا دی۔ عادل آلتی پالتی مار کر بیٹھا تو اس نے کمبل اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ "تو نہیں کھائے گی؟" عادل نے پوچھا۔

"میں نے تو نماز کے بعد ہی کھا لیا تھا۔ شریفاں کے گھر سے تڑکے والے چاول آگئے تھے۔ تو، تو کھاتا نہیں ہے۔ میں نے ہی کھالیے...... بلکہ کچھ زیادہ ہی کھالیے۔"

دال کدو کا کل والا سالن ہی تھا مگر روٹی تازہ تھی اور پھر اس میں ماں کے ہاتھ کا سواد بھی تھا۔ عادل کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر ماں سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے دو چار لقمے لیے تو پھر دل بھی کرنے لگا۔ کھانا کھا کر اس نے ڈکار لی اور گڑ کی ڈھیلی ڈھونڈنے کے لیے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ گڑ بھی ختم ہوچکا تھا، بس کنستر کے پیچھے تھوڑا سا بھور چور پڑا تھا۔ اس نے گڑ کھا کر ایک اور چھوٹی سی ڈکار لی۔ نلکے کے تازہ پانی سے کلی کی اور اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔ ماں نے لالٹین کی لو بالکل نیچی کردی تھی۔

وہ کمبل کے نیچے کروٹ پر کروٹ لیتا رہا۔ بدن اور دماغ میں پھر چنگاریاں سی بھرنے لگی تھیں۔ تایا فراست کی شکل بار بار نگاہوں میں گھومتی تھی اور ان کے کہے ہوئے وہ الفاظ جنہوں نے اس کا سینہ چھید دیا تھا اور کسی وقت اسے لگتا تھا کہ شاید انہوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ کہاں وہ اونچی حویلیوں میں رہنے والے، مربعوں اور باغوں کے مالک، کہاں وہ کسی کے فارم پر دیہاڑی پر کام کرنے والا مزدور اور مزدوری بھی وہ جسے ابھی پچھلے تین ہفتوں کی پگار بھی نہیں ملی تھی۔ مہینے کے پہلے ہفتے کی پگار فارم کے مالک کرم داد نے اسے پھل کی صورت میں دی تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ اس کے گلے ڈال دی تھی۔ یہ کوئی تیس درجن مالٹے ہوں گے۔ مالٹوں کو بوری میں بھر کر بیس کلومیٹر دور قصبے تک لے جانا اور ان کو منڈی میں بیچنا عادل کے لیے کافی مشکل تھا۔ آنے جانے کے لیے بھاڑا درکار تھا، اس لیے یہ کچے پکے مالٹے وہیں چھوٹے کمرے کے ایک کونے میں پڑے رہے تھے۔ ماں نے تھوڑے بہت اڑوس پڑوس کے بچوں کو دے دیے تھے، باقی وہیں پڑے سوکھ رہے تھے۔ اتنی سردی میں ان مالٹوں کو کھانا بھی خود پر جبر کرنے کے مترادف ہی تھا۔

عادل کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ اچانک اسے آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے کمبل میں سے سر نکال کر دیکھا۔ ماں اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔ اسے برآمدے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ لالٹین کی مدھم روشنی بھی اسی طرف تھی۔ وہ ہولے سے چارپائی پر سے اترا اور کچے فرش پر ننگے پاؤں چلتا ہوا برآمدے کی طرف آیا۔ ماں چولہے کے پاس بیٹھی تھی، اس کے سامنے مرچ مسالا کوٹنے والی کونڈی تھی۔ عادل نے روٹی کے جو ٹکڑے چھوڑے تھے وہ اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ انہیں کونڈی میں رگڑ رگڑ کر کھانے کی کوشش کر رہی تھی...... اس نے ایک آہ بھری اور چپکے سے واپس آکر بستر پر لیٹ گیا۔

وہ مسلسل جاگ رہا تھا۔ آج بڑی یخ رات تھی، کسی زہر کی طرح اس کے رگ و پے میں اتر رہی تھی اور آگ بن کر اس کے خون میں گردش کر رہی تھی۔ کیا وہ اسے کھو دے گا؟ کیا وہ ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہوجائے گی؟ کیا وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گا اور کیا...... وہ زندہ نہ رہا تو اس کی ماں زندہ رہ پائے گی؟ ان گنت سوالات تھے اور ہر سوال اس کی گردن پر کند چھری کی طرح حرکت کرتا تھا۔

اچانک کمرے کی کچی دیوار پر مخصوص ٹھک ٹھک سنائی دی۔ عادل کا بستر اس دیوار کے بالکل ساتھ تھا۔ عادل نے اس ٹھک ٹھک کا جواب دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے دو تین بار دیوار پر ہلکی سی چوٹ لگائی اور پھر گرم کمبل سے باہر نکل آیا۔ ماں سو رہی تھی، اس کی بھاری سانسیں نیم تاریک کمرے میں گونج رہی تھیں۔ عادل نے کمبل کو درست کرکے چارپائی پر رکھا بغیر آواز پیدا کیے چپل پہنی اور کمرے سے نکل آیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ گھر کی کچی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آچکا تھا۔ ساتھ والے گھر کی چھت پر ایک کچا ڈھارا سا بنا ہوا تھا۔ اس ڈھارے کی دیوار کے سائے میں کوئی موجود تھا۔ یہ عادل کی پڑوسن ریحانہ تھی۔ ریحانہ ان ملازموں میں سے تھی جو تایا فراست کی وسیع و عریض حویلی میں صفائی ستھرائی کا کام کرتے تھے۔ ریحانہ، عادل کو بھائی کہتی تھی اور اس کی حیثیت عادل اور شہزادی کے رازدار کی سی تھی۔ شہزادی تایا فراست کی اکلوتی بیٹی کا نام تھا۔ وہی بیٹی جو عادل کے رگ و پے میں سما چکی تھی...... جو سانس بن کر اس کے سینے میں آتی جاتی تھی، دھڑکن بن کر اس کے دل میں دھڑکتی تھی اور لہو بن کر اس کی رگوں میں سنسناتی تھی۔

قدرے فربہ اندام ریحانہ نے خود کو گرم چادر میں لپیٹا ہوا تھا اور ڈھارے کی دیوار کے بالکل ساتھ لگ کر بیٹھی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ دونوں چھتوں کے درمیان بس دو تین فٹ اونچی پکی منڈیر تھی۔

ریحانہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”عادے بھائی! شہزادی شام سے رو رہی ہے۔ آج جو کچھ ہوا اس کا بہت دکھ ہے اسے۔ بہت زیادہ دکھ ہے۔“

”خیر، یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔“ عادل نے لمبی سانس کھینچی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا جوان سینہ کچھ اور بھی پھیل گیا۔

ریحانہ کچھ دیر خاموش رہ کر بوجھل آواز میں بولی۔ ”عادے بھائی! شہزادی نے مجھے تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے۔“

”کیا کہتی ہے؟“

”ریحانہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”عادے بھائی! وہ کہتی ہے کہ اس کا اور تمہارا میل نہیں ہو سکتا۔ بدنامی اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اس لیے چنگا یہی ہے کہ اپنے رستے وکھرے کر لیے جائیں۔ وہ کہتی ہے کہ مجھ میں اور دکھ سہنے کی ہمت نہیں ہے اور نہ وہ تم کو اور ماں جی کو دکھی دیکھ سکتی ہے۔ اس نے...... تمہارا دیا ہوا...... یہ چھلا بھی واپس کیا ہے۔ اور تم سے معافی مانگی ہے۔“ ریحانہ نے ریشمی کپڑے کی دھجی میں لپٹا ہوا چاندی کا چھلا عادل کی طرف بڑھایا۔

عادل گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے چھلا واپس لینے کے لیے بھی ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”کیا سوچ رہے ہو عادے بھائی؟“

وہ تلخی سے بولا۔ ”یہ چھلا اسے واپس کر دو ریحانہ! اس سے کہنا کہ یہ میں نے اسے دے دیا ہے، چاہے اپنے پاس رکھے یا کوڑے میں پھینک دے۔“

”بھائی! یہ بات نہیں ہے کہ وہ تم سے پیار نہیں کرتی۔ وہ جتنا کرتی ہے بس میں ہی جانتی ہوں، پر وہ مجبور ہے۔ وہ اپنے ماں پیو کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتی۔ وڈے مالک نے اسے بہت زیادہ جھڑکیاں دی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب کبھی اسے گھر سے اکیلے باہر نکلنے دیں گے اور اگر اس نے کہیں ایسا کیا تو وہ تو اس کا خون پی جائیں گے۔“

”مطلب یہ کہ وہ حوصلہ چھوڑ رہی ہے۔ ہار مان رہی ہے پر میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا ریحانہ! میں پوری کوشش کروں گا۔ آخری دم تک کروں گا۔ تایا فراست نے جو بات کہی ہے، میں اسے دیاہ کر دکھاؤں گا۔ چاہے اس میں جان ہی چلی جائے۔ انہوں نے تین سال کی مہلت دی ہے اور ابھی اس میں سے بس ایک دن کم ہوا ہے۔“ اس کی آواز غصے اور جوش سے لرز رہی تھی۔

ریحانہ نے التجا کے لہجے میں کہا۔ ”عادے بھائی! ایویں ہوا کے پیچھے نہ بھاگو، جو کام ہو نہیں سکتا اس کے لیے خود کو رولنے سے کیا فائدہ اور پھر وڈے وڈیرے تو یہی کہتے ہیں نا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اگر تمہارا جوڑا ابھی بننا ہوگا تو کسی نہ کسی طرح خود ہی بن جائے گا۔ نہیں تو خود کو جتنا مرضی ہلکان کرو، کچھ نہیں ہو سکے گا، اس لیے......“

”اچھا زیادہ پڑنانی نہ بن تو۔“ عادل نے تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے جو کچھ کرنا ہے وہ میں چنگی طرح جانتا ہوں اور تو جا کر اس سے کہہ دینا۔ میں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گا اور اگر ہار ہی گیا تو پھر صرف اس کو ہی نہیں ہاروں گا، ساتھ میں اپنی جان بھی ہاروں گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ رات تو جیسے تیسے کٹ گئی۔ اگلا دن اس کے لیے اور بھی گمبھیر تھا۔ وہ صبح سویرے ناشتا کیے بغیر ہی گھر سے نکل گیا۔ ماں اس وقت پھٹے ہوئے لحاف میں گھٹنے پیٹ سے لگائے پڑی تھی۔ جاتے جاتے عادل نے اپنا والا کمبل بھی آہستہ سے اس پر ڈال دیا تھا۔ سورج ابھی اگا نہیں تھا۔ زمین پر کہر تھا اور گلیوں میں کہرے کی چادر تھی۔ وہ بے مقصد پیدل چلتا رہا اور ایک بار پھر درختوں کے اسی جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں شیشم کے ایک نوخیز تنے کے ساتھ پرانا گدیلا سا بندھا ہوا تھا اور چھوٹا سا اکھاڑا بھی تھا۔ عادل کے ہمجولی لڑکے یہاں زور آزمائی کرتے تھے...... اور کبھی کبھی سچ مچ لڑ بھی پڑتے تھے۔ مگر ان لڑائیوں میں نفرت یا عداوت نہیں ہوتی تھی بس وقتی غصہ ہوتا تھا، کسی نے کسی کے حلیے کے بارے میں کوئی بات کہہ دی، کسی کی محبوبہ کے بارے میں کوئی پھبتی کس دی، یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ ایسی لڑائیاں جتنی جلدی شروع ہوتی تھیں اتنی ہی جلدی ختم بھی ہو جاتی تھیں۔

مگر اس وقت صبح سویرے درختوں کے اس جھنڈ میں، ٹھٹھرے ہوئے سرکنڈوں کے درمیان اور کوئی نہیں تھا۔ بس ایک آوارہ کتا ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کر خاموشی سے ایک طرف نکل گیا۔ عادل نے ”لوری نت“ پر چند زوردار مکے برسائے مگر یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ وہاں سے نکل آیا اور درختوں کے درمیان پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔ اس کا قد چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ شانے چوڑے، جسم دبلا پتلا لیکن بہت مضبوط، کمر چیتے کی



طرح پتلی اور ٹانگیں سبک۔ غربت کے باوجود چہرے پر صحت مندی کی جھلک تھی اور انگ انگ سے جوانی کی سرمستی اور توانائی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی...... ہاں وہی عمر جب چال میں پہاڑی ندیوں کی سی طغیانی ہوتی ہے اور لب و لہجے میں برق لہراتی ہے، جب مشکلات ہیچ محسوس ہوتی ہیں اور ناممکن رکاوٹوں کے ساتھ ٹکرانے کو دل چاہتا ہے۔

وہ کسی جوان چیتے ہی کی طرح لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے جسم میں بے پناہ لچک ہے اور اس کی حسیات بے حد تیز ہیں۔ وہ کافی دور نکل آیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور ”سردیوں“ کی زرد دھوپ، کہرے کی چادر کو چیرنے کی کوشش کر رہی تھی، ایک ویران جگہ پر سویا (چھوٹی نہر) کا پانی جھلک دکھا رہا تھا۔ کناروں پر گھاس تھی اور دھوپ تیزی کے ساتھ اس گھاس پر سے اوس کے موتی چن رہی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بہتے پانی کو دیکھنے لگا۔ یہ جگہ ان یادگار جگہوں میں سے تھی جہاں شہزادی اس سے ملی تھی۔ یہ ملاقاتیں بہت زیادہ تو نہیں تھیں لیکن جتنی بھی تھیں انمٹ حروف میں عادل کے دل پر نقش تھیں۔ وہ سوچنے لگا۔ ”یہاں وہ بیٹھی تھی، اس نے اس شاخ پر ہاتھ رکھا تھا، یہاں اس نے ٹیک لگائی تھی۔ عید سے ایک دن پہلے کی وہ کتنی خوبصورت شام تھی۔ ان گنت اندیشوں کے باوجود ان کی آنکھوں میں سپنوں کی جھلک تھی، آنے والے دنوں میں انہونیوں کی امید تھی۔ انہوں نے خاموشی کی زبان میں وعدے کیے تھے، پیمان باندھے تھے۔ اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگا۔ یہ انہونیوں کی امید انسان کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی، یہ دریاؤں اور ندی نالوں کا پانی کیوں وہیں سر ٹکراتا ہے جہاں اسے رستہ نہیں ملتا۔

وہ دیر تک اس چھوٹی نہر کے کنارے بیٹھا رہا۔ آخر اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی بوڑھی والدہ کو اپنے منہ بولے طفیل ماموں کے گھر چھوڑ کر شہر کا رخ کرے گا اور اپنی قسمت آزمائے گا۔ شہزادی کو جیتنے کے لیے ایک ایسی بھرپور کوشش جو کوشش کے لفظ کا حق ادا کر دے اور جس کے بعد دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔ ابھی تک اس نے لاہور کا صرف نام سنا تھا۔ وہاں گیا نہیں تھا لیکن اس ”شہر ہفت رنگ“ کے بارے میں اسے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ سب سے بنیادی ”علم“ تو یہی تھا کہ لاہور یہاں سے کم و بیش 500 میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے پہلے پیدل، پھر تانگے، پھر بس اور آخر میں ریل گاڑی پر سفر کرنا ہوگا یا آخر میں پھر کسی اور بس میں بیٹھنا ہوگا۔ اس سفر کے لیے اسے کم از کم ایک ہزار روپے کرایہ درکار تھا۔ اس کے علاوہ اضافی طور پر دو تین سو روپیہ تو اس کی جیب میں ہونا چاہیے تھا یعنی کل ملا کر تقریباً تیرہ چودہ سو روپیہ...... اور عادل کے لیے یہ اچھی خاصی رقم تھی۔ وہ آج کل ایک مقامی زمیندار کرم داد کے فارم پر درختوں سے پھل اتارنے اور ان کو چھانٹنے کا کام کر رہا تھا۔ اس کی پچھلے تین ہفتے کی مزدوری اکیس سو روپے بنتی تھی لیکن عادل کو معلوم تھا کہ ملک کرم داد اسے یکمشت تیرہ چودہ سو روپے سے زیادہ نہیں دے گا۔ اس سے کرایے کا انتظام تو ہو جاتا لیکن وہ جو پچھلے دو مہینے سے ماں کے لیے نئے لحاف کا سوچ رہا تھا اس کا کیا بنتا اور گھر کے راشن کا کیا ہوتا۔ بے شک اس نے ماں کو ماموں طفیل کے گھر چھوڑ کر جانا تھا مگر کھانے پینے کا خرچا تو ماموں طفیل کو دیے بغیر گزارا نہیں تھا۔ ماں کو تھوڑی بہت دوا کی ضرورت بھی پڑتی رہتی تھی اور عادل کو ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ یہ سارا بوجھ ماموں طفیل پر ڈالے......

وہ بہت دیر تک اس گمبھیر ”معاشی مسئلے“ کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا...... ایک بار ریل میں بلاٹکٹ سفر کرنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں آیا لیکن پھر اس نے خود ہی اس کو رد کر دیا۔ سوچتے سوچتے اچانک عادل کے ذہن میں امید کی ایک کرن چمکی...... پانچ چھ دن بعد ساتھ والے گاؤں شاہ نوانہ میں میلا تھا۔ علاقے کے لوگ سال بھر اس میلے کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں بہت سے کھیل تماشے بھی ہوتے تھے۔ کبڈی، کشتی، رسا کشی اور اس طرح کے دیگر مقابلے میلے کی جان تھے۔ ان میں سے ایک مقابلہ درختوں پر چڑھنے کا بھی ہوتا تھا۔ پچھلے سے پچھلے سال عادل نے بھی اس مقابلے میں حصہ لیا تھا اور پندرہ سو روپے نقد کا پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ پچھلے سال والدہ بیمار تھی اور وہ اسے لے کر تحصیل اسپتال گیا ہوا تھا، اس لیے اس مقابلے میں حصہ نہیں لے سکا تھا اور چودھری مختار کے باغ میں کام کرنے والا ملازم فیروز عرف حبشی پہلے نمبر پر آ گیا تھا۔ میلے اور مقابلے کا سوچ کر عادل کے رگ و پے میں حرارت سی جاگ گئی اور سینے میں میٹھا میٹھا جوش لہر لینے لگا۔

درخت پر چڑھنے والا مقابلہ اس میلے میں پچاس ساٹھ سال سے مسلسل ہو رہا تھا۔ بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ عرصے سے ہو رہا تھا۔ یہ بڑا دلچسپ مقابلہ تھا۔ ایک ہموار جگہ پر درخت کے چار بالکل سیدھے تنے تھے۔ یہ کھجور کے سوکھے ہوئے درخت تھے۔ قریباً ایک ہی جتنے موٹے تھے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM



اوران کی اونچائی ٹھیک 12 گز یعنی 36 فٹ تھی (ممکن تھا کہ ان کی اصل لمبائی کم زیادہ ہو لیکن انہیں کاٹ کر برابر کر دیا گیا تھا) مقابلے کے وقت ان چاروں خشک تنوں کے بالائی سرے پر ایک ایک سرخ جھنڈا گاڑا جاتا تھا۔ کھلاڑیوں کو خالی ہاتھ تیزی سے ان درختوں پر چڑھنا ہوتا تھا۔ جو سب سے پہلے جھنڈا اتار لیتا تھا جیت جاتا تھا۔ بالکل سادہ سا کھیل تھا۔ نجانے کیوں عادل کو یقین ہونے لگا کہ اس مرتبہ وہ نہ صرف کھیلے گا بلکہ جیتے گا بھی اور یہ جیت اسے اس دوردراز غربت زدہ گاؤں سے اٹھا کر روشنیوں کے شہر لاہور تک پہنچانے میں مدد دے گی۔

☆☆☆

چھ سات روز بعد یہ میلے کا منظر تھا۔ شاہ نوانہ گاؤں کے اردگرد کھیتوں اور کھلے میدانوں میں دور تک رنگ برنگے خیمے اور عارضی چھپر نظر آرہے تھے۔ چھوٹی بڑی اَن گنت دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ تھیٹر، سرکس، جھولے وہ سب کچھ یہاں موجود تھا جو پنجاب کے دیہی میلوں ٹھیلوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ آج میلے کا دوسرا اور بھرپور دن تھا۔ عادل کو معلوم تھا کہ آج تایا فراست اور ان کے گھر کی عورتیں بھی میلے میں آئیں گی۔ وہ صبح ہی سے شہزادی کی دید کا منتظر تھا۔ دس بجے کے قریب تین سجے سجائے تانگوں کا قافلہ میلے کی حدود میں داخل ہوا۔ آگے پیچھے دو دو مسلح گھڑسوار تھے۔ ان تانگوں کی چاروں جانب ریشمی چادروں سے پردہ کیا گیا تھا۔ یہی علاقے کا رواج تھا۔ تایا فراست خود بھی ایک سفید گھوڑی پر سوار تھے۔ ساتھ میں ان کے دو بیٹے قاسم اور عاصم بھی گھڑ سواری کررہے تھے۔ دونوں تنومند جوان تھے۔ تایا فراست کی طرح ان دونوں کے زرق برق لباس اور اونچے شملے بھی ان کی شان وشوکت کو نمایاں کررہے تھے۔ دیکھا جائے تو قاسم اور عاصم رشتے میں عادل کے تایازاد بھائی تھے لیکن "حیثیت" کے فرق نے جہاں اور بہت سے فاصلے پیدا کیے تھے وہیں ان دونوں کو بھی عادل سے بہت دور رکھا تھا۔

عادل دور ایک مٹھائی فروش کی عارضی دکان کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ درمیانی تانگے کی طرف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادی اسی تانگے سے اترے گی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ دوسری عورتوں کے ساتھ شہزادی اسی تانگے سے اتری۔ عادل کی پیاسی نگاہیں اس کی جھلک دیکھنے میں کامیاب رہیں۔ وہ ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی طرح تھی۔ گورا رنگ، سبک بدن، مہندی رنگ کے جھلملاتے لباس میں وہ سچ مچ "شہزادی" ہی نظر آتی تھی۔

سب عورتیں میلے کے اس حصے کی طرف چلی گئیں جہاں صرف عورتوں کے لیے اسٹال وغیرہ لگائے گئے تھے۔ اس جانب مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ عادل اپنے دوستوں کے ساتھ ادھر ادھر گھومتا رہا اور سہ پہر کا انتظار کرتا رہا۔ درختوں پر چڑھنے والا دلچسپ مقابلہ سہ پہر کے وقت ہی ہوتا تھا۔ مقامی رواج کے مطابق اسے "چڑھائی" "چڑھائی کا مقابلہ" کہا جاتا تھا۔

کھلے میدان میں کھجور کے چار بالکل سیدھے تنے کھڑے تھے۔ عام دنوں میں بھی لڑکے بالے ان پر اترنے چڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بڑے ڈنڈل قدرے ہموار اور چکنے ہوچکے تھے۔ یہ چڑھائی کرنے والوں کے جسموں کو زیادہ چھیلتے نہیں تھے۔ آج ہر درخت کے اوپر ایک چھوٹا سا سرخ جھنڈا لہرا رہا تھا اور درختوں کے نیچے زمین پر چونے سے دائرے بنائے گئے تھے۔ میدان میں سیکڑوں لوگ جمع ہوچکے تھے اور بے چینی سے مقابلے کے آغاز کے منتظر تھے۔

عادل کو امید تھی کہ تایا فراست اور ان کے گھر والے بھی مقابلہ دیکھنے والوں میں شامل ہوں گے...... اور گھر والوں میں شہزادی بھی تھی مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ تایا کے گھرانے میں سے صرف ان کا ایک سمبندھی اور بیٹے قاسم اور عاصم ہی تماشائیوں میں موجود تھے۔ آج کافی کچھ معمول سے ہٹ کر ہوا تھا۔ اس سے پہلے شہزادی اور دیگر لڑکیاں پورے میلے میں گھوما پھرا کرتی تھیں مگر آج وہ صرف زنانے حصے تک ہی محدود رہی تھیں۔ یہاں چڑھائی کے مقابلے میں بھی تایا کے گھر کی کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ ہاں کچھ دوسرے زمینداروں کی طرح چودھری مختار کے گھر کی عورتیں اور ملازمائیں بھی تماشائیوں میں دکھائی دے رہی تھیں۔ چودھری مختار کا "کاماں" فیروز عرف حبشی، عادل کا سب سے تگڑا حریف تھا۔ وہ اصیل مرغ کی طرح اکڑا اکڑا رہا تھا۔ اسے پچھلے سال کی جیت کا گھمنڈ تھا۔

عادل کا دوست کوڈا اس کے پاس آیا اور کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "لے میرے یار! تھوڑا سا اور خوش ہوجا۔ چودھری مختار صیب نے بتایا ہے کہ اس بار انعام کی رقم پندرہ سو سے بڑھا کر دو ہزار کردی گئی ہے۔ سو سو والے لال رنگ کے پورے دس نوٹ۔ آج جان لڑا دے سجن پیارے۔"

"حبشی کدھر ہے؟" عادل نے پوچھا۔



"ادھر گرم شرم کررہا ہے اپنے آپ کو۔ ڈنڈ بیٹھکیں لگا رہا ہے۔ ابھی باداموں کی پوری آدھ کلو گریاں کھلائی ہیں اسے چودھری مختار نے۔ اوپر سے دو کلو گرم دودھ پیا ہے اس نے۔ تو بھی تھوڑا سا کچھ کھا پی لے۔ حلوا پوری لاؤں تیرے لیے؟"

"نہیں، میں نے بھی ابھی دودھ پیا ہے۔"

"جھوٹ نہ بول عادے۔ مجھے تو لگتا ہے تو نے ناشتا بھی چنگی طرح نہیں کیا۔"

"تو نے میرے پیٹ میں وڑ کر دیکھ لیا ہے؟" عادل نے خشک لہجے میں کہا تو کوڈا چپ ہوگیا۔

ویسے کوڈا کچھ ٹھیک ہی رہا تھا۔ سویرے باسی روٹی کے ساتھ اس نے تھوڑا سا اچار کھایا تھا اور بس۔ شاید کھانے کو کچھ ہوتا بھی تو اس کا دل نہ چاہتا۔ آج کل کچھ عجیب کیفیت تھی اس کی۔ ہر چیز سے دل اچاٹ تھا۔ وہ بس جلد از جلد اس خشکی مارے گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی کے لیے اور شہزادی کے لیے ایک بھرپور لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ تایا فراست نے ٹھیک ہی تو کہا تھا اس سے کہ وہ خود پر غور کرے اور دیکھے کہ شہزادی کے مقابلے میں وہ کہاں کھڑا ہے۔

ڈھول پر چوٹ پڑی اور مقابلہ شروع ہوگیا۔ کل سولہ لڑکے اس مقابلے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ ان میں عادل اور فیروز عرف حبشی بھی شامل تھے۔ چار چار لڑکوں کی چار ٹولیاں تھیں۔ ہر ٹولی میں سے ایک لڑکے کو جیتنا تھا۔ آخر میں جیتنے والے چاروں لڑکوں کا فائنل مقابلہ ہونا تھا۔ پہلے نمبر پر آنے والے کو دو ہزار اور دوسرے پر آنے والے کو پانچ سو روپے حوصلہ افزائی کے ملنا تھے۔ آج ایک نئی بات بھی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ شہر سے ایک مووی کیمرے والا بھی یہاں آیا ہوا تھا اور فلم بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

پہلے چار لڑکوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ تنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اپنے جوتے اتار دیے تھے اور نظریں 36 فٹ اوپر سرخ جھنڈوں پر گاڑ دی تھیں۔ ان میں فیروز عرف حبشی بھی شامل تھا۔ چودھری مختار اس کی حوصلہ افزائی کے لیے خود موقعے پر موجود تھا اور بار بار اس کی پیٹھ ٹھونکتا تھا۔ آخر ڈھول پر چوٹ پڑی اور چاروں لڑکوں نے تیزی سے درختوں پر چڑھنا شروع کردیا۔ پتا نہیں کیوں عادل کے دل میں یہ دبی ہوئی خواہش موجود تھی کہ حبشی اس کھیل میں آگے نہ جاسکے اور یہیں ہار جائے۔ شاید ہر سخت حریف کے حوالے سے دوسرے حریف کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ بہرحال ہوا وہی جس کی توقع تھی۔ آدھی چڑھائی کے فوراً بعد گہری رنگت والا حبشی آگے نکل گیا...... اور آخر تک آگے ہی رہا۔ اس نے سب سے پہلے جھنڈا اکھاڑ کر ہوا میں لہرایا اور فضا تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھی۔

عادل کی طرح فیروز عرف حبشی بھی "باغ مزدور" تھا اور ہر طرح کے درختوں سے پھل اتارنے کا کام کرتا تھا۔ یقیناً اس کا یہ پیشہ بھی "چڑھائی" والے کھیل میں اس کی مدد کرتا تھا۔

عادل کی باری تیسری ٹولی کے ساتھ تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگا تو کوڈے نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "لال رنگ کے پورے دس نوٹ۔"

چاروں لڑکے تنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور تیزی سے چڑھائی شروع ہوگئی۔ شروع میں عادل تھوڑا سا پھسل گیا۔ دوسرے آگے نکل گئے، اس کے باوجود اس نے ہمت کرکے زور مارا اور آخر میں یہ مقابلہ جیتنے میں کامیاب ہوگیا۔ (اب وہ فائنل کھیلنے کا حق دار تھا) درخت کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے سرخ جھنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ اس کے دوستوں اور ہمدردوں نے شور مچا کر اسے داد دی۔ بلندی سے اسے پورا میلا نظر آرہا تھا۔ دور تک شامیانوں اور عارضی جھونپڑوں کی قطاریں، پکوانوں کی دکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں، عادل کی نگاہیں ایک کھیت کے کنارے کھڑے تین عدد تانگوں پر جم گئیں۔ ان کے گرد ریشمی چادروں کا پردہ تھا۔ پردوں میں سے کچھ چہرے بھی جھانک رہے تھے۔ ان میں ہی سے ایک چہرہ یقیناً شہزادی کا بھی ہوگا۔ عادل نے سوچا اور اس کا کشادہ سینہ خوشگوار دھڑکنوں سے بھر گیا۔ اس نے ایک بار پھر جھنڈا ہوا میں لہرایا اور نیچے اتر آیا۔

اگلے مقابلے میں وہ چاروں لڑکے شامل تھے جو اپنی اپنی ٹولی میں پہلے نمبر رہے تھے اور یہ بڑا سخت مقابلہ تھا، کسرتی جسم والا تنومند حبشی اس کی طرف جلتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک لمبا کچھا (نیکر) اور بنیان تھی۔ عادل کے جسم پر فقط شلوار تھی، اس کے سینے پر درخت کی رگڑیں تھیں۔ حبشی کے مقابلے میں عادل کا جسم چھریرا تھا۔ خاص طور سے اس کی کمر دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کشادہ سینے کے نیچے یہ پتلی کمر بالکل چیتے کے جیسی تھی۔

فائنل مقابلہ سنسنی خیز تھا۔ ڈھول پر چوٹ پڑتے ہی چاروں لڑکوں نے تیزی سے تنوں پر چڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے ٹانگوں اور بازوؤں کو کلاوں کی شکل دے دی تھی اور چھوٹی چھوٹی جستوں کی صورت میں اوپر چڑھ رہے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ عادل کے جسم میں عجیب سی آگ بھری ہوئی تھی۔ اس آگ نے اس نہایت سخت مقابلے کو اس کے لیے آسان بنا دیا۔ وہ آدھا رستہ طے ہونے سے پہلے ہی آگے نکل گیا اور پھر اس فرق کو بڑھاتا چلا گیا۔ حبشی سرتوڑ کوشش کے باوجود اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکا۔ ایک نہایت واضح فرق کے ساتھ عادل نے یہ مقابلہ جیتا اور سرخ جھنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ نیچے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے ڈالے جانے لگے۔ جیت کی خوشی منانے والے زیادہ تر کھیت مزدور اور غریب غربا ہی تھے۔ عادل نے ایک بار پھر دور بجے ریشمی پردوں والے سجے سجائے تانگوں کو دیکھا۔ کیا وہ خوش رنگ، ہرنی جیسی آنکھوں والی بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''شہزادی! تو مجھے دیکھ رہی ہے یا نہیں دیکھ رہی..... لیکن یقین رکھ کہ تیرا عشق مجھے ایسے ہی آگے بڑھائے گا، میں ایک دن ایسے ہی تیرے نام کا جھنڈا ہوا میں لہراؤں گا اور تجھے گلے سے لگاؤں گا۔''

☆☆☆

اب عادل کے پاس راشن کے پیسے موجود تھے۔ ماں کے اوپر نیا لحاف بھی آچکا تھا...... پہلے والی روئی میں کچھ مزید روئی ڈال لی گئی تھی اور اس پر چھینٹ کا نیا کپڑا چڑھا دیا گیا تھا۔ ماں نے بڑی محبت سے لحاف کو اپنے اردگرد لپیٹا ہوا تھا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں ماں کے سفیدی مائل بال چمک رہے تھے اور چہرے پر مسرت کی جھلک تھی۔ وہ چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھا ماں کے پاؤں دبا رہا تھا اور ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا کہ اس کو اپنی روانگی کے بارے میں کس طرح بتائے۔ وہ تو اس سے ایک دو دن کی دوری بھی برداشت نہیں کرتی تھیں، کہاں اب ہفتوں اور مہینوں کی جدائی پڑنے والی تھی۔ ماں بہت خوش تھی۔ عادل نے سوچا، چلو ابھی اس خوشی کو برقرار رہنے دیتے ہیں، کل اطمینان سے، پہلے ان کا ذہن بنائیں گے پھر بتائیں گے۔

ماں سوگئی تو وہ آہستہ سے اٹھا اور اپنے بستر پر آگیا۔ کمبل لپیٹ کر اور دیوار سے ٹیک لگا کر لیٹا رہا۔ روزن میں سے درمیانی راتوں کا چاند جھانک رہا تھا۔ اس نے سوچا یہی چاند پال پور گاؤں کے آخری سرے پر تایا فراست کی شاندار حویلی پر بھی چمک رہا تھا۔ حویلی کے برجوں پر، اس کے باغیچوں پر، کھلے برآمدوں کے فرش پر، کیا پتا، شہزادی بھی کسی ادھ کھلی کھڑکی یا نیم وا روزن میں سے اس چاند کو دیکھ رہی ہو۔ (پال پور تایا فراست کا گاؤں تھا۔ عادل کے گاؤں لالی اور پال پور میں مشکل سے تین چار فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ ان دونوں گاؤں کو لوگ ''جوڑے گاؤں'' بھی کہتے تھے)

کمبل میں لپٹے لپٹے اور چاند کو دیکھتے دیکھتے عادل کے خیالات اسے ماضی کے دھندلکوں میں لے گئے۔ ایک پورا دور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل گیا۔ عادل کے اباجان امانت علی اور شہزادی کے اباجان فراست علی دو ہی بھائی تھے۔ دادا کی وفات کے بعد جائداد کی تقسیم میں چھوٹے بھائی امانت علی کے حصے میں دو باغ اور دو ڈھائی ایکڑ کی کھیتی آئی تھی۔ امانت کو کھیتی باڑی کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ وہ درویش منش بندہ تھا۔ عموماً سردیوں گرمیوں میں صرف کھدر کے کپڑے پہنتا اور کھانے پینے کے شوق سے بھی بہت دور تھا۔ ہر ضرورت مند کی بہت کھلے دل سے مدد کرتا اور کبھی کبھی اپنی اس غیر معمولی فیاضی کی وجہ سے دھوکا بھی کھاتا۔ اسے چونکہ کھیتی باڑی سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اپنی زمین اس نے ٹھیکے پر دے دی تھی جو دھیرے دھیرے ٹھیکے دار کے پاس ہی چلی گئی۔ زمین کے معاوضے میں ملنے والی رقم کا زیادہ تر حصہ اس نے لالی گاؤں میں بننے والی مسجد کی تعمیر میں ڈال دیا تھا۔ دونوں باغ امانت علی کے اپنے پاس تھے۔ تاہم ایک باغ بعد ازاں عادل کی دو بڑی بہنوں کی شادی کے سلسلے میں فروخت ہوگیا۔ دوسرے باغ کی زمین کا کچھ جھگڑا ابھی چل رہا تھا۔ لہٰذا آٹھ دس سال پہلے جب عادل کی والدہ شدید بیمار ہوئیں اور انہیں علاج کے لیے بہاولپور کے بڑے اسپتال میں داخل کرانا پڑا تو امانت علی نے یہ دوسرا باغ بھی فروخت کردیا۔ یہ باغ بس اونے پونے ہی بیچا گیا تھا۔ عادل کو معلوم تھا کہ اگر اس موقع پر تایا فراست ان کی کچھ مالی مدد کردیتے تو یہ باغ بکنے سے بچ جاتا اور آج ان کی آمدنی کا معقول ذریعہ ہوتا۔

والدہ تو صحت یاب ہوکر گھر آگئی تھیں لیکن انہی دنوں عادل کے اباجان بیمار پڑے اور ایسے پڑے کہ پھر بستر سے اٹھ نہ سکے۔ انہوں نے صرف 48 سال عمر پائی تھی۔ عادل اس وقت فقط آٹھ نو سال کا تھا۔ یتیمی اور غربت نے ایک ساتھ اس کے گھرانے کو آدبوچا تھا۔

دوسری طرف تایا فراست کی کہانی کافی مختلف تھی۔ وہ دنیادار ذہن کے مالک تھے اور زمینداری میں بھی پوری دلچسپی رکھتے تھے۔ جائداد کی تقسیم میں بھی انہوں نے اپنی دلچسپیوں کا خاص خیال رکھا تھا۔ انہوں نے ایسی نہری زمین رکھی تھی جو کاشت کے حوالے سے زرخیز اور منافع بخش تھی۔ آبائی گھر بھی انہوں نے اپنے پاس رکھا، جسے بعد ازاں انہوں نے وسیع کرکے ایک شاندار حویلی کی شکل دے دی





تھی۔ ان کے دونوں بیٹے قاسم اور عاصم بھی زبردست کاروباری ذہن کے مالک تھے۔ بلکہ بڑا بیٹا قاسم تو کاروباری ہونے کے ساتھ ساتھ جھگڑالو اور پھڈے باز بھی تھا۔ یہ تو کسی حد تک تایا فراست نے اسے لگام دے رکھی تھی ورنہ وہ کئی زمینوں پر ناجائز قبضے کرچکا ہوتا۔

اب تایا فراست اور عادل کے گھرانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اپنے باپ کی طرح عادل بھی کاشت کاری یا کاروبار میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سخت جان اور محنتی ہونے میں تو کوئی شک نہیں تھا لیکن روپیہ کمانے کے لیے جس خاص قسم کی حسابی ذہانت اور عمومی سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں دور دور تک نہیں تھی۔ اس کے بجائے اس پر ایک طرح کا کھلنڈرا پن طاری رہتا تھا۔ وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ آوارہ بگولے کی طرح لالی گاؤں کی گلیوں میں چکراتا رہتا تھا۔ تایا کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔ دو چار فرلانگ کا ہی تو فاصلہ تھا لالی گاؤں میں اور پال پور میں لیکن ''یہ دو چار'' فرلانگ کا فاصلہ دراصل ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ یہ وہی فاصلہ تھا جو امیر اور غریب رشتے داروں کے درمیان پیدا ہوتا ہے اور اولادیں بڑی ہونے کے بعد مزید بڑھتا جاتا ہے۔ معاشی حیثیت کا روزافزوں فرق بھی اس فاصلے کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ تایا اور اس کے بیٹوں نے کبھی نظر اٹھا کر اپنے اس غریب رشتے دار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ عادل اور اس کے گھر والوں کو شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں نہیں بلایا جاتا تھا اور اگر کبھی کبھار کسی محفل میں آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو ان کا تعارف کرانے سے گریز کیا جاتا تھا۔ ایک ایسے ہی موقعے پر عادل کو یادگار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تایا فراست کے ڈیرے پر ان کے کچھ ہم عصر زمیندار آئے ہوئے تھے۔ شہر سے آیا ہوا ان کا کوئی مجسٹریٹ دوست بھی موجود تھا۔ شکار وغیرہ کا پروگرام تھا۔ عادل کامے کی حیثیت سے ملک کرم داد کے باغ میں ہی کام کررہا تھا۔ انہوں نے آموں کی دو بڑی ٹوکریاں تایا فراست کے لیے ڈیرے پر بھجوائی تھیں۔ یہ ٹوکریاں عادل ہی لے کر گیا تھا۔ روانی میں اس نے مہمانوں کے سامنے تایا فراست کو تایا ابا کہہ کر مخاطب کردیا تھا۔ تایا فراست کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ وہ اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں انہوں نے عادل کو بری طرح بے عزت کیا اور خبردار کیا کہ آئندہ وہ انہیں اس طرح مخاطب نہیں کرے گا۔ اس کے بعد انہوں نے عادل کے مالک کرم داد کو بھی سخت سرزنش کی اور کہا کہ وہ عادل کو کسی کام سے ڈیرے یا حویلی پر نہیں بھیجیں گے۔

اپنے تایا زاد کزنوں سے بھی عادل کی ملاقات نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے شہزادی کو بھی بس ایک دو بار ہی دیکھا تھا۔ حویلی کے اندر شہزادی کو اس نے آخری بار شاید تب دیکھا تھا جب وہ چھ سات سال کی ہوگی۔ عادل اس وقت بمشکل دس سال کا تھا۔ عادل کی دادی فوت ہوئی تھی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے تایا فراست کی شاندار حویلی میں گئے تھے۔ حویلی کی ان اونچی دیواروں کے پیچھے کیا ہوتا تھا، کیا رونقیں تھیں، کیا روز و شب تھے عادل کو کچھ معلوم نہیں تھا...... اور وقت گزرتا چلا جارہا تھا۔

لیکن پھر دو سال پہلے بہار کی ایک شام ایسی آئی تھی جب سات پردوں میں چھپی ہوئی شہزادی اس کے سامنے آشکار ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں وہ بہار کے دن تھے، جب دلوں میں گلاب کھلتے ہیں اور ہواؤں میں نشہ سرایت کرجاتا ہے اور جب رگوں میں جوان لہو بھی دوڑتا ہو تو خوامخواہ ناچنے گانے اور اچھلنے کودنے کو دل چاہتا ہے۔ اس شام عادل بھی ہوا کے کسی آوارہ جھونکے کی طرح درختوں میں گھوم رہا تھا۔ یہاں بانس کے بھی بہت سے درخت تھے۔ عادل بانسری بنانے کے لیے کسی اچھی لکڑی کی تلاش میں تھا۔ اچانک اسے چلانے کی نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ ایک درخت پر چڑھتا چڑھتا ٹھٹک کر رک گیا۔ آواز دوبارہ آئی تو وہ دیوانہ وار اس سمت میں بھاگا تھا۔ اس نے گھنے پیڑوں کی اوٹ سے دیکھا، پال پور کی حویلی کا ایک سجا سجایا تانگا راستے پر آڑا ترچھا کھڑا تھا۔ ایک پرانی سی کھٹارا جیپ پاس ہی موجود تھی۔ جیپ پر سے اترنے والے تین ڈھاٹا پوش افراد تانگے کے گھڑسوار محافظوں سے مارا ماری کر رہے تھے۔ ایک گھڑسوار زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ اس پر غالباً کلہاڑی سے وار کیا گیا تھا۔ عادل کے دیکھتے ہی دیکھتے بارہ بور کی رائفل سے ایک فائر ہوا جو سیدھا گھڑسوار کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ میں لگا۔ گھوڑا بدک کر بھاگا۔ اس سے پہلے کہ رائفل بردار گھڑسوار سنبھل سکتا، گھوڑا سرپٹ ہوگیا۔ گھڑسوار کا سر شیشم کی ایک تناور شاخ سے ٹکرایا اور وہ الٹ کر زمین پر آرہا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں جھاڑ جھنکاڑ میں گھس گئی تھی۔ ڈھاٹا پوشوں میں سے ایک دراز قد شخص نے گرنے والے کے قدموں میں سیون ایم ایم کے سنگل فائر کیے۔ وہ بوکھلا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اس دوران میں ڈھاٹا پوش تانگے کے گرد لپٹی ہوئی ریشمی چادر کھینچ کر علیحدہ کرچکے تھے۔ اندر موجود ایک ادھیڑ عمر



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

عورت کے سر پر رائفل کے کندھے سے بے رحم ضرب لگائی گئی۔ وہ وہیں نشست پر گر گئی۔ تانگے میں موجود نوجوان لڑکی کو اٹھا کر کھٹارا جیپ میں ڈال لیا گیا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی اور مدد کو پکار رہی تھی۔ عادل نے کسی حد تک پہچان لیا۔ ہونہ ہو یہ تایا فراست کی بیٹی شہزادی تھی۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اب عادل کے لیے صرف تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک برق سی کوندی۔ کسی شکاری جانور کی طرح جھپٹتے ہوئے اس نے پندرہ بیس قدم کا فاصلہ بھاگ کر طے کیا اور ہر خطرے کو نظر انداز کرتے ہوئے کھلی جیپ میں کود گیا۔ جیپ کے اندر زبردست دھینگا مشتی ہوئی۔ عادل ڈھاٹا پوش ڈرائیور پر جا پڑا۔ اس نے گاڑی رکوانے کی کوشش کی۔ ایک شخص تو شہزادی کو دبوچے بیٹھا تھا، دوسرا عقب سے عادل کے ساتھ چمٹ گیا۔ عادل نے اس کی پسلیوں میں کہنی کی شدید ضرب لگائی اور جیپ کے اگنیشن میں سے چابی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران میں جیپ کا رخ مڑ گیا۔ وہ نیم دائرے کی شکل میں گھومی اور بانس کے چند نوزائدہ پودوں کو توڑتی ہوئی سر کے بل ایک جوہڑ میں جا گری۔ اس کے پچھلے پہیے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بونٹ دلدلی جوہڑ میں ڈوب چکا تھا۔ عادل کو عقب سے دبوچنے والا الٹ کر جوہڑ میں گر چکا تھا۔ دوسرے کو اپنے سر کی زوردار ٹکر سے عادل نے جوہڑ میں پہنچا دیا۔ جیپ کے جوہڑ میں گرنے سے ڈرائیور کے سر پر کوئی اندرونی ضرب آئی تھی اور اس کی ناک سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ نیم جان سا نظر آ رہا تھا۔ عادل نے اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ جمایا اور اسے بالکل ہی بے سدھ کر دیا۔ اس ڈرائیور کی بارہ بور ڈبل بیرل رائفل جیپ کے فرش پر ہی پڑی تھی۔ عادل نے بلا توقف یہ رائفل اٹھائی اور یخ بستہ جوہڑ میں کود گیا۔ جوہڑ میں گرنے والے دونوں افراد اب نہتے تھے۔ عادل کے ہاتھ میں رائفل تھی اور جسم میں بجلی کوند رہی تھی۔ یوں بھی وہ لڑکپن سے ہی لڑائی بھڑائی کا شوقین تھا اور اس حوالے سے اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کافی کھول لیے تھے ـــــ دو منٹ کے اندر اس نے دونوں ڈھاٹا پوش افراد کو جوہڑ سے نکل کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں سے ایک نے تھوڑی سی مزاحمت دکھائی لیکن جب عادل نے اس کی ٹانگوں پر بارہ بور کا فائر مارنے کا ارادہ کیا تو اس نے بھی پیٹھ دکھائی اور سرکنڈوں میں روپوش ہو گیا۔

شہزادی ابھی تک جیپ میں تھی۔ اس نے کھلی چھت والی جیپ کا ایک راڈ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ جیپ لحہ بہ لحہ جوہڑ کی گہرائی میں دھنستی جا رہی تھی۔ عادل جیپ تک آیا، اس نے سہمی ہوئی شہزادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا، اس کا ایک ہاتھ شہزادی کی گردن کے نیچے اور دوسرا اس کی ٹانگوں کے نیچے تھا، وہ ایک طرح سے اس کی گود میں تھی۔ وہ اسے اسی طرح لے کر جوہڑ سے باہر نکل آیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔ ''تم...... عادل ہو نا؟ چچی کے بیٹے؟''

عادل نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

ان کے کنارے پر پہنچنے سے پہلے ہی تایا فراست کے گھڑ سوار موقع پر پہنچ چکے تھے۔ ان مسلح گھڑ سواروں میں سب سے آگے تایا کا بڑا بیٹا قاسم تھا۔ بڑی گراری والا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ان لوگوں کو وہی محافظ بلا کر لایا تھا جو بچ کر درختوں کے اندر روپوش ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔

''مجھے اتار دو۔'' کنارے پر پہنچتے ہی شہزادی نے لرز کر کہا تھا۔

قاسم کی انگارہ آنکھیں دیکھ کر عادل نے شہزادی کو اتارنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔

قاسم نے تو کچھ نہیں کہا لیکن چند منٹ بعد جب تایا فراست موقع پر پہنچا تو اس نے شکریے کے دو چار بول عادل کے لیے کہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ بہ امر مجبوری تھا۔ لڑائی بھڑائی کے دوران میں عادل کی کلائی پر چوٹ بھی آئی تھی اور یہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ تایا فراست نے اپنے ایک کارندے سے کہا تھا کہ وہ عادل کو فوراً گاؤں کے جراح کے پاس لے جائے اور مرہم پٹی کرائے۔

بعد ازاں حملہ آوروں کے بارے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ تایا کی فیملی کے ایک دیرینہ دشمن چودھری سہراب خان کے کارندے تھے اور انہوں نے ایک پرانا بدلہ چکانے کی کوشش کی تھی۔

بہرحال اس واقعے کے تیسرے روز عادل کی پڑوسن ریحانہ خاموشی سے عادل کے گھر آئی۔ وہ صبح سویرے حویلی کے کام کاج کے لیے پال پور چلی جاتی تھی اور شام پڑے واپس آتی تھی۔ آج بھی وہ وہیں سے آ رہی تھی۔ ''چاچی کہاں ہے؟'' اس نے دائیں بائیں دیکھ کر عادل سے پوچھا۔

''سو رہی ہے۔'' عادل نے جواب دیا۔

ریحانہ کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر ابھرا۔ ذرا شوخی سے عادل کو دیکھ کر بولی۔ ''حویلی میں شہزادی نے تیری چوٹ کا حال پوچھا ہے اور...... تیرا شکریہ بھی کہا ہے۔''

عادل کے دل میں جیسے ایک جلترنگ سا بج اٹھا تھا۔





اس نے اپنی چڑھی ہوئی سانس کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''اور کیا کہتی تھی وہ؟''

''تیرے لیے تو اور کچھ نہیں کہا۔ ویسے تیرے بارے میں باتیں شاتیں پوچھ رہی تھی۔ تو کس طرح کا ہے، کیا کرتا ہے، چاچی کی طبیعت آج کل کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

عادل خاموش کھڑا رہا۔ دل کی کیفیت کچھ عجیب تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ ریحانہ اس کی طرف دیکھ کر پھر شوخ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''تجھے بھی کچھ کہنا ہے شہزادی باجی سے؟''

عادل نے دھڑکتے دل کے ساتھ سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''کہہ دینا، یہ ذرا سی چوٹ ہے۔ اپنے خاندان کی عزت کے لیے تو جان بھی چلی جائے تو معمولی بات ہے۔''

''ٹھیک ہے، کہہ دوں گی۔'' فربہ اندام ریحانہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

اس کے بعد نامہ و پیام کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اور دو دلوں کے درمیان ایک ایسا دروازہ کھلا جو کسی کو نظر نہیں آتا تھا مگر جس میں سے گزرنے والی خوشبودار ہوا عادل اور شہزادی کے سینوں میں محبت کے گلاب کھلا رہی تھی۔ مہینے دو مہینے بعد کسی نہ کسی بہانے انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع بھی مل ہی جاتا تھا اور پھر پچھلی عید کے موقع پر جب حسب دستور پال پور گاؤں کی بہت سی لڑکیاں چوڑیاں چڑھوانے کے لیے لالی گاؤں آئی تھیں۔ عادل کو کماد کے ایک بلند و بالا کھیت میں شہزادی سے مختصر سی ملاقات کا موقع بھی مل گیا...... یہ ملاقات قابل اعتماد و رازداں ریحانہ کی کوشش سے ہی ہو پائی تھی۔ اس روز عادل نے شرماتی لرزتی شہزادی کو چھوا تھا، اسے گلے بھی لگایا تھا۔ سراپا کی سونا برنگ دوپہر کی وہ چند ساعتیں عادل کے لیے یادگار اور بے مثال تھیں۔ اس روز ان کی محبت کو لمس کی سچی گواہی ملی تھی۔

وہ نام ہی کی نہیں، دیکھنے میں بھی شہزادی ہی تھی۔ سرخ و سپید رنگ، نرم و نازک جسم، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اس کے طور اطوار میں ایک طرح کا دلکش وقار تھا۔ وہ سات آٹھ ماہ کے اندر ہی عادل کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ اسے اپنے باپ کے اونچے شملے اور عزت کا بے پناہ خیال تھا۔ اسی لیے وہ اپنے اس تعلق کے سلسلے میں بے حد محتاط تھی۔ وہ دونوں یہ بھی بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں ہیں۔ اونچی شان والا تایا کا گھرانا اپنی بیٹی ایک باغ مزدور کو دینے پر کیسے آمادہ ہو سکتا تھا۔ شہزادی نے ایک دوبار اسے اشاروں کنایوں میں کہا بھی تھا کہ وہ اپنے گھر کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے عادل کو اپنے ایک ماموں زاد شبیر کی مثال بھی دی تھی۔ اس کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی۔ اس نے زمین ٹھیکے پر لینی شروع کی اور محنت کر کے کچھ ہی عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا تھا۔

عادل کے ذہن میں بھی ایسے کئی خیالات یلغار کرتے رہتے تھے لیکن ابھی اس کے اندر شاید وہ ٹھہراؤ نہیں تھا جو بندے کو بڑے اور سنجیدہ کاموں پر آمادہ کرتا ہے...... کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ حالانکہ شہزادی اپنے اس تعلق کے سلسلے میں بے حد محتاط تھی لیکن پھر بھی آشکار ہونے والی بات آشکار ہو کر رہی۔ یہ سب کچھ دس بارہ دن پہلے ہوا تھا۔ شہزادی حویلی کی اونچی دیواروں کے پیچھے گم تھی۔ وہ وہاں سے کم کم ہی نکل پاتی تھی لیکن کبھی کبھار کوئی موقع مل ہی جاتا تھا...... شہزادی کی ایک خالہ زاد کی شادی تھی۔ یہ بھی زمیندار لوگ تھے اور ایک قریبی گاؤں فتح پور میں رہتے تھے۔ ایسی شادیوں پر عادل اور اس کی ماں کو شاذ و نادر بلایا جاتا تھا۔ اس شادی پر بھی نہیں بلایا گیا تھا۔ بہرحال اس شادی کے موقع پر عادل کو شہزادی سے ملنے کا کوئی بہانہ مل سکتا تھا۔ شہزادی کو دو دن وہاں فتح پور گاؤں میں رہنا تھا۔ عادل اور شہزادی کی رازداں ریحانہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

پروگرام کے مطابق مہندی کی رات عادل بھی خاموشی سے فتح پور گاؤں پہنچ گیا۔ شام کے وقت کچھ لڑکیاں دو تین بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلیں۔ کچھ لڑکیاں کچے پکے امرود توڑنے کے لیے ایک باغیچے میں گھس گئیں۔ کچھ پھلواری میں گھومنے پھرنے لگیں۔ جو لڑکیاں باغیچے میں گھسیں ان میں شہزادی بھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عادل اسی باغیچے کے پچھواڑے درختوں کے جھنڈ میں موجود ہے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ جھنڈ میں آئی۔ عادل نے اس کے لرزاں ہاتھ تھامے۔ ویلوٹ کے عنابی کامدار جوڑے میں وہ جگمگا رہی تھی۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''عادل! مجھے ایسے کاموں کے لیے نہ کہا کرو، مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''میں اپنے دل کا کیا کروں شہزادی، میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' عادل نے اسے کھینچ کر گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

اس نے چند سیکنڈ بعد خود کو عادل سے علیحدہ کیا اور بولی۔ ''اچھا اب مجھے جانے دو۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ خالہ کی بیٹی فوزیہ کو شک ہو گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی وہ مجھے گھور رہی تھی۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’ایک تو تمہیں وہم بھی بڑے ہوتے ہیں شہزادی۔‘‘ عادل نے اس کے نرم گلاب ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ وہم نہیں تھا۔ فوزی کے حوالے سے شہزادی کا شک بالکل درست تھا۔ اچانک شاخوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ شہزادی تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ شام کی نیم تاریکی میں ایک لڑکی کا چہرہ اور بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں۔ یہ فوزی ہی تھی۔ چہرہ جلدی سے اوجھل ہو گیا۔ ’’ہائے میں مری‘‘ شہزادی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

پھر وہ بھی جھاڑیوں میں اوجھل ہو گئی۔ عادل اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ خالہ زاد فوزیہ نے ساری بات شہزادی کی والدہ کو بتائی تھی۔ شہزادی کی والدہ یعنی تائی مجیدہ تو عادل کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ کہاں یہ کہ وہ ان کی بیٹی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ حویلی میں اندرخانے جیسے ایک آگ سی بھڑک گئی تھی۔ ایک دن عادل کی ہمراز ریحانہ نے اسے اطلاع دی۔ ’’عادے! مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قاسم یا عاصم میں سے کوئی تجھے پکڑ لے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان دونوں کو بھی اس گل کا پتا چل گیا ہے۔‘‘

’’جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔‘‘ عادل نے سینہ تان کر کہا تھا۔

لیکن اگلے ہی دن تایا فراست نے عادل کو ڈیرے پر بلا بھیجا تھا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں تایا فراست اور عادل میں طویل گفتگو ہوئی تھی۔ تایا فراست نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی تھی، مگر پھر یہ دھیما لہجہ بتدریج گھن گرج میں بدل گیا تھا۔ ایک موقع پر تو یوں لگا تھا کہ شاید تایا فراست غصے سے پھٹ پڑیں گے اور کوئی آتشیں ہتھیار نکال کر عادل کو شوٹ کر دیں گے۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد یہ سنگین ترین مرحلہ گزر گیا اور گفتگو پھر سے قدرے دھیما انداز اختیار کر گئی۔ اسی مرحلے میں تایا فراست نے وہ بات کہی تھی جس نے عادل کے تن بدن میں ایک اور طرح کی آگ بھڑکائی تھی۔ تایا فراست نے کہا تھا۔ ’’عادے! وہ جو کپڑے پہنتی ہے اس کا ایک جوڑا...... تیری سارے مہینے کی کمائی میں نہیں آسکتا۔ تیری اور ہماری حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ باقی باتوں کو چھوڑ وہ سامنے جو حویلی نظر آ رہی ہے نا تجھے، اس کی قیمت ہی ڈھائی کروڑ سے زیادہ ہے۔ کبھی کروڑ کا یا لاکھ کا یا پندرہ دس ہزار کا ہی منہ دیکھا ہے تو نے؟‘‘

عادل خاموش کھڑا رہا تھا۔

تایا فراست نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ ’’میں ظالم باپ نہیں ہوں اور نہ ہی ظالم تایا ہوں لیکن اپنی اولاد کا اچھا برا سوچنے کا مجھے پورا حق ہے۔‘‘

عادل نے ہولے سے کہا تھا۔ ’’مگر تایا جی! ہمیشہ ایک جیسا تو نہیں رہتا۔ کہتے ہیں کہ چنگا ویلا گزر جاتا ہے تو ماڑا بھی گزر جاتا ہے۔‘‘

’’تو تیرا چنگا ویلا گزر گیا ہے نا۔ اب میں اپنی دھی کو برے ویلے میں دھکا دے دوں؟‘‘

’’مجھے تھوڑا سا وقت دیں تایا جی! میں کچھ کر کے دکھا دوں گا۔‘‘

’’کیا کر کے دکھا دے گا تو؟ کیا کر کے دکھائے گا؟‘‘

عادل نے اپنے بال پیشانی سے ہٹا کر کھڑکی سے باہر تایا کی بلند و بالا حویلی کو دیکھا تھا۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایک نیلا شعلہ سا بھڑک رہا تھا۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’تایا جی! آپ نے ڈھائی کروڑ کی حویلی کی بات کی ہے۔ آپ مجھے دو ڈھائی سال کی مہلت دے دیں۔ میں آپ کو کم از کم...... اتنے پیسے ضرور اکٹھے کر کے دکھا دوں گا۔ حق حلال کے پیسے۔‘‘

’’سبحان اللہ...... سبحان اللہ۔‘‘ تایا جی نے اپنی بھاری مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ’’میں ڈھائی کروڑ کی بات کر رہا ہوں...... ڈھائی لاکھ کی نہیں۔‘‘

’’میں نے سن لیا ہے تایا جی۔ اچھی طرح سن لیا ہے۔‘‘

اور پھر وہیں، ڈیرے کے اسی کمرے میں تایا اور بھتیجے کے درمیان یہ مکالمہ عجیب سے انداز میں اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ عادل نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے دعوے سے کہا تھا کہ وہ تین سال کے اندر اندر کم از کم ڈھائی کروڑ روپیہ اکٹھا کر کے دکھا دے گا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اس دوران میں کبھی شہزادی سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے بعد وہ ’’سلام تایا‘‘ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل آیا تھا۔

اور اب عمل کا وقت آ چکا تھا۔ وہ گاؤں سے لاہور جانے کے لیے تیار تھا اور سوچ رہا تھا کہ صبح ماں کو کس طرح بتائے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اس سے دور جا رہا ہے۔

نیم تاریک رات میں روزن کے اندر سے چاندنی کی لکیر کو دیکھتے دیکھتے اس کے خیالات دور دور کی پرواز کر کے واپس آ گئے۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے اونگھنے لگا۔ رات کا تیسرا پہر شروع ہو رہا تھا۔ لالی گاؤں کی گلیوں میں سناٹے کا راج تھا۔ سفر کی صبح اس کے سر پر تھی، وہ سو گیا۔

ٹھیک دو روز بعد وہ ایک طویل سفر طے کر کے روشنیوں اور رنگوں کے شہر لاہور پہنچ چکا تھا۔ دریائے راوی کے کنارے کی وہ وسیع و عریض آبادی جہاں پنجاب بھر سے بلکہ ملک بھر سے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس نگری کی بانہیں بہت کشادہ ہیں۔ یہ مواقع کا شہر ہے، یہ داتا کی نگری ہے۔ دور دراز گاؤں سے آنے والا عادل یقیناً یہاں کھو کر رہ جاتا لیکن ایک آسرا یہاں اس کے لیے موجود تھا۔ یہ اس کے گاؤں کا رہائشی اور بچپن کا دوست عبدالقدیر تھا۔ قدیر آٹھ نو سال پہلے لاہور چلا آیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے ہتھ ریڑھی پر کباڑ اکٹھا کیا تھا، پھر اپنا کباڑ خانہ کھولا...... بعد میں اس نے پرانے لوہے کو ڈھالنے والی ایک بھٹی لگائی اور سلائی مشینوں کے ڈھانچے تیار کرنے شروع کر دیے۔ اب اس کا اچھا بھلا کارخانہ تھا اور وہ مزید ترقی کر رہا تھا۔ اس کا ایڈریس عادل کے پاس موجود تھا۔ عادل سیدھا اسی کے پاس باداامی باغ میں پہنچا۔ قدیر نے اسے خوش آمدید تو کہا لیکن اتنی گرمجوشی سے نہیں جتنا عادل سمجھتا تھا...... دو تین روز کی سوچ بچار کے بعد قدیر نے اسے اپنے ایک کباڑ خانے میں کباڑ وغیرہ تولنے کے کام پر لگا دیا۔ اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ اسی میں اسے کھانا وغیرہ بھی کھانا تھا۔ ہاں کباڑ خانے کے اندر ہی ایک کوٹھری میں اسے رہائش ضرور میسر آ گئی۔ نوکری کے پہلے دن وہ شام تک ردی کاغذ، لوہا اور پلاسٹک وغیرہ تول تول کر وہ نڈھال ہو گیا۔ رات کو جب وہ بان کی چارپائی پر لیٹا اور اس نے حساب لگایا تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ تین سالوں میں ڈھائی کروڑ اور پہلے دن کی کمائی دو سو روپے۔ جن میں سے پچاس روپے خرچ ہو چکے تھے۔ اس رفتار سے سفر جاری رہتا تو اسے منزل تک پہنچنے میں چار، ساڑھے چار سو سال تو لگ ہی جانے تھے۔

دوسری طرف لالی گاؤں میں ایک اور کام ہو رہا تھا۔ رات کے نو بجے تھے جب دھول سے اٹی ہوئی ایک کار گاؤں میں پہنچی اور چودھری مختار کے حویلی نما مکان کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں سے دو افراد نکلے۔ ایک تو وہی جواں سال شخص تھا جس نے پانچ چھ روز پہلے میلے میں گھوم پھر کر ویڈیو بنائی تھی اور خاص طور سے ’’چڑھائی‘‘ والے کھیل کو عکس بند کیا تھا۔ دوسرا بھاری توند والا ایک سیٹھ نما شخص تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پر براؤن کوٹ پہن رکھا تھا۔ چودھری مختار کو مہمانوں کی آمد کا شاید پہلے سے ہی پتا تھا۔ اس نے گھر کے دروازے پر سیٹھ کا استقبال کیا۔ دونوں گلے ملے لیکن ملنے سے پہلے ہی دونوں کی توندوں نے معانقہ کیا۔

دس پندرہ منٹ بعد یہ لوگ گھر کی وسیع بیٹھک میں بیٹھے تھے اور گرما گرم دودھ پتی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ چودھری مختار کا بیٹا ناصر بھی یہاں موجود تھا۔ یہ لمبے قد کا دبلا پتلا لیکن کرخت سا لڑکا تھا۔

چودھری مختار نے اپنا بڑا سا سر اوپر نیچے ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’میں سمجھ گیا، میں سمجھ گیا رانا صاحب! آپ اس لڑکے عادے کی بات کر رہے ہو، مائی سکینہ کا پتر ہے وہ...... پر...... شاید آپ کو پتا نہیں...... وہ تو بس اتفاق سے ہی جیت گیا اس دن۔ ورنہ میرے کالے حبشی نے تو اس کی مت مار کے رکھ دینی تھی۔ پچھلے دو تین سالوں سے حبشی ہی پہلا نمبر لیتا ہے جی چڑھائی والے کھیل میں۔‘‘

’’حبشی؟‘‘ کیمرا مین نے سوالیہ نظروں سے چودھری مختار کو دیکھا۔ ’’یہ وہی کالا سا لڑکا ہے جو دوسرے نمبر پر آیا تھا؟‘‘

’’آہو جی۔ پر دوسرے نمبر پر تو وہ اس لیے آیا تھا...... کہ...... اسے...... چوٹ لگی ہوئی تھی۔ ورنہ میں نے کہا ہے نا جی کہ اس نے تو مت مار دینی تھی عادے کی۔ یہ حبشی میرا جدی پشتی ملازم ہے۔ اصلی نام فیروز ہے اس کا...... ہمارے باغوں میں پھل توڑنے کا کام کرتا ہے۔ اونچے سے اونچے درخت پر بالکل باندر کی طرح چڑھتا ہے جی۔ لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں ابھی تھوڑی دیر میں اسے ملواتا ہوں آپ سے۔‘‘

رانا صاحب نے ٹٹولنے والی نظروں سے چودھری مختار کو دیکھا، پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔ ’’چلیں آپ کے بندے سے بھی مل لیتے ہیں لیکن یہ عادا کہاں ہے اب؟‘‘

’’وہ تو کہیں چلا گیا ہے اب...... شاید لاہور گیا ہے محنت مزدوری کے لیے۔‘‘ چودھری مختار نے گول مول انداز میں کہا۔

’’کچھ اتا پتا ہے اس کا؟‘‘ اس بار جواں سال کیمرا مین نے پوچھا۔

’’آہو جی، وہ......‘‘ چودھری کے بیٹے ناصر نے کہنا چاہا لیکن چودھری نے انگلی کے ہلکے سے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ ناصر جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ’’وہ ادھر پرانے لاہور کے علاقے میں ہی کہیں ٹھہرے گا۔ یہی بتایا تھا اس نے۔‘‘

’’پرانا لاہور تو بھی بہت بڑا ہے۔ پورا ایک علیحدہ شہر ہے۔‘‘ رانا صاحب نے کہا۔

چودھری مختار نے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’جاؤ چوکیدار رشید سے پوچھو شاید اس کو کچھ پتا ہو۔ اس کے ساتھ کافی یارانہ ہے اس کا۔‘‘





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

ناصر "جی اچھا" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری مختار نے پیچھے سے ہانک لگائی۔ "اور حبشی کو بھی دیکھ۔ شاید واڑے میں بیٹھا ریڈیو سن رہا ہو۔"

ایک دو منٹ بعد چودھری مختار بھی "ابھی آیا" کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ برآمدے میں دراز قد ناصر کھڑا تھا۔ چودھری نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ کر تیز سرگوشی میں کہا۔ "تیرا دماغ کام کرتا ہے یا نہیں۔ ہمیں کیا لوڑ ہے عادے کے بارے میں بتانے کی۔ یہ رانا صاحب لاہور کے کافی وڈھے سیٹھ ہیں۔ انہوں نے دو چار دن پہلے "چڑھائی مقابلے" کی فلم دیکھی ہے۔ یہ کھیڈ ان کو بڑی پسند آئی ہے۔ آج کل رانا صاحب نے لاہور میں کوئی نمائش وغیرہ لگا رکھی ہے۔ یہ وہاں بھی یہ کھیڈ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر عادے کے بجائے یہ ہمارا حبشی وہاں جائے گا تو چنگا بھلا روپیہ ملے گا۔ مشہوری علیحدہ سے ہوگی اور پھر تجھے تو پتا ہی ہے عادے کے کرتوتوں کا۔ اس کی نظریں جہاں پر جمی ہوئی ہیں تو بھی جانتا ہے۔ ہمیں کیا لوڑ ہے اسے اس معاملے میں اُگے کرنے کی؟ بات سمجھ رہا ہے نا میری؟"

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔

چودھری مختار بولا۔ "تجھے کیا پتا ہے عادے کے بارے میں؟"

"اس نے یہی کہا تھا کہ وہ شاید قدیر کباڑیے کے پاس جائے گا۔ قدیر بادامی باغ میں رہتا ہے۔"

"اس گل کا اور کس کو پتا ہے؟"

"میرے خیال میں چوکیدار رشیدے کے سوا اور کسی کو پتا نہیں۔"

"تو بس ٹھیک ہے جا کر رشیدے کو سمجھا دے کہ کوئی پوچھے تو بتانا کچھ نہیں۔ کسی کو بھی نہیں بتانا۔"

"ٹھیک ہے ابا جی۔"

"اور دیکھ اس حبشی کو۔ ادھر ادھر ہی کہیں ہوگا۔ اس کو لبھ کے لے آ۔"

چودھری مختار واپس مہمانوں کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوشیاری اور لالچ کی چمک تھی۔

پانچ دس منٹ بعد دراز قد ناصر واپس بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اس نے والد کو بتایا کہ چوکیدار رشیدے کو بھی عادے کا کچھ پتا نہیں۔

چودھری مختار نے بیٹے سے کہا۔ "تم ادھر مہمانوں کے پاس بیٹھو۔ میں حبشی کو ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔"

چودھری مختار باہر گیا۔ حبشی ایک قریبی کمرے میں موجود تھا۔ وہ ابھی ابھی پہنچا تھا۔ اس کا قد زیادہ لمبا نہیں تھا۔ مگر جسم مضبوط اور کسرتی تھی۔ چال ڈھال میں چیتے کی طرح کی چستی اور تیزی تھی۔ وہ جدی پشتی اس گاؤں کا رہنے والا تھا۔ گہرے سانولے رنگ کی وجہ سے اس کا نام حبشی پڑ گیا تھا۔ "خیر ہے چودھری جی! آپ نے بلایا تھا۔" اس نے سوالیہ نظروں سے چودھری کو دیکھا۔

"خیر ہی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی خیر ہے۔ لیکن اسی طرح کرنا ہے جس طرح میں کہوں۔"

"آپ حکم کرو جی۔"

"اپنی قمیص اوپر اٹھا اور منہ دوجے پاسے کر۔"

حبشی نے روبوٹ کی طرح ہدایت پر عمل کیا اور قمیص اٹھانے کے بعد منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ چودھری مختار نے جیسے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔ اس نے دراز میں سے ایک استرا نکالا اور حبشی کی پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان دو تین انچ کا کٹ لگا دیا۔ خون رسنے لگا۔ چودھری نے پرانے کپڑے سے خون پونچھا اور ایک دوسرے ملازم فخری کو آواز دی۔ چودھری کی ہدایت پر فخری ایک تھالی میں چولہے کی راکھ اور زخم پر باندھنے کے لیے کپڑے کی پٹی اور روئی وغیرہ لے آیا۔ راکھ سے خون کا رساؤ بند کیا گیا۔ پھر روئی رکھ کر بغلوں کے نیچے سے پٹی باندھ دی گئی۔ اس کے بعد حبشی نے اپنی بنیان اور قمیص جو اوپر کندھوں پر چڑھائی ہوئی تھی، نیچے گرا دی۔

پانچ دس منٹ بعد حبشی اور چودھری مختار دوبارہ بیٹھک میں مہمانوں کے پاس موجود تھے۔ "لیں جی یہ ہے فیروز۔ ہم پیار سے اسے حبشی حبشی کہتے ہیں۔" چودھری مختار نے رانا سیٹھ سے کہا۔ پھر بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "چڑھائی کے مقابلے کا اصل ہیرو تو یہی ہے۔ وہ تو اس کی چوٹ کی وجہ سے مائی سکینہ کا پتر عادا آگے نکل گیا۔"

چودھری مختار حبشی کو سب کچھ سمجھا کر لایا تھا۔ دونوں مہمانوں نے حبشی سے بات چیت کی۔ حبشی نے مہمانوں کو اپنی کمر پر بندھی ہوئی پٹی بھی دکھائی اور اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔

رانا سیٹھ اور کیمرا مین ابرار نے رات وہیں چودھری کے حویلی نما گھر میں گزاری۔ صبح وہ لالی گاؤں کے دو چار اور بندوں سے بھی ملے ان میں عادے کی ماں سکینہ بی بی بھی تھی۔ ان ملاقاتوں کے بعد رانا سیٹھ اور نادر کو یقین ہو گیا کہ عادا روزگار کے سلسلے میں لاہور یا کراچی جا چکا ہے اور فی الحال اس کا کوئی اتا پتا نہیں اور نہ اس کا کسی سے رابطہ ہے۔





وہ لوگ چودھری کے بیٹے، حبشی کو لاہور لے جانے پر رضامند ہو گئے۔

☆☆☆

کباڑ خانے میں کباڑ تولتے تولتے عادل کو بیس پچیس روز ہو چکے تھے اور یہ بات اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ یہاں سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قدیر کے رویے نے بھی اسے مایوس ہی کیا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا کہ کوئی اور کام دیکھے۔ ان دنوں ابھی موبائل فون وغیرہ کا رواج زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ رابطے کا ذریعہ عام فون یا خط وغیرہ تھا۔ فون تو اس کے گاؤں میں تھا نہیں، آجا کے خط کا ہی سہارا تھا۔ وہ خط لکھنا جانتا تھا۔ اس نے خود ہی خط لکھ کر گاؤں کے پتے پر پوسٹ کر دیا تھا اور ماں کو بتایا تھا کہ وہ خیر خیریت سے ہے۔ باغ میں مزدوری کرنے کے باوجود اس نے میٹرک پاس کیا تھا اور اسے آگے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں وہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں میں جب مقامی ماسٹر صاحب نہیں ہوتے تھے، گاؤں کے لوگ عادل سے خط کے علاوہ ٹیلی گرام وغیرہ بھی پڑھوا لیتے تھے۔

کباڑ خانے میں ہی صادق نام کا ایک لڑکا اس کا دوست بن گیا تھا۔ وہ بھی یہاں کباڑ خانے میں اپنے کام سے مطمئن نہیں تھا اور مالک قدیر کے رویے سے بھی شاکی تھا۔ اس کی سوچ بھی یہی تھی کہ اسے کہیں اور قسمت آزمانی چاہیے۔ ایک دن جب وہ دونوں سارے دن کے تھکے ہارے، کباڑ خانے سے ملحقہ کوٹھری میں بیٹھے تھے اور کوڑے کرکٹ کی بو سونگھ رہے تھے۔ صادق نے آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے کہا۔ "عادے! یہاں ایک نمائش لگی ہوئی ہے۔ وہی جسے وہ کیا کہتے ہیں..... صنعتی نمائش، یہاں بہت طرح کے اسٹال لگے ہوتے ہیں، لوگ رنگ برنگی چیزیں بیچتے ہیں۔"

"تو وہاں جا کر کیا کریں گے۔ وہاں تو بھری ہوئی جیبوں والے لوگ جاتے ہیں۔"

"یار خریدنے نہیں جائیں گے۔ دیکھنے جائیں گے۔ کیا پتا کسی چھوٹے موٹے کاروبار کا آئیڈیا ہمارے دماغ میں بھی آ جائے۔"

اس روز تو پروگرام نہیں بن سکا لیکن اگلے روز شام سات بجے کے قریب وہ دونوں اس صنعتی نمائش میں گھوم رہے تھے۔ یہاں بچوں اور بڑوں کی تفریح کے بہت سے سامان بھی موجود تھے۔ جھولے، سرکس، جادو کے کھیل وغیرہ۔ گھومتے گھومتے صادق نے کہا۔ "اوئے عادے..... بازیگر لے! زور آزمائی کرنی ہے تو نے؟"

"کیا مطلب؟"

"یہاں ایک جگہ کئی طرح کے مقابلے ہوتے ہیں۔ مکے کی طاقت دیکھنا، بھاری وزن اٹھانا، بازو چھڑانا، بازو لڑانا، پانی میں دیر تک ڈبکی لگانا وغیرہ وغیرہ...... ایسے مقابلوں پر انعام شام بھی ہوتے ہیں۔ یہاں کوئی رانا کلب ہے، وہاں ہوتا ہے یہ سب کچھ۔"

"لیکن اندر جانے کی ٹکٹ بھی تو ہوتی ہوگی۔"

"یار! اگر ٹکٹ ہوگی تو واپس آ جائیں گے۔ انہوں نے کوئی پکڑ کر تھوڑا بٹھا لینا ہے ہمیں۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں نمائش کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے رانا کلب کے وسیع احاطے کے سامنے پہنچ گئے۔ رانا کلب کے الفاظ ایک بڑے بورڈ پر روشنیوں کی شکل میں جگمگا رہے تھے۔ اندر بھی وافر لائٹنگ کی گئی تھی۔ احاطہ تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی عادل تھوڑا سا چونکا۔ احاطے کے بیچوں بیچ درخت کے دو بلند تنے سیدھے کھڑے تھے۔ یہ خشک کھجور کے ویسے ہی تنے تھے جو شاہ نوانہ کے میدان میں پرانے وقتوں سے گڑے ہوئے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی؟" عادل نے صادق علی سے پوچھا۔

صادق نے قریب کھڑے ایک نوجوان سے پوچھا۔ "بھائی جان! یہ سوکھے درخت یہاں کیوں کھڑے کیے گئے ہیں؟"

"بڑا زوردار مقابلہ ہوتا ہے بھئی یہاں۔ زیادہ لوگ یہاں اسی مقابلے کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہیں۔"

"کس طرح کا مقابلہ ہے؟" عادل نے پوچھا۔

"رانا کلب والوں نے تین لاکھ روپے کا نقد انعام رکھا ہوا ہے۔ ان کا بندہ صرف چودہ سیکنڈوں میں اس 36 فٹ اونچے درخت پر چڑھ کر دکھاتا ہے۔ جو اس سے کم وقت میں درخت پر چڑھے گا اسے فی الفور یہ انعام ملے گا۔ دو ہفتے ہو گئے ہیں، ابھی تک کوئی نہیں جیتا۔ بلکہ دگنے وقت والا مقابلہ بھی بس چھ سات لڑکے ہی جیتے ہوں گے۔"

"دگنے وقت والا مقابلہ؟" عادل نے پوچھا۔

"ہاں، کلب والوں کا دوسرا چیلنج یہ ہے کہ جو بندہ دگنے وقت یعنی 28 سیکنڈ میں چڑھ کر دکھائے گا اسے پانچ ہزار روپیہ دیا جائے گا۔"

عادل کے چہرے پر دبا دبا جوش لہر لینے لگا تھا۔ اس نے جواں سال شخص سے پوچھا۔ "کوئی ٹکٹ بھی ہے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے؟"



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## ہم خاص کیوں ہیں :۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paksociety1


"تین سو روپیہ۔ کافی سارا روپیہ تو یہ لوگ ٹکٹوں پر ہی کما چکے ہوں گے۔ اس کے علاوہ شرطیں وغیرہ بھی لگتی ہوں۔ پرسوں ملتان سے دو لڑکے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کافی سخت مقابلہ کیا ہے کلب کے لڑکے سے...... پر جیت نہیں سکے۔"

عادل اپنے دوست صادق کو ایک طرف لے گیا۔ بڑے اعتماد سے بولا۔ "صادق! مجھے لگتا ہے میں یہ کام کرسکتا ہوں۔ ادھر ہمارے گاؤں کے پاس شاہ نوانہ میں بھی ایسی کھیڈ ہوتی ہے، پرانے وقتوں سے ہو رہی ہے۔ اس کو چڑھائی کہتے ہیں۔ ابھی کوئی ایک مہینا پہلے میں نے میلے میں یہ مقابلہ جیتا ہے۔ پورے دو ہزار کا انعام ملا تھا مجھے۔"

"پر یہ تیرا گاؤں نہیں شہر ہے باگڑ بلے! کلب والوں کا کھلاڑی کوئی ایویں شیدیں تو نہیں ہوگا نا۔ یہ نہ ہو کہ خوامخواہ تین سو روپیہ برباد ہوجائے ہمارا۔"

"نہیں ہوگا یار! تجھے کہا ہے نا میں جیت کر دکھا سکتا ہوں اور اگر نہ بھی ہوا تو...... دگنے وقت والا مقابلہ تو سمجھو اپنی جیب میں ہے۔ دگنے وقت کا پانچ ہزار بتایا ہے نا اس بندے نے؟"

صادق نے اثبات میں سر ہلایا اور پرسوچ لہجے میں بولا۔ "اچھا ایسے کر۔ پہلے ایک آدھ مقابلہ دیکھ لے۔ پھر تجھے اندازہ ہوجائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ویسے مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ آسانی سے کسی کو جیتنے دیتے ہوں گے۔"

عادل اور صادق کچھ اور آگے چلے گئے۔ احاطے میں داخلے کے لیے کوئی ٹکٹ نہیں تھا...... لوگ باہر کھڑے ہوکر بھی یہ تماشا دیکھ سکتے تھے۔ بہرحال یہ دونوں ہجوم میں گھس کر درختوں کے کچھ اور قریب ہوگئے۔ کلب کے احاطے میں زور آزمائی کے دیگر مظاہرے بھی جاری تھے۔ کچھ تنومند نوجوان ایک طرف ویٹ لفٹنگ میں مشغول تھے۔ کھلاڑیوں کے حامی نعرے بازی کر رہے تھے۔ ایک جانب ہاتھ کی گرفت کا زور ناپنے والی بڑی سی مشین پڑی تھی اور نوجوانوں کی ایک ٹولی اسے گھیرے ہوئے تھی۔ اس طرح کی دیگر مصروفیات بھی تھیں لیکن لوگوں کی اصل توجہ اسی کھجور کے تنوں والے کھیل کی طرف تھی۔ تنوں کے پیچھے دائیں طرف ایک بڑا کلاک تھا۔ یہ کلاک چودہ پندرہ فٹ اونچے پول پر نصب تھا اور اس پر چودہ اعشاریہ دس کا ہندسہ روشنیوں کی صورت میں جگمگا رہا تھا۔ یہ دراصل ایک ڈیجیٹل اسٹاپ واچ تھی۔ اس اسٹاپ واچ پر وہ ریکارڈ ٹائم درج تھا جو کلب کے کھلاڑی نے 36 فٹ اونچے تنے پر چڑھنے میں صرف کیا تھا۔ یعنی چودہ اعشاریہ دس سیکنڈ۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوجوان قسمت آزمائی کے لیے میدان میں آگیا۔ یہ کوئی کالج اسٹوڈنٹ تھا اور جمناسٹک کرتا تھا۔ بہرحال جمناسٹک ایک علیحدہ چیز ہے، کھجور کے کھردرے درخت پر ہاتھ پاؤں کی مدد سے چڑھنا ایک دیگر بات۔ اس نوجوان نے پہلے آزمائش کے طور پر درخت پر تھوڑی سی چڑھائی کی، پھر اصل مقابلہ شروع ہوا۔ وہ تنے پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک گھڑیال پر چوٹ پڑی، اس کے ساتھ ہی نوجوان نے اوپر چڑھنا شروع کردیا۔ جمناسٹک کا کھلاڑی ہونے کے باوجود وہ دگنے وقت والا مقابلہ بھی نہیں جیت سکا۔ اس نے درخت کے آخری سرے تک پہنچنے اور ہاتھ مار کر سرخ جھنڈی نیچے گرانے میں تقریباً تیس سیکنڈ لگائے۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد عادل کا جوش سوا ہوگیا۔ اس نے صادق کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "ہم اس مقابلے میں حصہ لیں گے۔ میرے پاس ڈھائی سو روپیہ ہے۔ پچاس روپے دو، ہم ٹکٹ لیتے ہیں۔"

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد صادق نے پچاس روپے عادل کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ان کے اردگرد موجود لوگ مختلف تبصروں میں مصروف تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو ناقابل یقین نظروں سے چودہ اعشاریہ دس کے ہندسے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ اپنی آنکھوں سے چودہ اعشاریہ دس والی کارکردگی دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ عادل نے تنے کی بلندی دیکھ لی تھی اور باقی ساری صورت حال بھی بھانپ لی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہ چودہ اعشاریہ دس سیکنڈ والا ریکارڈ توڑ لے گا۔ تو کیا واقعی اسے وعدے کے مطابق تین لاکھ روپیہ انعام دے دیا جائے گا؟ کیا کلب والے، حسب اندیشہ، کوئی گھپلا شپلا کر دیں گے؟ بہرحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ یہاں کافی لوگ موجود تھے اور ایک دو فوٹو گرافرز پر بھی عادل کی نظر پڑی تھی۔ صادق نے بتایا تھا کہ یہ اخباری فوٹو گرافر ہیں۔

اچانک ایک ہاتھ عادل کے کندھے پر آیا اور وہ بری طرح چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور بھونچکا رہ گیا۔ اس کے سامنے چودھری مختار کا بیٹا چھوٹا چودھری ناصر کھڑا تھا۔

"چودھری ناصر! تم یہاں؟" عادل نے حیران ہوکر کہا۔

"ہاں...... ہاں، آؤ میرے ساتھ۔" دراز قد ناصر نے جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ہجوم سے باہر نکلنا شروع کردیا۔ عادل نے صادق کو بھی اشارہ کردیا۔ وہ بھی اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ساتھ چل پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ تینوں ایک بڑے شامیانے کے پیچھے نیم تاریکی میں کھڑے تھے۔

"تم یہاں کیسے عادے؟" ناصر نے پوچھا۔

"بس نمائش دیکھنے کے لیے آ گیا۔ تمھیں بتایا تھا نا کہ یہاں باداتی باغ میں قدیر کے پاس ٹھہرنا ہے۔"

"ہاں بتایا تو تھا تو نے......" ناصر نے کہا۔ وہ کچھ گھبرایا اور سٹپٹایا سا نظر آ رہا تھا۔

عادل نے کہا۔ "تم نے دیکھا ناصر بھائی! یہ ویسا ہی مقابلہ ہے جیسا ہمارے گاؤں میں "چڑھائی مقابلہ" ہوتا ہے۔ کیا پتا کسی نے وہیں میلے میں یہ سارا تماشا دیکھا ہو اور یہاں بھی شروع کر دیا ہو۔"

ناصر خاموش رہا۔

عادل نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "ناصر بھائی! یہاں پورے تین لاکھ کا انعام ہے......اور......اور مجھے لگتا ہے کہ میں کوشش کروں تو یہ جیت سکتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

ناصر نے مسکرا کر کہا۔ "خیال تو صحیح ہے لیکن اصل بات کا تمھیں پتا نہیں۔"

"کیا مطلب ناصر بھائی؟"

"یہاں یہ سارا بکھیڑا میں نے ہی پالا ہوا ہے۔ کلب کا مالک رانا سیٹھ یار ہے اپنا۔ وہی ادھر گاؤں گیا تھا۔ اسے یہ کھیڈ پسند آئی تھی۔ کوئی وڈیو شیڈیو دیکھی تھی اس نے۔"

عادل کے ہونٹ بے ساختہ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ چودھری ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "یہاں ہم حبشی سے کام لے رہے ہیں۔ اس نے رانا سیٹھ کی مرضی کے مطابق کام کیا ہے۔ رانا سیٹھ خوش ہے اس سے۔ لوگ بھی اس کے کام کو پسند کر رہے ہیں۔ وہ دیکھو پیچھے......وہ تصویر لگی ہے اس کی۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے ہر روز دھڑا دھڑ یہاں پہنچتے ہیں۔"

ایک طرف پندرہ بیس فٹ اونچے کھمبے پر فیروز عرف حبشی کی بڑی سی پینٹنگ لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے فتح کی "وی" بنائی ہوئی تھی اور چیلنج کرنے والے انداز میں کھڑا تھا۔ عادل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن ناصر بھائی! تم تو جانتے ہو میں حبشی کو آسانی کے ساتھ ہرا چکا ہوں۔ میں یہاں کے لوگوں کو اور زیادہ حیران کر سکتا ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو عادے! لیکن......مسئلہ یہ ہے کہ اب لوگ یہاں صرف حبشی کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ اس کی مارکیٹ بن گئی ہے اب......وہ جس طرح فلم ایکٹروں کی مارکیٹ نہیں بنتی؟ پھر وہ جیسے بھی ہوں

لوگ ان کو ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔" آخر میں ناصر نے ذرا پرسوچ انداز میں کہا۔

عادل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

ناصر بولا۔ "رانا صاحب نے دو ڈھائی مہینے بعد فیصل آباد کی نمائش میں بھی اپنا کلب لے کر جانا ہے۔ انہوں نے وہاں یہ آئٹم رکھا تو پھر تم اس میں حصہ لے لینا۔"

وہاں شامیانوں کے عقب میں کھڑے کھڑے ناصر اور عادل میں قریباً بیس پچیس منٹ بات ہوئی۔ اس گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ فی الوقت عادل سامنے نہیں آ سکتا۔ بلکہ آئندہ اسے یہاں نمائش میں ہی نہیں آنا چاہیے۔ ناصر نے اسے یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ یہاں قدیر کباڑیے کی نوکری وغیرہ چھوڑ دے اور پسرور چلا جائے۔ وہاں ان کا کوئی دوست فٹ بال وغیرہ بنانے کا کام کرتا تھا اور ناصر کی سفارش پر عادے کو مناسب اور مستقل ملازمت مل سکتی تھی۔ آخر میں ناصر نے یہ بھی کہا۔ "پھر اگر تم نے سیالکوٹ والی نمائش میں حصہ لینا ہوا تو تمھیں آسانی رہے گی۔ تم پسرور سے سیالکوٹ دو گھنٹے میں آ جا سکتے ہو۔"

عادل شہر میں نیا نیا ضرور آیا تھا مگر اتنا بھولا بھی نہیں تھا کہ ناصر کی باتوں کا مطلب نہ سمجھتا۔ ناصر فی الحال اسے اس نمائش اور کلب سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی پچھلے چند ماہ سے ناصر اسے بڑی کڑی نظروں سے دیکھتا تھا۔ عادل کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ تایا فراست کے گھرانے سے چودھری مختار کے بڑے پکے رابطے ہیں۔ کئی لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ چودھری مختار اپنے بیٹے ناصر کے لیے فراست کی بیٹی شہزادی کا رشتہ لینا چاہتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ ناصر کو شہزادی اور عادل کے حوالے سے تھوڑا بہت شک بھی ہو چکا ہو۔ دبی دبی باتیں تو گاؤں میں گردش کرتی ہی رہتی تھیں۔

گفتگو ختم کرنے سے پہلے ناصر نے عادل سے کہا۔

"اب کہاں جانا ہے تم نے؟"

"واپس باداتی باغ ہی جاؤں گا۔"

"چلو پھر میں رانا کے ڈرائیور سے کہتا ہوں، وہ تمھیں چھوڑ آئے۔ اس نے بھی ادھر یادگار کی طرف ہی جانا ہے۔ ہاں......مگر کل ہماری ملاقات ضرور ہونی چاہیے۔ ڈرائیور تمہارا ٹھکانا دیکھ لے گا۔ میں کل وہیں آ جاؤں گا۔ پسرور والی نوکری کے بارے میں تفصیل سے کل بات کریں گے۔"

اچانک سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ ایک بندہ خیمے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گیا۔ عادل نے پہچان لیا۔ یہ وہی کیمرا مین تھا جو چند ہفتے پہلے شاہ نوانہ کے میلے میں آیا تھا اور





پھیلی تماشوں کی وڈیو بناتا رہا تھا۔ عادل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے ناصر اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو یا گفتگو کا کچھ حصہ سن لیا ہے۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ وہ عادل سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے پہچان لیا ہے بھئی تمھیں۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ یہاں اتنے بڑے شہر میں تم سے ایسے اچانک ملاقات ہو جائے گی۔ زبردست......ونڈرفل۔"

عادل نے دیکھا، چودھری ناصر کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کیمرا مین نے عادل کی کلائی پکڑی اور بولا۔ "آؤ تمھیں رانا صاحب سے ملاؤں، بڑا خوش ہوں گے۔"

وہ عادل کو اپنے ساتھ لیتا چلا گیا۔ عادل نے سوالیہ نظروں سے ناصر کی طرف دیکھا۔ ناصر جیسے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتا، کیمرا مین اسے کھینچتا ہوا کلب کے عارضی دفتر کی طرف لے آیا۔

دو منٹ بعد عادل، شامیانے کے سجے سجائے دفتر کے اندر ایک فربہ اندام نیم گنجے شخص کے روبرو کھڑا تھا۔ کیمرا مین اس کا تعارف کراتے ہوئے نیم گنجے شخص سے کہہ رہا تھا۔ "رانا صاحب! یہی ہے وہ لڑکا جسے آپ نے وڈیو میں دیکھا تھا۔ یہ آج کل یہاں باداتی باغ میں کباڑیے کا کام کر رہا ہے۔ بس اتفاق ہی ہے کہ یہاں نمائش میں چلا آیا ہے۔"

رانا صاحب نے عادل کو سرتاپا دیکھا اور ان کی آنکھوں میں تعریف کی جھلک نظر آئی۔ عادے کا سراپا واقعی متاثر کرنے والا تھا۔ اس کی سب سے اہم جسمانی خصوصیت اس کا کشادہ سینہ اور غیر معمولی پتلی کمر تھی۔ کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے جسم میں بہترین ایتھلیٹس والی لچک اور سبک روی ہے۔ کیمرا مین چند قدم چل کر رانا سیٹھ کے قریب پہنچا پھر مؤدب انداز میں جھک کر ان کے کان میں ایک طویل سرگوشی کی۔ رانا سیٹھ اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ عادل کو اندازہ ہوا کہ اس سرگوشی کا تعلق شاید چودھری ناصر اور اس کے رویے سے ہے۔

رانا سیٹھ نے عادل کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ عادل جھجکتا ہوا بیٹھ گیا۔ رانا سیٹھ بولا۔ "حبشی کو ہرا سکتے ہو تم؟"

"ہرانے کو تو...... ہرا سکتا ہوں...... لیکن...... وہ چودھری ناصر کہہ رہا تھا کہ......"

"چودھری ناصر کو چھوڑو تم......جو میں کہہ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ حبشی کو ہرا لو گے......اس کا ٹائم وہاں سامنے لکھا ہوا ہے گھڑی پر قریباً 14 سیکنڈ۔"

عادل نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "اگر یہ حبشی کا ٹائم ہی ہے تو میں اس سے کم وقت میں چڑھ کر دکھا دوں گا جی۔"

"ٹھیک ہے، دیکھ لیتے ہیں۔" رانا سیٹھ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد عادل کھلے میدان میں حبشی کا ریکارڈ توڑنے کے لیے تیار تھا۔ چھوٹا چودھری ناصر اور حبشی بھی وہاں موجود تھے۔ چھوٹے چودھری ناصر کی آنکھوں میں ناراضی تھی۔ حبشی بھی تیکھی نظروں سے عادل کو گھور رہا تھا۔ چودھری ناصر کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اندر سے کھول رہا ہے اور اگر اسے موقع ملے تو وہ کبھی بھی عادل کو اس مقابلے میں حصہ نہ لینے دے۔ بہرحال رانا سیٹھ کی موجودگی میں وہ چپ رہنے پر مجبور تھا۔

تین چار سو تماشائیوں اور میڈیا والوں کی موجودگی میں عادل نے چند منٹ کے لیے خود کو "وارم اپ" کیا اور پھر چڑھائی کے لیے تیار ہو گیا۔ حسب معمول گھڑیال پر چوٹ پڑی اور عادل نے پھرتی سے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ اسٹاپ واچ کے ہندسے بھی تیزی سے متحرک ہو گئے۔ تماشائی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ جب عادل نے تقریباً 36 فٹ کی بلندی پر جا کر سرخ جھنڈی نیچے گرائی تو اسٹاپ واچ بارہ اعشاریہ دس سیکنڈ پر رک گئی۔ عادل نے حبشی کے ریکارڈ ٹائم سے پورے دو سیکنڈ کم وقت لیا تھا۔ قرب و جوار تالیوں اور حوصلہ افزائی کی آوازوں سے گونج اٹھے۔ عادل نے نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ساتھی صادق خوشی سے چلا رہا تھا اور اچھل رہا تھا۔ کیمرا مین ابرار اور رانا سیٹھ کے چہرے بھی جوش سے تمتمائے ہوئے تھے۔ وہ نیچے اترا تو لوگوں نے اس پر شاباشی تھپکیوں کی بارش کر دی۔ صادق نے دوسرے افراد کے ساتھ مل کر اسے کندھوں پر اٹھا لیا۔

عادل نے اسی پر بس نہیں کیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اس نے ایک بار پھر ٹرائی کیا۔ اس دفعہ اس کی رفتار مزید بہتر ہوئی۔ اس نے تقریباً ایک سیکنڈ مزید کم وقت لیا۔ اب اس کا ریکارڈ گیارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ تھا۔ ہندسے جگمگا رہے تھے اور جیسے خاموشی کی زبان میں پکار رہے تھے ہاتھ کنگن کو آرسی نہیں۔ اگر کسی میں اس سے زیادہ دم ہے تو آئے اور کر کے دکھائے۔

عادل نے دیکھا۔ فیروز عرف حبشی واضح طور پر



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

پژمردہ دکھائی دیتا تھا۔ ناصر کی ہلاشیری پر اس نے خود کو گرم کیا اور خود کو طیش میں لا کر اپنا وقت بہتر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر اپنے ریکارڈ میں چوتھائی سیکنڈ کی معمولی سی بہتری ہی لا سکا۔ سیکڑوں لوگوں کے سامنے رانا سیٹھ نے عادل کی کلائی اپنے ہاتھ میں پکڑی اور اس کا بازو ہوا میں بلند کر کے اس کی فتح کا اعلان کیا۔

اس موقع پر بہ ظاہر چھوٹا چودھری ناصر بھی خوش نظر آیا اور اس نے عادل کو مبارک باد دی لیکن عادل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اندر سے چودھری ناصر بری طرح تپا ہوا ہے۔

یہ دو تین گھنٹے عادل کے لیے ''کایا پلٹ'' ثابت ہوئے تھے۔ وہ جیب میں ڈھائی تین سو روپیہ لے کر نمائش دیکھنے کے لیے آیا تھا مگر اب اس کے کندھے پر آناً فاناً رانا سیٹھ کا ہاتھ آ گیا تھا۔ رانا کے ملازم اس کے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ رانا سیٹھ نے مسکراتے ہوئے عادل کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ظاہر ہے بھئی اعلان شدہ انعام تو تمہیں نہیں ملے گا کیونکہ تم اپنی ہی فیلڈ کے بندے ہو لیکن میں اپنی طرف سے تمہیں تیس ہزار کا نقد انعام دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں فوری ملازمت کی بھی آفر ہے۔ بیس ہزار روپے ماہانہ۔ کھانا رہائش اور دیگر سہولتیں کلب کے ذمے۔ اس کے علاوہ ترقی کے بھی پورے پورے موقعے موجود ہیں۔''

''لیکن مجھے کرنا کیا ہوگا سیٹھ صاحب؟''

''یہی جو ابھی کر کے دکھایا ہے۔ اور یہ بھی روز تو نہیں۔ جب بھی ضرورت پڑے گی...... آرام زیادہ کام کم......'' سیٹھ پھر مسکرایا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کاروباری چمک تھی۔

عادل نے کن انکھیوں سے چھوٹے چودھری ناصر کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا مگر عادل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سپاٹ چہرے کے پیچھے گہری کدورت موجود ہے۔ عادل کو خاموش پا کر صادق نے اسے پیچھے سے ٹہوکا دیا۔ مطلب یہی تھا کہ وہ کیا حماقت فرما رہا ہے فوراً آفر قبول کرے۔

عادل نے آفر قبول کر لی۔

''کب سے شروع کرو گے؟'' رانا سیٹھ نے پوچھا۔

''کل ہی حاضر ہو جاؤں گا جی۔ یہاں بادامی باغ میں میرا کچھ سامان پڑا ہے۔ وہ لانا ہے اور ایک دو دوستوں سے ملنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، کل شام تک پہنچ جاؤ۔'' سیٹھ نے کہا پھر حبشی اور چودھری ناصر کی طرف دیکھ کر ان کی اشک شوئی کے لیے بولا۔ ''چودھری ناصر! تمہارے بندے کی ملازمت بھی برقرار ہے بھئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں کی موجودگی سے مقابلے کا ماحول پیدا ہوگا اور مقابلے کا ماحول کسی بھی کام کے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔''

لیکن اگلے چند گھنٹے کے اندر ''مقابلے کا یہ ماحول'' کچھ اور ہی رنگ اختیار کر گیا۔ عادل اور صادق نمائش سے بادامی باغ واپس آ گئے۔ اپنے دوست کی کامیابی پر صادق بھی بہت خوش تھا۔ اسے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ عادل کی اچھی ملازمت کی وجہ سے اسے بھی رانا سیٹھ کے پاس کوئی ڈھنگ کا کام مل جائے گا۔ اپنی کباڑ خانے والی کوٹھری میں بیٹھ کر دونوں دوست لوہے کی انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے رہے اور اس حیران کن کایا کلپ کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ پھر صادق تو سو گیا لیکن عادل جاگتا رہا۔ رانا سیٹھ نے اسے تیس ہزار روپے نقد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ ماہانہ بیس ہزار کی نوکری تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آناً فاناً یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ اسے ماں اور شہزادی دونوں شدت سے یاد آئیں۔ اس کا جی چاہا، شہزادی اس کے سامنے ہو۔ وہ اسے بتائے کہ اس نے سپنوں کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا ہے...... وہ اس سفر کو تیز سے تیز کرے گا، اور اس کی محبت کی دی ہوئی طاقت سے منزل پر پہنچ کر دکھائے گا۔ اس نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ شہزادی نے یہ باتیں سنی ہیں...... وہ شرمائی ہے اور اس نے ذرا آگے جھک کر اپنی پیشانی اس کے سینے سے لگا دی ہے، اس نے شہزادی کو بانہوں میں لے لیا ہے۔

اچانک عادل کو اپنے تصورات سے باہر آنا پڑا۔ کوٹھری کے دروازے سے باہر آہٹیں سنائی دیں اور پھر زوردار دستک ہوئی۔ یہ رات قریباً دو بجے کا وقت تھا۔ ''کون ہے؟'' عادل نے لحاف سے سر نکالتے ہوئے پوچھا۔

''دروازہ کھول عادے۔'' باہر سے چھوٹے چودھری ناصر کی بھاری آواز سنائی دی۔

''یااللہ خیر۔'' عادل نے دل ہی دل میں کہا اور چارپائی سے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ اس دوران میں صادق بھی جاگ گیا تھا۔ دراز قد چودھری ناصر تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوا۔ حبشی کے علاوہ ایک اور ہٹا کٹا شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ یہ بھی ناصر کے پالتو ملازموں میں سے تھا۔ صادق نے لالٹین کی لو اونچی کی۔ ناصر نے کینہ توز نظروں سے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تجھے کہا تھا، عادے! اس معاملے میں نہ آ۔ تو نے اپنی من مانی کی ہے۔ کیا چاہتا ہے تو؟ ٹکر لے گا ہم سے......؟''

''اللہ معاف کرے ناصر بھائی! میں اپنے چودھریوں سے ٹکر لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے دیکھا ہی ہے جو کچھ ہوا ہے میری مرضی کے بغیر ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔''

''اچھا، سیٹھ صاحب نے تجھے بولنے ہی نہیں دیا۔ لیکن اب تو سیٹھ یہاں نہیں ہے نا۔ اب تو تو 'اپنی مرضی' چلا سکتا ہے نا۔ بتا اب کیا کرتا ہے؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں ناصر بھائی۔''

''دیکھ عادے! تو اتنا کاکا نہیں ہے۔ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور پہچان بھی رہا ہے۔ جس طرح تو سوچ رہا ہے اس طرح کام چلے گا نہیں۔ حبشی کی ناکامی ہماری بدنامی ہے۔ تجھے پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ میں نے تجھے کل ہی کہا تھا۔ چپ کر کے نسرور چلا جا۔ میں نے ادھر اپنے دوست سے گل کر لی ہے۔ تجھے پکی نوکری مل جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر میں تجھے کوئی ٹھیکا شیکا بھی لے دوں۔ وہاں فٹ بال کا بہت زیادہ کام ہے۔ گیند اور بلا وغیرہ بھی بنتے ہیں۔''

عادل نے چند لمحے سوچا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پر ناصر بھائی! اب تو سیٹھ صاحب سے بات ہو چکی ہے۔ میں تمہارے سامنے ہی زبان دے چکا ہوں ان کو۔''

''یعنی تو نہیں جائے گا۔'' ناصر کی آنکھوں میں انگارے سے دہک اٹھے۔

''ناصر بھائی! ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں بھی تو تمہارے ہی پنڈ کا بندہ ہوں۔ اگر مجھے کچھ کامیابی ملے گی تو وہ بھی تمہاری ہی کامیابی ہے۔ چودھری مختار صاحب کی کامیابی ہے، بات تو ایک ہی ہے حبشی نہ سہی میں سہی۔''

''دیکھ عادے! زیادہ باتیں نہ بنا۔'' ناصر نے آنکھیں نکالیں۔ ''مجھ سے دو حرفی گل کر۔ تو نے یہاں سے جانا ہے یا نہیں۔''

عادل ذرا سنبھل کر بولا۔ ''ناصر بھائی! تم کیوں مجھے پیچھے رکھنا چاہ رہے ہو۔ ادھر سیٹھ کے بندے ابرار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ لوگ میرا پوچھنے کے لیے پنڈ گئے تھے مگر تم نے اور بڑے چودھری جی نے میرا پتا دینے سے انکار کر دیا۔ کہہ دیا کہ عادا لاہور یا کراچی میں ہے اور اس کی کچھ خبر نہیں۔ حالانکہ میں تمہیں پورا پتا دے کر گیا تھا۔''

''وہ پتا گم ہو گیا تھا چودھری صاحب سے۔'' حبشی نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ایسے نہیں مانے گا تو؟'' ناصر کا لہجہ زہرناک ہو گیا۔ ''اپنی ماں کی طرح اڑیل ہے تو...... پورا پورا اڑیل ہے۔''

عادل کے سینے میں شعلے بھڑک اٹھے۔ ''دیکھو چودھری! میری ماں کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔''

چودھری زہرخند لہجے میں گویا ہوا۔ ''لو بھئی، سلطان راہی جاگ گیا ہے اس کے اندر۔ اس کی ماں کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ ایسی سچی کھری ماں ملتی بھی کہاں سے ہے۔ نہ ہی ایسا پتر کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ دونوں جھونپڑے میں بیٹھ کر حویلیوں اور جاگیروں کے سندر سپنے دیکھ رہے ہیں۔ ماں گر سکھا رہی ہے اور پتر عشق پیچے لڑا کر تا یا کے گھر میں سن (نقب) لگانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ پر یہ گندی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی عادے پتر۔ خود بھی جوتے کھائے گا اور ماں کو بھی پڑوائے گا۔''

ناصر کی آنکھوں میں غضب کے شعلے تھے۔ اب عادل کے لیے مزید سہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ چودھری ناصر پر جا پڑا۔ وہ جیسے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے کھڑے کھڑے ٹانگ رسید کی۔ وہ اچٹتی سی عادل کے سینے پر پڑی۔ مگر یہ ضرب عادل کو روکنے میں ناکام رہی۔ وہ سیدھا چودھری ناصر پر آیا اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا چارپائی پر گرا۔ چارپائی ٹوٹ گئی۔ عادل کا بھرپور گھونسا چودھری ناصر کے منہ پر پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا گھونسا مارتا عقب سے حبشی نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا اور ایک دھاڑ کے ساتھ اسے ہوا میں اٹھانے کی کوشش کی۔ عادل نے اپنی دونوں ٹانگیں جوڑ کر ناصر کے منہ پر ماریں اور اسے پھر سے زمیں بوس کر دیا۔ حبشی اسے چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھا۔ عادل نے اپنے سر کے عقبی حصے سے اس کی ناک پر ضرب رسید کی لیکن وہ سہہ گیا۔

عادل بچپن سے ہی لڑائی بھڑائی کا شوقین تھا۔ خالی ہاتھ دو تین بندوں سے نبٹ لینا اس کے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا انتہائی لچک دار اور سبک جسم بنا ہی مار دھاڑ کے لیے ہے۔ مگر یہاں صورت حال اچانک ہی گمبھیر ہو گئی تھی۔ حبشی کے ساتھ ہی ہٹا کٹا تاجا بھی عادل پر جھپٹ پڑا۔ اب عادل کے دوست صادق نے بھی اس لڑائی میں کودنا ضروری سمجھا۔ اس نے عادل کو حبشی سے چھڑانے کے لیے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور پورے زور سے کھینچنے لگا۔ اس دوران میں تاجے نے اپنی کہنی کی ایسی شدید ضرب صادق کو لگائی کہ اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ نیم جان سا ہو کر انگیٹھی پر گرا اور ادھ




SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

بجھے انگارے چاروں طرف بکھر گئے۔ چودھری ناصر سمیت تینوں افراد نے اب عادے کو دبوچ لیا تھا "حرامزادے، کتے، ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے" چودھری ناصر پھنکارا اور عادل کے چہرے پر گھونسے رسید کرنے لگا۔ عادل نے ایک بار پھر زور مارا۔ وہ حبشی کی گرفت سے قریباً نکل ہی گیا تھا مگر تاجے نے چارپائی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر ضرب لگائی، وہ اوندھے منہ گر گیا۔ چند ادھ بجھے انگارے اس کے سینے اور بازوؤں پر برچھیوں کی طرح چبھے۔ "ہڈیاں توڑ دو حرامی کی۔" چودھری ناصر دھاڑا۔ اس کی ساری اندرونی نفرت اور کدورت اب شیش ناگ کی طرح پھن پھیلا کر باہر نکل آئی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ عادل کو اپاہج کرنے کے چکر میں ہے۔

دھما چوکڑی کی آوازوں سے کباڑ خانے کے دو دیگر ملازم بھی جاگ گئے تھے۔ غالباً ان کی آوازوں نے ہی ڈھلائی کے کارخانے میں سوئے ورکروں کو بھی جگا دیا۔ کئی افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ وہ چودھری ناصر اور اس کے کارندوں کو عادل سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ عین ممکن تھا کہ ان میں سے کچھ ناصر وغیرہ پر ٹوٹ بھی پڑتے لیکن تب تک ہٹا کٹا بدمعاش تاجا اپنی قمیص کے نیچے سے بٹن سے کھلنے والا چاقو نکال چکا تھا۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ اگر اندر آنے والے افراد نے لڑائی میں شرکت کی کوشش کی تو وہ چاقو کا بے دریغ استعمال کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندر آنے والے افراد صرف بیچ بچاؤ تک محدود رہے۔ گلی کا چوکیدار اور چند مزید افراد بھی اندر آگئے۔ کچھ لوگوں نے مضروب عادل کو گھیر لیا۔ کچھ چودھری ناصر اور اس کے کارندوں کو دھکیل دھکال کر کوٹھری سے باہر لے گئے۔ یہ لڑائی کسی بڑے سانحے میں تبدیل ہونے سے بچ گئی۔ صادق کا جبڑا ٹوٹ چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ دبائے کوٹھری کے نیم پختہ فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

معاملہ تھانے کچہری تک پہنچ سکتا تھا لیکن رانا سیٹھ بیچ میں کودا...... اس نے کوشش کر کے اس گرما گرمی کو ٹھنڈا کیا۔ عادل کے کباڑیے دوست نے بھی (جواب کارخانے دار بھی تھا) بیچ بچاؤ میں کردار ادا کیا۔ یہ لوگ ایک دو معزز بندوں کے ساتھ لالی گاؤں بھی گئے اور چودھری مختار کے ساتھ مل کر صلح صفائی کرائی۔ عادل کا ساتھی صادق میو اسپتال کے ہڈی وارڈ میں زیر علاج تھا۔ اس کے جبڑے کا علاج ہو رہا تھا۔

اس سارے واقعے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حبشی، رانا سیٹھ کی ملازمت چھوڑ کر گاؤں واپس چلا گیا۔ چھوٹے چودھری ناصر اور رانا سیٹھ کے تعلقات بھی تقریباً ختم ہو گئے۔ بہرحال عادل اور چھوٹے چودھری ناصر کی دبی دبی دشمنی میں جو چنگاریاں بھڑکی تھیں وہ بہ دستور چمکتی رہیں۔ عادل کو بڑی اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ چنگاریاں جلد یا بدیر پھر سے شعلے بنیں گی اور ان کی تپش کسی نہ کسی شکل میں اس تک پہنچے گی۔

ایک دن رانا سیٹھ کے دفتر میں چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے عادل نے مؤدب انداز میں کہا۔ "سیٹھ جی! میں سمجھتا ہوں کہ اب میری ماں کا وہاں گاؤں میں رہنا ٹھیک نہیں۔ چودھری اسے کسی نہ کسی طرح پریشان ضرور کریں گے۔ وہ بوڑھی جان ہے۔ پہلے ہی صدموں کی ماری ہوئی ہے۔"

"کیا چاہتے ہو؟"

"کیا کوئی ایسا انتظام ہو سکتا ہے کہ میں ماں کو یہاں لاہور لے آؤں۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا گھر مل جائے۔"

رانا سیٹھ نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور ناک سے دھواں چھوڑ کر بولا۔ "اچھا، میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہو سکے لیکن...... لیکن تمہاری ماں کو تو پھر بھی زیادہ تر اکیلا ہی رہنا پڑے گا کیونکہ ہم نے تو مختلف نمائشوں میں شرکت کرنی ہوتی ہے۔ ادھر سے ادھر سفر کرتے ہی رہنا ہوتا ہے ہم نے۔ کیا تمہارا کوئی اور ایسا رشتے دار نہیں جو کسی دوسرے گاؤں میں یا شہر میں تمہاری والدہ کو رکھ سکے؟"

عادل نے کہا۔ "نہیں سیٹھ جی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، ہمارے سارے رشتے دار کھاتے پیتے لوگ ہیں اور...... غریب رشتے داروں سے میل جول رکھنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔"

"گھبراؤ نا۔ بہت جلد تم اتنے غریب نہیں رہو گے۔" رانا سیٹھ نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

"میں ہر طرح کی محنت کو تیار ہوں سیٹھ جی۔ کلب کا کام تو شام کے بعد ہی ہوتا ہے، سارا دن تو فارغ ہوتا ہوں۔ آپ بے شک کوئی اور کام بھی میرے ذمے لگا دیں۔"

"نہیں عادے! ابھی تم اپنا سارا دھیان اسی چڑھائی والے کھیل کی طرف ہی رکھو۔ لوگ تمہارے کام کو پسند کر رہے ہیں۔ ہم اس میں کچھ نئی چیزیں شامل کر کے اسے اور دلچسپ بنائیں گے۔ تم اس میں بہت آگے جا سکتے ہو۔ باقی کھانے پینے کی کوئی پروا نہیں کرنی۔ جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے یا ابرار سے کہہ دیا کرو...... اور ہاں...... مجھے پتا چلا ہے کہ سندھ سے کوئی لڑکا آرہا ہے۔ کسی وڈیرے کا ہاری ہے۔ کھجور کے باغوں میں کام کرتا ہے، لگتا ہے کہ وہ کافی سخت مقابلہ کرے گا تمہارا۔ ان لوگوں نے کہیں اخبار میں خبر پڑھی ہے، ہمارے اس چڑھائی والے آئٹم کی اور انعام کا بھی پتا چلا ہے ان کو۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ انعام اب چار لاکھ کر دیا ہے ہم نے۔ چار لاکھ کا معاملہ ہے اور عزت بے عزتی کا بھی۔" سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں جی۔ میں جان لڑا دوں گا۔" عادل نے کہا۔

عادل نے واقعی اس مقابلے میں جان لڑا دی۔ یہ مقابلہ سات آٹھ روز بعد ہوا۔ سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ اخباری نمائندے اور ٹی وی کے دو چار رپورٹرز بھی آئے ہوئے تھے۔ کھجور کے دونوں تنوں کے اردگرد سیکڑوں تماشائی منتظر تھے۔ پورا احاطہ روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ رانا سیٹھ نے عادل کو کھل کر تو نہیں بتایا تھا لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس مقابلے پر موٹی رقموں کی شرطیں وغیرہ بھی لگائی گئی ہیں۔ عادل کا مد مقابل لڑکا اپنے سائیں اور کچھ دیگر لوگوں کے ہمراہ یہاں پہنچا تھا۔ وہ گہری گندمی رنگت والا چھریرے بدن کا تھا۔ سنا تھا کہ وہ درخت پر چڑھنے کے علاوہ بلندی سے پکی زمین پر چھلانگ لگانے اور تنے ہوئے رسے پر چلنے جیسے کاموں میں بھی ماہر ہے۔ اس لڑکے نے واقعی خوب مقابلہ کیا۔ پہلی چڑھائی میں تو اس نے عادل کو تقریباً ہرا ہی دیا تھا۔ مگر دوسری چڑھائی میں عادل نے حقیقی معنوں میں سرتوڑ کوشش کی۔ اس کی کھال نے کئی جگہ سے چھل کر خون اگلا اور اس کی سانس سینے میں خنجر کی طرح چلی مگر وہ کمان سے چھوٹے ہوئے تیر کی طرح اپنے ہدف کی طرف بڑھتا گیا اور اپنے مد مقابل کو ایک واضح فرق سے ہرا دیا۔ اس چڑھائی میں عادل نے اپنا سابقہ ریکارڈ بھی آدھے سیکنڈ کے فرق سے بہتر کر لیا۔

یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ عادل کا خیال تھا کہ اسے کچھ انعامی رقم دی جائے گی لیکن اس بار بھی دس ہزار روپے کا صرف وعدہ ہی ہوا (ابھی پچھلا تیس ہزار والا انعام بھی اسے نہیں ملا تھا) ہاں اتنا ضرور ہوا کہ سیٹھ صاحب نے اسے ماہانہ تنخواہ مقررہ مدت سے تین روز پہلے ہی دے دی۔ یعنی بیس ہزار کے نوٹ اس کی جیب میں آگئے۔ کلب کے احاطے میں اب حبشی کے بجائے اس کی پینٹنگ، بلند پول پر آویزاں تھی۔

سیٹھ صاحب نے وعدے کے مطابق ابھی اس کی والدہ کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ عادل نے سوچا چلو جتنی دیر تک لاہور میں کسی رہائش کا بندوبست نہیں ہوتا وہ والدہ کو گوجرانوالہ میں اپنے بڑے خالو عطا شاہ کے ہاں منتقل کر دے۔

وہ رات کو اندھیرا ہونے کے بعد اپنے گاؤں لالی پہنچا۔ وہ یہاں کسی کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا اور چودھریوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔ چودھری کے بیٹے ناصر کے ساتھ اس کی لڑائی کی خبر پورے گاؤں کو مل چکی تھی۔ عادل نے راتوں رات ہی والدہ کو تیار کیا اور پھر منہ اندھیرے انہیں وہاں سے لے کر گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

گوجرانوالہ میں والدہ کا انتظام ہو گیا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔ اب وہ زیادہ یکسوئی سے اپنی مصروفیات کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ وہ کام تو کر رہا تھا مگر اپنی آمدن اور آگے بڑھنے کی رفتار سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے تایا کے ڈیرے پر کھڑے ہو کر دعویٰ بھی تو غیر معمولی کر لیا تھا۔ یہ کوئی پانچ دس لاکھ کی بات نہیں تھی، دو ڈھائی کروڑ کی بات تھی۔ تین سال میں ڈھائی کروڑ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب ہی لگتا تھا۔

عادل کے پاس دن کے زیادہ تر حصے میں کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ وہ اپنے گاؤں کے عبدالقدیر کی طرح خود بھی کباڑ کا کام شروع کر دے۔ قدیر نے اسی کام سے پچھلے ڈھائی تین سال میں نہ صرف بہت سی مشینیں خرید لی تھیں بلکہ اپنا ایک پلاٹ بھی لے لیا تھا۔ اس پلاٹ سے بھی اسے کافی فائدہ ہوا تھا۔ یعنی وہ دو چار سالوں میں صفر سے پچاس ساٹھ لاکھ کی اسامی بن چکا تھا۔

بہرحال ایسا کوئی کام شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ رانا سیٹھ سے اجازت لے لی جائے۔ ایک دن اس نے رانا سیٹھ سے بات کی۔ سیٹھ نے کہا۔ "عادے! دیکھو اصل بات پھر تمہارے ذہن سے نکل رہی ہے۔ ہم نے لاہور میں مستقل نہیں ٹھہرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو ماہ بعد ہمیں سیالکوٹ جانا ہو گا اور پھر آگے کسی شہر میں۔ تم اپنے کباڑ کے اس کام کو ساتھ ساتھ تو لے کر نہیں پھر سکتے نا؟"

"سیٹھ جی! میں نے اس کا بھی سوچا ہے۔" عادل نے اعتماد سے جواب دیا۔ "میرا یار اب آپ کی دعا اور مدد سے صحت یاب ہے۔ میں یہ کام شروع کر کے اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ جب ہم لاہور میں نہیں ہوں گے، وہ دیکھ بھال کرتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔" رانا سیٹھ نے کہا۔

عادل کے اندر ایک عجیب سی بے قراری تھی جو ہر وقت اسے متحرک رکھتی تھی۔ ایک ترنگ ایک لہر، آگ کی ایک لپٹ سی...... اس کے سینے میں ہر پل کچھ سلگتا رہتا تھا جو اسے غیر معمولی توانائی فراہم کرتا تھا۔ دو تنخواہیں اکٹھی ہو چکی







SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھیں۔ وہ بڑی کفایت شعاری سے خرچ کرتا تھا۔ قریباً پینتیس ہزار روپیہ اس کے پاس موجود تھا، دس پندرہ ہزار کی بچت صادق کے پاس بھی تھی۔ انہوں نے ایک خالی پلاٹ کرائے پر لے لیا۔ اس پر ٹین کی بری بھلی چھت ڈالی۔ بڑے سائز کا ترازو یعنی کنڈا خریدا اور کباڑ کا کام شروع کر دیا۔ سائیکلوں اور ریڑھیوں والے کباڑیے ان کے پاس آنے لگے اور اپنا مال فروخت کرنے لگے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ بندہ جب کسی کام میں پڑتا ہے تو پھر اس کی اصل مشکلات اور اونچ نیچ کا علم ہوتا ہے۔ عادل بالکل ایمانداری سے کام کرنا چاہتا تھا مگر دیگر کاموں کی طرح اس کام میں بھی کئی ہیر پھیر تھے۔ خاص طور سے وزن اور تول کی چکر بازی اس میں شامل تھی۔

عادل کا دوسرا کام بھی کامیابی سے جاری تھا۔ اس کی وجہ سے رانا سیٹھ کے کلب کی کافی شہرت ہوئی تھی۔ رانا سیٹھ کلب کے ساتھ ہی ایکسرسائز کی جدید مشینوں کا اسٹال بھی لگاتا تھا۔ یہ اسٹال بھی معمول سے زیادہ چل رہا تھا۔ ان دنوں ابھی ٹی وی چینل اتنے زیادہ تو نہیں تھے پھر بھی ایک چینل نے اس کے مظاہرے کو اپنی اسکرین پر دکھایا اور تعریف کی۔ وقتاً فوقتاً سخت مدمقابل بھی کلب میں آتے رہتے تھے مگر ابھی تک کوئی بھی عادل سے سبقت لے جانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ موقع پڑنے پر وہ بڑے اعتماد سے اسٹارٹنگ پوائنٹ پر آتا۔ گھڑیال پر چوٹ پڑتے ہی بجلی کی رفتار سے 36 فٹ اونچے تنے پر چڑھتا اور دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا۔ آج کل ڈیجیٹل اسٹاپ واچ پر اس کا ریکارڈ ٹائم، گیارہ اعشاریہ پانچ سیکنڈ چمکتا تھا اور دیکھنے والوں کو چیلنج کرتا تھا۔

رانا سیٹھ نے اسے ابھی تک رہائش فراہم نہیں کی تھی۔ وہ اس خالی پلاٹ میں ہی رہ رہا تھا جہاں وہ اور صادق کباڑ کا سامان اکٹھا کرتے تھے۔ یہاں کچی چھت ڈال کر انہوں نے ایک اور نیم پختہ کمرا سا بنا لیا تھا۔ ایک روز گاؤں سے اس کے بچپن کا دوست شاہد عرف ڈاکٹر اس سے ملنے کے لیے آیا۔ وہ دونوں آپس میں ہر طرح کی بات کر لیا کرتے تھے۔ عادل اور شہزادی کی ہمراز ریحانہ جولالی گاؤں میں عادل کی پڑوسن تھی، شاہد کی ماموں زاد بھی تھی۔ ریحانہ کے ذریعے تایا فراست علی کی حویلی کی باتیں شاہد کو معلوم ہوئیں اور اس نے یہ صورت حال آکر عادل کو بتائی۔

شاہد نے کہا۔ ”یار! وہاں اندر خانے کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ پچھلے ہفتے چودھری مختار نے تمہارے تایا جی اور ان کے سارے گھر کی کافی بڑی دعوت کی ہے اپنے گھر میں۔ شہزادی بھی گئی ہوئی تھی۔ لمبے چوڑے انتظام تھے وہاں۔“

”لمبے چوڑے کیا مطلب؟“

”بڑے ٹھاٹ باٹ دکھائے ہیں چودھری مختار نے تمہارے تایا صاحب کو۔ گوجرانوالہ سے باورچی بلائے گئے تھے۔ کوئی بیس طرح کے کھانے تھے۔ مرغابی اور ہرن وغیرہ کا گوشت تھا۔ لوک پنجابی گیت گانے والے بھی آئے ہوئے تھے۔ سنا ہے چار پانچ لاکھ روپیہ تو ان گانے والوں کو ہی دیا گیا ہے۔“

”دعوت کس سلسلے میں تھی؟“

”یار! یہ وڈے لوگ جب وڈے لوگوں کی دعوتیں کرتے ہیں تو اس کے لیے کسی وجہ کی لوڑ نہیں ہوتی۔ ویسے اس دعوت میں تو شاید تھوڑی بہت وجہ ہے بھی۔“

”کیا مطلب؟“ عادل نے پوچھا۔

”ریحانہ نے بتایا ہے کہ چودھری مختار تمہارے تایا سے جو میل جول بڑھا رہا ہے تو اس کے پیچھے شہزادی کا رشتہ ہی ہے۔ اس نے چھوٹے چودھری ناصر کے لیے سرسری طور پر شہزادی کا رشتہ مانگا ہے اور اندر خانے کی خبر یہ ہے کہ تمہارے تایا جی نے انکار نہیں کیا۔“

”کیا مطلب، اقرار کیا ہے؟“ عادل کی دھڑکن رک سی گئی۔

”نہیں، اقرار بھی نہیں کیا۔ یعنی ابھی یہی کہا ہے کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ شاید ان کا مطلب یہ ہوگا کہ شہزادی ابھی چھوٹی ہے۔“

عادل ایک طویل ”ہوں“ کر کے خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد پرسوچ انداز میں بولا۔ ”ریحانہ نے کچھ اور بھی بتایا ہے؟“

”یہی کہ شہزادی آج کل بہت اداس رہتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی آنکھیں رونے سے سرخ نظر آتی ہیں لیکن اب وہ ریحانہ سے تمہارے بارے میں کسی طرح کی کوئی بات نہیں کرتی۔ شاید اس نے اس بارے میں کوئی قسم کھائی ہوئی ہے۔ ویسے تم نے شہزادی کو کوئی پیغام دینا ہے تو دے دو۔ ہوسکتا ہے کہ ریحانہ تمہاری بات شہزادی تک پہنچا دے۔“

”پیغام کیا دوں شاہد! میں نے جو کچھ اس سے کہنا تھا کہہ دیا ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔ میں اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کروں گا جو میرے بس میں ہے۔ اگر کامیاب ہو گیا تو ایک دن اس کے پاس گاؤں پہنچ جاؤں گا اور اگر ناکام ہو گیا تو...... پھر بھی اسے شکل نہیں دکھاؤں گا





اور...... ہوسکتا ہے کہ خود کو مٹی کے نیچے ہی چھپا لوں۔“

عادل کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر شاہد بھی اداس ہو گیا۔ بھرائی آواز میں بولا۔ ”ایسی باتیں نہ کر یار۔ تیرے ارادے نیک ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ سوہنا کوئی نہ کوئی راہ نکال دے گا۔ ویسے تو کوئی پیغام شیغام بھیج دے شہزادی بہن کو۔ اس کو حوصلہ ملے گا۔“

”نہیں شاہد! میں نے تایا سے وعدہ کیا ہے۔ اب شہزادی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھوں گا۔ اگر کبھی ملوں گا تو ان کی اجازت سے ملوں گا۔“

شاہد اس کا بچپن کا یار تھا۔ سمجھ گیا کہ اب وہ اس معاملے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”تیرا یہ کباڑ والا کام کیسا جا رہا ہے؟“

”بس چل ہی پڑا تھا لیکن...... اب ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”یہ کرائے کا پلاٹ ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ اگلے مہینے خالی کر دو۔ اب پھر کوئی اور جگہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ پتا نہیں کوئی ڈھنگ کا ٹھکانا ملتا بھی ہے یا نہیں۔“ عادل کے لہجے میں پریشانی کی جھلک تھی۔

اسی دوران میں پلاٹ سے باہر کوئی بڑی گاڑی رکنے اور دروازے بند ہونے کی آوازیں آئیں۔ ساتھ ہی گیٹ پر دستک ہوئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ موسم ابر آلود تھا۔ کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش ہو رہی تھی۔ عادل، ایک پلاسٹک کا ٹکڑا سر پر اوڑھ کر پھاٹک پر گیا۔ باہر ایک کرولا کار کھڑی تھی۔ گیٹ پر پچپن ساٹھ سال کا ایک دراز قد شخص موجود تھا۔ اس کی کاٹھی مضبوط اور سر کے بال لمبے تھے۔ گھنی بھوؤں اور چھوٹی چھوٹی سفیدی مائل ڈاڑھی نے اس کے سرخ و سپید چہرے کو ایک باوقار رنگ دے رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر نمایاں چیز اس کی بڑی بڑی پرسوچ آنکھیں اور اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی مضبوط ہڈیاں تھیں۔ یہ ہڈیاں اس کی سخت جانی اور جاں فشانی کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس نے پینٹ کے اوپر سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک ملازم ٹائپ شخص اس کے سر پر چھتری تانے کھڑا تھا۔

”جی فرمائیں۔“ عادل نے ذرا حیرت سے کہا۔

”تمہارا نام ہی عادل ہے نا۔“ عادل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیا میں تمہارا تھوڑا سا وقت لے سکتا ہوں؟ دراصل میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

عادل نے کہا۔ ”یہاں آپ کے لائق بیٹھنے کی جگہ تو نہیں ہے۔ اگر...... آپ مناسب سمجھیں تو گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔“

”نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... جہاں تم بیٹھ سکتے ہو، وہاں میں بھی بیٹھ سکتا ہوں۔ ہم دونوں انسان ہی تو ہیں۔“ وہ ہولے سے مسکرایا اور اس کی آنکھوں کے گرد خوب صورت سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ اس کے لب و لہجے میں عجیب سا فلسفیانہ آہنگ تھا۔

”آیئے۔“ عادل نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

بارش کچھ تیز ہو گئی تھی۔ وہ دونوں جلدی سے اس چھوٹے سے کمرے میں آگئے جہاں اینٹوں کے چولہے میں آگ روشن تھی۔ عادل کے اشارے پر صادق نے پلاسٹک کی ایک کرسی کو اچھی طرح جھاڑا۔ ”بیٹھیے جناب!“ عادل نے کہا۔ وہ شخص بڑی تمکنت سے بیٹھ گیا۔ نجانے کیوں اب عادل کو لگ رہا تھا کہ اس نے اس باوقار چہرے کی جھلک پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ اس کا ملازم، جو ڈرائیور تھا، واپس گاڑی میں چلا گیا۔ عادل کے اشارے پر صادق بھی باہر نکل گیا اور ٹین کی چھت والے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔

ڈاڑھی والے شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام سرمد ابدال ہے۔ بس گزر اوقات کے لیے یہاں لاہور میں ایک چھوٹی سی فیکٹری رکھی ہوئی ہے۔ وہاں ایکسرسائز کی مشینیں وغیرہ بنتی ہیں۔ ویسے میرا اصل شوق سیاحت ہے۔ اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق بہت سے سفر کیے ہیں۔ ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔ خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے، ہم اس پر بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔ فی الحال میں تمہیں یہاں اپنے آنے کی وجہ بتانا چاہتا ہوں اور یقیناً یہی سوال اس وقت تمہارے ذہن میں بھی شدت سے ابھر رہا ہوگا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر۔“

ڈاڑھی والے شخص نے اپنی چھوٹی سی ڈاڑھی میں انگلیاں چلائیں اور کہا۔ ”میں پچھلے دس پندرہ روز سے وہاں نمائش میں جا رہا ہوں...... اور تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تم جو کچھ وہاں کر رہے ہو اس نے مجھے حیران کیا ہے اور...... کسی حد تک مایوس بھی۔“ ایک لحہ توقف کر کے اس شخص نے بہ غور عادل کا چہرہ دیکھا۔ عادل کو لگا کہ یہ شخص بندے کے اندر تک جھانک لیتا ہے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”حیرانی کی وجہ تو یقیناً سامنے کی بات ہے اور یہ بات سب کو ہی معلوم ہے تم درخت پر چڑھنے کا جو مظاہرہ کرتے ہو وہ بے حد متاثر کرنے والا ہے۔ بے شک اس میں تمہاری بہت سی مشق بھی شامل ہے اور تجربہ بھی۔ بہرحال



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بجلی کی سی رفتار سے درخت کی چوٹی پر پہنچنا اور ہاتھ مار کر سرخ جھنڈی کو گرانا ایک قابل دید منظر ہوتا ہے۔ مجھے نظر نہیں آتا کہ کوئی جلد ہی تمہارے اس ریکارڈ کو توڑ سکے گا۔ یہ بالکل گاڈ گفٹڈ ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' عادل نے کہا۔

''اب اگر تم برا نہ مانو تو میں مایوسی والی بات کی طرف آتا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم خود کو ضائع کر رہے ہو۔ بالکل ضائع کر رہے ہو۔ یہ کرکٹ، ہاکی یا جمناسٹک وغیرہ کی طرح کوئی ایسا کھیل نہیں، جس میں بندہ آگے بڑھ سکے، نام پیدا کر سکے، ملک میں اور ملک سے باہر کامیابیاں سمیٹ سکے۔ میں اپنے تجربے اور اپنے نالج کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ قدرت نے تمہیں ایک زبردست صلاحیت دی ہے۔ اس صلاحیت کو اگر کوئی مناسب راستہ نہ ملا تو یہ یہیں کھجور کے درختوں پر چڑھ چڑھ کر اور الٹے سیدھے کاموں میں حصہ لے کر ضائع ہو جائے گی۔''

''میں سمجھا نہیں جناب! آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

اس شخص نے کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہ بادلوں نے عین دوپہر کے وقت ہی شام کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ اس لہریے کا عکس اس شخص کی سوئی سوئی خوب صورت آنکھوں میں نمایاں ہو کر اوجھل ہو گیا۔ دو تین سیکنڈ کے وقفے سے بادل دہاڑے اور یوں لگا کہ اس کمرے کے بلکہ پورے شہر کے در و دیوار لرز گئے ہیں۔ اس نے چولہے میں روشن آگ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تم مستقبل بینی کے بارے میں کیا جانتے ہو۔ میرا مطلب ہے آنے والے وقت کے بارے میں پہلے سے جان جانے کا علم؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میری تعلیم بہت کم ہے۔ بس اتنا پتا ہے کہ غیب کا علم صرف اوپر والے کو ہے۔ ہم تو صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ غیب کا علم صرف اوپر والے کو ہے، ہم تو صرف اندازے لگا سکتے ہیں۔ یہ اندازے ہم اس اوپر والے کی دی ہوئی عقل سمجھ سے ہی لگاتے ہیں۔ یہ کام بھی اوپر والے نے ہمارے اوپر ہی چھوڑ دیا ہے کہ ہم اپنی عقل کو کتنی توجہ اور یقین کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔ مستقبل کے بارے میں جاننے کا علم کیا ہے؟ یہ کوئی سفلی عمل یا جادو ٹونہ نہیں ہے۔ یہ سارا سمجھ بوجھ اور سوچ بچار کا کھیل ہے۔ اگر ہم اپنے خدا کی دی ہوئی عقل کو ٹھیک سے استعمال کریں اور چیزوں کو پوری باریک بینی سے پرکھ کر حالات پر غور کریں تو ہم مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔''

''لیکن جناب! یہ تو صرف اندازہ ہوا نا۔''

''اندازہ لگانے کی صلاحیت جب عروج پر پہنچتی ہے تو یہی پیش گوئی اور مستقبل بینی بن جاتی ہے۔ ہمارے اردگرد کے حالات اور مناظر میں بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہر وقت رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارا ذہن ان میں سے کچھ کو نوٹ کرتا ہے اور اکثر کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن جو لوگ مستقبل میں جھانکتے ہیں وہ زیادہ کو نوٹ کرتے ہیں اور کم کو نظر انداز کرتے ہیں، دھیرے دھیرے وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بدلنے والے حالات کے بارے میں پیشگی اندازے لگا لیتے ہیں۔ شاید تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ آج کے سائنسدان اور دانشور یہی سمجھتے ہیں کہ انسان اپنی دماغی صلاحیت کا بالکل مختصر سا حصہ استعمال کرتا ہے، باقی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا رہتا ہے اور لاش کے ساتھ قبر میں چلا جاتا ہے۔''

''آپ کی کچھ باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں اور کچھ نہیں۔ پھر بھی آپ کی ساری باتیں دل پر اثر کر رہی ہیں۔'' عادل نے کہا۔

''دیکھو، میں اپنے خیال کی وضاحت ایک معمولی سی بات سے کرتا ہوں۔'' سرمد صاحب نے کہا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ نوٹ بک نکالی، پھر جیکٹ کی جیب سے ایک قلم نکالا اور اس پر کچھ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ عادل سمجھا کہ وہ اس بارے میں شاید کوئی بات کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ عادل کے والدین اور اس کے گھر بار کے بارے میں عمومی سوالات کرتے رہے۔ چولہے میں آگ روشن تھی اور چند موٹی لکڑیوں کو لگنے کے بعد آگ مزید روشن ہو گئی تھی۔ عادل نے تپش سے بچنے کے لیے اپنی کرسی تھوڑی سی پیچھے کھسکائی۔ شیشے کے ایک گلاس میں کچھ چائے بچی ہوئی تھی وہ الٹ گئی۔ تاہم کچے فرش کی وجہ سے گلاس ٹوٹنے سے بچا رہا۔ عادل نے گلاس کو جلدی سے اٹھا کر سیدھا کیا۔ ایسا کرنے کے لیے وہ جب نیچے جھکا تو اس کی قمیص کی سامنے والی جیب سے کچھ کاغذات پھسل کر گر گئے اور ادھر ادھر بکھر گئے۔ ان میں رسیدیں وغیرہ تھیں اور چالیس پچاس روپے کے کرنسی نوٹ ہوں گے۔ عادل نے انہیں جلدی جلدی سمیٹا۔

سرمد صاحب مسکرائے۔ ''لگتا ہے کہ میری موجودگی تمہیں نروس کر رہی ہے۔ میرا مطلب ہے پریشان ہو تم۔''

''نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تو آپ کی باتیں اچھی لگ رہی ہیں۔''

''پتا ہے کیوں اچھی لگ رہی ہیں؟'' وہ سوالیہ نظروں سے سرمد صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ نیم تاریک کمرے میں آگ کی روشنی چہرے کو عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ لمبے بالوں کی ایک لٹ ان کی کشادہ پیشانی پر جھول رہی تھی۔ ہولے سے بولے۔ ''اس لیے کہ میں تمہیں بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے تمہارے اندر کچھ نظر آ رہا ہے..... تمہارا مستقبل..... تمہاری آنے والی زندگی اور جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ بہت خوش کن ہے اور حیرت انگیز بھی۔ میں..... تمہیں..... ایک بہت اونچی جگہ پر دیکھ رہا ہوں عادل..... ایک ایسے مقام پر جہاں کم ہی لوگ پہنچے ہیں لیکن تمہارے اور اس مقام کے درمیان کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ ایک بڑا مشکل اور پرپیچ سفر ہے۔ یہ آگ اور برف کے سات سمندر ہیں۔ کیا تم آگ اور برف کے سات سمندر پار کرنے کی ہمت رکھتے ہو؟'' وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولتے چلے گئے۔

عادل ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھا تھا۔ انہوں نے اس کی پریشانی دیکھی اور بولے۔ ''میرا مطلب مشکلات سے ہے۔ میں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھ رہا ہوں مگر بہت سی مشکلات کے بعد اور پتا نہیں کیوں..... پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے کہ تم مشکلات سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہو۔ کوئی توانائی ہے تمہارے اندر جو تمہیں آگے بڑھا سکتی ہے، ایک بے قراری ہے، ایک ایسی بے چینی جو لوگوں میں شاذ و نادر ہی نظر آیا کرتی ہے۔ اس بے پناہ بے چینی اور توانائی کو اگر درست راستہ مل گیا تو تمہارا مشکل سفر آسان ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے کسی سے پیار کیا ہے؟''

انہوں نے آخری الفاظ ایک دم ہی کہہ ڈالے تھے، عادل بھونچکا سا رہ گیا۔ ''جج..... جی..... میں سمجھا نہیں۔'' وہ ہکلایا۔

''کسی سے پیار کیا ہے تم نے..... کسی کو بہت شدت سے چاہا ہے۔ بہت زیادہ شدت سے۔'' اس مرتبہ سرمد صاحب کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا، آگاہ کرنے والا تھا۔

وہ خاموش رہا۔ ''شرماؤ مت عادل۔ یہ سلسلہ تو آدم حوا سے چلا آ رہا ہے اور تمہاری عمر میں پیار نہیں ہوگا تو کب ہوگا۔ مجھے بتاؤ..... مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ، میں بھی تمہیں، تمہارے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ میں نے بتایا ہے نا کہ میں پچھلے کافی دنوں سے نمائش پر جا رہا ہوں اور تمہیں وہاں دیکھ رہا ہوں۔ میں اگر یہاں پہنچا ہوں تو اس کے پیچھے

## کترنیں

☆اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کیچڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔

☆ایک اچھے دوست کی مثال ایک اچھی خوشبو کی طرح ہوتی ہے جب بھی تم اس کو یاد کرو گے تو تمہیں اس کی مہک ضرور آئے گی۔

☆اپنی زندگی میں ایسے دوستوں کو شامل کرو جو ہمیشہ آئینہ اور سایہ بن کے رہیں کیونکہ آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور سایہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

☆انسان کو جتنا لگاؤ رزق سے ہے، اگر اتنا لگاؤ رزق دینے والے سے ہوتا تو اس کا مقام فرشتوں سے بڑھ کر ہوتا۔

☆رشتے بھی پودوں کی طرح ہوتے ہیں جس طرح پانی نہ ملنے سے پودے مرجھا جاتے ہیں ویسے ہی وقت اور پیار نہ ملنے سے رشتے مرجھا جاتے ہیں۔

☆رزق کے لیے اپنا ایمان خراب نہیں کرو کیونکہ نصیب کا رزق انسان کو ایسے تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے کو موت۔

☆صبر انسان کی بنیاد ہے

☆نرمی کامیابی کی کنجی ہے۔

☆سچائی حق کی زبان ہے۔

☆سخاوت انسان کی زینت ہے۔

☆اور موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔

اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا ایک بہترین خصوصیت ہے، اس سے نفس میں عاجزی پروان چڑھتی ہے اور تکبر کمزور ہو جاتا ہے۔

☆اکثر اوقات سچ کڑوا نہیں ہوتا، سچ بولنے کا انداز کڑوا ہوتا ہے۔

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی

اورنگی ٹاؤن، کراچی





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی وجہ ہے، بہت خاص وجہ۔ تم مجھے اپنے بارے میں معلومات دو عادل۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ باتیں بس میرے اور تمہارے درمیان رہیں گی۔ پلیز عادل! مجھے غیر نہ سمجھو اور...... اپنا بزرگ بھی نہ سمجھو۔ مجھے اپنا دوست سمجھو۔ میں جانتا ہوں، تم مشکل میں ہو۔ میں تمہیں اس مشکل سے نکال کر ایک بہت بڑی آسانی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں۔"

پتا نہیں کیوں عادل کا دل اس مہربان شخص کی طرف جھکتا چلا جارہا تھا۔ ایک گھنٹے کے ساتھ کے بعد ہی اسے لگنے لگا تھا کہ وہ انہیں مدتوں سے جانتا ہے...... اور وہ ایسے ہیں جن پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ خود کو اپنی تمام تر الجھنوں کے ساتھ ان کی غیر معمولی دانش کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ذات میں کئی باتیں انوکھی محسوس ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ عادل کو ان کے خوب صورت ہاتھوں پر کچھ گٹھے سے نظر آرہے تھے۔ سیاہی مائل سخت جلد...... جس کی وجہ عموماً کڑی محنت مشقت ہی ہوتی ہے۔

باہر بارش مسلسل جاری تھی۔ صادق نہ جانے کہاں سے صاف ستھرے برتنوں میں چائے لے آیا تھا۔ اس نے ایک پیالی باہر گاڑی میں ڈرائیور کو پہنچا دی تھی باقی سرمد صاحب اور عادل کے سامنے رکھ دی تھی...... عادل نے اپنے حالات ابتدا سے لے کر انتہا تک سرمد صاحب کے گوش گزار کردیے۔ اپنی یتیمی، بہنوں کی شادیاں، بیماری، غربت اور پھر غربت میں شہزادیوں جیسی شہزادی سے محبت۔ اور محبت بھی ایسی جس نے اسے بنیادوں تک ہلا دیا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح لالی گاؤں کے چودھری اس کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کی فکر میں ہیں اور کس طرح اس نے ڈھائی تین ماہ پہلے اپنے تایا کے ڈیرے پر کھڑے ہوکر ایک بلند بانگ دعویٰ کرلیا ہے اور اب اس دعوے کی لاج رکھنے کے لیے شب و روز انگاروں پر چل رہا ہے۔

عادل کی اس روداد کے دوران میں سرمد صاحب گاہے بگاہے اس سے سوالات بھی پوچھتے رہے۔ ان کی آنکھوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے عادل جو کچھ بھی بتا رہا ہے ان کی توقعات اور اندازوں کے مطابق ہی ہے۔ عادل کی بات اپنے اختتام کو پہنچی تو سرمد صاحب نے ایک طویل سانس لے کر چولہے میں آگ درست کی اور بولے۔ "بہت لمبا سفر ہے تمہارا۔ بہت تیز تیز چل رہے ہو۔ لیکن تمہارے قدم بہت چھوٹے ہیں۔ ان چھوٹے قدموں کے ساتھ بہت تیز چلو گے یا بھاگو گے تو گر پڑو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں، بہت کچھ سمجھ رہا ہوں۔ کیا تم کرنا چاہتے ہو؟"

"میں پھر کہوں گا۔ مجھے آپ کی باتیں پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہی ہیں سر! لیکن میں کرنا نہیں چاہتا۔ میں شہزادی کو پانے کے اس سفر میں گرنا نہیں چاہتا۔"

"پورے ہوش و حواس اور ارادے سے کہہ رہے ہو؟"

"جی سر۔"

"تو پھر...... آج یہاں اس "برستی بارش والی شام" میں، اس آگ کے سامنے اور اس چھت کے نیچے، ایک فیصلہ کرلو۔"

"کیسا فیصلہ سر؟"

"جو میں کہوں گا مانو گے۔ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن اس پر عمل کرو گے۔ اس کے بدلے، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں عادل! میں تمہیں منزل تک پہنچاؤں گا، وہ سب کچھ تمہیں حاصل ہوگا جس کا تم نے ارادہ کیا ہے۔ ہاں! عادل! میں ایک حقیر سا بندہ ہوں لیکن قدرت نے مجھے تھوڑی سی باریک بینی عطا کی ہے۔ اس کی بخشی ہوئی عقل کا حق تو ہم میں سے کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا، بس اس عقل میں سے تھوڑا سا حصہ میں استعمال کرنے کے قابل ہوسکا ہوں اور میری اتنی سی کامیابی نے مجھے کافی دور تک دیکھنے کے قابل بنادیا ہے۔"

"یعنی آپ کا خیال ہے کہ آپ آنے والے وقت کے بارے میں جان جاتے ہیں؟"

سرمد صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کرلیں۔ "اللہ مجھے معاف کرے۔ شاید میں نے بے دھیانی میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے۔ میں تو کسی اندھے کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوں۔ وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی وقت میرے ذہن کو درست سمت میں منتقل کردیتا ہے۔ لیکن میں پھر کہوں گا کہ یہ کوئی جادو یا ماورائی علم نہیں۔ نوع انسانی کو خدا کی بخشی ہوئی دانش ہے، جس کا کچھ حصہ مجھ جیسے لوگ استعمال کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔"

"ابھی آپ نے اس ڈائری میں کچھ لکھا تھا اور بتایا بھی نہیں کہ کیا لکھا تھا؟"

"ہاں...... میں بھول گیا۔ بس ایک چھوٹی سی بات تھی۔ تمہیں فقط یہ سمجھانے کے لیے کہ مستقبل کے بارے میں اندازے لگانے کی حس کس طرح پروان چڑھتی ہے؟"

انہوں نے ڈائری کھولی اور لکھا ہوا صفحہ عادل کے سامنے کردیا۔ یہ بس دو فقرے تھے۔ لکھا تھا۔ "عادل! عین ممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر میں تم اپنی کرسی کچھ پیچھے ہٹاؤ اور وہ





گلاس گرادو جس میں بچی ہوئی چائے ہے۔"

عادل دنگ رہ گیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ فقرے سرمد صاحب نے چائے گرنے والے واقعے سے پہلے لکھے تھے۔ شاید تین چار منٹ پہلے۔ "یہ کیسے...... ہوا سر؟ آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"بہت سادہ ہے۔ تمہاری کرسی آگ کے زیادہ قریب تھی۔ تم باتیں کرتے ہوئے بے دھیانی میں بار بار اپنی پنڈلی کو سہلا رہے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ تمہیں تپش محسوس ہو رہی تھی۔ چولہے میں مزید لکڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ انہیں ایک دو منٹ میں مزید آگ پکڑنا تھی اور تپش کو بڑھانا تھا۔ یقینی بات تھی کہ تم اپنی کرسی کچھ پیچھے ہٹاؤ گے۔ کرسی کے پچھلے پائے کے بالکل ساتھ یہ گلاس رکھا تھا یہ تمہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے الٹنے کا امکان بہت زیادہ تھا اور دیکھو ایسا ہی ہوا۔ میں تھوڑا سا مزید غور کرتا تو اس پیش گوئی کو مزید حیران کن بنا سکتا تھا۔ تمہاری قمیص کی جیب میں کاغذات اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ تمہارے جھکنے کے سبب پھسل کر نیچے گر سکتے تھے اور یہ گرے بھی۔ اگر میں یہ منظر بھی پیش گوئی میں شامل کردیتا تو تم اور بھی ہکا بکا ہوجاتے۔ یہ سب ایک چھوٹی سی مثال ہے عادل! ہم اپنے اردگرد ہونے والی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے لے کر بڑے بڑے عالمی واقعات تک پر غیر معمولی غور کرنا شروع کردیں اور اپنے پچھلے تجربات کو خوبی سے استعمال کر پائیں تو حیران کن پیش گوئیاں کرسکتے ہیں۔ چہرے پڑھ سکتے ہیں۔ انسانوں کے اندر جھانک سکتے ہیں۔"

"نہیں سر۔ یہ اتنا سادہ نہیں۔ مجھے لگتا ہے، آپ ایک غیر معمولی شخص ہیں۔ کچھ ہے آپ کے پاس، خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ مجھے بتائیں، آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"ایک سفر۔" سرمد صاحب نے ٹھہری آواز میں کہا۔ "بہت لمبا نہیں، اور بہت چھوٹا بھی نہیں۔"

"کہاں کا سفر سر؟"

"وہاں کا۔" سرمد صاحب نے عجیب انداز سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ بارش کچھ ہلکی ہوگئی تھی لیکن لاہور کے آسمان پر تاریک بادل موجود تھے اور ان میں کبھی کبھی بجلی کا لہریا دوڑتا تھا۔ خستہ حال کمرے کی یہ کھڑکی شمال کی طرف کھلتی تھی اور سرمد صاحب کی نگاہ جیسے دور کہیں شمال میں دیکھ رہی تھی۔

"آپ اس طرف کیوں دیکھ رہے ہیں سر؟"

"اس طرف پہاڑ ہیں۔ بلندیاں ہیں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں۔ ان چوٹیوں کے بالائی سرے گھیرے بادلوں میں چھپے رہتے ہیں...... اور انہی چوٹیوں کے اوپر کہیں تمہارے لیے کچھ موجود ہے۔"

"ہم...... میرے لیے؟"

"ہاں، تمہارے لیے اور ہر اس شخص کے لیے جو اپنے اندر ہمت رکھتا ہے اور تکلیفیں سہنے کا عزم رکھتا ہے...... یہ چوٹیاں دل والوں کا امتحان لیتی ہیں اور جو اس امتحان میں پورا اترتے ہیں انہیں کچھ نہ کچھ دیتی بھی ہیں۔ اس لیے مجھے ہمیشہ ان سے پیار رہا ہے۔ یہاں کی یخ ہوائیں، یہاں کی برفیلی ڈھلوانیں، یہاں کی پر خطر پگڈنڈیاں...... سب مجھے مجذوب رہی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میری عمر کا زیادہ حصہ سیاحت میں گزرا ہے اور اس سیاحت کا ساٹھ ستر فیصد حصہ کوہ نوردی پر مشتمل ہے۔"

"لیکن آپ مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟"

سرمد صاحب نے عادل کی آنکھوں میں جھانکا، بہت اندر تک، پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولے۔ "تمہیں بتایا ہے نا کہ تمہارے لیے وہاں کچھ موجود ہے۔ ایک راستہ جو صرف تمہارے لیے بنا ہے۔ جسے بس تم جیسا شخص ہی طے کرے گا۔"

"آپ کی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں سر، کیا آپ کھل کر کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

"بتا دوں گا۔ بلکہ ضرور بتاؤں گا لیکن وقت آنے پر ہی ایسا ہوسکے گا۔ فی الحال یہ ایک غیر متعلق موضوع ہے۔ تم مجھے صرف بتاؤ، کیا تم اپنا ذہن بنانے میں کامیاب ہوگئے ہو۔ مجھے بہت جلدی بھی نہیں۔ میں تمہیں اچھی طرح سوچنے کے لیے مناسب وقت دے سکتا ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں، سوال تو بہت سے ذہن میں آرہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر میں آپ کے ساتھ کسی سفر پر جاتا ہوں تو یہ سفر کتنے دن میں ختم ہوگا۔ اس دوران میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ مجھ پر میرے گھر کی کچھ ذمے داریاں بھی ہیں۔ میرے روزگار کا کیا ہوگا......؟"

"میرے اندازے کے مطابق اس سفر کا دورانیہ تین سے چار ماہ ہوسکتا ہے۔ یہ کسی بھی طرح سے کوئی غیر قانونی کام نہیں ہوگا۔ ہاں مہم جوئی اور کوہ پیمائی والے عام خطرات تو اس میں موجود ہوں گے۔ تم نے ابھی بتایا ہے کہ تم رانا سیٹھ کے پاس ماہانہ بیس ہزار روپیہ لے رہے ہو۔ تمہارا یہ بیس ہزار والا اعزازیہ برقرار رہے گا۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی سہولتیں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی ملیں گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے تمہیں بتادوں کہ رانا سیٹھ تم سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس درختوں پر چڑھائی والے کھیل پر درپردہ بھاری شرطیں لگائی جارہی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق زیادہ نہیں تو آٹھ دس لاکھ روپیہ ہفتے کا یہ شخص تمہارے ذریعے سے بنارہا ہے۔"

ایک دم عادل کو وہ تیس ہزار روپیہ بھی یاد آگیا جس کا وعدہ، رانا سیٹھ نے انعام کے طور پر کیا تھا اور ابھی تک وعدہ بس وعدہ ہی تھا۔ اسی طرح رہائش مہیا کرنے والے معاملے کو بھی وہ مسلسل ٹالتا چلا جارہا تھا۔ سرمد صاحب نے کہا۔ "میں کچھ زیادہ بتاؤں گا تو یہ چغلی ہوجائے گی لہٰذا تھوڑے کہے کو ہی زیادہ سمجھو۔ رانا سیٹھ تمہیں اور تمہاری خاص الخاص صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرے گا۔ تمہیں اس کے گھیرے سے نکل کر آگے بڑھنا ہے۔ بہت اونچی پرواز کرنی ہے عادل...... اور مجھے پتا ہے تم کرسکتے ہو۔"

"مجھے اس بات پر معاف کیجیے گا سر! مجھے شہرت، ناموری، عیش وعشرت کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میری سب سے بڑی ضرورت روپیہ ہے۔ وہ روپیہ جو اس وقت میرے اور شہزادی کے کام آسکے۔ میں کمانا چاہتا ہوں سر! بہت تیزی سے کمانا چاہتا ہوں۔"

"تم بہت تیزی سے کماؤ گے۔ ایک ہی چھلانگ میں اس جگہ تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کا لوگ بس تصور ہی کرتے ہیں۔ جس سفر کی میں بات کررہا ہوں اس کا اختتام تمہارے لیے ایک بہت ہی اچھی جگہ پر ہونے والا ہے۔"

"کوئی...... اشارہ دیں گے آپ؟"

"ابھی نہیں، لیکن کہا ہے ناوقت آنے پر سب کچھ بتا دوں گا......"

آخر عادل نے کرسی پر پہلو بدلا اور مؤدب انداز میں بولا۔ "مجھے فیصلہ کرنے کے لیے دو دن کا وقت چاہیے سر۔"

"میں تمہیں چار دن کا وقت دیتا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ تم اچھا فیصلہ کرو گے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارا براہ راست ملنا زیادہ مناسب نہیں۔ میں تمہیں اپنا موبائل فون نمبر دیتا ہوں۔ تم رات کے سات آٹھ گھنٹوں کو چھوڑ کر جب چاہو اس پر رابطہ کرسکتے ہو۔"

☆☆☆

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ عادل نمائش گاہ میں تھا۔ معمول کے مطابق وہ ہر روز دوبار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ایک دفعہ آٹھ بجے کے لگ بھگ پھر دس بجے کے لگ بھگ۔ آج اس کے گاؤں کے عادے کا نام شہر میں مشہور ہے۔ اس کی تصویریں لگی ہوئی ہیں اور شہری لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ آج عادل نے اپنا ایک ہاتھ پشت پر باندھ کر صرف ایک ہاتھ سے درخت پر چڑھنے کا مظاہرہ کیا اور احاطہ دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔

عادل کے یار دوست گاؤں سے اس کے لیے کچھ سوغاتیں لائے تھے۔ باداموں والا گڑ، شکر پارے اور پنجیری وغیرہ...... عادل کا جگری دوست شاہد بھی ساتھ آیا تھا۔ وہ بھی اطلاع کی صورت میں ایک سوغات لایا تھا اور اس سوغات نے عادل کا منہ کافی کڑوا کردیا۔

وہ عادل کو ایک طرف لے جا کر بولا۔ "یار عادل! تجھے پنڈ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ آہستہ آہستہ شہزادی والی گیم تیرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، تو خوامخواہ پریشان ہوگا لیکن وہ جو سیانے کہتے ہیں کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند بھی نہیں کرنی چاہئیں۔"

"اچھا چل بتانا۔" عادل نے تیوری چڑھا کر کہا۔

"تمہارے تایا اور چودھری مختار کا گھرانہ تیزی سے قریب آرہا ہے۔ تمہارے تایا اور چودھری مختار نے مل کر وہاں پنڈ میں چاول صاف کرنے والی مشین لگائی ہے۔ کافی پیسا خرچ ہوا ہے اس مشین پر۔ سمجھو اب وہ دونوں ساجھے دار بھی ہوگئے ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ چودھری مختار کے دماغ میں وہی رشتے داری والی بات ہے۔ اس لیے وہ اس طرح کی ساجھے داریاں بنا رہا ہے۔"

عادل کے سینے میں تیز چبھن سی تو ہوئی لیکن وہ نارمل لہجے میں بولا۔ "شاہد! جب تک شہزادی میرے ساتھ ہے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ہم سب کچھ اپنے حق میں کرلیں گے۔"

"پر یار! یہ بھی تو سوچ کہ کئی دفعہ دوری سے نقصان بھی ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ بندے کا ذہن بدلنا شروع ہوجاتا ہے۔ اب دیکھو پچھلی جمعرات کو راہ پورے میں بگے سائیں کا عرس تھا۔ پنڈ کے سارے لوگ سج دھج کر عرس پہ گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح تمہارے تایا کے گھر والوں نے پردے والے تانگوں پر جانا تھا مگر چودھری مختار نے دو گڈوں (بیل گاڑیوں) کا انتظام کرایا۔ ان کو بڑی چنگی طرح سجایا سنوارا گیا۔ دونوں گھروں کی زنانیاں مل جل کر ان گڈوں پر بیٹھیں۔ مرد گھوڑیوں پر سوار ساتھ ساتھ تھے۔ خوب ڈھول ڈھمکا ہوتا رہا۔ عورتیں پردے کے اندر ہی ڈھولکی وغیرہ بجاتی رہیں۔ میں سارے راستے دیکھتا رہا وہ لمبو چودھری ناصر، شہزادی والی گڈ کے ساتھ ساتھ ہی رہا۔ عرس میں بھی وہ بیل گکڑ کی طرح ساری عورتوں کو ساتھ لے کر پھرتا رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ ناصر کی چھوٹی بہن فاخرہ پوری کوشش کررہی ہے شہزادی اور ناصر کو ایک دوبے کے قریب لانے کی۔ ریحانہ بتا رہی تھی کہ وہ کئی بار تمہارے تایا کی حویلی بھی آجاتی ہے اور گھنٹوں باتیں کرتی رہتی ہے شہزادی سے۔ اس کی ضد پر ایک دو دفعہ شہزادی بھی چودھریوں کے گھر گئی ہے۔"

سب کچھ عادل کے لیے دلسوز تھا مگر اس نے شاہد پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ شاہد نے ایک بار پھر کہا۔ "کبھی کبھی تو لگتا ہے عادے! کہ تو نے ماں جی کو گوجرانوالہ بھیج کر چنگا نہیں کیا۔ وہ ادھر ہوتیں تو ان سے ملنے کے بہانے تو پنڈ آتا جاتا رہتا۔ تجھے وہاں کی خیر خبر رہتی۔"

عادل تپ کر بولا۔ "تو تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں پنڈ آنے جانے کی خاطر ماں جی کو مصیبت میں ڈالے رکھتا۔ تجھے پتا ہی ہے چودھری ناصر سے جھگڑے کے بعد کتنی ٹینشن بن گئی تھی۔"

شاہد نے جلدی سے موضوع بدل کر کہا۔ "اچھا، چل تو کوئی پیغام وغیرہ ہی بھیج دے شہزادی بہن کو۔ اسے کچھ احساس تو ہو کہ تو دن رات اس کے لیے سوچ رہا ہے۔"

عادل نے آہ کے انداز میں سانس لی۔ "شاہد! کہہ کر احساس دلایا تو کیا دلایا۔ اسے خود ہی پتا ہونا چاہیے اور میں جانتا ہوں کہ اسے پتا ہے۔"

عادل نے اصرار کرکے گاؤں والوں کو رات اپنے پاس ٹھہرایا، کھانا وغیرہ کھلایا۔ صبح وہ لوگ چلے گئے تو وہ بیٹھا دیر تک سوچتا رہا۔ شاہد کی باتیں پریشان کن تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ عادل، شہزادی سے رابطہ رکھے اور کسی بہانے گاؤں میں آتا جاتا رہے۔ مگر وہ تو اب گاؤں جانے کے بجائے کہیں اور جانے کا سوچ رہا تھا۔ کہیں بہت دور...... نامعلوم راستوں پر۔ اس دھواں دھار برستی شام میں سرمد صاحب نے جیسے اس پر ایک جادو سا کردیا تھا۔ وہ اسی طرح سوچنے پر مجبور ہورہا تھا جس طرح وہ چاہتے تھے۔ کچھ خاص تھا ان میں۔ ان کے اردگرد جیسے ایک نظر نہ آنے والا کشش کا ہالہ تھا...... اور وہ اس ہالے میں سے اپنا ہاتھ نکال کر اس کی طرف بڑھا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے...... یہ ہاتھ تھام لو۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن تھام لو۔ جو کچھ تم چاہ رہے ہو اور جتنی جلدی چاہ رہے ہو، وہ اسی طرح ممکن ہے کہ میرے کہنے پر چلو۔

عادل اور سرمد صاحب کی اگلی ملاقات سرمد صاحب کے گھر میں ہوئی۔ ان کا گھر لاہور کے مضافات میں ایک فارم ہاؤس کی شکل میں تھا۔ یہ گھر بھی سرمد صاحب کی طرح انوکھا اور ناقابل فہم تھا۔ تین ایکڑ کے فارم ہاؤس کے بیچوں بیچ یہ خوب صورت عمارت تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو نہایت آرام دہ اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ تھا۔ تاہم دوسرا حصہ بالکل مختلف اور کسی درویش کا ڈیرا نظر آتا تھا۔ عادل یہ دیکھ کر حیران ہوا۔ یہاں گیس پانی اور بجلی جیسی سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں۔ کمرے ہر طرح کے فرنیچر سے تقریباً عاری تھے۔ سونے کے لیے فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہاں ضرورت کے لیے الماریاں وغیرہ موجود تھیں۔ روشنی کے لیے لالٹینیں تھیں۔ جب بجلی ہی نہیں تھی تو اے سی اور پنکھے وغیرہ کا وجود کہاں ہوسکتا تھا۔ احاطے میں پانی کے لیے دو ہینڈ پمپ موجود تھے۔ عادل نے اندازہ لگایا کہ یہاں کھانا وغیرہ بھی لکڑی کی آگ سے پکایا جاتا ہوگا۔ سرمد صاحب عجیب ہیئت کذائی میں یہاں موجود تھے۔ عادل حیران رہ گیا۔ سخت سردی میں انہوں نے بس ایک نیکر پہن رکھی تھی جو ان کے گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ بنیان پسینے میں بھیگی ہوئی تھی، ہاتھ پاؤں مٹی میں لتھڑے تھے جیسے وہ کہیں کاشت کاری کرتے رہے ہیں (بعدازاں یہ کاشت کاری والا اندازہ بھی درست ثابت ہوا۔ عادل پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے گھر کے پچھواڑے قریباً ڈیڑھ ایکڑ رقبے پر چاول گندم اور دو تین قسم کی دالیں کاشت کررکھی ہیں ایک چھوٹا سا ٹریکٹر ہے جسے وہ خود ہی چلاتے ہیں۔ ایک چھوٹے پمپ کے ذریعے اس زمین کو پانی ملتا تھا۔ پمپ کو بجلی، گھر کے دوسرے حصے سے فراہم ہوتی تھی)

اپنے گھر میں جدید سہولتوں کی عدم موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرمد صاحب مسکرائے اور بولے۔ "دیکھا نا عادل! کتنا آسان حل ہے، بجلی گیس اور پانی کے بھاری بلوں کا۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

عادل کس کس بات پر حیرت کا اظہار کرتا۔ وہ سرمد صاحب کے ساتھ گھر کے ڈرائنگ روم میں آبیٹھا۔ یہاں ایک کھردری چٹائی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف لکھنے پڑھنے کے لیے لکڑی کی چوکی پڑی تھی۔ چوکی کے قریب گیس لیمپ رکھا تھا۔ پیچھے ایک دیوار گیر الماری میں نیچے سے اوپر تک کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ گھر کے اس حصے میں شاید ایک آدھ ملازم بھی ہوگا لیکن اس وقت وہ بھی موجود نہیں تھا۔ عادل کے بہت منع کرنے کے باوجود سرمد صاحب نے خود ہی چائے بنائی اور خود ہی لے کر عادل کے پاس چٹائی پر آبیٹھے۔ قریباً پچپن سال عمر کے باوجود ان کا جسم



SCANNED BY PAKSOCIETY / URDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ورزشی اور تنا ہوا تھا۔

''آپ کا رہن سہن مجھے حیران کررہا ہے سر۔''

وہ مسکرائے۔ ''یہ کوئی دکھاوا نہیں ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی اچھا لگتا ہے۔ پھل پھول اگانا اور کھیتی باڑی کرنا میرا شوق بھی ہے اور اس سے میری ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ بلکہ اس سے میں اوروں کی خاطر تواضع بھی کرسکتا ہوں۔ یہ جو پیچھے مرغی خانے کے ساتھ چاول کی فصل نظر آرہی ہے یہ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ میرے تین خاص ملازم ہیں۔ جو اس سارے کام میں میری مدد کرتے ہیں۔ جب میں یہاں نہیں ہوتا وہ سب کچھ اچھی طرح سنبھال لیتے ہیں۔''

''اور آپ کے...... بیوی...... بچے؟''

وہ پھر مسکرائے۔ ''ایک بچہ تو میرے سامنے بیٹھا ہے...... اور بھی کچھ بچے ہیں۔''

''کیا مطلب سر؟''

''اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ ایک بیٹا تھا بہت کم سنی میں فوت ہوگیا۔''

''اور...... آپ کی وائف؟''

''وہ بہت اچھی عورت ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ اس دیوانے پن میں میرا ساتھ دے سکے۔ وہ علیحدہ رہتی ہے ہم اکثر ملتے رہتے ہیں اور...... اچھا وقت گزارتے ہیں۔ بہت مہربان اور نفیس خاتون ہے وہ۔''

عادل نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''سر! اس دن جب میں نے آپ کے ہاتھوں کے گٹھے دیکھے تھے تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آپ جیسا خوش حال شخص اپنے ہاتھوں پر یہ نشان لیے کیوں پھر رہا ہے۔ لیکن آج بہت کچھ سمجھ میں آرہا ہے۔''

''محنت مشقت میں ہی زندگی کا حسن ہے عادل۔ سچی خوشی دراصل مشقت اور تکلیف کے اندر سے ہی پھوٹتی ہے۔ جو لوگ یہ رونا روتے ہیں کہ ان کی زندگی میں خوشیاں نہیں، وہ غور کریں تو انہیں پتا چلے گا کہ ان کی زندگی میں کوئی مشقت کی تکلیفیں بھی نہیں۔ بہر حال یہ بہت لمبا موضوع ہے۔ تم بتاؤ کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

عادل کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولا۔ ''سر! آپ اتنے مہربان ہیں کہ آپ کی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں اپنے دل میں کوئی الجھن لے کر آپ کے ساتھ چلوں گا تو شاید اس توجہ اور ذوق و شوق کا مظاہرہ نہ کرسکوں جو مجھے کرنا چاہیے۔''

''تو کیا چاہتے ہو تم؟'' سرمد صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

''سر! آپ مجھے تھوڑا بہت بتادیجیے۔ تاکہ مجھے پتا ہو کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں اس حساب سے اپنے آپ کو تیار کروں اور خود میں حوصلہ پیدا کروں۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے عادل، بس یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری اس خاص جسمانی صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں جس کا مظاہرہ تم رانا کے کلب میں کرتے ہو۔''

''لیکن سر! معافی چاہتا ہوں، میرا سوال تو وہیں ہے مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''اچھا ہم اس مسئلے کا ایک درمیانی حل نکالتے ہیں۔'' وہ ہولے سے مسکرائے اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے روانہ ہونے کے تین چار دن بعد میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔ اس وقت ہم ایسی جگہ پر ہوں گے جہاں سے ہمارا اصل سفر شروع ہوتا ہے، اگر تم سب کچھ جاننے کے بعد واپس آنا چاہو گے تو باآسانی واپس آسکو گے۔ آٹھ دس گھنٹے کا پیدل سفر ہوگا۔ پھر تم پکی سڑک پر آجاؤ گے۔ وہاں سے تمہیں کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی، جو تمہیں کسی قصبے یا پھر اسکردو تک پہنچا دے گی۔ دوسری صورت میں ہم آگے بڑھ جائیں گے۔'' اسکردو کے نام نے عادل کو تھوڑا سا ٹھٹکایا لیکن وہ خاموش رہا۔

''ہمارے ساتھ اور کون ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے خیال میں صرف دو بندے ہوں گے۔ ان میں ایک برٹش خاتون ہے جو بہت اچھی ہمسفر ثابت ہوگی۔ یعنی ہم چار ہوں گے۔''

عادل کچھ دیر سوچ میں رہنے کے بعد بولا۔ ''تو سر...... پھر میں ایسا کرتا ہوں کہ ابھی رانا سیٹھ سے آٹھ دس روز کی چھٹی لے لیتا ہوں۔ میرا مطلب ہے لگی لگائی روزی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اگر تم نے سفر آگے جاری رکھنا ہوا تو پھر؟''

''کیا وہاں سے فون وغیرہ پر رابطہ نہیں ہوسکے گا؟''

''نہیں، یہ تو ممکن نہیں ہوگا۔''

''تو...... ٹھیک ہے، میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ فی الحال دس پندرہ روز کی رخصت چاہتا ہوں۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تو وہ دوسرا انتظام کرلے۔''

''اور تمہارے اس کباڑ والے کام کا کیا ہوگا؟''

''یہ کام تو ابھی پوری طرح جما ہی نہیں ہے سر! پلاٹ





بھی خالی کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر کوئی نئی جگہ مل گئی تو صادق وہاں شفٹ ہوجائے گا۔ ورنہ پھر بعد میں دیکھا جائے گا۔''

کچھ دیگر تفصیلات طے کرنے کے بعد سفر کا فیصلہ ہوگا۔ عادل کے پیش نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ پیسا کمانا چاہتا تھا۔ سرمد صاحب نے عادل سے کہا۔ ''عادل! ایک بات پھر ذہن نشین کرلو۔ اس سفر میں خطرے بھی ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشین کرلو کہ خطروں کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا......''

''میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں سر!''

''تو درست ہے، کل گوجرانوالہ جاکر والدہ سے مل آؤ اور ان سے اجازت وغیرہ لے لو۔ ہم انشاء اللہ پیر کے روز یہاں سے روانہ ہوں گے۔ صبح پانچ چھ بجے کے قریب اور یہ لو دو ماہ کا ایڈوانس۔ چالیس ہزار ہیں۔ تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری والدہ کو ضرورت ہوگی۔'' انہوں نے کرنسی نوٹ عادل کی جیب میں ڈال دیے۔

☆☆☆

عادل اور سرمد صاحب لاہور سے بذریعہ بس روانہ ہوئے۔ ان کے ہمسفروں میں ایک تو خوبرو انگلش لڑکی کرسٹل تھی...... دوسرا ایک چھبیس ستائیس سال کا نوجوان ہمایوں تھا۔ ہمایوں گو پاکستانی تھا لیکن بہت چھوٹی عمر میں والدین کے ساتھ انگلینڈ چلا گیا اور وہیں پلا بڑھا تھا۔ وہ باکسنگ اور رومن اسٹائل کشتی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ خوب صورت کسرتی جسم کا مالک، بال سنہری مائل اور آنکھیں ہلکی براؤن تھیں۔ کرسٹل جتنی چہکتی اور کھلکھلاتی ہوئی لڑکی تھی ہمایوں اتنا ہی خاموش طبع تھا۔ ان کا پہلا پڑاؤ ایبٹ آباد میں تھا۔ ڈائیوو کی بس کے ''لگیج کمپارٹمنٹ'' میں ان کا کافی سامان موجود تھا۔ جن میں دو درمیانے سائز کے خیمے اور ایک چھوٹا خیمہ تھا۔ اس کے علاوہ سفری تھیلے اور کوہ پیمائی کے جملہ لوازمات تھے۔ اس سارے سامان میں جس چیز نے عادل کو زیادہ حیران کیا وہ دو چھوٹے سائز کے پیراشوٹ تھے۔ دونوں پیراشوٹس کو پیک کرکے بالکل مختصر کردیا گیا تھا۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا تکیہ ہو۔

ایبٹ آباد کے ایک اچھے ہوٹل میں ان کے لیے کمرے بک تھے۔ یہ انگریزوں کے دور کا لیکن بڑا صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ سرمد صاحب نے کچھ سامان یہاں ایبٹ آباد سے بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ سرمد صاحب اور ہمایوں شاپنگ کے لیے نکل گئے۔ ہوٹل کی اونچی چھت والی نیم گول لابی میں بید کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ عادل اور کرسٹل وہاں بیٹھ گئے اور سڑک کی گہما گہمی کا نظارہ کرنے لگے۔ کرسٹل اردو بھی بول لیتی تھی، تاہم یہ گلابی اردو تھی۔ ہم کو ''ہام'' اور تم کو ''توم'' کہتی تھی۔

''ہام کو پاکستان ہمیشہ سے بہت آچھا لگتا۔'' وہ اپنے خاص اسٹائل سے آنکھیں جھپک کر بولی۔

''آپ کتنی دفعہ پاکستان آچکی ہیں؟'' عادل نے پوچھا۔

''سب سے پہلے کوئی سات سال پہلے۔ تب ہام ڈاکٹری کے فورتھ ایئر میں تھا۔ ہام سے بالکل پڑھا نا ہیں جارہا تھا۔ ہام بالکل مایوس تھا۔ اس ٹائم سر سرمد نے ہام کو ہمت دلایا۔ ہمارے اندر بہت زیادہ انرجی پیدا کیا۔ سر نے ہام کو بتایا، کامیابی دینا گاڈ کا کام ہے۔ انسان کا کام ''اسٹرگل'' کرنا ہے، محنت کرنا ہے، جو محنت سے پیچھے نا ہیں ہٹتا وہ ضرور کامیاب ہوتا۔ اور دیکھو مسٹر عادل۔ ہام نے ہمت نہ چھوڑا۔ ہام ڈاکٹر تو نہ بنا مگر ڈاکٹر سے بڑھ کر کامیاب ہوگیا۔ اب برمنگھم میں ڈاکٹر تو بہت سارا ہوئیں گا مگر کرسٹل ایک ہی ہے۔ شہر کا دی موسٹ پاپولر اور مہنگا فزیو تھراپسٹ ہے ہام۔'' اس نے کہا اور خود ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

وہ ہنستی تھی تو ساتھ ہی اس کا پورا جسم بھی ہنستا تھا۔ نہایت دلکش جسم جو ہر جگہ لباس سے برسرپیکار نظر آتا تھا۔ عادل نے کہا۔ ''راستے میں آپ نے بتایا تھا کہ آپ کو پہاڑوں سے عشق ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ پہاڑ تو انگلینڈ میں بھی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''انگلینڈ میں پہاڑ تو ہیں لیکن سر سرمد نا ہیں ہیں۔ سر سرمد کے بغیر پہاڑوں کو دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے پھولوں کے بغیر باغیچے کو دیکھا جائے یا مون کے بغیر مون لائٹ کا تصور کیا جائے۔''

''آپ تو شاعری...... میرا مطلب ہے پوئٹری بھی کرتی ہیں۔''

''مسٹر عادل...... سر سرمد جیسا انسان دوسروں کو پوئٹ بنادیتا ہے۔ ہی از اے گریٹ مین۔ ہام اپنے لفظوں میں اس کی ''گریٹ نیس'' کو بیان نا ہیں کرسکتا۔ وہ ہام کے لیے ایک فرینڈ کی طرح بھی ہے، ایک ٹیچر کی طرح بھی اور شاید باپ کی طرح بھی۔ پتا ناہیں کہ آپ اس کو کب سے جانتا اور کتنا جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک سینٹ (بزرگ) کی طرح ہے۔ اس کا پرسنیلٹی آپ کو بہت انسپائر کردیتا۔''

عادل نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اسے اب تک جو معلوم ہوا تھا، اس کے مطابق کرسٹل کا تعلق وسطی انگلینڈ کے ایک قدیم نوابی خاندان سے تھا۔ سات آٹھ سال پہلے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  پریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈفری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1


انگلینڈ میں ہی اس کی ملاقات سرمد صاحب سے ہوئی اور وہ ایک طرح سے ان کی مریدنی بن گئی۔

ان کا دوسرا ہمسفر ہمایوں بھی سرمد صاحب کو کسی رہنما اور قائد کی حیثیت دیتا تھا۔ چند سال پہلے جب وہ پاکستان میں تھا لاہور آیا تھا۔ وہ سرمد صاحب کا ورزشی مشینوں والا کارخانہ دیکھنے گیا، وہیں اس کی ملاقات سرمد صاحب سے ہوئی اور چند ہی ماہ میں یہ ملاقات ایک نہایت قریبی روحانی تعلق میں بدل گئی۔

گفتگو کے دوران میں عادل نے کرسٹل سے تھوڑی بہت ٹوہ لینے کی کوشش کی۔ وہ اس سفر کا مقصد جاننا چاہتا تھا۔ اس کے اندیشے کے عین مطابق کرسٹل نے اس حوالے سے کچھ نہیں بتایا اور ہر بار خوب صورتی سے بات گول کر گئی۔ وہ بڑی بولڈ لڑکی تھی۔ ایبٹ آباد کی سردی اس کے بھرے بھرے جسم پر کوئی خاص اثر ڈالنے میں ناکام رہی تھی۔ اب بھی وہ بڑے سکون سے ایک شارٹ پینٹ اور ہاف سلیو شرٹ میں عادل کے سامنے بیٹھی تھی اور بار بار اپنے سنہری ریشمی بالوں میں انگلیاں چلاتی تھی۔ مئی کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ایبٹ آباد میں کافی ٹھنڈ تھی۔

ہمایوں اور عادل ایک ہی ڈبل بیڈ کمرے میں تھے۔ ان کے ساتھ کرسٹل کا کمرا تھا۔ اس سے آگے ایک کمرا چھوڑ کر سرمد صاحب کا کمرا تھا۔ سرمد صاحب جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کے عادی تھے۔ وہ صبح سویرے تین چار کلومیٹر کی دوڑ لگاتے تھے اور یہی ان کی جسمانی چستی کا راز تھا۔ عادل اور ہمایوں بھی جلد ہی سو گئے کیونکہ کل انہیں پھر سفر پر روانہ ہونا تھا۔ رات کسی وقت پیاس کے سبب عادل کی آنکھ کھلی۔ منہ میں پیاز اور مچھلی کا ذائقہ تھا۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ یہ کوئی رات ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اچانک اسے کھڑکی سے باہر ایک سایہ سا نظر آیا۔ چند لمحے بعد اسے یوں لگا جیسے کرسٹل والے کمرے کا دروازہ ہولے سے کھلا ہے اور کوئی اندر داخل ہوا ہے۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟ ہمایوں تو ساتھ والے بیڈ پر سو رہا تھا۔ سرمد صاحب کا کمرا بائیں جانب تھا اور سایہ دائیں طرف سے آیا تھا۔ ویسے بھی سرمد صاحب کو اس وقت کرسٹل کے کمرے میں جانے کی کیا ضرورت ہو سکتی تھی۔ تجسس سے مجبور ہو کر عادل نے کمرے کا دروازہ بے آواز کھولا اور باہر کوریڈور میں آ گیا۔ کوریڈور میں نیم تاریکی تھی۔ ویسے بھی کوریڈور یہاں آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ اس جانب کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں تھا۔ پرانی عمارتوں کے انداز میں عمارت کی چھت اونچی تھی اور چھت سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے مستطیل روشندان تھے۔ کرسٹل کے کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ عادل نے کچھ دیر سوچا پھر کھڑکی کے نچلے کنارے پر پاؤں رکھا اور اچک کر روشندان کا نچلا کنارہ پکڑ لیا۔ انگلیوں اور کلائیوں کے زور پر اس نے خود کو اوپر اٹھایا۔ ایسا کرنا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ جلد ہی وہ روشن دان سے کمرے کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے پاؤں کے پنجوں کو کھڑکی کی دو انچ چوڑی کارنس کا تھوڑا سا سہارا مل گیا تھا۔ روشندان کا شیشہ بند تھا لیکن نچلی جانب معمولی سی درز موجود تھی جس میں سے باریک آوازیں عادل کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ نیچے سات آٹھ فٹ کے فاصلے پر کرسٹل نظر آ رہی تھی۔ اس نے مہین سا گلابی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا جس میں سے اس کا توبہ شکن پیکر جیسے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ تاہم اس کے حسین چہرے پر ایک بے چینی سی تھی۔ کرسٹل کے عین سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ عادل کو نظر نہیں آیا۔ وہ بھی غیر ملکی تھا۔ اس نے جین، جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جسم سڈول اور کسرتی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کرسٹل کو اس کے نیم عریاں کندھوں سے تھاما اور کھردرے لہجے میں کچھ بولا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ اس کا پہلا فقرہ تو عادل کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن دوسرا فقرہ اس نے صاف سنا اور سمجھا بھی۔ ”ہاؤ لونگ آئی ہیو ٹو ویٹ..... ہاؤ لونگ.....(میں کب تک انتظار کروں گا..... کب تک؟)

کرسٹل نے انگریزی میں جواب دیتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”زیادہ دیر نہیں اب۔“

”تم ہمیشہ یہی کہتی ہو۔“ نوجوان بولا۔ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے وہ تھوڑا سا گھوما اور عادل نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ مخصوص انگلش ناک اور چھریرے بدن والا ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ قدرے چھوٹی اور اٹھی ہوئی ناک کے قریب رخسار پر ایک پرانے زخم کا نشان تھا۔ اور نہ جانے کیوں اس نشان کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک تند خو، جھگڑالو نوجوان ہے۔ بہرحال یہ نشان اس کی مجموعی ”قبول صورتی“ کو متاثر نہیں کرتا تھا۔

اگلے دو چار منٹ میں ان دونوں کے درمیان کچھ اور جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ ان میں سے کچھ تو عادل کو سنائی ہی نہیں دیے۔ کچھ سنائی تو دیے لیکن ان کی انگلش اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ جو تھوڑا بہت سمجھ میں آیا اس سے عادل کو اندازہ ہوا کہ کرسٹل اس نوجوان کی بہت قریبی گرل فرینڈ یا منگیتر ہے، اور یہ نوجوان اس سے ملنے کے لیے اسلام آباد

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے یہاں پہنچا ہے۔ کرسٹل واضح طور پر اس سے دبی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کی ساری شوخی ایک طرح کے ہراس کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ وہ جیسے جلد از جلد نوجوان سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی مگر وہ اس کے ساتھ چپکا جا رہا تھا۔ اس نے اس کے رخساروں اور ہونٹوں پر انگلیاں چلائیں پھر اسے ذرا دھکیل کر دیوار سے لگا دیا۔ اس کے طویل بوسے کو کرسٹل نے خاموشی سے برداشت کیا۔ اس کی خاموشی نوجوان کے لیے مزید حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اس نے کرسٹل کو کئی بار چوما اور اپنے ہاتھوں کو آزادانہ کرسٹل کے سراپے پر حرکت دی۔ آخر کرسٹل جز بز نظر آنے لگی۔ اس نے ناگوار لہجے میں نوجوان سے کچھ کہا۔ ان فقروں میں بس لیوپڈ...... ڈونٹ...... اور کریزی کے الفاظ ہی عادل کی سمجھ میں آسکے۔ لیوپڈ غالباً اس نوجوان کا نام تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص قسم کا تنازعہ ہے۔

یوں لگتا تھا کہ اب یہ ''لیوپڈ'' کسی بھی وقت کمرے سے باہر آسکتا تھا۔ عادل کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کوئی اسے اس طرح روشندان سے چپکے ہوئے نہ دیکھ لے۔ وہ جلدی سے نیچے اتر آیا اور بے آواز چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کا یہ اقدام بالکل درست ثابت ہوا۔ صرف چند سیکنڈ بعد کرسٹل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور مردانہ قدموں کی آواز سنائی دی۔ لیوپڈ کا سایا کھڑکی کے سامنے سے گزر کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف چلا گیا۔

عادل بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک سوچتا رہا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ کرسٹل جیسی شوخ و شنگ لڑکی اس نوجوان کے سامنے بھیگی بلی کیوں بنی رہی تھی۔ اس فقرے کا کیا مطلب تھا کہ اب اس کے بوائے فرینڈ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا؟ کرسٹل اور لیوپڈ ایک مادر پدر آزاد معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر وہ چوری چھپے کرسٹل سے ملنے کے لیے کیوں پہنچا تھا۔ یقیناً سرمد صاحب کو بھی اس ملاقات کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ انہی سوالوں میں الجھا الجھا عادل، نرم و گداز بستر پر سو گیا۔ وہ رات کچھ عجیب انداز میں گزری۔ عادل کے دل و دماغ کو نہ جانے کن سوچوں نے جکڑے رکھا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب اسے ہمایوں نے جگایا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ لگتا تھا کہ کہیں سے لمبی دوڑ لگا کر آیا ہے...... یقیناً وہ بھی صبح سویرے سرمد صاحب کے ساتھ ہی جاگنگ پر نکلا ہوا تھا۔ بعد ازاں عادل کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کرسٹل بھی ان کے ساتھ شامل تھی۔ وہ بھی ٹریک سوٹ میں تھی۔ اس کے بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ رخسار سرخ سیبوں جیسے اور نیلگوں آنکھوں میں ستاروں کی چمک، وہ حسب عادت چہک رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ہرگز اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے اپنے کمرے میں وہ ایک نہایت ناگوار و ناپسندیدہ صورت حال سے دو چار رہی ہے۔

دو بڑی جیپیں ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ چکی تھیں۔ ان میں سے ایک میں تو صرف ان لوگوں کا ساز و سامان ہی آیا تھا۔ دوسری میں وہ چاروں سوار ہوئے۔ اس جیپ کا ڈرائیور مرجان خاں نام کا ایک قبائلی تھا۔ وقت رخصت سرمد صاحب نے عادل کو بس اتنا بتایا کہ وہ مانسہرہ سے بشام کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کا اگلا پڑاؤ ''داسو'' میں ہوگا جو قریباً نو گھنٹے کا سفر ہے۔ انہیں مسلسل شاہراہ قراقرم یعنی KKH پر چلنا تھا۔

پر پیچ پہاڑی راستوں پر ان کا سفر جاری رہا۔ سورج نے ہلکے بادلوں کے پیچھے منہ چھپایا ہوا تھا۔ چوٹیوں پر برف تھی اور ٹنڈ منڈ پہاڑی درخت، یخ بستہ ہواؤں کی مار جھیل رہے تھے۔ ہمایوں بہت ہی کم بات کرتا تھا۔ کم گو لوگ ذرا پراسرار نظر آتے ہیں ہمایوں بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دیتا تھا۔ چہرے بشرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نہایت سخت جان شخص ہے اور موقع پڑنے پر لڑائی بھڑائی بھی کرسکتا ہے۔ سخت جانی اور جفاکشی میں کرسٹل بھی کچھ کم نظر نہیں آتی تھی تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ دلکش اور خوش گفتار بھی تھی۔ وہ اپنی گلابی اردو میں گاہے بگاہے کوئی لطیفہ بھی سنا دیتی تھی۔ بہرحال سرمد صاحب سے براہ راست بات کرتے ہوئے وہ ذرا مؤدب ہو جاتی تھی۔

عادل کے ذہن میں کئی سوال مسلسل کھلبلی مچا رہے تھے۔ یہ کرسٹل کون ہے؟ کیا وہ کسی بڑے لارڈ وغیرہ کی بیٹی ہے۔ وہ اتنے ذوق شوق سے سرمد صاحب کی ہمسفر کیوں ہے؟ وہ خود کو اتنا بے خبر کیوں محسوس کر رہا ہے۔ سرمد صاحب اسے اس سفر کا مقصد اور اس کی منزل کے بارے میں کیوں نہیں بتا رہے۔ وہ کون سا مقام ہوگا جہاں پہنچ کر وہ اسے فیصلہ کرنے کا اختیار دیں گے۔ عادل اپنی مرضی سے چلنے والا شخص تھا۔ وہ اپنا راستہ خود منتخب کرتا تھا۔ بہت سے سوالوں کے باوجود اگر وہ اب تک سفر کر رہا تھا تو اس کی وجہ صرف سرمد صاحب تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن وہ آنکھیں کہاں تک بند کرسکتا ہے، اس کا فیصلہ ابھی ایک دو دن میں ہو جانا تھا۔ عادل کا ایک قیافہ یہ بھی تھا کہ شاید سرمد صاحب اسے اس خاص مقام پر پہنچ کر کوئی خاص چیز دکھانا چاہتے تھے۔

☆☆☆

ان کا سفر پروگرام کے مطابق جاری رہا۔ اس کا مختصر احوال یہی تھا کہ وہ پہلے داسو پہنچے۔ وہاں ایک ریسٹ ہاؤس میں رات گزاری اور کسی حد تک تھکن دور کی۔ چلاس تک انہوں نے مسلسل شاہراہ قراقرم یعنی KKH پر سفر کیا اور پھر اسکردو روڈ کی طرف مڑ گئے۔ جوں جوں وہ بلند پہاڑی سلسلوں میں داخل ہو رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بلند و بالا برفانی چوٹیاں جیسے انہیں اپنے گھیرے میں لیتی جا رہی تھیں۔ ان لامتناہی پہاڑی سلسلوں کو دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے روئے زمین پر برفانی چوٹیوں، ڈھلوانوں اور جمے ہوئے ندی نالوں کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ ایسے مناظر سے گزرتے ہوئے بہاولپور کا تصور کرنا اور بہاولپور سے آگے اپنی جنم بھومی ''لالی گاؤں'' کے کھیتوں کھلیانوں اور چلچلاتی دھوپوں کا تصور کرنا عادل کو بہت عجیب لگتا تھا۔ اس کا تصور پگھلا کر اسے اپنی ماں کے پاس لے گیا اور پھر شہزادی کے پاس لے گیا۔ اس نے سوچا شاید شہزادی اپنی حویلی کی ہوادار چھت پر ململ کا کڑھائی دار کرتہ پہنے بیٹھی ہو۔ کوئی ملازمہ اس کے لمبے بالوں میں کنگھی کر رہی ہو۔ کرم داد کے باغ سے قلمی آموں کی پہلی ڈالی آگئی ہو اور اس کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خوشبو اسے عادل کی یاد دلا رہی ہو۔ وہ جب کرم داد کے باغ میں تھا انہوں نے ایک ہی آم کو باری باری چوسا تھا اور وہ آم دنیا کا سب سے خوشبودار اور میٹھا آم تھا۔ کیا یہ یاد اور اس طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی یادیں اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں؟ کیا وہ چاندی کے چھلے کی طرح ان یادوں کو خود سے دور کرنے...... دور ہٹانے کی کوشش تو نہیں کر رہی۔ اور اگر کر رہی ہے تو کیا یہ کوشش کامیاب ہو جائے گی؟

وہ سوچتا رہا اور لینڈ روور جیپ دشوار راستوں پر دندناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ سرمد صاحب کی اجازت سے ڈرائیور مرجان خاں میٹھی آواز میں گنگنا رہا تھا۔ جانے والے میں تیرے قربان خدا حافظ۔ اے میرے حسین سپنوں کے مہمان خدا حافظ (وہ سپنوں کا لفظ اپنی طرف سے استعمال کر رہا تھا)

ان کا اگلا پڑاؤ اسکردو میں تھا۔ کنکورڈیا گلیشیر اور کے ٹو وغیرہ کی طرف جانے والوں کے راستے میں آخری بڑی آبادی اسکردو ہی ہے۔ سرمد صاحب نے عادل کو بتایا تھا کہ سردیوں میں اسکردو کا درجہ حرارت منفی دس سے منفی پندرہ سولہ ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ بہرحال اب بھی یہاں سردی کم نہیں تھی۔ ہاتھ پاؤں جمتے محسوس ہو رہے تھے۔ تاہم عادل کے تینوں ہمسفروں بشمول کرسٹل پر یہ سردی کچھ زیادہ اثر نہیں کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ لوگ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ یا پھر انہوں نے اپنے اندر غیر معمولی قوت برداشت پیدا کرلی تھی۔

اسکردو اور کنکورڈیا گلیشیر کے درمیان ایک جگہ پر انہوں نے جیپیں چھوڑ دیں...... یہاں دو مقامی افراد کے ساتھ سرمد صاحب کے معاملات پہلے سے طے تھے۔ ان دونوں افراد کے پاس چار صحت مند ٹٹو موجود تھے۔ سامان ان ٹٹوؤں پر لادا گیا اور آگے کا سفر پا پیادہ شروع ہوا۔ عادل اس سے پہلے مری سے آگے نہیں گیا تھا۔ مری کی اونچائی چھ ہزار فٹ کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ اب اس کے اردگرد اس سے چار گنا اور پانچ گنا اونچی چوٹیاں موجود تھیں۔ وہ خود کو ایک نہایت یخ بستہ لیکن طلسماتی ماحول میں محسوس کر رہا تھا...... ان کا اگلا پڑاؤ برفانی پہاڑوں کی گود میں ایک نہایت حسین قطعہ زمین پر تھا۔ یہاں کیمپ لگا دیے گئے اور کھانے پینے کا انتظام ہونے لگا۔ کھانے پینے کا انتظام فی الحال انہی لوگوں کے ذمے تھا جنہوں نے ٹٹو فراہم کیے تھے۔ دیسی مرغیاں، دنبے کی دو روسٹ رانیں۔ تیز پشاوری قہوہ، ڈرائی فروٹ اور تھوڑا اسا ٹن پیک فوڈ...... یہ تھا ڈنر کا مینو۔

رات کے کوئی بارہ بجے کا عمل تھا۔ عادل اور سرمد صاحب، نیم گرم، جدید خیمے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ عادل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اہم گفتگو شروع ہونے والی ہے...... ہواؤں سے پھڑ پھڑاتے ہوئے خیمے سے باہر وہ عجیب منظر تھا۔ ٹھٹھری ہوئی چاندنی نے برفانی چوٹیوں کو روپہلی تاج پہنا رکھے تھے۔ سپید ڈھلوانوں پر یہ چاندنی منعکس ہوتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ چاندی کے آبشار بڑی خاموشی سے بہہ رہے ہیں۔ فلک بوس پہاڑوں کے درمیان یہ وادی ایک عظیم الشان پیالے کی طرح تھی اور اس پر کسی ماورائی منظر کا گمان ہوتا تھا۔ کسی گاڑی کا شور، نہ کسی پرندے کی چہچہاہٹ، نہ کسی مشینی اڑن کھٹولے کی آواز...... یہاں جو کچھ تھا بس خالص قدرت کے زمرے میں آتا تھا اور یہ جو کچھ بھی تھا دل پر اثر کر رہا تھا۔ ایک ہیبت ناک لیکن دلکش اثر۔

سرمد صاحب نے خیمے کے مختصر روزن سے دور کنکورڈیا گلیشیر اور گلیشیر سے آگے کے ٹو کی عظیم الشان چوٹی کو دیکھا اور ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ''تمہیں پہاڑوں سے دوستی کرنے کا کہا جائے تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''







SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

”میں سمجھا نہیں سر؟“
”کیا تم پہاڑوں میں سفر کرنا، ان پر چڑھنا پسند کرو گے؟“
عادل نے ذرا توقف سے کہا۔ ”میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے سر! اور میں سچ ہی بولوں گا۔ جو کچھ آپ نے کہا، مجھے یہ پسند نہیں۔“
”لیکن تمہیں پیسا حاصل کرنا تو پسند ہے، کیونکہ وہ تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری اور شہزادی کی ضرورت۔“
”جی سر۔“
”تو پھر اس کا مطلب یہی ہے کہ تم میرے پہلے سوال کا جواب ”ہاں“ میں دے رہے ہو عادل! ہمیں چند ہفتے یہاں پہاڑوں میں گزارنے ہیں...... میں تمہیں اس قابل بنانا چاہتا ہوں کہ تم یہاں کے ٹو کے پہلو میں ایک خاص راستے پر سفر کر سکو۔ وہ ارد گرد پھیلی ہوئی بیسیوں چوٹیوں میں سے ایک چوٹی ہے۔ وہ کے ٹو سے کافی چھوٹی ہے لیکن وہ اس لیے مشکل ہے کہ ہم اس پر اس جانب سے نہیں چڑھ سکتے جس جانب سے ہمیں چڑھنا چاہیے۔ ہمیں اس کے لیے ایک مشکل راستہ اختیار کرنا پڑے گا اور یہ ہماری مجبوری ہے، اور یہی مسئلہ ہے۔“
”سر! میں کوہ پیمائی وغیرہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن...... اگر آپ کوئی ایسی مشکل چوٹی سر کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو تجربہ کار کوہ پیما مل سکتے ہیں۔ باہر کو تو چھوڑیے سر! ہمارے پاکستان میں ہی بڑے بڑے مہم جو پڑے ہوئے ہیں اور...... آپ تو ماشاء اللہ خود بھی کوہ پیمائی کا بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی نظر مجھ پر ہی کیوں پڑی ہے؟“
”بہت اچھا سوال ہے اور تمہیں کرنا بھی چاہیے تھا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے عادل...... کہ وہ ایک ایسی چوٹی ہے جسے صرف تم سر کر سکتے ہو۔ ایک ایسا راستہ...... جو شاید صرف تمہارے جیسے ہی کسی شخص کے لیے بنا ہے۔“
”میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا سر د صاحب! میں جانتا ہوں کہ کچھ چوٹیاں چڑھائی کے لیے بڑی مشکل سمجھی جاتی ہیں لیکن شاید ہی کوئی ایسی چوٹی ہو جسے سر نہ کیا جا سکتا ہو۔ جب کے ٹو اور ماؤنٹ ایورسٹ جیسی چوٹیاں سر ہو چکی ہیں تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ معاف کیجیے گا، مجھے آپ کی یہ دوسری بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس چوٹی پر آسان راستے سے چڑھا نہیں جا سکتا۔ آپ آسان کو چھوڑ کر مشکل راستہ کیوں اختیار کرنا چاہ رہے ہیں؟“
”ایک وجہ ہے۔ بہت ٹھوس وجہ۔ وہ بالکل بے آباد چوٹی نہیں ہے۔ اس کی برفیلی ڈھلوانوں کے دامن میں کچھ لوگ آباد ہیں۔ ایک کوہستانی برادری جو شاید مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے سے وہاں موجود ہے۔ پاؤندوں کی نسل کے کچھ لوگ ہیں۔ سخت ترین موسموں میں زندگی گزار لیتے ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی مہم جو کو اس چوٹی کی طرف جانے نہیں دیتے۔“
”اس کی کوئی خاص وجہ؟“
”جس طرح کچھ لوگ نانگا پربت کو مقدس سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے پاؤں تلے روندنے والوں پر آفت نازل ہوتی ہے، اسی طرح اس چوٹی کے بارے میں بھی مقامی لوگوں کا ایک پختہ عقیدہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس چوٹی پر انسانی قدموں کا پہنچنا بہت بڑی نحوست کا سبب ہوگا۔ وہ اس نحوست سے بچنے کے لیے کسی بھی ملکی یا غیر ملکی مہم جو کو اس طرف کا رخ نہیں کرنے دیتے۔ انہوں نے ایک ایسی فضا بنائی ہوئی ہے کہ مہم جوؤں کی توجہ بھی اس بظاہر غیر اہم چوٹی کی طرف سے ہٹ گئی ہے۔ وہ خود کو خوامخواہ مشکل میں ڈالنے کے بجائے نسبتاً بہتر چوٹیوں کی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔“
”یہ کون سی برادری ہے سر! میرا مطلب ہے ان کا مذہب......؟“
”مذہب کے بارے میں جاننے سے زیادہ اہم سوال ایک اور ہے اور وہ یہ کہ کیا یہ واقعی کوئی روحانی معاملہ ہے یا کچھ لوگوں نے اپنے کسی خاص مقصد کی وجہ سے اسے روحانی یا مذہبی رنگ دے رکھا ہے...... اور چوٹی پر پہنچنے کو منحوس قرار دیتے ہیں۔“
”شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے یہی سوال پوچھنا چاہیے تھا۔“
”اس کا جواب یہ ہے عادل! کہ اصل میں یہ کوئی روحانی معاملہ نہیں ہے۔ یہ کچھ خاص لوگوں کی سازش ہے، جنہوں نے اپنے مقصد کے لیے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنایا ہے اور وہ باہر سے آنے والے ٹریکرز اور کلائمبرز کو ”پیک“ کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔“
”یہ کس طرح کا مقصد ہے سر؟“
”بہت خاص...... اور بہت گہرا۔ ایک ناقابل یقین بھید۔

**زندگی کے دشوار گزار رستوں پر لمحہ بہ لمحہ طوفان وبادوباراں سے نبرد آزما اس داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ...**



# زندہ لاش

سلیم انور

کبھی کبھی زندگی کچھ اس انداز میں انسان کو برتتی ہے کہ وہ ایک زندہ لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ بہ ظاہر سانسوں کی آمدورفت درحقیقت زیست کے بقیہ لمحات کی الٹی گنتی بن جاتی ہے۔ وہ بھی انہی اعداد و شمار میں الجھا حسابِ زیاں میں گم تھا کہ زندگی کا ایک قیمتی لمحہ اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہو گیا۔

**تھکن زدہ ذہنوں کی غفلتوں کا عبرت اثر واقعہ**

اس عورت کے بالوں کی رنگت قدرتی طور پر سنہری تھی۔ وہ لمبے قدم اٹھاتی ہوئی میرے دفتر میں داخل ہوئی اور بلاتکلف میری میز کے مقابل رکھی ہوئی کرسی پر براجمان ہوگئی۔ ”سوری، میں تمہارے لنچ میں...... مخل ہوئی۔“ اس نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ خلوص سے عاری تھا۔
میں نے منگل کی رات کے بچے ہوئے کھانے کی طرف دیکھا۔ اس عورت نے لنچ تذبذب کا اظہار کیا تھا۔ اسے نہ تو لنچ کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی ڈنر۔ میں پیپر نیپکن سے اپنا منہ پونچھنے کے بعد بولا۔ ”میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں، مس......؟“
”تم مر سکتے ہو، مسٹر پیٹرمین!“
میں نے چونک کر نگاہ اٹھائی تو اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور کو اپنے سامنے پایا جس کی نال کا رخ عین میرے سینے کی جانب تھا۔ میں نے ایک اچٹتی نگاہ اپنے گلیڈیز پر ڈالی جو میرے دفتر کے ایک گوشے میں فاصلے پر موجود کوٹ ریک کے ہولسٹر میں لٹکا ہوا تھا۔ اس تک پہنچنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔
میں نے نظریں گھما کر اس عورت کی جانب دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ ”آگے بڑھو اور کوشش کر کے دیکھ لو۔“ اس

نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔
"میں بے وقوف ہرگز نہیں ہوں، مس......" میں نے جواب دیا۔
اس بات پر اس کی بھویں تن گئیں۔ "میں اتفاق نہیں کرتی مسٹر پیٹرمین۔ اور میرا نام مارگریٹ ہے...... مارگریٹ بیکسٹر!"
بیکسٹر؟ یہ نام سن کر میرے کانوں میں جیسے دور کوئی گھنٹی سی بجی ہو لیکن تب بھی مجھے اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں آیا۔ اس کی شکل وصورت اور حلیہ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے بھلا سکتا۔ اس نے نفیس تراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بال بے عیب انداز اور مخصوص طرز سے سنوارے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگیں لمبی اور نہایت خوب صورت تھیں۔ اس نے پیروں میں قیمتی جوتے پہنے ہوئے تھے اور وہ متاثر کن انداز میں کرسی پر براجمان تھی۔
بیکسٹر؟ میرے ذہن میں وہ نام گونجا۔
وہ میرے ردعمل کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی مدھم نیلی آنکھیں میری میز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات نے مجھے اپنی میز پر موجود سامان کے ڈھیر کے بارے میں احساس دلادیا۔ پرانے میگزین، نوٹ بکس، پرانے قلم جن میں سے چند شاید اب بھی کام کرتے ہوں، کینڈی کے دو یا تین ریپر۔
تب مجھے اچانک یاد آیا کہ یہ سب چیزیں قدرے گرد میں اٹی ہوئی ہیں اور میں نے انہیں چند دنوں سے جھاڑا ہی نہیں ہے۔ انہیں جھاڑ پونچھ کر رکھنا ہوگا اگر میں یہاں موجود رہا تو، میں نے خود سے کہا۔
"وہ کیا ہے؟ کوئی یادگار؟"
اس کی نگاہ اس نیوز پیپر آرٹیکل پر مرکوز تھی جو ایک فریم میں دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چند دیگر تراشے بھی تھے۔ یہ میرے ان چند ابتدائی کیسز میں سے ایک کے بارے میں تھا جب میں نے پولیس فورس چھوڑی تھی اور اپنی پرائیویٹ ایجنسی کھول لی تھی۔
"ہاں، یہ ایک بناوٹی اغوا کا کیس تھا جس کو حل کرنے میں، میں نے مدد کی تھی۔ شاید تم نے اس کیس کے بارے میں سنا ہو۔ اقصم نامی ایک بینکر کے متعلق یہ گمان ہوا تھا کہ اسے اغوا کرلیا گیا ہے......"
"یہ میرے وقت سے پہلے کی بات ہوگی۔" مارگریٹ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔
میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے اور پھر اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی طرف دیکھا۔

بیکسٹر؟ میرا ذہن اسی نام کو کریدے جارہا تھا۔
ایک منٹ، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ مدھم نیلی آنکھیں...... "تمہارا کیلون بیکسٹر سے کوئی تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔
"براوو مسٹر ڈیٹیکٹیو۔" اس نے مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "وہ میرے ڈیڈی تھے۔"
کیلون بیکسٹر! وہ منی برنارڈ میڈوف بننا چاہتا تھا وہی برنارڈ میڈوف جس نے لوگوں کو منافع دینے کے بہانے بڑی بڑی رقمیں بٹوری تھیں۔
کیلون بیکسٹر، ایک پرائیویٹ فرم کے متعدد پارٹنرز میں سے ایک تھا۔ یہ فرم دھوکا دے کر رقم بٹورنے والی اسکیم چلا رہی تھی جس میں نئے سرمایہ کاروں کی رقم پرانے سرمایہ کاروں کو ان کی سرمایہ کاری پر ناقابلِ یقین منافع دینے کے لیے استعمال کی جاتی تھی جبکہ حقیقت میں لوگوں کی رقوم برائے نام ہی کہیں انویسٹ کی گئی ہوتی تھیں۔ بیشتر یہ رقوم ایک جگہ سے دوسری جگہ گردش میں رہتی تھیں اور جہاں یہ رقوم رک جاتی تھیں تو پتا چلتا تھا کہ وہ شخصیت کیلون بیکسٹر کی ہوتی تھی۔
اس فرم کے دیگر پارٹنرز میں سے ایک نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور دبے لفظوں میں اپنے شک کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں چوکسی کے ساتھ اس بات کا پتا لگاؤں کہ وہ بیان کردہ کون سی کمپنیاں ہیں جہاں فرم نے سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔
جب میں نے تحقیقات کیں تو پتا چلا کہ ان میں سے بعض کمپنیوں کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ بعض وجود رکھتی ہیں لیکن انہوں نے اس فرم کا کبھی نام ہی نہیں سنا تھا۔ بعض نے فرم کے حوالے سے رقوم تو دیکھی تھیں لیکن انہوں نے کبھی اتنا بھاری منافع کسی فرم کو نہیں دیا تھا جتنا کہ فرم اپنے سرمایہ کاروں کو رپورٹ کررہی تھی۔
میں نے اپنے کلائنٹ کو مکمل تفصیل سے آگاہ کردیا تو یہ معاملہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے سپرد کردیا گیا۔ تب یہ پوری اسکیم زبردست مالی تباہی کا شکار ہوگئی اور کئی سو ملین ڈالرز کھاتے میں غیر موجود پائے گئے جن کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں تھا اور نیلی آنکھوں والا تیز طرار کیلون بیکسٹر کٹہرے میں جا پہنچا۔ تمام انگلیاں اسی کی جانب اٹھ گئیں کہ وہی دھوکے بازی سے رقوم بٹورنے والی اسکیم کا بانی تھا۔ اس نے پرجوش جذباتی انداز میں اپنے جرم کی صحت سے انکار کیا لیکن عدالت نے اسے مجرم قرار دے دیا اور اسے لگ بھگ ایک صدی کی قید کی سزا سنادی گئی۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں؟
ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
ہر کتاب کا الگ سیکشن
ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
We Are Anti Waiting WebSite
واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں
WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شاید تین یا چار سال پہلے کی بات تھی...... اور اب اس کی بیٹی ان ہی نیلی آنکھوں کے ساتھ میرے مقابل بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی کانپا نہیں تھا۔ اس کا رخ بہ دستور میرے سینے کی جانب تھا۔

''میں تمہارے احساسات بخوبی سمجھ سکتا ہوں مس مارگریٹ۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے بے شمار لوگوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ مجھے مار ڈالنے سے انہیں قید سے رہائی نہیں ملے گی۔'' میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں پُرسکون لہجے میں کہا۔

''وہ مر چکے ہیں۔''

''مر چکے ہیں؟''

''دماغ کی طرف دوران خون رک جانے کے سبب ان پر جیل میں اچانک غشی طاری ہوگئی تھی جو ان کی موت کا باعث بن گئی۔'' مارگریٹ نے بتایا۔

''مجھے تمہارے ڈیڈی کی موت کا سن کر افسوس ہوا، مس مارگریٹ۔'' میں نے معمول کے مطابق تعزیت کرتے ہوئے کہا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے احساس ہوگیا کہ مجھے مزید پسینا آنا شروع ہوگیا ہے۔ ''لیکن تمام شہادتیں تمہارے ڈیڈی کے خلاف تھیں......''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''انہیں سازش کے ذریعے پھانسا گیا تھا۔''

میں نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''نقصانات کے بارے میں متعدد ثبوت اور شہادتیں پیش کی گئی تھیں......''

''اوہ مسٹر پیٹرمین، تم حقیقت میں بے وقوف ہو۔ وہ ثبوت اور شہادتیں فرم کے بانی پارٹنرز کی جانب سے تھیں جنہوں نے شہادتوں کے عوض معاملات طے کرلیے تھے۔ اس ڈیل کے نتیجے میں انہیں معمولی سزائیں ہوگئی تھیں اور اس سات سال سے زائد عرصے میں انہوں نے اپنی سزائیں بھگت لی تھیں۔ اب وہ سب کے سب کہاں ہیں؟''

میں یہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔

''میں پوچھ رہی ہوں کہ وہ سب کے سب اب کہاں ہیں مسٹر پیٹرمین؟ اور وہ تمام رقوم کہاں ہیں جو کسی کھاتے میں موجود نہیں تھیں اور جن کا آج تک کچھ پتا نہیں چلا؟'' مارگریٹ نے کہا۔

مجھے اس کے ذہنی صدمے پر ہمدردی محسوس ہوئی لیکن...... اس نے یہ کیا کہا کہ اس بات کو سات سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے...... کیا واقعی اتنا عرصہ بیت چکا ہے؟

''وہ اسکیم بکھرنا شروع ہو چکی تھی۔'' مارگریٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا کہ معیشت کی رفتار قدرے سست پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے سرمایہ کاروں کی رقوم اتنی زیادہ نہیں آ رہی تھیں کہ جو کلائنٹس کی بڑے منافعوں کی طلب کو پورا کرسکتیں۔ وہ تمام پرانے سرمایہ کاروں کا منافع طے شدہ ریٹ سے ادا کرنے سے قاصر تھے۔ اب ان کی یہ پوری اسکیم اس طرح ڈھیر ہو رہی تھی جیسے کاغذی مکان تیز ہوا کے جھونکوں سے بکھر جاتا ہے۔ انہیں اب ایک قربانی کا بکرا ڈھونڈنا ضروری ہوگیا تھا اور......'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شانے اچکاتے ہوئے غصے سے مجھے دیکھنے لگی۔

''مس مارگریٹ، تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ فرم کے دیگر ساجھے داروں نے تمہارے ڈیڈی کے خلاف سازش کی تھی لیکن جو شخص میرے پاس آیا تھا، بھلا سا نام تھا اس کا۔ آں ہاں گارفیلڈ! اسے جب میں نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ پیش کی تھی تو اسے حقیقت میں شاک پہنچا تھا اور وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''وہ جیرمی گارفیلڈ ہوگا...... فرم کے بانی پارٹنرز میں سے ایک۔ اس نے عدالت میں جرم کا اقرار کیا، جیل کاٹنے کی مختصری سزا ہوئی اور اب رہائی پانے کے بعد کوسٹاریکا میں عیش کی زندگی گزار رہا ہے۔ کیا کسی کو حیرانی ہے کہ اس نے یہ سب کیسے کیا؟ اس کے پاس عیش و عشرت کی موجودہ زندگی کے لیے سرمایہ کہاں سے آیا؟ اور کیا کبھی اس نے یہ بات بتائی کہ اس تحقیقات کے لیے اس نے تمہارا چناؤ کس طرح کیا تھا؟''

میں یہ سن کر قدرے چونک گیا۔ لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

مارگریٹ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں نہایت نازک اور پیچیدہ مالی معاملات کے بارے میں تحقیقات کرنا تھیں؟ تمہارا تجربہ طلاق کے چند کیسوں، کم اجرت ملازمین کے رقوم چرانے کے کیسوں تک محدود تھا۔ کیا یہ تجربہ تمہیں اس نوعیت کے پیچیدہ مالی معاملات کے کیس کو حل کرنے کے لیے حقدار بناتا تھا؟ تمہارے ساتھ کھیل کھیلا گیا تھا، مسٹر پیٹرمین۔'' مارگریٹ نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے تمہاری تھوتھنی کے آگے ایک بڑی قیمتی نوٹوں کی گڈیاں لہرائیں اور تم ایک کتے کے مانند دم ہلاتے ہوئے ان کے اشاروں پر کام کرتے رہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق تمہیں چلاتے رہے۔''

مجھے غصے میں آجانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے چیلنج نے مجھے رکنے پر مجبور کردیا۔ کیا میں یہ سب کچھ غلط سمجھا تھا



نہیں، تمام ثبوت تو موجود تھے لیکن...... انہیں تلاش کرنا مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ بھاگ دوڑ تو بہت کرنی پڑی زیادہ۔ ہاں لیکن انہیں تلاش کرنے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ کسی پزل کو حل کرنے کے لحاظ سے تمام ٹکڑے نمودار ہوکر بہ آسانی صحیح طور پر فٹ بھی ہو گئے تھے۔ شاید کثیر فیس کی بنا پر میں نے بہت زیادہ سوچ وبچار سے کام لیا ہوگا۔ ثبوت کا کھوج لگانے میں...... کیا میں نے کہیں غلطی کی تھی؟ کیا مجھے بھی اسی طرح بے وقوف بنایا گیا تھا جیسے کہ مارگریٹ کا کہنا تھا کہ اس کے باپ کو بے وقوف بنا گیا تھا؟

میرے ذہن میں ایک تلاطم سا برپا تھا۔

نہیں، مجھے بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ میں ایک تجربہ کار انوسٹی گیٹر تھا۔ میں نے ایک نگاہ اخبارات کے ان تراشوں پر ڈالی جو فریم شدہ حالت میں دیوار پر آویزاں تھے۔ یہ ان کیسز سے متعلق تھے جو میں نے حل کیے تھے اور اس لمحے میں نے پہلی بار یہ بات نوٹ کی کہ وہ تراشے وقت گزرنے کے ساتھ پیلے پڑ چکے تھے۔ ایسا کب ہوگیا تھا؟ کیا مجھ سے واقعی غلطی سرزد ہوئی تھی؟

مارگریٹ کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں لیکن منہ سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ میرے ذہن میں خیالات کی جنگ جاری تھی۔

مارگریٹ جاذب نظر اور بھرپور شخصیت کی مالک تھی۔ اس کی موجودگی نے میرے تنگ سی جگہ میں محدود آفس کی حالت زار کو شرمناک بنا دیا تھا۔ نہیں، نہیں...... میرے آفس کی شرمناک حالت زار اس کی موجودگی کی وجہ سے نہیں تھی۔ اس کی وجہ وہ تمام عرصہ تھا جو میری توجہ کے بغیر گزر چکا تھا۔ ایسا کیوں کر ہوا تھا؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پولیس میں بیس سال کا عرصہ گزارنے کے بعد جب میں ریٹائر ہوا تھا تو میں نے اپنے اس پیشے کا آغاز پُراعتماد امیدوں اور بڑی اونچی توقعات کے ساتھ کیا تھا۔ اپنا ذاتی دفتر کھولتے وقت میرے حوصلے بڑے بلند تھے...... اور اچانک مجھے یہ یاد رکھنے میں دشواری پیش آنے لگی کہ اس بات کو کتنا عرصہ بیت چکا ہے؟ لیکن اس دوران میں نے چند بڑے کیس بھی نمٹائے تھے۔ میں نے ایک بار پھر ایک نگاہ اخبارات کے تراشوں پر ڈالی اور ان کا زردی مائل میلا پن دیکھ کر تیزی سے نظریں ہٹا دیں۔ پھر اپنی میز پر کھلی ہوئی فائلوں پر نگاہ جما دی...... ایک کیس کسی نوعمر ملازم کا تھا جس پر ایک ریڈیو اسٹور سے کچھ سامان چوری کرنے کا الزام تھا...... ایک کسی کی بے وفا بیوی سے متعلق تھا۔ وہ تمام کے تمام ایسے ہی معمولی نوعیت کے کیسز تھے۔

میں پچھلے چند برسوں کے دوران حل کیے جانے والے کیسز کے متعلق غور کرنے لگا۔ میں نمایاں قسم کا کوئی ایک کیس یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایسا کوئی بھی کیس ذہن میں نہیں آیا۔ صرف ان کیسز کی ایک لمبی قطار تھی جو میاں بیوی کی بے وفائی اور بچوں کے معمولی جرائم سے متعلق تھے۔

میں نے اپنی گردن گھمائی اور کھڑکی سے باہر سڑک پار ہائی رائز آفس ٹاور کی عالی شان عمارت پر نظریں جما دیں۔ مجھے یاد تھا کہ جب اس نئی عمارت کی تعمیر ہو رہی تھی تو میں کس طرح اسے دیکھا کرتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ میں اس پرانی بلڈنگ کے چھوٹے خستہ حال دفاتر میں اپنے کام کا آغاز کر رہا ہوں اور پھر بالآخر سامنے نئی عمارت کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس نئے چمکدار ٹاور میں اپنے اسٹاف اور عمدہ فرنشنگ کے ساتھ ایک فرسٹ کلاس انوسٹی گیٹر کا بزنس تعمیر کرکے وہاں منتقل ہو جاؤں گا۔

لیکن آج بھی میں نے بہ دستور سڑک پار نہیں کی بلکہ اسی پرانے دفتر میں موجود تھا اور حسرت بھری نگاہوں سے اس عالیشان ہائی رائز ٹاور کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔

پھر میں چونک پڑا۔

میں مارگریٹ بیکسٹر کو قطعی فراموش کیے ہوئے تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کھڑکی سے سڑک پار عالیشان عمارت کو کتنی دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ میں نے گردن واپس گھماتے ہوئے اپنی نظریں مارگریٹ پر مرکوز کردیں تو دیکھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات تھے۔

مزید یہ کہ اب اس کے ہاتھ میں کوئی ریوالور بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

مجھے اپنی جانب متوجہ پاکر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے میرے دفتر پر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر دوبارہ مجھ پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ ''میں یہاں تمہیں مارنے کے لیے آئی تھی مسٹر پیٹرمین...... لیکن اب میں دیکھ رہی ہوں کہ تم تو پہلے ہی مرے ہوئے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور ڈگ بھرتے ہوئے میرے دفتر سے نکل گئی۔

کمرے میں اب اس کے پرفیوم کی مہک باقی رہ گئی۔

میں اپنی حالت زار، دفتر کی خستہ حالی اور اپنے خوابوں کے چکنا چور ہونے پر ایک زندہ لاش کے مانند اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔



SCANNED BY PAKSOCIETY
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

# آنگن ٹیڑھا

مسرز امجد بیگ

دورِ حاضر میں انسان ایمانداری کرکے گویا مشکلات کو دعوت دے لیتا ہے کیونکہ یہ تو گئے وقتوں کا قصہ ہے جب ایمانداری کے ساتھ ساتھ وفاشعاری بھی زمانے کا چلن تھی مگر چال ہو یا چلن ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں... اس کی سادگی... اور پسند کی شادی... اس کے گلے کا طوق بنتی جارہی تھی اور رشتے پیروں کی زنجیر بنے اسے آگے بڑھنے سے روک رہے تھے ایسے میں مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق اس نے وہ انتہائی قدم اٹھالیا جس کی اسے خود بھی توقع نہ تھی لیکن وقت کے آئینے میں اسے حالات کی جو صورت نظر آئی اسے دیکھ کر وہ گویا لرز گیا... اسی لیے کہتے ہیں کہ رشتوں کی لاٹھی زندگی کے سفر کو آسان کردیتی ہے بشرطیکہ خلوص اور محبت بھی ساتھ ساتھ چلے تو... ورنہ امتحان، آزمائش اور وہم وگمان کی تیز دھوپ زندگی کے تمام رنگوں کو پھیکا کردیتی ہے۔

**ایک ٹیڑھے آنگن کی روداد جس میں آفتوں نے ڈیرا جمالیا تھا**

ایک روز میں عدالت سے نکل کر پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسٹیمپ فروش کے اسٹال پر ایک شخص نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ”بیگ صاحب! ایک منٹ......!“

میں رک گیا اور مڑ کر پکارنے والے کو دیکھا۔ وہ ایک اسٹیمپ فروش تھا۔ میں نے اسے اکثر اس اسٹال میں بیٹھے دیکھا تھا اور اس کا صورت آشنا ہی نہیں بلکہ نام شناس بھی تھا۔

”غوری صاحب...... فرمایئے؟“ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

”کیا ابھی آپ عدالت کے کمرے سے نکلے ہیں؟“ غوری نے پوچھا۔

”ہاں......“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کوئی خاص بات؟“

اس نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو روزانہ اس سے بہت پہلے رخصت ہوجاتے ہیں۔ آج کافی دیر نہیں ہوگئی؟“

”عدالتی چکروں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے غوری صاحب۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ادھر برآمدے میں ایک کلائنٹ نے گھیر لیا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی پھر بھی وہ زبردستی منت کرکے مجھے کینٹین لے گیا اور جب تک میں نے اس کی جیب سے چائے کے ساتھ بسکٹ نہیں کھالیے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ ابھی اسے مطمئن کرکے بھیجا ہے۔“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”غوری صاحب! آپ کا چہرہ اور آنکھیں بتارہی ہیں کہ آپ نے کسی وجہ سے مجھے روکا ہے......“

”وہ بات دراصل یہ ہے بیگ صاحب!“ وہ سر کو اثبانی جنبش دینے کے بعد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی چند منٹ پہلے ایک شخص آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ابھی تک عدالت میں موجود ہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ بیگ صاحب تو جاچکے ہیں۔“



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اس شخص نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''علی مراد......!''

میں نے اپنے ذہن پر زور ڈالا لیکن فوری طور پر مجھے یاد نہ آسکا کہ میں نے کسی علی مراد کو آج عدالت آنے کا کہا ہو۔ اس دوران میں غوری یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ علی مراد مجھے کس سلسلے میں ڈھونڈ رہا تھا؟''

''آپ علی مراد کے حوالے سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' غوری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا اندازہ تو یہ کہتا ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی نیا کلائنٹ ثابت ہوسکتا ہے۔ میں نے اسے آپ کے دفتر کا ایڈریس سمجھا دیا ہے۔ وہ آپ کو وہیں مل جائے گا۔ کافی ضرورت مند نظر آرہا تھا۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی، غوری کا شکریہ ادا کیا اور تیز قدموں کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں نے اپنے پسندیدہ مخصوص ہوٹل سے ڈٹ کر کھانا کھایا اور آفس پہنچ گیا۔ میرا آفس سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں واقع تھا اور مذکورہ ہوٹل میرے راستے میں پڑتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا کہ عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہونے کے بعد میں ہوٹل میں بیٹھ کر تسلی سے کھانا کھاتا پھر آفس میں جا کر کلائنٹس سے ملاقات شروع کر دیتا تھا۔

اس روز میں حسب معمول جب اپنے آفس پہنچا تو وزیٹرز لابی خاصی آباد نظر آئی۔ میں نے وہاں موجود کلائنٹس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور اپنے چیمبر کی جانب بڑھ گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک علی مراد میرے ذہن سے سلپ ہو چکا تھا۔

لگ بھگ ایک گھنٹے بعد میری سیکریٹری نے انٹرکام پر بتایا۔ ''سر! ایک صاحب کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے پاس اپائنٹمنٹ نہیں تھا اس لیے میں نے انہیں روکے رکھا۔ ابھی میں انہیں بھیج رہی ہوں۔''

''کیا اپائنٹمنٹ والے تمام کلائنٹس نمٹ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''یس سر......!'' سیکریٹری کی پُراعتماد آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ٹھیک ہے......تم ان صاحب کو اندر بھیج دو۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک پستہ قامت، فربہ اور گول مٹول سا شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی ڈاڑھی بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! میرا نام علی مراد ہے۔ میں دن میں آپ کی تلاش میں سٹی کورٹ کی طرف بھی گیا تھا......''

اسی لمحے غوری اسٹیمپ فروش کی بات میرے ذہن میں گھوم گئی۔ میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

''ہاں، مجھے پتا چل گیا تھا لیکن میں ایک ایسے معاملے میں الجھا ہوا تھا کہ دفتر پہنچنے میں مجھے دیر ہوگئی خیر......'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ''آپ بتائیں......میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔

علی مراد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ کے پاس مجھے نفیس احمد نے بھیجا ہے اور یقین دلایا ہے کہ آپ تسلی بخش انداز میں میرا کام کر دیں گے۔''

''کون نفیس احمد؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نفیس الیکٹرونکس والے نفیس صاحب۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''صدر کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں جن کی فریج، فریزر اور واٹر کولر کی دکان ہے۔''

''اوہ......وہ نفیس صاحب!'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟''

نفیس احمد سے میری دیرینہ شناسائی تھی۔ مجھے یا میرے کسی بھی تعلق دار کو بھی فریج یا فریزر وغیرہ خریدنا ہوتا اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرتا تو میں اسے سیدھا ''نفیس الیکٹرونکس'' کی راہ دکھا دیا کرتا تھا اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ نفیس احمد نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔

''الیکٹرونکس مارکیٹ ہی میں میری ٹی وی کی دکان ہے۔'' علی مراد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''نفیس صاحب سے میری اچھی دعا سلام ہے۔''

''بہت خوب......!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''اب آپ جلدی سے مجھے اپنے مسئلے کے بارے میں بتا دیں تاکہ میں فیصلہ کرسکوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔''

''مسئلہ میرا نہیں، فرقان کا ہے۔'' علی مراد نے بتایا۔





''یہ فرقان کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ''فرقان میرا داماد ہے۔''

''اوہ......!'' میں نے علی مراد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ کا داماد کسی انداز میں آپ کی بیٹی کو تنگ کر رہا ہے۔''

''نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فرقان تو اتنا اچھا انسان ہے کہ اس کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف پہنچ ہی نہیں سکتی اور شاید......شاید اس کا یہی اچھا پن اس کے لیے مصیبت بن گیا ہے......''

''کیسی مصیبت علی مراد صاحب؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''فرقان کو پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''دو روز پہلے کی۔'' اس نے بتایا۔

''فرقان پر کس کے قتل کا الزام ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''مسز نگہت کے قتل کا الزام......!''

''یہ مسز نگہت کون ہیں؟'' میں نے استفسار کیا۔

''فرقان کے مالک مکان کی بیوی تھی وہ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''فرقان کے ساتھ بے در پے زیادتی ہوئی ہے بیگ صاحب۔ نرگس کے شوہر قاضی وحید نے پہلے اسے اپنے گھر میں ایک کرایے دار کی حیثیت سے رکھا۔ پھر گھر کی بالائی منزل پر شفٹ کر دیا اور آخر میں گھر فروخت کرنے کے بہانے اس کو بے دخل کر دیا۔ جب فرقان نے اس سے حساب مانگا تو ایک گہری سازش کے تحت اس قتل کے الزام میں بند کروا دیا۔''

''اوہ......دلچسپ اور افسوس ناک واقعہ ہے۔'' میں نے رف پیڈ پر قلم گھسیٹتے ہوئے کہا پھر نگاہ اٹھا کر علی مراد کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''آپ نے بتایا ہے کہ فرقان کو دو روز پہلے پولیس نے گرفتار کیا ہے۔ آج اٹھارہ اکتوبر ہے۔ اس کا مطلب ہے فرقان کی گرفتاری......''

''پندرہ اکتوبر کی رات۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''فرقان کو پندرہ اکتوبر کی رات میرے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''گویا پولیس نے سولہ اکتوبر کی صبح فرقان کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ لے لیا ہوگا اور اس وقت وہ پولیس کسٹڈی میں ہے؟''

''جی......آپ کا اندازہ درست ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''وہ کون سے تھانے میں بند ہے؟'' میں نے پوچھا۔

علی مراد نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''علی مراد صاحب! ابھی تک آپ نے مجھے اپنے داماد کے بارے میں جو بھی معلومات فراہم کی ہیں وہ بہت ہی الجھی ہوئی اور نامکمل ہیں۔ اس صورتِ حال میں، میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھے پوری تفصیل کے ساتھ یہ پتا ہونا چاہیے کہ آپ کے داماد اور قاضی وحید کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا رہی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس نازک موقع پر جبکہ فرقان قتل کے الزام میں، ریمانڈ پر ہے تو اس کے گھر والے کہاں غائب ہیں......ایسے حالات میں فرقان کے والدین کو تو سب سے آگے حرکت کرتے ہوئے نظر آنا چاہیے......؟''

''آپ بجا فرما رہے ہیں بیگ صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''انہیں واقعی سب سے زیادہ متحرک نظر آنا چاہیے مگر......! وہ لوگ فرقان سے سخت ناراض ہیں۔'' علی مراد نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ''سمجھ لیں کہ مرنا جینا ختم کیا ہوا ہے انہوں نے......!''

''اس بائیکاٹ کا کوئی خاص سبب؟''

''فرقان کی شادی......!''

''اوہ......!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''یعنی وہ لوگ آپ کی بیٹی اور فرقان کی شادی کے خلاف تھے؟''

''سخت خلاف!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''تاہم اس شادی کے موقع پر کسی طرح منت خوشامد کر کے فرقان نے انہیں راضی کرلیا تھا۔ وہ لوگ نہ صرف بڑے بھرپور انداز میں اس شادی میں شریک بھی رہے بلکہ شادی کے بعد لگ بھگ تین ماہ تک عظمیٰ اپنی سسرال میں بھی رہی تھی پھر وہاں فتنہ فساد اس قدر بڑھ گیا کہ فرقان کو گھر چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بعد ہی وہ کرایے کے مکان میں گیا تھا۔''

''عظمیٰ آپ کی بیٹی کا نام ہے......؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو عظمیٰ اور فرقان کی ''لو میرج'' ہے؟''

''آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔''



www.paksociety.com
SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

محبت کی شادیوں میں عموماً سماجی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی لڑکی کو اور کبھی لڑکے کو اور بعض حالات میں دونوں کو۔ اسی کھینچا تانی اور کشمکش میں میاں بیوی ایسے معاشرتی جھمیلوں میں پھنس جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے پر توجہ دینے کی فرصت ہی میسر نہیں آتی۔ پیار محبت تو رہی دور کی بات، وہ ایک دوسرے سے ڈھنگ سے بات کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ لومیرج کرنے والوں کو ایک دوسرے سے سنگین شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے جتنی شدت کی محبت اور چاہت کی توقع کر رہے ہوتے ہیں، زمینی حقائق اس کی اجازت نہیں دیتے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے محبت کی شادیوں کی غالب تعداد ناکامیاب رہتی ہے۔ یا تو یہ بندھن قائم ہی نہیں رہتا اور یا پھر زہر کے گھونٹ پی پی کی زندگی گزارنا ہوتا ہے۔

''آپ نے فرقان کے والدین کو اس افسوسناک واقعے کی اطلاع دی؟'' میں نے علی مراد سے استفسار کیا۔

''براہ راست تو نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن کسی تیسرے شخص کے توسط سے میں نے ان تک اس معاملے کی خبر پہنچا دی ہے۔''

''انہوں نے کیا ردِعمل ظاہر کیا ہے؟''

''وہ اپنی ضد بہ الفاظ دیگر اپنی ہٹ دھری پر قائم ہیں۔'' علی مراد نے دکھی لہجے میں جواب دیا۔ ''ان کا مؤقف بہت ہی سفاک اور غیر انسانی ہے۔ ان کے مطابق جب فرقان نے گھر چھوڑا تھا وہ ان کے لیے مر گیا تھا۔''

''ہوں......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''یہ صورتِ حال خاصی گمبھیر اور افسوس ناک ہے۔ بہرحال......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''آپ مجھے فرقان اور قاضی وحید کے باہمی معاملے کے بارے میں بتا رہے تھے......؟''

''یہ معاملہ بھی خاصا الجھا ہوا اور پیچیدہ ہے۔'' وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو سمجھانے کے لیے تھوڑی تفصیل میں جانا ہوگا۔''

''میں سن رہا ہوں......'' میں نے سنجیدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ روانی سے بولتے جائیں۔''

آئندہ آدھے گھنٹے میں علی مراد نے مجھے جو تفصیل فراہم کی، میں اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کرکے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

واضح رہے کہ ان میں سے بہت ساری باتیں مجھے بعد میں اپنی تحقیق کے دوران میں معلوم ہوئی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب اور تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے میں نے انہیں یہاں بیان کر دیا ہے۔ اسی طرح چند باتیں میں فی الحال گول کر رہا ہوں۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اسی شام متعلقہ تھانے جا کر میں نے ملزم فرقان سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کر لی تھی۔ فرقان بھرے بھرے بدن کا مالک ایک متناسب قامت اور گندمی رنگت والا جوان تھا۔ اس کی عمر ستائیس سال رہی ہوگی۔ مجھے وہ ایک تعلیم یافتہ اور سمجھا ہوا انسان لگا۔ اس نے میری معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا تھا۔ علی مراد کی زبانی مجھ تک جو حالات پہنچے تھے، فرقان نے ان کی کماحقہ تصدیق بھی کی تھی۔

☆☆☆

فرقان نے کچھ عرصہ پہلے یونیورسٹی سے کامرس میں ماسٹرز کرنے کے بعد بینکنگ لائن جوائن کر لی تھی۔ اس فیلڈ میں قدم جمانے کے لیے اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کا باپ کفیل احمد ایک ریٹائرڈ بینکر تھا اور اسی کی خواہش پر فرقان نے کامرس کا انتخاب کیا تھا۔ کفیل احمد ریٹائرمنٹ کے بعد ''شیئرز'' کی دنیا کی طرف نکل گیا تھا۔ اسٹاک مارکیٹ پر اس کی گہری نظر تھی اور وہ مختلف طریقوں سے ماہانہ اتنا کما لیتا تھا کہ گھر میں کسی مالی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

کفیل احمد کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑا فرقان، اس سے چھوٹی انیلا جس کی شادی فرقان سے پہلے ہو گئی تھی۔ انیلا کا شوہر فرہاد بھی ایک پرائیویٹ بینک ہی میں ملازم تھا۔ انیلا اپنی سسرال میں خوش اور مطمئن تھی۔ انیلا سے چھوٹا ایک بھائی عرفان تھا جو ابھی محض تیرہ سال کا تھا اور ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔ فرقان کی والدہ شگفتہ ناز ایک گھریلو خاتون تھی تاہم اسے گھومنے پھرنے اور ہوٹلنگ وغیرہ کا بہت شوق تھا۔ شاپنگ بھی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ان کی رہائش بفرزون کے علاقے میں تھی۔

علی مراد کی بیوی سلمیٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ سلمیٰ طویل عرصے تک سرطان ایسے موذی مرض میں مبتلا رہنے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھی۔ علی مراد کی دو بیٹیاں تھیں۔ عظمیٰ اور نادیہ۔ نادیہ عظمیٰ سے چند سال بڑی تھی اور اس کی شادی بھی عظمیٰ سے دو سال پہلے ہو گئی تھی۔ نادیہ کی سسرال





حیدرآباد میں تھی۔ اس کا شوہر شاہد خٹک پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا اور اس نے ادھر حیدرآباد ہی میں اپنا ایک شوروم بھی بنا رکھا تھا۔

جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ علی مراد کی صدر کی الیکٹرونکس مارکیٹ میں ٹی وی کی دکان تھی۔ اس کی رہائش بہادرآباد کے علاقے میں تھی۔ اس کی دکان میں عموماً نئے ٹی وی فروخت کیے جاتے تھے تاہم وہ چلتے ہوئے پرانی ٹی وی کے بدلے میں مزید رقم لے کر نیا ٹی وی بھی دے دیا کرتا تھا۔ پرانے ٹی وی کو وہ دوسری مارکیٹ میں فروخت کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے بڑی ٹھیک ٹھاک سیٹنگ بنا رکھی تھی۔

عظمیٰ اور فرقان کی پہلی ملاقات عظمیٰ کے گھر ہی میں ہوئی تھی اور پہلی نظر ہی میں دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ دراصل فرقان اور نادیہ یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھے لہٰذا نادیہ کی شادی میں فرقان بھی مدعو تھا۔ نادیہ کی مایوں اور مہندی میں بھی وہ گیا تھا اور جبھی اس کی عظمیٰ سے ملاقات ہوئی تھی۔

نادیہ تو بیاہ کر حیدرآباد چلی گئی لیکن عظمیٰ اور فرقان کی پہلی ملاقات آخری ثابت نہ ہوئی بلکہ اس کے بعد تو ان کے درمیان ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ نادیہ نے اس معاملے میں دونوں سے حتی الامکان تعاون کیا اور ان کی محبت شادی کے بندھن کی جانب بڑھنے لگی۔ نادیہ نے علی مراد کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دیا تھا۔ علی مراد کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ فرقان اس کا دیکھا بھالا تھا اور وہ بھی اس کو پسند کرتا تھا۔ فرقان کے مزاج اور اخلاقیات نے علی مراد کو متاثر کیا تھا۔ پھر وہ تعلیم یافتہ تھا اور اس کے سامنے روشن مستقبل بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک آئیڈیل داماد اور آئیڈیل شوہر کی تمام تر خوبیاں فرقان میں موجود تھیں لہٰذا علی مراد اس رشتے سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

انکار تو فرقان کے گھر کی طرف سے تھا۔ فرقان کی والدہ شگفتہ اپنی بہن کی بیٹی غزالہ سے اس کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ غزالہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھی لیکن فرقان، غزالہ کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر صورت اور ہر قیمت پر عظمیٰ ہی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ تنازع اس قدر بڑھا کہ فرقان نے دوٹوک انداز میں اپنے والدین سے کہہ دیا۔

''میں شادی کروں گا تو عظمیٰ سے ورنہ کسی سے بھی نہیں!''

''اور میں تمہاری شادی کروں گی تو غزالہ سے......'' شگفتہ نے بھی فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ورنہ کسی اور سے بھی نہیں ہونے دوں گی۔''

''یہ تو سراسر زیادتی ہے امی!'' فرقان نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''میں غزالہ میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ آپ خوامخواہ کیوں یہ شادی مجھ پر مسلط کرنا چاہتی ہیں......؟''

''میں اپنی بہن کو اس رشتے کے لیے زبان دے چکی ہوں۔'' شگفتہ نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''جیسے ہی غزالہ کی تعلیم مکمل ہوگی، میں تمہاری شادی کی تاریخ بھی کر دوں گی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہونے والا امی!'' فرقان بھی ضدی لہجے میں بولا۔ ''آپ کو اپنی بہن کا بڑا خیال ہے، ہمارے جذبات کا کوئی احساس نہیں؟''

اس دوران میں کفیل احمد خاموش بیٹھا بڑی سنجیدگی سے ماں بیٹے کی باہمی تکرار کو سماعت کر رہا تھا۔ ابھی تک اس نے ایک بار بھی مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ شگفتہ نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں بیٹے سے سوال کیا۔

''فرقان! تم کس کے جذبات کی بات کر رہے ہو......؟''

''اپنے اور عظمیٰ کے......'' فرقان نے کہا۔ ''اور کس کے جذبات......!''

''اچھا......تو وہ لڑکی جمعہ جمعہ آٹھ دن میں تمہاری زندگی میں مجھ سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔'' شگفتہ نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ''اور میں نے جو تمہیں جنم دیا......اور پال پوس کر اتنا بڑا کیا......میرا تم پر کوئی حق ہی نہیں رہا......؟''

''ایسی کوئی بات نہیں امی!'' فرقان نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''آپ کا حق اور اہمیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ آپ الٹی سیدھی باتوں کو ذہن میں جگہ نہ دیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ غزالہ مجھے پسند نہیں اس لیے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''جب غزالہ مجھے پسند ہے تو تمہیں اسی سے شادی کرنا ہوگی۔'' شگفتہ کے فیصلے سے ہٹ دھرمی جھلکتی تھی۔

''فرقان!'' کفیل احمد نے لب کشائی کی۔ ''تمہاری ماں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اس نے غزالہ کی ماں کو اس رشتے کے لیے زبان دے رکھی ہے اور پھر......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''جہاں تم شادی کے لیے بہ ضد ہو وہ لوگ دوسری کمیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا کلچر اور خاندان ان سے بالکل الگ ہے۔''

''کلچر، خاندان، کمیونٹی......'' فرقان نے بیزاری سے کہا۔ ''آپ لوگ بھی پتا نہیں، کن فضول باتوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور عظمیٰ کا تعلق بھی ایک مسلم فیملی سے ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ عظمیٰ کے گھر والوں کو اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ لوگ بھی معقولیت کا مظاہرہ کریں۔ میں کوئی غلط کام کرنے نہیں جارہا۔ عظمیٰ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ میرا قانونی وشرعی حق ہے۔"

"تو اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ معقولیت کا مظاہرہ کس طرح کیا جاتا ہے۔" کفیل احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فرقان! میں ہر حال میں تمہاری ماں کا ساتھ دوں گا۔ اگر تمہیں ہماری عزت کا ذرا سا بھی خیال ہے تو تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں ہم چاہتے ہیں۔ اگر تم ہماری بات نہیں مانو گے تو پھر ہم تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔"

"ساتھ نہیں ہیں...... کیا مطلب؟" فرقان نے حیرت بھری نظر سے اپنے باپ کو دیکھا۔

"مطلب یہ کہ......" شگفتہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ہم تمہاری شادی میں شرکت نہیں کریں گے۔"

"اور اس شادی سے پہلے تمہیں یہ گھر چھوڑنا ہوگا۔" کفیل احمد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہم سے ہر رشتہ ناتا توڑنا ہوگا......"

فرقان کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اس کے سگے والدین ہیں۔ درحقیقت کفیل احمد نے ایک نفسیاتی چال چلی تھی۔ وہ فرقان کو گھر سے نکالنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس دباؤ میں آکر وہ عظمیٰ کا خیال اپنے دل سے نکال دے گا مگر فرقان پر بھی جیسے ضد سوار ہوگئی تھی۔

"ٹھیک ہے......!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں عظمیٰ سے شادی کی خاطر یہ گھر چھوڑ دوں گا۔"

کفیل اور شگفتہ کو توقع نہیں تھی کہ فرقان ایسا سنگین فیصلہ کرے گا۔ اگلے روز فرقان نے علی مراد کو صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔ علی مراد عظمیٰ کا باپ تھا۔ اسے بہت کچھ سوچنا تھا۔ وہ تو یہی چاہتا تھا کہ فرقان کے والدین اس شادی کے لیے رضامند ہوجائیں۔ اگر وہ دل سے راضی نہیں بھی ہوتے تو کم از کم اس شادی میں بھرپور شرکت کریں اور عظمیٰ رخصت ہوکر اپنی سسرال ہی میں جائے۔ بعد میں جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔

علی مراد ایک سمجھدار اور دور اندیش شخص تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ڈرامائی منصوبہ ترتیب دیا جس کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے فرقان کو اس کا ساتھ دینا تھا۔ یہ ایک جذباتی چال تھی جس میں ایک موقع پر فرقان کو اسپتال کی ایمرجنسی تک بھی جانا تھا۔ میں اس منصوبے کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قصہ مختصر فرقان نے کفیل احمد کی ہدایت کے مطابق اداکاری کی اور ان کی چال کامیاب رہی۔ فرقان کے والدین کو نہ صرف اس شادی میں شریک ہونا پڑا بلکہ عظمیٰ بیاہ کر سیدھی اپنی سسرال بھی گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ تک ہی وہاں ٹک سکی۔

شگفتہ نے عظمیٰ کے ہاتھوں اپنی شکست کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ عظمیٰ کو ذلیل کرکے رہے گی۔ پہلے ہی دن سے ساس اور بہو کی روایتی جنگ کا آغاز ہوگیا۔ عظمیٰ چونکہ اس جنگ کی مجے دار نہیں تھی۔ لہٰذا شگفتہ کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے میدان خالی مل گیا۔ وہ ایسا کھل کر کھیلی کہ فرقان اور عظمیٰ کو گھر چھوڑنا پڑا۔ عظمیٰ پر ہر روز ایک نیا الزام آجاتا تھا۔ تا کہ ایک موقع پر شگفتہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی کہ عظمیٰ نے اسے کھانے میں زہر دے کر مارنے کی کوشش کی ہے۔ شگفتہ نے مذکورہ زہریلا کھانا بلی کے آگے ڈالا تو وہ بلی تھوڑی ہی دیر میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ عظمیٰ نے شگفتہ کی جان لینے کی ہرگز کوشش نہیں کی تھی لیکن اس ڈرامہ باز عورت نے بڑا جاندار ناٹک کیا تھا۔ اس ناٹک کا سب سے زیادہ اثر کفیل احمد پر ہوا۔ اسے عظمیٰ سے شدید ترین نفرت ہوگئی۔ ان تین ماہ میں فرقان قدم قدم پر عظمیٰ کی حمایت کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ اس معاملے میں جب اس نے اپنے باپ کے سامنے عظمیٰ کی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش کی تو کفیل احمد نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

"دیکھو فرقان! میں نے تمہاری خاطر شگفتہ کی مخالفت لے کر تمہاری شادی میں شرکت کی تھی اور آج تمہاری بیوی نے میری بیوی کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔ جو کھانا بلی کے پیٹ میں گیا وہ اگر تمہاری ماں کھالیتی تو سوچو......!"

"ابو...... یہ عظمیٰ کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے......" کفیل احمد نے درشت لہجے میں بیٹے سے استفسار کرتا رہا۔

"اس میں شک کی گنجائش کہاں ہے۔" فرقان دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "امی کی ناک میں ایسا کون سا سینسر لگا ہوا ہے کہ کھانے کو سونگھتے ہی انہیں پتا چل گیا کہ وہ زہریلا ہے اور یہ کہ کھانے میں زہر عظمیٰ نے ملایا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد اگر ایسا کوئی انکشاف ہوتا تو دوسری بات تھی......!"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر تمہاری ماں وہ زہریلا کھانا کھالیتی اور اس کے بعد شگفتہ کے ساتھ کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آتی تب تمہیں یقین آتا کہ عظمیٰ نے تمہاری





ماں کو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" فرقان نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں ہے۔"

"پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟" کفیل احمد نے اکھڑے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ امی نے عظمیٰ کو ذلیل کرنے کے لیے یہ ڈراما رچایا ہے۔" فرقان نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "زہریلے کھانے میں عظمیٰ کا کوئی کردار نہیں ہے۔"

"تو تمہارے خیال میں شگفتہ نے خود ہی کھانے میں زہر ملا کر یہ کھیل کھیلا ہے؟" کفیل احمد نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ "تم اپنی ماں پر شک کررہے ہو......؟"

فرقان ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جی...... میرا یہی خیال ہے!"

"بکواس بند کرو......" کفیل احمد غصے کی شدت سے دہاڑا۔ "اور جتنی جلدی ہوسکے، اپنی بیوی کو لے کر اس گھر سے دفع ہوجاؤ۔ میں تمہیں اور تمہاری بیوی کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔"

"ٹھیک ہے ابو!" فرقان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "جب آپ میں حق اور انصاف کا حوصلہ نہیں رہا اور ہر صورت میں آپ عظمیٰ ہی کو قصوروار سمجھ رہے ہیں تو ان حالات میں، میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہوں گا۔ میں بہت جلد اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کرلوں گا۔"

"بڑے شوق سے جاؤ اور میری ایک بات ذہن نشین کرلینا......!" کفیل احمد نے رکھائی سے کہا۔

فرقان نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کیا اب بھی کہنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا ہے؟"

"ہاں...... ایک بات!" کفیل احمد کی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ "بہت ہی اہم بات۔"

فرقان الجھن زدہ انداز میں اپنے باپ کو دیکھتا چلا گیا لیکن مزید کوئی سوال نہ کیا۔ لمحاتی توقف کے بعد کفیل احمد نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ تم میری اولاد ہو لیکن تم میرے لیے شگفتہ سے زیادہ اہم نہیں ہو۔ کبھی واپس آنے کا ارادہ ہو تو میری ایک شرط یاد رکھنا۔"

"کیسی شرط؟" فرقان کی الجھن دوچند ہوگئی۔

"اس گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے...... صرف تمہارے لیے!" کفیل احمد نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "جب دل چاہے، واپس آجانا مگر تمہارے

## شوخیاں

ایک پارٹی میں بیوی اپنے شوہر سے بولی۔ "وہ آدمی دیکھو جو ڈانس کررہا ہے۔"

شوہر۔ "وہ کون ہے؟"

بیوی۔ "10 سال پہلے اس نے مجھے شادی کی آفر کی تھی مگر میں نے ریجیکٹ کردیا تھا۔"

شوہر۔ "او مائی گاڈ وہ ابھی تک خوشی میں ناچ رہا ہے؟"

❋ ❋ ❋

پولیس راہ گیر سے۔ "تلاشی دو میں اس علاقے کا S.P. ہوں۔"

راہ گیر۔ "اور میں اس علاقے کا M.P.W. ہوں۔"

پولیس مین۔ "گھبرا کر غلطی ہوگئی سر۔ ویسے یہ M.P.W. کیا ہوتا ہے؟"

راہ گیر۔ "مونگ پھلی والا۔"

❋ ❋ ❋

پولیس نے دروازے پہ دستک دی۔ ٹھک ٹھک۔

سردار۔ "کون؟"

پولیس۔ "ہم پولیس والے ہیں دروازہ کھولو تم سے بات کرنی ہے۔"

سردار۔ "تم لوگ کتنے ہو؟"

پولیس۔ "3"

سردار۔ "تو آپس میں باتیں کرلو ناں۔"

❋ ❋ ❋

شوہر نے بیوی کو میسج کیا۔ "میں رات کو لیٹ ہوجاؤں گا، میرے آنے سے پہلے میری فیورٹ ڈش بنالینا۔"

پھر دوسرا میسج کیا۔ "میری سیلری زیادہ ہوگئی ہے اگلے مہینے تمہیں سونے کی انگوٹھی لے کردوں گا۔"

بیوی نے ریپلائے کیا۔ "او مائی گاڈ، سچی؟"

شوہر۔ "تمہیں چیک کررہا تھا تمہیں میرا پہلا میسج ملا یا نہیں۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈوی
اورنگی ٹاؤن، کراچی



SCANNED BY PAKSOCIETY.COM / PAKSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ عظمیٰ کو قطعاً برداشت نہیں کیا جائے گا۔ تم اسے اپنی زندگی سے نکالنے کے بعد ہی ادھر کا رخ کر سکتے ہو۔''

''میں عظمیٰ کو اپنی زندگی سے نکال دوں......'' فرقان نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ کسی قیمت پر نہیں ہو سکتا۔''

''بس تو پھر آج کے بعد تم ہمارے لیے اور ہم تمہارے لیے مر گئے۔'' کفیل احمد نے سفاکی سے کہا۔ ''اب تم جانو اور تمہاری بیوی......''

اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ اس موقع پر شگفتہ نے بہت واویلا مچایا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی بات کو دہرائے جا رہی تھی کہ عظمیٰ اور اس کے گھر والوں نے کسی سے گندا عمل کرا کے فرقان کا دل و دماغ اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔ وہ جورو کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ وہ والدین کی محبت، محنت اور قربانیوں کو بھول گیا ہے۔ میں بھی روز محشر اسے دودھ نہیں بخشوں گی وغیرہ وغیرہ......!

آئندہ روز فرقان اپنی بیوی کو لے کر علی مراد کے پاس پہنچ گیا اور نہایت ہی جامع الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد گہری سنجیدگی سے کہا۔

''انکل! میں چند روز کے لیے عظمیٰ کے ساتھ آپ کے گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔ بہت جلد میں کرایے کے گھر کا بندوبست کر لوں گا۔''

مکمل طور پر نہ سہی لیکن علی مراد بڑی حد تک فرقان اور عظمیٰ کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔

''چند دن کے لیے کیوں بیٹا۔ تم چاہو تو مستقل اس گھر میں رہائش اختیار کر سکتے ہو۔''

فرقان نے متذبذب انداز میں اپنے سسر کو دیکھا۔

''میں یہ پیشکش رسماً نہیں کر رہا ہوں۔'' علی مراد نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اللہ نے مجھے دو بیٹیاں دے کر زندگی کے ساتھی کو واپس اپنے پاس بلا لیا ہے۔ میری دونوں بیٹیاں اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں اس گھر میں تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ اگر تم لوگ مستقل یہاں آ کر رہنے لگو گے تو میری تنہائی دور ہو جائے گی اور تم لوگوں کی رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔''

''انکل! میں آپ کے خلوص اور محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔'' فرقان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ کی یہ پیشکش مجھ پر ادھار رہی۔ فی الحال آپ ہمیں چند روز قیام کی اجازت دے دیں۔ اگر کبھی مستقل رہائش کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔''

''پیشکش ادھار رہی...... میں کچھ سمجھا نہیں بیٹا۔'' علی مراد نے سوالیہ نظر سے فرقان کی طرف دیکھا۔

جواب میں فرقان نے ان نکات کی وضاحت کر دی جن کی بنا پر وہ فی الحال اپنی سسرال میں مستقلاً ڈیرا ڈال کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ فرقان کے والدین حتیٰ کہ بہن بھائی کا بھی یہی خیال تھا کہ عظمیٰ اور اس کے گھر والوں نے فرقان پر عمل کرا رکھا ہے۔ وہ لوگ اسے اپنے والدین اور گھر کے دیگر افراد سے متنفر کر کے گھر داماد بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ اگر فرقان عظمیٰ کے ساتھ مستقل طور پر علی مراد کے گھر میں ٹھہر جاتا تو اس کے گھر والوں کے کہے کو سند مل جاتی۔

علی مراد نے حالات کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا اور فرقان کو اس کے حالات کے مطابق نقل و حرکت کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر آزاد چھوڑ دیا۔ فرقان نے عظمیٰ کو علی مراد کے گھر میں رکھا اور خود کرایے کے مکان کی تلاش میں اٹھ کھڑا ہوا اور یہیں سے اس کی زندگی میں قاضی وحید کی انٹری ہوئی تھی۔

قاضی وحید جو عرف عام میں محض ''قاضی'' کے نام سے مشہور تھا، پیشے کے اعتبار سے وہ ایک پراپرٹی ڈیلر تھا۔ ناظم آباد کے علاقے میں اس کی ''قاضی اسٹیٹ'' کے نام سے ایک ایجنسی تھی۔ فرقان کی ڈیوٹی بینک کی جس برانچ میں تھی وہ حیدری کے علاقے میں واقع تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ کرایے کا گھر کسی ایسے علاقے میں ہونا چاہیے جہاں سے اس کی جاب زیادہ دور نہ ہو۔ وہ گھومتے پھرتے ہوئے قاضی وحید کی ایجنسی پر پہنچ گیا۔

قاضی نے اس کی ضرورت کو توجہ سے سنا اور آخر میں پُرخلوص انداز میں کہا۔ ''فرقان صاحب! فی الحال میرے پاس کوئی چھوٹا فلیٹ کرایے پر اٹھانے والا تو ہے نہیں۔ سب تین یا چار بیڈ روم والے ہیں۔''

''یہ تو ہماری ضرورت سے بہت بڑے ہیں۔'' فرقان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں تو کم از کم اور زیادہ سے زیادہ دو کمروں والا فلیٹ چاہیے۔ ایک میاں اور ایک بیوی کی ضرورت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔''

''ہوں......!'' قاضی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ٹٹولنے والی نظر سے فرقان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔ اگر آپ تیار ہو جائیں تو آپ کا مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل ہو سکتا ہے۔''

''ایسی کون سی تجویز ہے۔'' فرقان نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔ ''ذرا میں بھی تو سنوں......؟''





''آپ کسی کے ساتھ شیئر کر کے رہ لیں گے؟''

''مطلب یہ کہ کسی فیملی کے ساتھ مل کر۔'' قاضی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''سوگز کے ایک گھر میں، آپ ہی کی طرح کی ایک مختصری فیملی رہ رہی ہے۔ وہ گھر ان کی ذاتی ملکیت ہے مگر ان کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم اور ایک کامن روم...... یہ ہے اس گھر کی مکانیت۔ اگر آپ تیار ہو جائیں تو اس میں دونوں کا بھلا ہے۔ ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ بن جائے گا اور آپ کو بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔ آپ دن بھر بینک میں رہیں گے تو آپ کی وائف گھر میں بوریت محسوس نہیں کرے گی۔''

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔'' فرقان نے سراہنے والے انداز کہا۔ ''لیکن یہ تو پتا چلے وہ فیملی آخر ہے کون۔ اجنبی لوگوں پر آنکھیں بند کر کے بھروسا بھی تو نہیں کیا جا سکتا نا......!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں فرقان صاحب!'' قاضی نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بھروسے اور سیکورٹی کے حوالے سے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ وہ لوگ میرے دیکھے بھالے ہوئے...... بلکہ فرقان صاحب! آپ پہلی ہی ملاقات میں مجھے اتنے زیادہ پسند آگئے ہیں کہ میں آپ سے صاف بات ہی کہہ دیتا ہوں۔''

اتنا بول کر قاضی رکا تو فرقان سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا کہ پتا نہیں، وہ کون سی ''صاف بات'' بتانے والا ہے۔

قاضی نے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''وہ میری فیملی ہے یعنی...... میں اور میری بیوی نگہت!''

''اوہ......!'' فرقان نے ایک گہری سانس خارج کی اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''قاضی صاحب! میرے اندازے کے مطابق آپ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔ کیا آپ نے لیٹ شادی کی ہے یا ابھی تک صاحب اولاد نہ ہونے کی کوئی اور وجوہات ہیں؟'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ندامت آمیز لہجے میں اضافہ کیا۔ ''معاف کیجیے گا، میں نے آپ سے ایک انتہائی ذاتی نوعیت کا سوال کر دیا ہے......!''

''معذرت کی ضرورت نہیں ہے فرقان صاحب!'' قاضی نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ جیسے صاف گو لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ آپ کے دل میں جو کچھ تھا وہ آپ نے زبان سے کہہ دیا۔ میں نے آپ کی بات کا قطعاً برا نہیں منایا......'' اس نے سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جہاں تک میری عمر کا تعلق ہے تو میں آپ کے اندازے کی داد دیتا ہوں۔ میں پچاس کے قریب ہوں اور یہ کہ میری شادی لیٹ نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی کیونکہ نگہت بانجھ ہے۔''

''اوہ......!'' فرقان نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کے ذہن میں دوسری شادی کا خیال نہیں آیا...... اولاد کی خواہش تو سبھی کو ہوتی ہے نا؟''

''ہاں ہوتی ہے۔'' قاضی نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''یہ خواہش میرے دل میں بھی تھی بلکہ ہم دونوں کے دل میں تھی۔ نگہت نے کئی بار مجھ سے کہا بھی کہ میں اولاد کے حصول کی خاطر دوسری شادی کر لوں لیکن میں ایسا کرنا تو دور کی بات ہے، اس کے بارے میں، میں سوچ بھی نہ سکا۔ نگہت کی محبت ہمیشہ اولاد کی خواہش پر غالب آ گئی۔ اس عورت نے میرے ساتھ ازدواجی زندگی کے پچیس سال گزار دیے ہیں۔ وہ میری دکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ میں اس پر سوتن لانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ بانجھ ہے تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے......!''

فرقان، قاضی وحید کی کہانی سن کر بے حد متاثر ہوا تھا۔ قاضی نے اسے یہ بھی بتایا کہ نگہت آج کل بیمار رہنے لگی ہے۔ اس کی دور کی نظر بھی خاصی کمزور ہو چکی ہے۔ چشمے کے بغیر وہ گھر کے اندر بھی چل پھر نہیں سکتی۔ جواب میں فرقان نے بھی قاضی کو اپنے تازہ ترین حالات سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ اس طویل میٹنگ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اگلے روز فرقان عظمیٰ کے ساتھ قاضی کے گھر میں منتقل ہو گیا۔ قاضی کا مذکورہ گھر بورڈ آفس کے نزدیک واقع تھا۔

ایک بیڈ روم فرقان اور عظمیٰ کے حوالے کر دیا گیا۔ ایک بیڈ روم قاضی اور اس کی بیوی نگہت کے پاس رہا۔ ڈرائنگ روم کو وہ لوگ مشترکہ طور پر استعمال کرنے لگے۔ کچن پوری طرح عظمیٰ کے تصرف میں آ گیا۔ نگہت کی طبیعت اکثر خراب ہی رہتی تھی اور وہ بہت کم کچن کا رخ کرتی تھی۔ قاضی اپنے اور اس کے لیے ہوٹل سے کھانا لایا کرتا تھا۔ عظمیٰ کے آ جانے سے قاضی اور اس کی بیوی کو کھانے کی سہولت ہو گئی تھی۔

تین ماہ میں وہ لوگ آپس میں اس قدر گھل مل گئے کہ دیکھنے والا یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ دو الگ الگ فیملیز ہیں۔ وہ ایک خاندان کی طرح رہ رہے تھے۔ ایک رات قاضی نے فرقان کو ایک اچھوتا اور عجیب و غریب مشورہ دیا۔

''فرقان صاحب! مجھے باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ عنقریب پراپرٹی کی مارکیٹ بہت تیز ہونے والی ہے۔ اگر آنے والے تین ماہ میں کسی نے اپنا گھر بنا لیا تو بنا لیا ورنہ زندگی بھر نہیں بنا سکے گا۔''

''ہاں قاضی صاحب! میں نے بھی لوگوں کو اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔'' فرقان نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''لیکن آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں......؟''

''تمہارے تمام تر حالات سے میں پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں فرقان بیٹا۔'' قاضی نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے گھر کی طرف واپس نہیں جا سکتے ہو کیونکہ آپ کے والدین نے واپسی کے لیے جو کڑی شرط رکھی ہے اسے پورا کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ ایک سمجھ دار شوہر ہیں اور اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں۔ والدین کو جوائن کرنے کے لیے آپ عظمیٰ کو اپنی زندگی سے نکالنے کی حماقت کبھی نہیں کر سکتے اور آپ کو کسی قیمت پر ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے......''

قاضی سانس درست کرنے کے لیے تھما تو فرقان خاموش سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔ قاضی سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اور آپ سسرال کی جانب سے کسی قسم کا احسان لینے کے حق میں نہیں ہیں، یہ بات بھی میں اتنے دنوں میں اچھی طرح جان گیا ہوں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا فرقان میاں؟''

''نہیں قاضی صاحب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' فرقان نے گردن کو اثباتی جنبش دی۔ ''لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اس وقت آپ نے یہ موضوع کیوں چھیڑا ہے؟''

''میری یہ خواہش ہے کہ آپ کا بھی اپنا ذاتی گھر ہو......'' قاضی وحید نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''یہ خواہش تو خود میری بھی ہے۔'' فرقان نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس خواہش کی تکمیل اتنی آسان نہیں...... بلکہ میرے خیال میں یہ تقریباً ناممکن ہے۔''

''فرقان صاحب! اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔'' قاضی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''اگر انسان کا ارادہ مضبوط ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔''

''لیکن قاضی صاحب......'' فرقان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ارادے کی مضبوطی اپنی جگہ مگر ذاتی گھر کے لیے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ کہاں سے آئے گی؟''

''آپ کے خیال میں ایک چھوٹا سا ذاتی گھر کتنے میں مل سکتا ہے؟''

''لگ بھگ دو لاکھ روپے میں......!'' فرقان نے جواب دیا۔

''اور اگر پچاس، ساٹھ ہزار روپے میں مل جائے تو......؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا قاضی صاحب!''

''سوال اور جواب کی پیدائش میں ذہن کو نہ تھکائیں فرقان صاحب!'' قاضی نے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے کہا۔ ''اگر پچاس، ساٹھ ہزار روپے میں آپ کو چھوٹا سا ذاتی گھر مل جائے تو......؟''

''کیا آپ قسطوں والے کسی گھر کی بات کر رہے ہیں؟'' ایک ممکنہ اندیشے نے فرقان کے سر میں انگڑائی لی۔

''نہیں...... قطعاً نہیں۔'' قاضی دوٹوک لہجے میں بولا۔

''میرے لیے یہ ناقابلِ یقین ہوگا۔'' فرقان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے ایک معجزہ ہی سمجھوں گا۔''

''فرقان صاحب!'' قاضی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر آپ پچاس، ساٹھ ہزار روپے خرچ کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو آپ بھی دو کمرے کے ایک چھوٹے سے گھر کے مالک بن سکتے ہیں۔''

''اتنی رقم تو دو کمروں کی تعمیر پر ہی خرچ ہو جائے گی قاضی صاحب!'' فرقان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ بھی کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

''بس...... دو کمرے ہی تو ڈالنا ہیں......'' قاضی نے سادگی سے کہا۔

یہ واقعہ آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے کا ہے اس لیے قیمتوں کے سلسلے میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح مہنگائی نے آسمان کو نہیں چھو رکھا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں قاضی صاحب......؟'' فرقان نے الجھے بھرے انداز میں قاضی وحید کی جانب دیکھا۔ ''دو کمرے ڈالنا ہیں تو کہاں...... ہوا میں تو تعمیر نہیں ہو سکتی نا!''

''ہوا میں نہیں، تعمیر چھت پر ہوگی فرقان صاحب!'' قاضی نے معنی خیز نظر سے فرقان کو دیکھا۔

''چھت پر تعمیر......'' فرقان کی الجھن دوچند ہو گئی۔ ''کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہیں قاضی صاحب......!''

''ارے، آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں فرقان صاحب!'' قاضی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''آپ نے بات ہی ایسی کی ہے قاضی صاحب!'' فرقان ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''بھلا مجھے





کون اپنی چھت پر مکان بنانے کی اجازت دے گا؟''

''میں...... اور کون!'' قاضی اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ رقم کا بندوبست کر لیں تو میرے مکان کی چھت حاضر ہے اور وہ بھی...... بالکل مفت!''

''یہ...... یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں...... قاضی صاحب؟'' فرقان بے یقینی سے اسے دیکھتا چلا گیا۔

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں فرقان صاحب!'' قاضی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ میرے بیٹے کی طرح ہیں۔ اگر آپ کہیں سے پچاس، ساٹھ ہزار روپے کا انتظام کر کے میرے مکان کی چھت پر دو کمرے ڈال لیں تو آپ بھی اپنے گھر کے مالک بن جائیں گے۔ میں آپ سے زمین کی قیمت وصول نہیں کروں گا اور جہاں تک آپ والے پورشن کی ملکیت یا مالکانہ حقوق کا تعلق ہے تو......'' وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جب اوپر والے پورشن کی تعمیر مکمل ہو جائے گی اور آپ اوپر شفٹ ہو جائیں گے تو باقاعدہ کسی تجربہ کار وکیل کی مدد سے بالائی منزل کی ملکیت کے کاغذات آپ کے نام بنوا لیں گے......''

وہ بہت سے سوالات جو فرقان کے ذہن میں بالائی پورشن کی ملکیت کے حوالے سے ابھر رہے تھے ان کا جواب قاضی نے بنا پوچھے ہی دے دیا تھا لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کی خاطر اس نے پوچھ لیا۔

''قاضی صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ بالائی منزل کی تعمیر پر میں اپنی جیب سے خرچ کروں گا لیکن بہرحال وہ چھت تو آپ ہی کے مکان کی ہوگی نا۔ آپ اس کی قیمت کیوں نہیں وصول کریں گے؟''

''فرقان صاحب! آپ کے اس سوال کے میرے پاس دو جواب ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ کو جو بھی جواب پسند آئے وہ منتخب کر لیں۔''

''اور وہ دو جواب کون سے ہیں؟'' فرقان ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''جواب نمبر ایک......'' قاضی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کو اپنے بیٹے کی جگہ اور عظمیٰ کو بہو کی جگہ سمجھتا ہوں تو پھر آپ لوگوں سے کسی نوعیت کی وصولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ لوگوں کو میرا بیٹا اور بہو بننا گوارا نہیں تو پھر، ہم آپس میں ایک ایگریمنٹ کر لیتے ہیں اور یہ ایگریمنٹ میرا دوسرا جواب ہوگا۔''

''اب ذرا اس ایگریمنٹ کی بھی وضاحت کریں۔'' قاضی کی بے لوثی کو دیکھتے ہوئے فرقان کی آواز بھی جذبات سے بوجھل ہو گئی تھی۔

''دیکھو عرفان میاں!'' قاضی نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''آپ نے تین ماہ میں دیکھ ہی لیا کہ آپ کی آنٹی نگہت کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور میں بھی مزید کتنا جی لوں گا......''

''یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے قاضی صاحب!'' فرقان نے دزدیدہ نظر سے قاضی وحید کی جانب دیکھا۔ ''اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔''

''انسان کی عمر کتنی بھی دراز کیوں نہ ہو جائے اسے ایک روز اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔'' قاضی نے کسی مفکر کی طرح، سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جس ایگریمنٹ کی بات کر رہا ہوں وہ ہماری زندگی سے متعلق ہے۔ اگر میں نگہت سے پہلے چل بسوں تو اس ایگریمنٹ کی رو سے میرے بعد آپ لوگ نگہت کا بھرپور خیال رکھو گے اور اگر نگہت مجھے داغِ مفارقت دے گئی تو عظمیٰ کی یہ ڈیوٹی ہوگی کہ وہ صبح شام میرے لیے کھانے کا بندوبست کرے گی اور ہاں......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ایگریمنٹ کسی اسٹیمپ پیپر وغیرہ پر تیار نہیں کیا جائے گا بلکہ یہ ہمارے بیچ ایک زبانی معاہدہ ہوگا جس کی اخلاقی پاسداری دونوں فریقوں پر لازم ہوگی۔''

''قاضی صاحب! آپ بہت ہی ذہین، سمجھ دار اور عظیم انسان ہیں۔'' فرقان نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''آپ کی دونوں شرائط ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ اگر ہم آپ کا بیٹا اور بہو بن جاتے ہیں تو وہ تمام تر ذمے داری ہمارے فرائض کا حصہ بن جائے گی جس کا ذکر آپ نے ایگریمنٹ والے جواب میں کیا ہے اور اگر ہم پہلی شرط کو نظر انداز کر کے ایگریمنٹ کرتے ہیں تو ہمارا عمل اس بات کو ثابت کرے گا کہ ہم نے ایک فرماں بردار بیٹے اور ایک سلیقہ شعار بہو کی طرح آپ کا خیال رکھا ہوا ہے۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے......؟'' قاضی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں آپ کی تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' فرقان نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر......!''

''مگر کیا؟'' فرقان نے جملہ ادھورا چھوڑا تو قاضی نے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میں فوری طور پر پچاس، ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست نہیں کرسکوں گا۔'' فرقان نے اپنی مشکل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''فرقان صاحب! آپ بینک میں ملازم ہیں۔'' قاضی نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''آپ کو تو بڑی آسانی سے قرضہ مل جائے گا۔ آپ کا بینک مشکل وقت میں کام نہیں آئے گا تو اس کا اچار ڈالنا ہے کیا......؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں قاضی صاحب! بینک سے قرضہ لینے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔'' فرقان نے اپنی الجھن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ کام ایک ماہ کے بعد ممکن ہوسکے گا۔''

''اس کا کوئی خاص سبب؟'' قاضی وحید نے پوچھا۔

''میں نے کچھ عرصہ پہلے موٹر سائیکل کی خریداری کے لیے بینک سے قرض لیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس قرض کی ایک قسط باقی ہے جو اگلے ماہ جائے گی۔ وہ قرض کلیئر ہوجائے تو میں نئے قرض کے لیے درخواست دے سکوں گا۔''

''ہوں......!'' قاضی نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''قرض کی درخواست کے کتنے عرصے بعد رقم آپ کے اکاؤنٹ میں آجائے گی؟''

''قرض کی منظوری کا پراسس مکمل ہونے میں زیادہ سے زیادہ ایک ماہ لگ جائے گا۔'' فرقان نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، قرض کی رقم آپ کے استعمال میں آنے میں دو ماہ لگ جائیں گے۔''

''جی! اتنا عرصہ تو لگ ہی جائے گا۔'' فرقان نے کہا۔

''مگر دو ماہ کے اندر تو بلڈنگ میٹریل کے نرخ بہت اوپر چلے جائیں گے۔'' قاضی نے متفکرانہ انداز میں کہا۔ ''میں اسٹیٹ کا بزنس کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے، آنے والے دو ماہ میں سریا، سیمنٹ، ریت، بلاکس اور دیگر سامان تعمیرات کی قیمت دگنی نہیں تو ڈیڑھ گنا ضرور ہوجائے گی۔ جو کام آج پچاس، ساٹھ ہزار میں ہو رہا ہے وہ پچھتر، اسی ہزار میں جاکر بیٹھے گا۔''

''یہ تو ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔'' فرقان نے سرسری انداز میں کہا۔ ''نہ تو میں دو ماہ سے پہلے قرض لے سکتا ہوں اور نہ ہی ہم بلڈنگ میٹریل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کو کنٹرول کرسکتے ہیں۔''

''کرسکتے ہیں......'' قاضی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم بلڈنگ میٹریل کی قیمتوں کو کنٹرول کرسکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' فرقان نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میری دو تین بلڈنگ میٹریل اسٹور والوں سے اچھی جان پہچان ہے۔'' قاضی اپنے منصوبے کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ ''ہم ان سے ابھی کے مارکیٹ ریٹ پر اپنی ضرورت کا سامان خرید لیتے ہیں۔ ادائی دو ماہ کے بعد کردیں گے۔''

''کیا وہ دو ماہ کے کریڈٹ پر ہمیں بلڈنگ میٹریل فراہم کرنے پر راضی ہوجائیں گے؟'' فرقان نے پوچھا۔

''سامان تو ہم اسی وقت اٹھائیں گے جب ادائی کریں گے۔'' قاضی نے کہا۔ ''ابھی تو صرف زبانی بکنگ ہوگی۔''

''بکنگ ابھی ہوگی اور وہ بھی ایک روپیہ ادا کیے بغیر......'' فرقان نے تصدیق طلب نظر سے قاضی کی طرف دیکھا۔ ''مگر اپنی ضرورت کا سامان ہم دو ماہ کے بعد اٹھائیں گے اور وہ بھی آج کے ریٹ کے حساب سے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا......؟''

''بالکل ٹھیک۔'' قاضی نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میں اتنی دیر سے آپ کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''قاضی صاحب!'' فرقان ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ کے تعلقات کی بنا پر یہ سہولت حاصل ہوسکتی ہے تو میری طرف سے آپ ''ڈن'' سمجھیں۔ میں دو ماہ کے بعد رقم کا بندوبست کردوں گا۔''

اس کے بعد تمام مراحل آسانی سے طے ہوگئے۔ ان دونوں کے بیچ یہ میٹنگ مارچ کے مہینے میں ہوئی تھی۔ اپریل میں فرقان کا موٹر سائیکل والا قرض کلیئر ہوا۔ مئی میں اس نے بینک سے ایک لاکھ کا لون منظور کرالیا۔ پچیس مئی کو ایک لاکھ کی رقم فرقان کے اکاؤنٹ میں جمع ہوچکی تھی۔ جون کے پہلے ہفتے میں بالائی منزل کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ دس جولائی کو یہ کام مکمل ہوا اور فرقان عظمٰی کے ساتھ بالائی پورشن میں منتقل ہوگیا۔ اس نے بینک سے جو ایک لاکھ روپے قرض اٹھایا تھا ان میں سے دل کھول کر پچھتر ہزار بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ ہوئے تھے اور پچیس ہزار اس نے زیریں منزل کی منتخب میٹنی نینس پر لگا دیے تھے۔ یہ قاضی کے لیے فرقان کی محبت کا اظہار تھا۔ گویا ایک لاکھ کی رقم اسی گھر کے اندر ''غائب'' ہوگئی تھی۔

فرقان اور عظمٰی نے اس گھر کے بالائی پورشن پر جولائی، اگست بڑے امن و سکون سے گزارے تھے۔ ستمبر کا





مہینا اپنے اختتام پر سنگر کی شکل اختیار کرگیا۔ ان کی زندگی میں وہ ٹوئسٹ آیا جس کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ وہ لوگ اچانک بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں گھر گئے تھے۔

قاضی وحید جو پچھلے آٹھ نو ماہ سے ایک فرشتہ صفت انسان کے روپ میں ان کے دل و دماغ میں جگہ بنا چکا تھا، جب اس کا اصلی چہرہ ان پر عیاں ہوا تو ان کے چودہ طبق کھل ہوگئے۔ قاضی کی عیاری اور مکاری کا شکار ہوکر پہلے انہیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا اور پھر فرقان قتل کے الزام میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کردیا۔ میں نے فرقان کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ اور اپنے موکل کی درخواست ضمانت دائر کردی۔ جج کرسیِ انصاف پر آکر بیٹھا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میرا موکل اس معاشرے کا ایک شریف النفس اور امن پسند شہری ہے۔ اس کا ماضی بے داغ ہے۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت قتل کے اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا سا ہے کہ اس نے اپنی سادگی کی وجہ سے مقتولہ کے شوہر اسٹیٹ ایجنٹ قاضی وحید پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرلیا تھا۔''

''یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست ملزم کو معصوم اور سادہ لوح ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جس شخص نے کامرس میں ماسٹرز کر رکھا ہو اور ایک پرائیویٹ بینک میں ملازمت کرتا ہو۔ دن رات مالیاتی فیگرز سے اس کا واسطہ پڑتا ہو وہ اتنا سادہ اور بے وقوف نہیں ہوسکتا کہ چپ چاپ آنکھیں بند کرکے کسی کی پراپرٹی میں ایک لاکھ روپے کی انویسٹمنٹ کردے۔''

''محبت اور اخلاص کو اگر منفی انداز میں استعمال کیا جائے تو یہ میٹھی چھری اور زہر ہلاہل کی طرح کام کرتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ملزم اسی لیے فریب کھا گیا کہ اس کے مالک مکان قاضی وحید نے اسے اخلاق اور جذبات کی مار ماری تھی۔ ملزم کی جگہ کوئی اور شخص بھی ہوتا تو وہ وہی کرتا جو ملزم نے کیا۔''

''ملزم نہایت ہی عیار اور مکار شخص ہے۔'' وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں خاموش کھڑے فرقان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس نے اپنے مسائل کا رونا رو کر پہلے مقتولہ کے شوہر قاضی وحید کے دل میں جگہ بنائی پھر ایک کرایے دار کی حیثیت سے اپنی بیوی سمیت ان کے گھر میں داخل ہوگیا۔ مقتولہ ایک پیار اور نرم دل خاتون تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے محبت کا ناٹک رچا کر مقتولہ اور اس کے شوہر کے دل جیت لیے۔ تین ماہ کے بعد قاضی وحید نے ان کی الگ رہائش کے لیے اپنے گھر کی چھت پر دو کمرے کا ایک پورشن تعمیر کرادیا۔ یہ لوگ بالائی منزل پر شفٹ ہوگئے اور پھر دو ماہ بعد ہی انہوں نے اپنے منصوبے کے مطابق قاضی وحید سے مطالبہ کردیا کہ وہ اس کے گھر میں نہیں رہنا چاہتے لہٰذا قاضی صاحب انہیں ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کردیں۔ ایک لاکھ وہ جو ملزم نے بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ کیا تھا اور پچاس ہزار روپے وہ جو پچھلے چھ ماہ میں قاضی وحید مختلف مد میں ملزم سے لیتا رہا تھا۔ جب مقتول کے شوہر نے ملزم کے مطالبے کو باطل قرار دیتے ہوئے اس پر واضح کیا کہ اس کے گھر کی تعمیر میں ملزم کا ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوا اور نہ ہی اس نے ملزم سے کبھی کسی مد میں کوئی رقم لی تو یہ سن کر ملزم بپھر گیا۔ ان دونوں کے بیچ شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا اور ملزم نے قاضی وحید کو یہ دھمکی دی کہ اگر اس نے شرافت سے ملزم کو ڈیڑھ لاکھ روپے ادا نہ کیے تو پھر اسے خطرناک نتائج کے لیے تیار رہنا چاہیے......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''پھر پندرہ اکتوبر کی شام ملزم نے اپنی سنگین دھمکی پر عمل کر دکھایا۔ وہ موقع پاکر ایسے وقت مقتولہ کے گھر میں گھسا جب اس کا شوہر وہاں موجود نہ ہو۔ ملزم نے مقتولہ کے گھر سے ایک لاکھ روپے چوری کیے اور اور مقتولہ کی مزاحمت پر اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا اور جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا۔ اس کی بدقسمتی کہ جب وہ مقتولہ کے گھر سے نکل رہا تھا تو قاضی وحید وہاں پہنچ گیا۔ ملزم قاضی کو نہیں دیکھ سکا تھا تاہم قاضی وحید اسے افراتفری کے عالم میں وہاں سے جاتے دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنے گھر میں داخل ہوا پھر حقیقت کسی بم کے مانند اس کے سر پر پھٹی۔ اس کی بیوی بیڈ روم میں مردہ پڑی تھی۔ مقتولہ کے لباس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی مزاحمت کے نتیجے میں ملزم نے گلا گھونٹ کر اس کی جان لے لی تھی۔ بیڈ روم میں موجود وہ الماری بھی کھلی پڑی تھی جس کے ایک خفیہ خانے میں قاضی وحید نے ایک لاکھ روپے رکھے ہوئے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

تھے۔ مذکورہ رقم کو غائب پا کر قاضی وحید کا دماغ گھوم گیا۔ ملزم نے من وعن اپنی خطرناک دھمکی پر عمل کر ڈالا تھا۔''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر میں نے ملزم کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ''وکیل سرکار حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں۔ میرا موکل نہ تو قاتل ہے اور نہ ہی اس نے مقتول کے گھر سے ایک روپیہ بھی چرایا ہے۔ مقتول کے شوہر نے ہوشیاری اور چال بازی سے ملزم کے ایک لاکھ روپے اپنے گھر کی بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ کرائے۔ یہ رقم ملزم نے اپنے بینک سے قرض لی تھی۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اس نے ایک خوب صورت سازش کے تحت پہلے ملزم کو گھر چھوڑنے پر راضی کیا پھر اس سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کی غرض سے اسے اپنی بیوی کے قتل میں ملوث کر کے یہ خطرناک ڈراما رچایا ہے لٰہذا میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اس کی رہائی کے احکام صادر فرمائے جائیں۔''

''ملزم کی ضمانت پر رہائی انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگی جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے ضمانت رکوانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ملزم نے قتل اور ڈکیتی جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کا ٹرائل لازمی ہے۔''

''جناب عالی! آج عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ کیس اتنا سیدھا اور سادا نہیں جیسا کہ استغاثہ کی رپورٹ اور چالان میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے اندر بہت سے پیچیدہ اور نازک موڑ ہیں۔ میں مناسب وقت آنے پر ثابت کر دوں گا کہ میرے موکل کو ایک گھناؤنی سازش کے تحت اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''یور آنر......!'' وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اپنے فاضل دوست کی ''مناسب وقت'' والی بات سے اتفاق کرتے ہوئے معزز عدالت سے گزارش کرتا ہوں کہ فی الحال ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں بھیج دیا جائے۔ جب مناسب وقت آئے گا اور میرے فاضل دوست اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو معزز عدالت انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے آزاد ہوگی......''

ہمارے درمیان مزید پندرہ بیس منٹ تک ضمانت کے حق اور مخالفت میں دلائل کا سلسلہ جاری رہا پھر جج نے درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے ملزم فرقان کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی کے احکام جاری کرنے کے بعد، پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو علی مراد میرے ساتھ تھا۔ ہمارے درمیان کیس کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت جاری تھی۔ جب جیل کی وین فرقان کو لے کر عدالت کے احاطے سے نکل گئی تو میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے علی مراد سے پوچھا۔

''آپ کو فرقان کے گھر والوں میں سے کوئی دکھائی دے رہا ہے؟''

''نہیں بیگ صاحب!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''حالانکہ میں آج ان کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے ضرور کوئی عدالت پہنچے گا مگر لگتا ہے... ان کے سینے میں دل نہیں، پتھر ہیں۔''

''یہ جو بھی ہے، نہایت ہی افسوس ناک ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کو ایسے سفاک رویے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''بہرحال......'' علی مراد گردن کو نفی میں جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس بات کی پروا بھی نہیں کہ فرقان کے گھر والوں کو اس کا خیال آتا ہے یا نہیں۔ وہ میرا داماد ہے، میری بیٹی کا سہاگ ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنا بیٹا سمجھا ہے۔ اس کی باعزت رہائی کے لیے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں۔''

''میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں علی مراد صاحب!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فرقان خوش قسمت ہے کہ اسے آپ جیسا سسر ملا۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو کوئی قربانی نہیں دینا پڑے گی۔''

''آپ نے کیس تو اچھی طرح اسٹڈی کر لیا ہوگا۔'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو کیا لگتا ہے فرقان کی رہائی کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟''

''ایک سو ایک فیصد!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''لیکن......!''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری انداز میں بولا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ......'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ''یہ کیس خاصا پیچیدہ اور الجھا ہوا ہے۔ اسے بڑی سوجھ بوجھ اور نزاکت سے سلجھانے کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے، میں یہ مشکل کام نہایت ہی آسانی سے کر لوں



SCANNED BY AMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

گا مگر یہاں ایک اور ''لیکن'' بھی کھڑا ہے......''

علی مراد میری بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔ ''اب اس ''لیکن'' کی بھی وضاحت کردیں بیگ صاحب؟''

''لیکن اس سلسلے میں مجھے آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

''ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ فرقان نے نگہت کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اس نے قاضی کے گھر سے ایک تنکا بھی چرایا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں نا؟''

''بالکل اتفاق کرتا ہوں جناب!'' وہ زور دے کر بولا۔ ''میں فرقان کو سو فیصد بے گناہ سمجھتا ہوں۔''

''لیکن اس وقت وہ قتل اور ڈکیتی کے کیس میں پھنسا ہوا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور اس معاملے سے اسے اس وقت تک نجات نہیں مل سکتی جب تک وہ بالائی منزل والی تعمیر والے ایشو میں سچا اور قاضی وحید جھوٹا ثابت نہ ہوجائے۔''

''یہ کام تو آپ ہی کریں گے بیگ صاحب۔'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''یقیناً میں ہی کروں گا مگر آپ کے تعاون سے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اس سلسلے میں، میں نے جو منصوبہ بنایا ہے اسے کامیاب کرنے کے لیے مجھے چند لوگوں کے بارے میں معلومات درکار ہوں گی اور یہ معلومات مجھے آپ فراہم کریں گے۔''

''ضرور کروں گا بیگ صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''آپ راہنمائی فرمائیں گے تو میں یہ کام بہ آسانی انجام دے لوں گا۔''

''ٹھیک ہے، آپ کل شام میں میرے آفس آجائیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کو بریف کردوں گا۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں اس سے مصافحہ کرکے دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

اگلے روز وہ حسب وعدہ مجھ سے ملنے دفتر آیا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ آدھا گھنٹا گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے ان افراد کی فہرست فراہم کردی جن کے بارے میں مجھے معلومات درکار تھیں۔ ان میں سرفہرست مقتولہ نگہت اور اس کے شوہر قاضی وحید کا نام تھا۔ میں ان کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ چند ایسے افراد تھے جو قاضی وحید کو روزانہ یا اکثر دیکھا کرتے تھے اور چند ایسے افراد جو ملزم فرقان کے گہرے شناسا تھے۔ میں نے استغاثہ کے دیوزاد کو پچھاڑنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ معلومات مختلف داؤ پیچ کی حیثیت رکھتی تھیں۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد ملزم فرقان کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ ملزم کا بیان مکمل ہوا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے تک وہ اسے جرح کی چکی میں پیستا رہا۔ فرقان نے میری ہدایت کے عین مطابق نہایت ہی تحمل اور برداشت کے ساتھ وکیل مخالف کے سوالات کے جوابات دیے۔ اپنی باری پر میں جج کی اجازت سے اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچا اور جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم جنوری سے مارچ تین ماہ تک مقتولہ کے گھر میں کرایے دار کی حیثیت سے اسی طرح رہے تھے کہ مقتولہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اسی گھر میں رہائش پذیر تھی؟''

''جی ہاں، آپ درست فرما رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہم چاروں افراد ایک ہی گھر میں، ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔''

''پھر مارچ کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''مارچ کے مہینے میں مقتولہ کے شوہر نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں کچھ رقم خرچ کرکے چھت پر دو کمرے ڈال کر ایک چھوٹا سا گھر بنوالوں تو آسانی سے بالائی منزل پر شفٹ ہوسکتا ہوں۔'' ملزم نے جواب دیا۔

''اور قاضی وحید کی یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی؟''

''پچھلے تین ماہ میں ہمارے درمیان محبت اور اخلاق کا جو رشتہ استوار ہوچکا تھا اس کے پیش نظر مقتولہ کے شوہر کا یہ مشورہ مجھے بھلا لگا۔'' ملزم فرقان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اور میں نے بینک سے لون لے کر اس مشورے پر عمل کر ڈالا۔''

''تم نے اس مقصد کے لیے اپنے بینک سے کتنا قرض لیا تھا؟''

''ایک لاکھ روپے۔'' اس نے بتایا۔





''کیا یہ ایک لاکھ روپے گھر کی بالائی منزل کی تعمیر پر خرچ ہوگئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''بالائی منزل کی تعمیر پر تو کم و بیش پچھتر ہزار خرچ ہوئے تھے۔ باقی کے پچیس ہزار زیریں منزل پر مختلف نوعیت کے مرمت کے کاموں پر خرچ ہوئے تھے۔''

''گویا آپ نے بینک سے جو ایک لاکھ کا قرض لیا تھا وہ تمام کا تمام قاضی وحید کی پراپرٹی کی توسیع، تزئین و آرائش کی نذر ہوگیا......؟'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔

''جی یہی حقیقت ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم نے کامرس پڑھی ہے اور ایک بینکر ہو۔'' میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا۔ ''کسی دوسرے کی پراپرٹی پر بغیر کسی لکھت پڑھت کے تم نے ایک لاکھ روپے خرچ کردیے۔ اس موقع پر تمہاری عقل کیا گھاس چرنے گئی تھی؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میری عقل پر واقعی پردہ پڑ گیا تھا۔ قاضی وحید نے مجھے محبت اور اخلاق کی چھری سے اس طرح ذبح کر ڈالا کہ آخری لمحے تک مجھے اس فراڈ کا احساس نہ ہوسکا۔''

اس کے بعد میں نے فرقان کی زبانی مختلف سوال و جواب کے ذریعے قاضی کی چال بازیوں کی تفصیل اگلوا کر عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ کردی اور آخر میں فرقان سے پوچھا۔

''تمہیں پہلی مرتبہ اس فراڈ کا احساس کب ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جب قاضی نے مجھ سے کہا کہ وہ مکان کو فروخت کرنا چاہتا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''ستمبر کے آخر... میں اس نے مجھ سے یہ سب کہا تھا۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''ملزم نے مجھے بتایا کہ اس مکان کی ایک پارٹی لگ گئی ہے۔ چھ لاکھ دینے کو تیار ہے۔ پچھلے زمانے میں اس نے گھر پر دو لاکھ خرچ کیے تھے۔ بالائی منزل کی تعمیر میں کم و بیش ایک لاکھ میرے لگے تھے۔ اس نے میرے سامنے آفر رکھی کہ اگر وہ مکان چھ لاکھ میں نکل جاتا ہے تو چار لاکھ وہ رکھے گا اور دو لاکھ مجھے دے دے گا۔ دونوں کو لگائی ہوئی رقم پر سو فیصد منافع مل جائے گا۔''

''تو کیا تم نے قاضی وحید کی تجویز پر رضامندی ظاہر کردی تھی؟''

میں چیدہ اور سلگتے ہوئے سوالات کے ذریعے قاضی وحید کی عیاری عدالت پر عیاں کررہا تھا۔ جب تک قاضی کا فراڈ عدالت کے ریکارڈ پر رجسٹر نہ ہوتا، میں اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ فرقان نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''میرے پاس رضامندی ظاہر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''بالائی منزل کے مالکانہ حقوق تمہارے پاس تھے۔ پھر کیسی مجبوری۔ وہ تمہاری مرضی کے بغیر پورے گھر کو فروخت کرنے کے اختیارات نہیں رکھتا تھا۔''

''نہیں جناب! حقیقت اس سے قطعی مختلف تھی......!'' اس نے بتایا۔

''عدالت حقیقت جاننا چاہتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے دیکھا، جج پوری توجہ اور دلچسپی سے میرے اور ملزم کے درمیان جاری سوال و جواب کو سماعت کررہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک خوش آیند بات تھی۔

''حقیقت یہ ہے جناب......!'' ملزم نے معتدل انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''بالائی منزل کی ملکیت کے حوالے سے قاضی نے مجھ سے جتنی بھی باتیں کی تھیں وہ زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھ سکی تھیں۔ ابھی بالائی منزل کی ملکیت کے کاغذات تیار نہیں ہوئے تھے کہ قاضی نے مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے روکنے کے لیے میرے پاس اختیارات نہیں تھے۔''

''اختیارات اس لیے نہیں تھے کہ تم نے اپنے ہاتھ پاؤں کاٹ کر قاضی کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''قاضی کی مکان فروخت کرنے کی اسکیم کے جواب میں تم نے کیا کہا تھا؟''

''میں نے قاضی سے کہا تھا کہ اگر وہ مکان فروخت کردے گا تو انہیں فوری طور پر گھر خالی کرنا ہوگا۔ پھر میں اپنی بیوی کو لے کر کہاں جاؤں گا؟''

''اس نے کیا جواب دیا تھا؟''

''وہ بولا۔ تم چند دن کے لیے اپنی سسرال چلے جانا اور میں اپنے کسی رشتے دار کے پاس چلا جاؤں گا۔'' ملزم نے جواب دیا۔ ''پھر جب مکان کی فروخت کا پراسس مکمل ہوجائے گا تو وہ دو لاکھ مجھے دے دے گا۔ اس کے بعد میں آزاد ہوں گا کہ کہیں بھی رہوں۔ اس کے ساتھ ہی قاضی نے مجھے ایک تجویز بھی دی تھی۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”کیسی تجویز؟“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ جو کافی دیر سے خاموش کھڑا میرے اور ملزم کے بیچ ہونے والی گفتگو کو تحمل سے سن رہا تھا، اچانک پھٹ پڑا۔

تمام حاضرین عدالت نے چونک کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ جج نے اس سے استفسار کیا۔

”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی!“ وہ جج کے سوال کے جواب میں بولا۔ ”اس وقت عدالت میں نگہت مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور ڈیفنس کونسلر ملزم کو کسی اور موضوع میں الجھا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں غیر متعلقہ باتوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

”جناب عالی!“ وکیل استغاثہ کے حملے کے جواب میں، میں نے کہا۔ ”میں نے اب تک اپنے موکل سے ایک بھی غیر متعلقہ اور غیر ضروری سوال نہیں کیا۔ میرے موکل کے ساتھ ایک لاکھ روپے کا فراڈ کیا گیا ہے۔ جب تک اس فراڈ کی تفصیلات معزز عدالت کے ریکارڈ پر نہیں آجاتیں قتل کے محرکات کو نہیں جانا جاسکتا۔ میں آگے چل کر یہ ثابت کردوں گا کہ میرا موکل بے گناہ ہے اور ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس قتل کے کیس میں ملوث کیا گیا ہے۔“

”یور آنر! میرے فاضل دوست جتنی سست روی سے ملزم پر جرح کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ملزم پر جرح مکمل کرنے میں انہیں مزید دو تین پیشیوں کی ضرورت ہوگی۔“ وکیل استغاثہ نے برا سا منہ بنا کر مجھ پر چوٹ کی۔ ”استغاثہ کے گواہوں کو بھی عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اس طرح تو یہ کیس لٹکتا چلا جائے گا۔“

وکیل استغاثہ نے میری سمت جو اینٹ پھینکی تھی اس کے جواب میں ایک پتھر لڑھکانا مجھ پر واجب ہوگیا تھا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

”جناب عالی! جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ میرے موکل کے ساتھ ہونے والے جائداد فراڈ کو بے نقاب کیے بغیر نگہت مرڈر کیس کو حل کرنا ممکن نہیں لہٰذا معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ مجھے ملزم پر اپنی جرح مکمل کرنے کے لیے تھوڑا ٹائم دیا جائے اور اس کے ساتھ ہی وکیل سرکار کو بھی اس امر کا پابند بنایا جائے کہ وہ میری جرح کے دوران میں کسی بھی قسم کی مداخلت کا خیال دل سے نکال دیں اور جہاں تک استغاثہ کے گواہوں کا تعلق ہے......“ میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس خارج کی پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اگر مجھے کھل کر بولنے کا موقع دیا گیا اور مجھے توجہ سے سننے کی کوشش کی گئی تو میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ استغاثہ کے گواہوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔“

وکیل استغاثہ نے میرے انکشاف پر حیرت بھری نظر سے پہلے مجھے اور پھر جج کو دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہوتاہم اس نے ”آبجیکشن یور آنر“ کا نعرہ لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”جرح جاری رکھی جائے۔“

میں ایک مرتبہ پھر ملزم کی طرف متوجہ ہوگیا اور جرح کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو پھر سے جوڑتے ہوئے کہا۔ ”تم قاضی وحید کی کسی تجویز کے بارے میں بتا رہے تھے؟“

”قاضی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں چاہوں گا تو دوبارہ بھی ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔“ ملزم فرقان نے بتایا۔ ”چھ لاکھ میں کوئی بڑا گھر خرید لیا جائے گا۔“

”پھر تم نے قاضی کو کیا جواب دیا تھا؟“

”میں نے کہا تھا بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا تھا؟“

”پھر...... قاضی کے مشورے پر میں عظمیٰ کے ساتھ اپنی سسرال میں شفٹ ہوگیا۔“ ملزم ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”قاضی نے کہا تھا کہ وہ بھی اپنے کسی رشتے دار کے یہاں چلا جائے گا مگر جب ایسا نہیں ہوا اور قاضی اپنی بیوی نگہت کے ساتھ بدستور اسی گھر میں مقیم رہا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے ”قاضی اسٹیٹ“ جاکر اس سے بات کی۔ اس نے ٹال مٹول کی راہ اپنائی اور ”آج کل، آج کل“ کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی نیت میں فتور آگیا ہے......“

”لیکن یہ سمجھ تمہیں بہت دیر میں آئی۔“ اس نے لمحاتی توقف کیا تو میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا بہرحال...... یہ بتاؤ تم نے قاضی وحید کا گھر کب چھوڑا تھا؟“

”مکان کی فروخت کا معاملہ ستمبر کے آخری دنوں میں سامنے آیا تھا۔“ وہ پُراعتماد انداز میں بولا۔ ”اور ہم نے اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں میں...... بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے تین اکتوبر کو شفٹنگ کی تھی۔“

”آپ لوگوں نے تین اکتوبر کو قاضی کے گھر کو خیرباد





کہہ دیا اور پھر پندرہ اکتوبر کو تمہیں قاضی کی بیوی نگہت کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے۔“ ملزم نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”تین سے پندرہ اکتوبر کے درمیان کیا ہوتا رہا؟“

”جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ہم نے قاضی کے ایما پر شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا گھر چھوڑ دیا تھا۔ تین اکتوبر سے چودہ اکتوبر تک میں ہر دوسرے تیسرے دن قاضی کی ایجنسی کے چکر کاٹتا رہا تاکہ اس سے دو لاکھ کی رقم وصول کرسکوں لیکن ہر مرتبہ وہ کوئی نیا بہانہ بنا کر کل پر ٹال دیتا تھا۔ چودہ اکتوبر کی شام میں نے اس کے ساتھ اچھی خاصی تلخ کلامی کر ڈالی حالانکہ یہ میرا مزاج نہیں ہے۔“

”عدالت جاننا چاہتی ہے کہ چودہ اکتوبر کی شام یعنی وقوعہ سے لگ بھگ چوبیس گھنٹے پہلے تمہاری اور قاضی وحید کی کس بات پر گرما گرمی ہوئی تھی؟“ میں نے اس کیس کے ملزم اور اپنے موکل فرقان سے سوال کیا۔

”بات کوئی نئی نہیں تھی۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”میں اس شام بھی دو لاکھ کی رقم لینے ہی اس کی ایجنسی پر پہنچا تھا۔“

”پھر وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”میرے ہر روز کے تقاضے پر قاضی چڑ گیا تھا۔“ ملزم نے بتایا۔ ”اس نے خاصے غصے سے پوچھا کہ کیا مجھے اس پر بھروسا نہیں ہے......؟“

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا۔ ”قاضی صاحب! پچھلے پندرہ بیس دن میں آپ نے جتنے بیانات بدلے ہیں ان کی روشنی میں مجھے آپ پر واقعی بالکل بھروسا نہیں ہے۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”فرقان صاحب! میں آپ کو اپنا بیٹا سمجھ رہا ہوں اور ہر موقع پر آپ کی خوشی اور فائدے کا خیال رکھا ورنہ آج کل کے غدار زمانے میں کون کسی کو چھت پر...... اپنے مکان کی چھت پر تعمیرات کی اجازت دیتا ہے۔ یہ میرا ہی جگرا اور ظرف تھا کہ میں نے چاہا کہ آپ کا بھی اپنا ذاتی گھر ہوجائے لیکن آپ نے کبھی دل سے میرے ایثار اور محبت کو محسوس کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میں تو اب بھی آپ ہی کے فائدے کے لیے کوشاں ہوں۔ آپ نے میرے گھر میں ایک لاکھ روپے لگائے اور میں آپ کو دو لاکھ دلوانا چاہتا ہوں لیکن اگر پارٹی کی طرف سے کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے......!“

”قاضی صاحب!“ میں نے اس کی جذباتی تقریر کے جواب میں سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے آج تک مجھ پر جتنے احسانات کیے ان کے لیے میں تہ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب میں آپ کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا۔ آپ دو لاکھ کی کہانی کو ختم کردیں۔ مجھے میرے ایک لاکھ ہی لوٹا دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔“

”یعنی آپ ایک لاکھ کے منافع کو پاؤں کی ٹھوکر میں اڑا رہے ہیں؟“ اس نے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی سمجھ لیں قاضی صاحب!“ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”میں ناسمجھ اور کم عقل ہوں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں الّو کا پٹھا ہوں جو جانتے بوجھتے اپنا ایک لاکھ روپے کا نقصان کر رہا ہوں۔ آپ میرے ایک لاکھ واپس کردیں۔ میں منافع والے ایک لاکھ کو حسین خواب سمجھ کر بھول جاؤں گا۔“

”اوہ......!“ قاضی نے میرے اس کلیئر کٹ جواب پر بڑے افسوسناک انداز میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”جب آپ نے حتمی فیصلہ کرلیا ہے تو پھر میں کیا کرسکتا ہوں۔“

”آپ یہ کرسکتے ہیں کہ میرے ایک لاکھ روپے واپس کردیں۔“ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

”اس کے لیے آپ کو ایک دن انتظار کرنا ہوگا۔“ وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ”آپ کل شام میں میرے گھر آجائیں اور اپنے ایک لاکھ روپے مجھ سے لے جائیں۔“

”جب دینا ہی ہیں تو کل شام کیوں۔“ میں نے اس کی نیت کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ ابھی ادائیگی کرکے اس باب کو بند کردیں۔“

”اگر اس وقت رقم میرے پاس موجود ہوتی تو میں ابھی نکال کر آپ کو دے دیتا۔“ وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ”کل دن میں کسی وقت پارٹی مجھے ایک لاکھ روپے ادا کرے گی اور مکان کا سیل ایگریمنٹ بنے گا۔ آپ کل شام میں میرے گھر آکر ایک لاکھ روپے لے جائیں۔“

قاضی نے مکان کے سیل ایگریمنٹ کا ذکر کرکے ایک بار پھر مجھے لالچ میں لانے کی کوشش کی تھی لیکن میں اب اس کے کسی فریب میں آنے والا نہیں تھا لہٰذا میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا اور مضبوط لہجے میں پوچھا۔

”قاضی صاحب! میں کل شام میں کتنے بجے آپ کے پاس حاضر ہوجاؤں؟“

”ٹھیک آٹھ بجے!“ وہ قطعی لہجے میں بولا۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

”لیکن یہ تو آپ کا ایجنسی کا وقت ہے۔“ میں نے متذبذب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا آپ کل شام آٹھ بجے مجھے اپنے گھر پر مل سکیں گے؟“

”جب کہہ دیا ملوں گا تو ملوں گا۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”آپ خواہ مخواہ وکیلوں کی طرح مجھ سے جرح نہ کریں۔“

میں اس کی ایجنسی سے اٹھا اور اپنی سسرال چلا گیا۔

ملزم نے دکھ بھری مگر دلچسپ کہانی کو ایک کنارے تک پہنچایا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”پھر پندرہ اکتوبر کی شام ٹھیک آٹھ بجے جب تم قاضی وحید کے گھر پہنچے تو کیا اس نے تمہیں ایک لاکھ روپے ادا کر دیے تھے؟“

”نہیں جناب!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”پیسے تو اس وقت ملتے جب قاضی ہاتھ لگتا......!“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے خاصی تیز آواز میں استفسار کیا۔

”جناب! پندرہ اکتوبر کی شام جب میں ٹھیک آٹھ بجے قاضی کے گھر پہنچا تو وہ مجھے ملا نہیں۔“ ملزم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”میں نے تین چار مرتبہ اطلاعی گھنٹی بجائی لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ میں نے دروازے پر دستک بھی دی اور دو چار بار قاضی کو پکارا بھی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر اندرونی نقل و حرکت کو محسوس کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اندر کی خاموشی اور سناٹا یہی بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں۔ مایوس ہو کر میں وہاں سے واپس آ گیا۔“

”جب تم قاضی کے گھر کی گھنٹی بجا رہے تھے یا دروازے پر دستک دے رہے تھے یا جب تم نے قاضی کو پکار کر دروازے تک لانے کی کوشش کی تو کسی نے تمہیں یہ کام کرتے ہوئے دیکھا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”یا واپسی پر تمہاری کسی سے بات ہوئی تھی؟“

”نہیں جناب! میری کسی سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اور جہاں تک کسی کے دیکھنے کا تعلق ہے تو یہ ممکن نہیں۔ قاضی کے گھر کا دروازہ ایسے زاویے پر پڑتا ہے کہ گلی میں گزرنے والوں کی نظر سے محفوظ رہتا ہے۔ سمجھیں کہ ایک اوٹ سی بنی ہوئی ہے۔“

”اوکے......“ میں نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”قاضی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد تم اپنی سسرال چلے گئے تھے؟“

”سسرال تو چلا گیا تھا مگر قاضی کی ایجنسی کو چیک کرنے کے بعد“ اس نے جواب دیا۔ ”ایجنسی پر تالا پڑا دیکھ کر میری مایوسی اور گہری ہو گئی تھی۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ دونوں میاں بیوی اچانک کہاں غائب ہو گئے ہیں لیکن میرا ذہن اس سوال کا جواب تلاش نہ کر سکا۔ میں نے گھر پہنچ کر عظمیٰ کو صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد انکل علی مراد گھر آئے تو یہ معاملہ میں نے من و عن ان کے بھی گوش گزار کر دیا۔ انہوں نے پوری توجہ اور سنجیدگی سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر کہا...... مجھے قاضی کے خلاف پہلی فرصت میں تھانے جا کر فراڈ کی رپورٹ درج کرا دینا چاہیے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ صبح میرے ساتھ تھانے جائیں گے مگر صبح سے پہلے ہی یعنی پندرہ اکتوبر کی رات گیارہ بجے مجھے نگہت کے قتل اور ایک لاکھ روپے کی چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔“

میں نے ملزم کو فارغ کیا اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی......!“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!“

☆☆☆

آئندہ دو ماہ میں تین پیشیاں ہوئیں اور ان میں استغاثہ کی طرف سے پانچ گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا جن کا تعلق اسی علاقے سے تھا جہاں قاضی وحید کا گھر واقع تھا۔ ان گواہوں پر میں نے خاطر خواہ جرح نہیں کی اور ان کے بیانات میں بھی ایسی کوئی خاص بات موجود نہیں تھی کہ جس کے لیے سسپنس ڈائجسٹ کے قیمتی صفحات کو قربان کیا جائے۔ مختصراً آپ اتنا جان لیں کہ استغاثہ نے ان گواہوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انہوں نے وقوعہ کی شام ملزم کو قاضی کے گھر کے آس پاس دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جس سے میرا موکل بھی انکاری نہیں تھا۔

آئندہ پیشی سے پہلے ملزم کے سسر علی مراد نے مجھ سے دو ملاقاتیں کیں۔ اس سے قبل بھی وہ گاہے بگاہے مجھ سے ملتا رہتا تھا۔ میں نے اس کے ذمے جو کام لگایا تھا وہ اس نے مرحلہ وار مکمل کر دیا تھا جس کی بنا پر زیر سماعت کیس پر میری گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔

اسی دوران میں ایک بار علی مراد اپنے حیدر آباد والے داماد کے ساتھ بھی میرے دفتر آیا تھا۔ نادیہ کا شوہر اور علی مراد کا بڑا داماد شاہد خٹک حیدر آباد میں کاروں کی





خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ وہ خاصا دبنگ آدمی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”وکیل صاحب! فرقان کو ہر قیمت پر باعزت بری ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے جتنا بھی پیسا خرچ ہو، پروا نہیں ہے۔“

”خان صاحب! آپ بالکل مطمئن رہیں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”آپ کا ہم زلف ان شاء اللہ! بہت جلد آزاد فضا میں سانس لے رہا ہوگا۔“

”وکالت آپ کا شعبہ ہے......!“ وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ کام آپ کریں۔ دوسرا کام میں خود کر لوں گا۔“

”دوسرا کام......!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون سا دوسرا کام خان صاحب؟“

”قاضی سے اپنی رقم کی وصولی کا کام۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں اس سے ایک نہیں، پورے دو لاکھ نکلواؤں گا اور...... وہ بھی اپنے طریقے سے وکیل صاحب!“

وہ خاصے خطرناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھ لیا۔ ”خان صاحب! آپ کا اپنا طریقہ کون سا ہے؟“

شاہد خٹک، فرقان کی بہ نسبت خاصا تیز طرار، پُرجوش اور چلتا پرزہ قسم کا شخص ثابت ہو رہا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

”وکیل صاحب! میرے جاننے والوں میں بڑے کام کے لوگ ہیں۔ قاضی کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میرے آدمی اسے علاقہ غیر میں پہنچا دیں گے۔ دو لاکھ کیا، یہ چار لاکھ دے کر اور قدموں میں گر کر جان چھڑائے گا۔“

”اتنی زیادہ مہم جوئی اور تکلیف کی ضرورت نہیں ہے خان صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس کیس کو کچھ ایسے انداز میں لے کر چل رہا ہوں کہ فرقان کی بے گناہی ثابت ہونے کے ساتھ ہی قاضی کا فراڈ بھی کھل کر سامنے آ جائے تاکہ باعزت رہائی کے ساتھ ہی اس کی ایک لاکھ کی رقم بھی واپس مل جائے۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“ وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ”اگر آپ اس معاملے کو عدالت میں نمٹا سکتے ہیں تو بڑی اچھی بات ہے ورنہ آپ مجھے اشارہ کر دیجیے گا۔ میں سنبھال لوں گا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ”آپ کو کسی قسم کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی اور......“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور جب تک میں آپ کو کسی قسم کا اشارہ نہ دوں، آپ کوئی بھی اچھا یا برا قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ بات میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کی کوئی بھی حرکت اس کیس کو خراب کر دے گی۔“

”ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ کا جو حکم ہوگا، میں ویسا ہی کروں گا۔ میں کوئی پاگل تو نہیں کہ آپ کا کیس خراب کر دوں......“

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”شاہد خٹک! تمہارے عزائم تو پاگلوں والے ہی ہیں......“ پھر زبان سے کہا۔ ”بہت شکریہ خان صاحب۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں اس کیس کا مدعی یعنی قاضی وحید استغاثہ کے سب سے اہم گواہ کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ یہ کم و بیش وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو بھی دے چکا تھا۔ استغاثہ کی عمارت اسی بیان کے مندرجات پر کھڑی تھی۔

سردار پارٹی میں گیا اور لڑکی سے کہا۔ ”آپ ڈانس کریں گی؟“

لڑکی کھڑی ہو کر۔ ”جی ہاں۔“

سردار۔ ”تو باجی پھر یہ کرسی میں لے لوں؟“

❋❋❋

بیوی۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

شوہر۔ ”مکھیاں مار رہا ہوں۔“

بیوی۔ ”کتنی ماری؟“

شوہر۔ ”3 مادہ، 2 نر۔“

بیوی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا میل اور فیمیل کا؟“

شوہر۔ ”3 شیشے کے سامنے بیٹھی تھیں اور 2 گولڈ لیف کے پیکٹ پہ۔“

مرسلہ: رضوان تنولی کریزدی

اورنگی ٹاؤن، کراچی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ اپنا فرض نبھانے کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”قاضی صاحب! آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہیں گے؟“ بات ختم کرتے ہی اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

”خودغرض، احسان فراموش، کم ظرف......“ قاضی نے نفرت انگیز نگاہ سے ملزم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور خونی......میری بیوی کا قاتل!“

”قاضی صاحب!“ وکیل استغاثہ نے بڑی چالاکی سے جرح کو ایک خاص ڈگر پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”ملزم کا بیان بلکہ دعویٰ ہے کہ اس نے آپ کے گھر کی بالائی منزل کی تعمیر پر لگ بھگ ایک لاکھ روپے خرچ کیے جو اس نے اپنے بینک سے قرض لیے تھے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے؟“

”یہ بات درست ہے کہ ملزم نے اپنے بینک سے ایک لاکھ کا لون لیا تھا۔“ وہ ناپسندیدہ نظر سے فرقان کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”مگر اس نے اس رقم میں سے ایک روپیہ بھی میرے گھر کی تعمیر پر خرچ نہیں کیا۔ گھر کی بالائی منزل اور دیگر چھوٹی موٹی مرمت کا کام میں نے اپنی جیب سے کرایا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے، اس حوالے سے ملزم نے صریحاً غلط بیانی سے کام لیا ہے؟“ وکیل استغاثہ کے استفسار میں ایک خاص نوعیت کی کاٹ پائی جاتی تھی۔

”یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔“ قاضی نے بہ آوازِ بلند کہا۔

”کیا آپ ملزم کے جھوٹ کو ثابت کر سکتے ہیں؟“

”میرے پاس جو بھی ثبوت تھے وہ میں آپ کو فراہم کر چکا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”آپ میری بیوی کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے اس کیس کی پیروی کر رہے ہیں۔ ان ثبوتوں کو کس طرح کام میں لانا ہے، یہ تو آپ ہی کو پتا ہوگا......“

قاضی وحید نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ بال کو وکیل استغاثہ کی کورٹ میں پھینک دیا تھا اور میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ یہ ان دونوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ وکیل استغاثہ نے دانستہ ایسے زاویے سے جرح کا آغاز کیا تھا کہ جس پر ملزم کو بڑی سہولت کے ساتھ چت کیا جاسکتا تھا لیکن مجھے وکیل استغاثہ یا قاضی وحید کے طریقہ واردات سے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ان کے زہر کا توڑ کرنے کے لیے میرے پاس بڑا موثر قسم کا تریاق موجود تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی فائلوں میں سے چند کاغذات نکالے اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یور آنر! قاضی وحید نے اپنے گھر کے بالائی حصے کی تعمیر کا کام مارچ کے مہینے میں شروع کر دیا تھا تاہم یہ کام جون کے مہینے میں جا کر مکمل ہوا۔ اس سلسلے میں قاضی وحید نے سریا، سیمنٹ، ریت، بلاکس اور دیگر تعمیراتی سامان مارچ ہی میں خرید لیا تھا۔ یہ ساری رسیدیں بلڈنگ میٹریل کی خریداری کے حوالے سے ہیں اور قاضی وحید کے نام پر کاٹی گئی ہیں......“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یور آنر! انہی کاغذات میں ملزم کے بینک ریکارڈ کے حوالے سے بھی چند اہم دستاویزات کی نقول شامل ہیں جو ایک لاکھ بینک لون سے متعلق ہیں۔ مذکورہ بینک نے ان امور کی باقاعدہ تصدیق بھی کی ہے......“ اتنا کہہ کر وکیل استغاثہ نے وہ تمام کاغذات جج کی جانب بڑھا دیے۔

جج نے مذکورہ کاغذات کو اپنے سامنے میز پر پھیلا کر چند لمحات تک ان کا باریک بینی سے جائزہ لیا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

وکیل استغاثہ اپنے دلائل کو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب عالی! ملزم چار مئی کو ایک لاکھ کے بینک لون کے لیے اپلائی کرتا ہے۔ یہ لون اپروو ہونے میں کم و بیش دو ہفتے لگ جاتے ہیں۔ بینک ریکارڈ کے مطابق لون کی رقم یعنی ایک لاکھ روپے پچیس مئی کو ملزم کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پچیس مئی سے پہلے ملزم لون کی رقم کا ایک روپیہ بھی کسی قسم کے تعمیراتی کام پر خرچ کرنے کا مجاز نہیں تھا جبکہ قاضی وحید تعمیر کے حوالے سے تمام تر خریداری مارچ اور اپریل میں مکمل کر چکا تھا۔ تمام رسیدیں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں......“ وہ ایک مرتبہ پھر تھما پھر ڈرامائی انداز میں اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

”ملزم نے ایک لاکھ روپے کہاں خرچ کیے ہوں گے یہ بات خدا کو معلوم ہے یا پھر ملزم خود جانتا ہوگا مگر تمام تر حالات و واقعات اور ثبوتوں کی روشنی میں یہ واضح ہو چکا تھا کہ ملزم نے قاضی وحید کے گھر پر ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کیا لہٰذا اس کا دعویٰ جھوٹا اور مبنی بر سازش ہے......دیٹس آل یور آنر۔“

میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑی توجہ اور دلچسپی سے وکیل استغاثہ کی کارکردگی کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ جج نے وکیل



SCANNED BY PAKSOCIETY / FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

استغاثہ سے کہا۔
''وکیل صاحب! پلیز پروسیڈ......!''
وکیل استغاثہ دوبارہ اپنے گواہ قاضی وحید کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''قاضی صاحب! ملزم کا دعویٰ ہے کہ وقوعہ سے ایک دن پہلے یعنی چودہ اکتوبر کی شام آپ کی ایجنسی پر اس سے ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے پندرہ اکتوبر کی شام آٹھ بجے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور یقین دلایا تھا کہ آپ اسے ایک لاکھ روپے ادا کریں گے۔ یہ کیا قصہ ہے؟''
''آپ نے خود ہی اسے ''قصے'' کا نام دے کر میری مشکل آسان کردی ہے وکیل صاحب'' وہ مکارانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کہانی سراسر جھوٹ پر مبنی اور ملزم کے ذہن کی اختراع ہے۔ یہ اکثر میری ایجنسی پر چکر لگاتا تھا تاکہ میں اسے کرائے کا کوئی گھر دلا دوں۔ یہ جب میرے گھر میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا تو بہت خوش تھا کیونکہ یہاں سے اسے بینک آنے جانے میں بڑی آسانی تھی۔ وہ اب بھی اسی علاقے میں کرائے کا کوئی گھر تلاش کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان کبھی پیسے کا لین دین نہیں رہا لہٰذا اسے ایک لاکھ روپے دینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ......'' اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
''البتہ...... چودہ اکتوبر کی شام جب ملزم میری ایجنسی پر آیا بیٹھا تھا تو میں نے ایک لاکھ روپے کا ذکر ضرور کیا تھا۔ میں نے ملزم کو بتایا تھا کہ پارٹی نے ایک لاکھ روپے کی پیمنٹ کر کے سیل ایگریمنٹ بنوالیا ہے جس کے مطابق پارٹی ایک ماہ کے اندر باقی کے پانچ لاکھ ادا کر کے گھر کا قبضہ لے لے گی۔ اس دوران میں جائداد کی منتقلی کی دستاویزات بھی تیار ہو جائیں گی۔''
''یعنی آپ نے ملزم کو یہ بتا دیا تھا کہ آپ کے گھر میں ایک لاکھ کی رقم رکھی ہے......؟'' وکیل استغاثہ نے چالاکی سے استفسار کیا۔
''جی بالکل، ہمارے درمیان اسی قسم کی بات ہوئی تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''اور اس شیطان نے اگلے ہی روز میرے گھر پر دھاوا بول دیا۔ یہ بہ خوبی جانتا تھا کہ میں رات دس بجے تک ایجنسی بند کر کے گھر آتا ہوں لہٰذا اس نے واردات کے لیے ایسا وقت چنا جب میری بیوی گھر میں تنہا ہوتی تھی۔ نگہت کی دور کی نگاہ بہت کمزور ہے اور وہ بیمار بھی رہتی ہے...... بلکہ تھی! اس ذلیل

انسان نے نگہت کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے گھر سے ایک لاکھ روپے اڑا لیے اور جب نگہت نے مزاحمت کی کوشش کی تو اس بھیڑیے نے گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا...... یہ تو ایک اتفاق ہے کہ وقوعہ کی شام میں جلدی گھر آ گیا اور میں نے اسے اپنے گھر سے نکل کر تیزی سے ایک طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں تو یہی سمجھا تھا کہ اس کا کوئی چھوٹا موٹا سامان میرے گھر میں رہ گیا ہوگا جسے لینے یہ وہاں آیا ہوگا لیکن میں اپنے گھر کے اندر داخل ہوا اور نگہت کو بیڈروم میں مردہ حالت میں پڑے دیکھا تو...... تو......'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے بوجھل ہوگئی پھر وہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔
''سر...... ملزم کوئی انسان نہیں، ایک وحشی درندہ ہے۔ اسے جتنی بھی سخت سزا دی جائے وہ اس کے جرائم کی سنگینی کے آگے کچھ بھی نہیں ہوگی۔''
ان جذباتی لمحات کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے بھی اپنی جرح کے اختتام کا اعلان دیا۔ ''دیٹس آل یور آنر...... مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''
اپنی باری پر میں جج کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت تک استغاثہ کا معزز گواہ بڑی حد تک سنبھل چکا تھا۔ میں نے بالکل مختلف اور جداگانہ انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے قاضی وحید سے کہا۔
''قاضی صاحب! میں مشکل اور پیچیدہ سوالات پوچھ کر آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔ صرف چند سوالات...... لیکن بہت سوچ سمجھ کر ان کا جواب دینا ہوگا۔''
وہ خاموش نظر سے یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔
میں نے کہا۔ ''میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ ملزم نے آپ کے گھر کی تعمیر میں کوئی رقم لگائی یا نہیں۔ اس بات کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہوگا کہ ملزم نے بینک سے جو لون لیا وہ اس نے کہاں خرچ کیا اور نہ ہی ایسا کوئی قصہ چھیڑا جائے گا کہ برے وقت میں آپ نے کن کن مواقع پر ملزم کی مالی اور اخلاقی مدد کی اور کب کب ملزم نے احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا......''
''تو پھر آپ پوچھیں گے کیا؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
''چند اہم اور سادہ سے سوالات۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو آپ جوابات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہیں نا......؟''
وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''جی...... تیار ہوں۔''





''قاضی صاحب! کیا آپ واقعی اپنا مکان فروخت کرنا چاہتے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''کیا مطلب ہے آپ کا۔'' اس نے حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھا۔ ''اگر مجھے مکان بیچنا نہ ہوتا تو میں پارٹی سے ایک لاکھ روپے وصول کر کے سیل ایگریمنٹ پر دستخط کیوں کرتا؟''
''اس سیل ایگریمنٹ کی رو سے مذکورہ پارٹی نے ایک ماہ کے اندر آپ کو باقی پانچ لاکھ ادا کر کے مکان کا قبضہ لینا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب اس واقعے کو کئی ماہ کا عرصہ بیت گیا ہے۔ کیا آپ نے بقیہ رقم وصول کر کے مکان اس پارٹی کے حوالے کر دیا ہے؟''
''نہیں......'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں ابھی تک اپنے ہی مکان میں رہ رہا ہوں۔''
''ایگریمنٹ کے اصول و ضوابط کے مطابق، اگر مذکورہ پارٹی ایک ماہ کے اندر باقی پیمنٹ نہ کرتی تو اس کے ادا کردہ ایک لاکھ آپ کے ہو جاتے جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔'' میں نے قاضی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر آپ اس سیل ایگریمنٹ کی مخالفت کرتے جیسا کہ آپ نے کی...... تو آپ کو دگنا اس پارٹی کو ادا کرنے ہوتے۔ کیا آپ نے مکان کی فروخت کی ڈیل کو کینسل کرتے وقت مذکورہ پارٹی کو دو لاکھ روپے ادا کیے تھے؟''
''دنیا میں تمام انسان ملزم کی طرح مطلبی، فریبی اور بے حس نہیں ہوتے۔'' وہ میرے موکل پر گہری چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری بیوی کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار کر ایک لاکھ روپے کی رقم کو گھر سے چوری کر لیا گیا تھا۔ وہ پارٹی میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی لہٰذا مجھ پر ایگریمنٹ کے قواعد و ضوابط کا دباؤ ڈالنے کے بجائے انہوں نے کہا کہ اگر میں مکان فروخت نہ کرنا چاہوں تو اپنی سہولت سے چند دنوں میں ان کی رقم واپس کر دوں۔ میں نے پارٹی کا شکریہ ادا کیا اور ادھر ادھر سے ادھار پکڑ کر پارٹی کی رقم لوٹا دی۔ اس طرح یہ معاملہ سیٹل ہو گیا۔''
''اس قسم کے معاملات اتنی آسانی سے سیٹل نہیں ہوا کرتے قاضی صاحب!'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آپ نے اپنے گھر کی بالائی منزل کی تعمیر کے سلسلے میں خریدے گئے ایک ایک سامان کی رسیدیں عدالت میں پیش کر کے خود کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا، آپ اگر ایک لاکھ روپے کی اپنے گھر میں موجودگی کا بھی کوئی ثبوت فراہم کر دیتے۔''
''میں سمجھا نہیں......'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ کس قسم کے ثبوت کی فراہمی کی بات کر رہے ہیں؟''
''اس سیل ایگریمنٹ کی ایک نقل اگر عدالت کی خدمت میں پیش کر دی جاتی جو مکان کے چھ لاکھ میں فروخت کے سلسلے میں تیار کیا گیا تھا جس میں سے ایک لاکھ آپ نے ایڈوانس میں وصول کر لیے تھے تو...... کم از کم یہ تو ثابت ہو جاتا کہ وقوعہ کے روز آپ کے گھر میں ایک لاکھ کی رقم موجود تھی......؟''
''اگر عدالت کا حکم ہوگا تو میں اس ایگریمنٹ کی نقل مہیا کر دوں گا۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔
''اور اگر اس پارٹی کی گواہی مقصود ہوئی تو......؟''
''تو میں اس پارٹی کو بھی عدالت میں لا سکتا ہوں۔''
''اس کا مطلب ہے، آپ مذکورہ پارٹی کے سچے ٹھکانے سے اچھی طرح واقف ہیں؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔
''جی ہاں...... میں انہیں جانتا ہوں۔''
''کیا میں مذکورہ پارٹی کا نام اور ایڈریس جان سکتا ہوں؟''
''میں آپ کو کوئی بھی جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر عدالت مجھ سے کہے گی تو میں اس کے احکام کی ضرور تعمیل کروں گا۔''
''قاضی صاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس ایگریمنٹ کی نقل عدالت کو مہیا کر سکتے ہیں اور نہ ہی مذکورہ پارٹی کو عدالت میں پیش کر سکتے ہیں کیونکہ مکان کی فروخت ایک خوبصورت فرضی قصہ ہے، ملزم کو بے وقوف بنانے اور قتل کے مقدمے میں پھنسانے کے لیے آپ نے سازش کا ایک جال بُنا تھا جس کی حقیقت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔
''قاضی صاحب! آپ تو اس مکان کو بیچنے کے مجاز ہی نہیں ہیں پھر کہاں کی پارٹی اور کہاں کا سیل ایگریمنٹ......؟''
''یہ...... یہ......'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔
''آپ...... کیا کہہ...... رہے ہیں......؟''
''میں حقیقت بیان کر رہا ہوں قاضی صاحب!'' میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''آپ جس مکان میں رہ رہے ہیں اس کا اصل مالک کبیر وارثی نامی ایک شخص ہے۔ کبیر وارثی کی بدقسمتی کہ وہ آپ جیسے دھوکے باز شخص کا رشتے میں سالا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگتا ہے۔ کبیر وارثی نے یہ مکان اپنی بہن مقتولہ نگہت کو رہنے کے لیے دیا تھا۔ پھر اچانک کبیر وارثی کی موت واقع ہوگئی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

قاضی کے غبارے کی ہوا بڑی حد تک نکل چکی تھی۔ میرے انکشاف نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ تمام تر معلومات علی مراد کی کاوشوں کے نتیجے میں مجھ تک پہنچی تھیں۔ قاضی کی تیزی سے بدلتی ہوئی حالت جج اور عدالت میں موجود کسی بھی شخص سے پوشیدہ نہیں تھی تاہم آخری لمحات میں اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"وارثی نے اپنی موت سے قبل مکان اپنی بہن یعنی میری بیوی نگہت کے نام کردیا تھا......"

"اور آپ کی کوشش تھی کہ نگہت اپنی موت سے قبل وہ مکان آپ کے نام کردے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "جب بیوی کو رام کرنے کی آپ کی ساری کاوشیں ناکامیاب ہوگئیں تو آپ نے میرے موکل کو قربانی کا بکرا بنا کر بیوی کا پتا صاف کردیا......؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے صدائے احتجاج بلند کی۔ "ڈیفنس کونسل استغاثہ کے معزز گواہ پر الزام لگا کر سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

جج جو بڑی توجہ اور انہماک سے میری جرح سماعت کررہا تھا، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"بیگ صاحب! آپ استغاثہ کے اعتراض پر کیا کہیں گے؟"

"جناب عالی! فی الحال تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے استغاثہ کے معزز گواہ قاضی وحید پر جو سنگین الزام تراشی کی ہے اسے عدالت کے روبرو ثابت بھی کرکے دکھا سکتا ہوں۔"

"اوہ......!" جج نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "گویا آپ یہ ثابت کرنے کا دعویٰ کررہے ہیں کہ قاضی وحید نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے؟"

"آف کورس یور آنر!" میں نے اعتماد کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے یہ آواز بلند کیا۔

جج نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "پرمیشن گرانٹڈ......!"

"جناب عالی!" میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سنجیدہ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس کیس کا انکوائری آفیسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ جج کے حکم پر وہ وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔

میں تفتیشی افسر کے قریب پہنچا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آئی او صاحب! آپ نے پوسٹ مارٹم اور میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کا تو بڑی توجہ سے مطالعہ کیا ہوگا؟"

"یہ تو میرے فرض کا حصہ ہے وکیل صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں اس سلسلے میں غفلت کس طرح برت سکتا ہوں۔"

"جائے وقوعہ پر آپ نے جو مشیرنامہ تیار کیا تھا اس سلسلے میں بھی آپ نے یقیناً بہت احتیاط سے کام لیا ہوگا؟"

"جی......" اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

"آئی او صاحب!" میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میں انہی تین رپورٹس کے مندرجات میں سے بعض کو ہائی لائٹ کروں گا۔ آپ صرف "ہاں" یا "نہ" میں جواب دیں گے...... آر یو ریڈی؟"

"یس......!"

"مقتولہ نگہت کی موت پندرہ اکتوبر کی شام یا رات جو بھی کہہ لیں...... سات اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی؟"

"یس!" آئی او نے جواب دیا۔

"اسے گلا گھونٹ کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا؟"

"یس!"

"مقتولہ کی گردن پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملے تھے۔" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جس سے یہ طے کرلیا گیا کہ قتل کے وقت قاتل نے اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے؟"

آئی او کا جواب آیا "یس!"

"مقتولہ کی لاش کے طبی معائنے سے پتا چلا تھا کہ جس شخص نے بھی گلا گھونٹ کر مقتولہ نگہت کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں (رنگ فنگر + مڈل فنگر) میں بیوی انگوٹھیاں پہن رکھی تھی۔ انگلیوں کے مخصوص دباؤ کے ساتھ ہی مذکورہ انگوٹھیوں کا دباؤ اور اس دباؤ سے بننے والے نشانات مقتول کی گردن پر ڈھونڈ لیے گئے تھے؟"

"یس!"

انگوٹھیوں کے ذکر پر قاضی وحید نے بے ساختہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی یہ حرکت میری عقابی نگاہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ تاہم میں نے اسے محسوس نہ ہونے



ماہنامہ
# سرگزشت
کی ایک اور قابل فخر پیشکش
# خطانمبر
انسان خطا کا پتلا ہے غلطی ہماری سرشت میں داخل ہے
بڑے لوگوں کی چھوٹی اور چھوٹے آدمیوں کی ایسی بڑی غلطیاں
جنہوں نے تاریخ' وقت' زندگی اور حالات کا دھارا بدل دیا
دلوں کو چھو لینے والی سچ بیانیاں' دلچسپ قصے اور انوکھی
وارداتیں' ہر تحریر آپ کو حیرت زدہ کر دے گی
یہ ایک ایسا خاص شمارہ ہے جسے آپ مجلد کرا کر محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے
بہت جلد آپ تک پہنچ رہا ہے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرا لیں

www.paksociety.com
SCANNED BY PAKSOCIETY / FAMOUSURDUNOVELS

کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ میں نے بہ دستور انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آئی او صاحب! وقوعہ کی رات لگ بھگ گیارہ بجے جب آپ نے ملزم فرقان کو اس کی سسرال واقع بہادر آباد سے گرفتار کیا تو کیا اس کے دائیں ہاتھ کی رنگ فنگر اور مڈل فنگر میں آپ کو انگوٹھیاں نظر آئی تھیں؟“

”نو......!“ اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

میں ایک جھٹکے سے استغاثہ کے معزز گواہ قاضی وحید کی جانب مڑا اور قدرے درشت لہجے میں کہا۔ ”قاضی وحید! تمہاری انگوٹھیاں کہاں ہیں؟“

”مم...... میری انگوٹھیاں......“ اس نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو کبھی انگوٹھیاں پہنی ہی نہیں...... آپ...... کن انگوٹھیوں کا...... ذکر کر رہے ہیں......؟“

”وہ انگوٹھیاں جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے قبل تمہارے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں موجود تھیں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اور اس وقت بھی انگلیوں میں موجود تھیں جب تم نے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا......؟“

”آپ...... جھوٹ بول رہے ہیں......“ وہ بے حد بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بکواس کر رہے ہیں......!“

”قاضی! میں تمہارے جاننے والوں میں سے کم از کم دس ایسے افراد کو گواہی کے لیے عدالت میں لا سکتا ہوں جنہوں نے وقوعہ سے پہلے سال ہا سال تک تمہاری انگلیوں میں چاندی کی دو ہیوی انگوٹھیاں دیکھی ہوں جن میں سے ایک انگوٹھی میں پندرہ قیراط کا حسین فیروزہ اور دوسری انگوٹھی میں دس قیراط کا یمنی عقیق جڑا ہوا تھا۔“ میں اپنی ہی روانی میں بولتا چلا گیا۔ ”اور دس ایسے افراد کو عدالت تک لانا بھی میرے لیے چنداں مشکل نہیں جو سال ہا سال سے ملزم کے قریب رہے ہوں لیکن انہوں نے کبھی اس کی کسی انگلی میں کوئی بھی انگوٹھی نہ دیکھی ہو اور......“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا اور قاضی کے حوصلے کے تابوت میں آخری میخ بھی ٹھونک دی۔

”اور ان ملے جلے گواہی بردار افراد میں سے آٹھ دس تو اس وقت بھی باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے ہیں......“

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر قاضی وحید نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا۔ اس کے بدن کی مخصوص جنبش سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے شدید نوعیت کا چکر آ گیا ہو۔ یہ میرے اس کاری وار کا اثر تھا جو میں نے انگوٹھیوں کی شہادتوں کے حوالے سے اس پر کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ جھول کر کٹہرے کے فرش پر دھڑام سے گرا۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر میرے کڑے سوالات کے نتیجے میں قاضی وحید کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس نے قاضی کا مجرم ہونا ثابت کر دیا تھا۔ جب عدالت کے حکم پر اسے پولیس کے حوالے کیا گیا تو اس نے اقبال جرم ہی میں عافیت جانی۔

قاضی کی بیوی یعنی مقتولہ نگہت دل کی بہت اچھی عورت تھی۔ قاضی نے فرقان کے ساتھ جو ایک لاکھ کا فراڈ کیا تھا وہ اس پر سخت برہم تھی اور اس نے قاضی کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے فرقان کی رقم واپس نہ کی تو وہ اس کے خلاف اور فرقان کے حق میں گواہ بن جائے گی۔ قاضی پہلے ہی اپنی بیوی کی بیماری سے نالاں تھا اور اسے ٹھکانے لگانے کی ترکیبیں ڈھونڈتا رہتا تھا تاکہ مکان پر اس کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہو جائے۔ نگہت بڑی حد تک قاضی کی نیت کو سمجھتی تھی اور اپنی زندگی میں تو وہ کسی بھی قیمت پر مکان اس کے نام کرنے کو تیار نہ ہوتی لہٰذا قاضی نے فرقان کو قربانی کا بکرا بنا کر ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر اسے اپنے اس منصوبے پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے پندرہ اکتوبر کی شام آٹھ بجے فرقان کو اپنے گھر بلایا تاکہ جائے وقوعہ پر اس کی آمد رجسٹر ہو جائے۔ وہ فرقان کے آنے سے پہلے اپنی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور گھر کے اندر چھپا بیٹھا تھا۔ گھر کو اس نے لاک کر دیا تھا تاکہ فرقان کو یہی تاثر ملے کہ گھر کے اندر کوئی موجود نہیں اور وہ مایوس ہو کر واپس چلا جائے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قاضی کے اقرار جرم کے بعد عدالت نے میرے موکل فرقان کو باعزت بری کر دیا تھا۔

موچی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو جوتے گانٹھنے کا کام کرتا ہو اور دوسرا وہ جس کے دماغ میں موچ آ جائے۔ دماغ کی موچ والے موچی کو دنیا کی ہر شے ٹیڑھی نظر آتی ہے چاہے وہ اس کے اپنے گھر کا آنگن کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو ناچنے کا ڈھنگ نہ آتا ہو وہ بھی آنگن کو ٹیڑھا کہہ کر اپنی نالائقیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی وحید نے بھی ایک ایسی ہی بے ڈھنگی اور ٹیڑھی کوشش کی تھی اس لیے وہ بے آواز لاٹھی کی دھواں دھار ضرب سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکا اور عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا۔

(تحریر: حسام بٹ)



صبح چار اور پانچ کے درمیان باقر بھائی کو کراچی سینٹرل جیل میں پھانسی دی گئی اور صبح گیارہ بجے ان کی لاش گھر پہنچا دی گئی۔ ان کی گرفتاری سے مقدمہ تک، فیصلے سے اپیلوں تک اور پھانسی سے لاش گھر پہنچنے تک، مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے ای کی آنکھوں کو کبھی خشک دیکھا ہو۔ آنسو جھرنے کی طرح بہتے رہے تھے، باقر بھیا کی تدفین کے چھ دن کے اندر اندر ای کا بھی انتقال ہو گیا۔

جب لاش گھر پہنچی تو پہلی دفعہ مجھے ایسا لگا جیسے ای نے

# کوکھ کا دکھ

## ڈاکٹر شیر شاہ سیّد

دنیا میں محبت کا سب سے خوب صورت روپ ممتا کا ہے اور سب سے مضبوط احساس بھی یہی ہے... لیکن ممتا اگر دکھ بن جائے تو اس سے بڑا غم بھی کوئی نہیں... ممتا کی ماری وہ بھی ایک ان دیکھا عذاب جھیل رہی تھی کیونکہ اس کے لختِ جگر نے بھی ایک غار میں قید اتنے اذیت ناک لمحات گزارے تھے کہ وہ بے بس ماں تمام عمر بلکتی رہی۔

ایک خوب صورت احساس کی اذیتوں کا بے مثال قصہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

رونا بند کردیا ہے۔ آنسوؤں کے سوتے خشک ہوگئے ہیں۔

ایدھی کی ایمبولینس سے باقر بھیا کی لاش کو آہستہ آہستہ باہر نکالا گیا، چار پانچ مردوں نے اسٹریچر کو پکڑ کر اٹھایا اور اندر گھر میں پہلے سے تیار کیے ہوئے کمرے میں لاش کو تخت کے اوپر رکھ دیا گیا تھا۔

امی اپنے مڑے تڑے ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آئی تھیں اور کہا کہ غسل دینے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے سب لوگ کمرا خالی کردیں۔ میری ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ باقر بھیا کو پھانسی لگ جائے گی۔

انہوں نے آہستہ سے بھیا کے چہرے سے چادر ہٹائی، بھیا کے چہرے پر ایک بڑا سا پیدائشی نشان تھا، سرخ سا، جو دائیں گال کے اوپر سے شروع ہوکر کنپٹی تک پہنچا تھا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ اس پر ہاتھ پھیرا، ان کی پیشانی پر آنکھوں کا بوسہ دیا اور اس پیدائشی نشان کو تھوڑی دیر تک چومتی رہیں۔ بھیا نے امی کی سی ہوئی سفید قمیص پہنی ہوئی تھی۔ امی نے آہستہ سے قمیص کے بٹن کھولے، بالکل ویسا ہی نشان بھیا کی دائیں چھاتی پر تھا۔ گول سا پھیلا ہوا سرخ سا۔ امی نے آہستہ آہستہ اس پیدائشی نشان کو بھی چوما، آنکھوں سے لگایا، گالوں سے دبایا اور دوبارہ قمیص کے بٹن لگا کر چادر بھیا کے منہ پر ڈال دی۔

''غسال کو بلالو بیٹا، باقر کے جانے کا وقت ہے۔''

میں پھر ایک بار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی مگر امی کے چہرے پر ایک ویران سا اطمینان تھا۔

میں نے کمرا کھولا اور امی کے ساتھ باہر آکر بیٹھ گئی۔ ظہر کی نماز سے پہلے جنازہ تیار ہوگیا۔ ساجد بھائی بھی ایک ہفتے پہلے سعودی عرب سے کراچی آچکے تھے، وہ اور عامر دونوں گھر میں ہر قسم کے کاموں کو نمٹا رہے تھے، میں امی کے ساتھ بیٹھی ہوئی بچوں کو سپارے پڑھتی ہوئی، دانوں پر ورد کرتے ہوئے دیکھتی رہی، روتی رہی۔ امی کی آنکھیں خشک تھیں، ویران جیسے کوئی صحرا بیابان۔ ٹھیک ایک بجے گھر کے مرد کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے باقر بھیا کے جنازے کو گھر سے نکال کر قبرستان چلے گئے تھے۔

باقر بھیا سب سے بڑے تھے، ان کے بعد دو بھائی ساجد اور عامر اور پھر میں سب سے چھوٹی تھی گھر میں۔ باقر بھائی مجھ سے آٹھ سال بڑے تھے۔ میں چھ ماہ کی تھی کہ ابو کا انتقال ہوگیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بس کے ایکسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔ تیزی سے جاتی ہوئی، ریس کرتی ہوئی بس فٹ پاتھ سے ٹکرا گئی تھی، اس حادثے میں سات آدمی جاں بحق ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک میرے ابو بھی تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ امی نے کبھی ابو کے بارے میں مجھ سے کوئی بات کی ہو، وہ ابو کے ذکر پر ہمیشہ خاموش ہوجاتی تھیں۔ ساری باتیں تو مجھے خالہ جانی اور ماموؤں سے معلوم ہوئی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ابو کے مرنے کے فوراً بعد کرائے کا گھر خالی کرنا پڑگیا تھا اور امی ہم چار بچوں کے ساتھ خالہ جانی کے گھر آگئی تھیں۔ خالو اچھے آدمی تھے، مالدار تھے۔ انہوں نے خالہ جانی سے خود ہی کہا کہ وہ کفالت کریں گے ہم سب کی اور بہت ضد کرکے ہمیں اپنے گھر لے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ہم سب کو لکھا پڑھا کر اس قابل کردیں گے کہ زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہوسکیں۔ امی اور ان کے گھر والوں نے روایت کے مطابق چار بچوں کے ساتھ دوسری شادی کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔

پھر یہ ہوا کہ باقر بھیا کی شرارتوں سے خالہ خالو اور خالو کے گھر والے پریشان ہوکر رہ گئے۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ باقر بھیا کی شرارتوں سے زیادہ امی کی ان کے بارے میں غیر ضروری جانبداری تھی جس سے خالو پریشان ہوگئے تھے۔ وہ گھر کی چیزیں توڑ دیں، اسکول سے بھاگ آئیں، خالو کے پیسے چرالیں، خالہ کے زیور بیچ دیں، بچوں کو تنگ کریں۔ بڑوں سے بدتمیزی کریں مگر امی کا مطالبہ تھا کہ انہیں کچھ نہ کہا جائے، وہ لاڈلے تھے ان کے۔ میں نے امی کو ہمیشہ انہیں پروٹیکٹ کرتے ہوئے، ہمیشہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ان کی جائز ناجائز ہر بات کی حمایت کرتے ہوئے دیکھا۔ انہیں ان میں کوئی برائی، کوئی خامی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ انہوں نے جیسے اپنے دل و دماغ میں طے کرلیا تھا کہ باقر بھائی کبھی کچھ برا کر ہی نہیں سکتے تھے، ان کے لیے دنیا میں وہی سب کچھ تھے۔

ایک سال کے اندر ہی خالو نے گھر کے بڑوں کی میٹنگ بلالی اور پھر یہی فیصلہ ہوا کہ ہم سب خالو کے گھر سے ماموں جان کے گھر منتقل ہوجائیں۔

ماموں جان کو جوان بیوہ بہن کا بڑا درد تھا۔ وہ تو شروع دن سے ہی چاہتے تھے کہ ہم سب ان کے ساتھ رہیں مگر ابو کے انتقال کے فوراً بعد معاملات کچھ اس طرح سے ہوئے اور خالو جان نے کچھ اتنی بڑھ کر گرمجوشی دکھائی کہ وہ اس وقت کچھ کہہ نہیں سکے۔ پھر خالو جان زیادہ دولت کی حیثیت تھے اور خالہ جان کے بہنا پے کا دباؤ بھی تھا کہ امی نے ان کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

ماموں جان کے گھر میں حالات ذرا مختلف تھے۔ انہوں نے پہلے ہی سے فیصلہ کرلیا تھا کہ باقر بھیا کو کچھ نہیں کہیں گے۔ اپنی بہن کی فطرت کا انہیں اندازہ تھا۔ وہ باقر بھیا کے سلسلے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں۔ ماموں جان کی ساری توجہ اپنے بچوں، میرے دو بھائیوں اور مجھ پر رہی۔ ہم سب اسی ڈسپلن کے پابند کرائے گئے جو ان کے بچوں کے لیے بھی تھا۔ وقت پر کھانا، وقت پر سونا، وقت پر اسکول جانا اور وقت پر ٹیوشن پڑھنا۔ ماموں جان کے گھر میں کبھی احساس نہیں ہوا کہ ہم ان کے حقیقی بچے نہیں ہیں۔ ان کی ہی مدد، رہنمائی اور مستقل نظر تھی جس کی بدولت ساجد نے کمپیوٹر میں ڈگری لی۔ عامر انجینئرنگ کالج سے انجینئر بن کر نکلا اور میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد کالج میں پڑھا رہی تھی۔ ساجد بھائی کی سعودی عرب میں نوکری کے بعد ماموں جان کے گھر کے نزدیک ہی ہم لوگوں نے اپنا ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا، زندگی بہ ظاہر پُرسکون ہوگئی تھی۔

باقر بھیا نے بڑی مشکل سے دسویں کا امتحان نہ جانے کتنی دفعہ فیل ہونے کے بعد پاس کیا۔ اس کے بعد وہ کسی پریس میں ملازمت کرنے لگے۔ پریس کی نوکری چھوٹی تو وہ کسی اخبار میں کام کرتے رہے۔ ان ہی دنوں پتا لگا کہ امی نے اپنے زیورات بیچ کر باقر بھیا کو کچھ پیسے دیے ہیں کہ وہ بزنس کریں گے۔ بزنس بھی ان کا ناکام ہوگیا پھر وہ سول کورٹ میں ملازمت کرنے لگے تھے۔ باقر بھیا کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں ہیں، کب آتے ہیں، کب جاتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کتنا کماتے ہیں اور کہاں خرچ کرتے ہیں، ان کی دنیا اور تھی اور ہم لوگوں کی دنیا اور۔

ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کا سامنا ماموں جان سے کبھی نہ ہو اور اگر ہوتا بھی تھا تو وہ سر جھکائے ان کی باتیں سنتے تھے، نہ ہاں نہ ناں اور پھر کئی دنوں کے لیے غائب ہوجاتے تھے۔ امی ہمیشہ ان کا ساتھ دیتی تھیں۔ مجھے کبھی ایسا نہیں لگا کہ امی نے مجھے، ساجد کو، عامر کو ہمارے حصے کا پیار نہیں دیا ہو۔ وہ ہمیں بھی چاہتی تھیں، ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ ہر وہ کام کیا انہوں نے جو مائیں کرتی ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر ہمیں ناشتا دینا، ہمارے لیے راتوں کو پریشان ہونا، راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہمیں سردیوں میں چادر کمبل اڑھانا، ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہمارا ہوم ورک کرانا، ہمارے سر کے درد پر، معمولی بخار پر، چھوٹی سی چوٹ پر تڑپ تڑپ جانا۔ رات سونے سے پہلے وہ خاموشی سے ہمارے کمرے میں آتیں اور دھیرے دھیرے دعائیں پڑھ کر ہمارے اوپر پھونکتی تھیں۔ میں کبھی بھی امی کے پیار کا شمار نہیں کرسکوں گی۔ ممتا کی کوئی کمی نہیں تھی ان میں۔ لیکن کبھی کبھی احساس سا ہوتا تھا کہ انہیں باقر بھائی ہم سب سے زیادہ پیارے ہیں۔ ان کا کوئی خاص مقام تھا ان کے پاس، ان کے لیے ہمیں ڈانٹ بھی پڑتی، برا بھلا بھی کہا جاتا مگر مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے امی کو کبھی بھی باقر بھیا کے لیے کچھ بھی برا کہتے ہوئے سنا ہو یا خود کبھی انہیں کچھ کہا ہو، وہ ہمیشہ ان کی تعریف و توصیف ہی کرتی رہتی تھیں۔

مجھے یاد ہے ایک دن تو غصے میں، میں نے انہیں کہہ بھی دیا تھا، جب انہوں نے مجھے شام کو یونیورسٹی کے ایک فنکشن میں جانے سے منع کردیا تھا۔ ''ساری پابندیاں میرے لیے ہیں، میرے لیے، اور وہ جو آپ کے بیٹے ہیں باقر کب آئیں، کب جائیں، کچھ کریں، کچھ نہیں کریں کچھ نہیں کہتی ہیں انہیں آپ۔ ان کے لیے سب جائز ہے، ان کے لیے سب صحیح ہے۔''

کچھ نہیں کہا تھا انہوں نے۔ دیکھتی رہیں مجھے کھڑے کھڑے اور آنسوؤں سے ان کا چہرہ بھر گیا تھا، زار و قطار روتی رہیں اور اسی وقت نہ جانے کہاں سے باقر بھیا آگئے۔ انہوں نے سن لیا تھا یا پتا نہیں کیا بات تھی، اس دن پہلی دفعہ ان کے ساتھ میں باہر نکلی تھی۔ ٹیکسی کرکے مجھے وہ یونیورسٹی چھوڑ گئے اور جس وقت میں نے کہا تھا اسی وقت ٹیکسی پر آکر مجھے واپس بھی لے گئے تھے۔ اس دن یونیورسٹی کے فنکشن کا مزہ آگیا تھا اور ایک نئے باقر بھائی یکایک میری زندگی میں داخل ہوگئے، بغیر کسی دستک کے، کسی کواڑ کو کھولے بنا۔

مجھے امی کا وہ روہانسا چہرہ یاد ہے۔ دوسرے دن گلے لگ کر میں رودی تھی۔ ان کی ٹیڑھی میڑھی انگلیوں کو پکڑ کر، ان کے جھکے ہوئے بائیں شانے سے لگ کر میں کچھ کہہ نہیں سکی، پر وہ سمجھ گئی تھیں۔ مائیں سمجھ جاتی ہیں۔ میرے وجود کے ایک ایک انگ نے ان سے معافی مانگی تھی، میں نے پھر کبھی بھی ان سے باقر بھیا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

باقر بھیا بہت مہربان ہوگئے تھے مجھ پر۔ جب بھی آتے، کچھ نہ کچھ لے کر آتے میرے لیے، جتنے دن گھر میں رہتے مجھ سے باتیں کرتے میری سنتے، میری بنائی ہوئی چائے، میرا پکایا ہوا ناشتا، میرے ہاتھ کے بنے ہوئے پکوڑے، میری بنائی ہوئی فروٹ چاٹ، سب کچھ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پسند تھا ان کو۔ میرا خیال اس طرح سے کرتے جیسے میں کوئی شہزادی ہوں۔ مذاق میں بھی منہ سے جو نکل جاتا اسے پورا کرنے کے ہر جتن کر ڈالتے تھے وہ۔ شاید چھوٹی بہن اور ایک ہی بہن ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں میرے لیے خاص جگہ تھی۔ مجھے تو لگتا تھا صرف پیار ہی پیار بھرا ہوا ہے ان کے دل میں۔

دور پار کے رشتہ دار، محلے والے عجیب عجیب باتیں کرتے تھے ان کے بارے میں، کسی اسمگلر کے لیے کام کرتے ہیں وہ، پولیس انفارمر ہیں، کسی ایجنسی کے لیے کام کرتے ہیں۔ فوجیوں سے رابطے ہیں ان کے۔ اغوا اور تاوان کے دھندے میں ہیں غرضیکہ جتنی منہ اتنی باتیں مگر کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ امی کے سامنے ان کے خلاف کوئی بات کریں۔ بچپن سے جوانی تک امی نے انہیں صرف پروٹیکٹ کیا تھا، کبھی انہیں ڈانٹا نہیں، کبھی انہیں مارا نہیں، اتنی عجیب و غریب محبت تھی انہیں ان سے۔ گھر میں، خاندان میں، پاس پڑوس محلے میں ہر ایک آگاہ تھا اس بات سے۔

ساجد کی باقر بھیا سے بالکل نہیں بنتی تھی، شروع شروع میں تو دونوں لڑتے ہی رہتے تھے۔ امی ہمیشہ باقر بھیا کی طرف داری کر کے لڑائی ختم کراتی تھیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ ساجد بھائی کو باقر بھیا سے نفرت تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ ساجد بھائی باقر بھیا کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ساجد بھائی نے کوشش کر کے ڈگری ملتے ہی ملک چھوڑ دیا، پیسے کمانے لگے، پیسے کما کر واپس آئے اور گھر لیا اور ہم سب ماموں جان کی مدد سے اپنی چھت کے نیچے رہنے لگے۔ یہ گھر انہوں نے امی کے نام سے لیا تھا۔

عامر کا رویہ کوئی خاص نہیں تھا۔ وہ باقر بھیا سے بھی خوب گھل مل جاتا اور ساجد بھائی سے بھی اس کی دوستی بھائی کے رشتے سے آگے تھی۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ کبھی بھی امی سے باقر بھیا کے بارے میں بات نہیں کرتا تھا۔

پھر ایک دن یہ سب کچھ ہو گیا۔ باقر بھیا گھر پر ہی سو رہے تھے کہ رات تین بجے یکا یک گھر میں پولیس گھس آئی اور دس پندرہ منٹوں کے اندر باقر بھیا کو ہتھکڑیاں بھی لگ گئیں اور آناً فاناً وہ غائب بھی ہو گئے تھے۔

پھر سب کچھ بہت جلدی جلدی ہوا۔ اخباروں سے پتا لگا کہ اس رات دو اور لوگوں کو بھی گرفتار کیا گیا تھا۔ باقر بھیا سمیت ان تینوں پر قتل کا الزام تھا۔ خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا جہاں سزائے موت سنائی گئی، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ اور صدر پاکستان سے اپیل۔ بائیس مہینے قیامت کی طرح گزر گئے۔ امی کے آنسو کبھی رکے ہوئے نہیں دیکھے میں نے۔ ساجد بھائی نے روپے بھیجنے میں بھی دیر نہیں کی۔ جو بڑا وکیل ہو سکتا تھا کیا گیا۔ جس در پر کھٹکھٹانے کو کہا گیا امی اپنا دامن پھیلا کر کھڑی ہو گئیں، مگر کچھ نہیں ہو سکا۔

اس منحوس صبح میں باقر بھیا کو پھانسی دے دی گئی۔ آخری ملاقات میں امی کا چہرہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ باقر بھیا کے چہرے پر بڑی تلخ مسکراہٹ تھی، وہ خاموش بیٹھے رہے اور امی بنا پلک جھپکائے سارا وقت ساکت نظروں کے ساتھ انہیں تکتی رہیں۔ ملاقات کا وقت ختم ہونے پر ان کی پیشانی کو چوما، ان کے چہرے کے پیدائشی داغ کو ہونٹوں سے چھوا، اپنے مڑے تڑے ہاتھ ان کے چہرے پر پھیرتی رہیں پھر روتی ہوئی، کانپتی ہوئی، سسکتی ہوئی گھر آگئیں۔

باقر بھیا کو دفنانے کے بعد امی نے کچھ کھایا نہیں۔ روئیں نہیں، سوئیں نہیں۔ شروع میں ضد کر کے میں نے انہیں کچھ پانی پلایا تو الٹی ہو گئی، دوسرے دن ہی انہیں اسپتال میں داخل کرنا پڑ گیا۔ پانی اور طاقت کی شدید کمی تھی ان میں۔ اسپتال پہنچتے ہی انہیں گلوکوز اور نہ جانے کیا کیا چڑھایا گیا، دو دن تیزی سے گزر گئے۔ وہ ایک لاش کی طرح بستر پر پڑی ہوئی نہ جانے دور تک کیا دیکھنے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔ کسی سوچ میں گم، کسی امید کے بغیر انہوں نے زندگی سے ناتا شاید توڑ لیا تھا۔

اس دن میں ان کے سرہانے بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی، دھیرے دھیرے، دھیمے دھیمے انہوں نے بہت آہستہ سے کہا تھا کہ بہت درد ہے بیٹا، بہت درد ہے۔ کہاں کہاں دباؤ گی۔ سر کو، کاندھوں کو، ہاتھوں کو، انگلیوں کو، پیروں کو، ہر طرف درد ہے بیٹا ہر طرف درد ہے۔ جسم میں، بدن میں، ذہن میں، روح میں، روح کے اندر نہ جانے کہاں کہاں۔

"امی جہاں بولیں وہاں دباؤں گی مگر خدا کے لیے کچھ کھا تو لیں، پی تو لیں، ایسے کیسے ہوگا، امی ایسے کیسے ہوگا۔" میں نے ان سے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں بیٹے اب میں جاؤں گی یہ درد اب ختم نہیں ہوگا، درد سہنے والا چلا گیا تو میرا اب کیا کام ہے۔" انہوں نے پھر دھیرے سے کہا تھا۔

میں ان کی گردن اور ٹیڑھے سے دائیں کاندھے کو آہستہ آہستہ سہلاتی رہی، مگر درد ان کے چہرے پر بادل کی طرح چھایا ہوا تھا۔

پھر اچانک آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اٹھا کر انہوں نے میرے ہاتھ پکڑ لیے، زور سے دبایا پھر کہنے لگی تھیں۔ "بیٹی ایسے ہی خوبصورت ہاتھ تھے میرے، ایسے ہی نرم، لانبی، گداز، نرم نرم انگلیاں تھیں میری۔ میں یہ ٹیڑھے میڑھے مڑے تڑے ہاتھ اور انگلیاں لے کر نہیں آئی تھی دنیا میں۔ میرا یہ ٹوٹا ہوا کاندھا نہیں تھا۔ میں پوری کی سالم سر سے پیر تک۔ ثابت انگلیوں اور انگلیوں کے پوروں سے لے کر جسم کی ہر ہر ہڈی تک۔ میرا سر سالم تھا میرے کاندھے شانے سب سالم تھے۔ بیٹے میں تمہاری طرح تھی مکمل، خوبصورت اور حسین۔" جیسے انہوں نے سرگوشی کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد پھر بولنا شروع کر دیا۔

"بیٹا شادی کے پہلے ہفتے سے مجھے ستایا گیا بات بات پہ مارا گیا ہر جگہ پر، ہر جگہ درد ہے بیٹا ہر جگہ درد، کہاں کہاں دباؤ گی، کدھر کدھر سہلاؤ گی۔" میں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"باقر میرا پہلا بچہ تھا۔ تم نے پوچھا تھا ناں ایک دن میں کیوں اس کی طرف داری کرتی ہوں، اسے کچھ نہیں کہتی ہوں۔ سب کہتے ہیں میں جانبدار ہوں اس کی۔ اس کا کچھ برا نہیں لگتا مجھے۔ کیسے لگتا، کیسے لگتا۔ وہ میرا باقر پھولوں جیسا۔ اس کی حفاظت نہیں کی میں نے۔ ساجد کو بچایا، عامر کو بچایا، تمہیں بچایا اپنے شانوں پر چوٹ کھائی، اپنے بازوؤں کو سامنے کر دیا، اپنے ہاتھوں کو ڈھال بنا دیا، اپنی انگلیاں تڑوا ڈالیں، اپنے شانے چھلوا دیے، نہ جانے کیا کیا ٹوٹا مرا، میں کسی ڈاکٹر کے علاج کے بغیر تم تینوں کو بچاتی رہی لیکن اس نے تو مار کھائی پیدا ہونے سے پہلے میری کوکھ کے اندر، میرے جسم کے اندر، میں اسے بچا نہیں سکی۔" یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔ میں نے زور سے ان کے مڑے تڑے ہاتھوں کو دبایا، بھینچا اور آہستہ آہستہ انہیں کبھی چومتی رہی، کبھی سہلاتی رہی۔ اتنی بے قرار انگلیاں پہلی دفعہ محسوس کی تھیں میں نے۔

"بیٹا یہ جو باقر تھا میری کوکھ میں تو میرے شوہر نے کرکٹ کے بلے سے میرے پیٹ پر مارا تھا بالکل وہاں جہاں اس کا چہرہ تھا، چھاتی تھی، سر تھا، گردن تھی وہ پیدائش نشان مستقل درد دیتے ہوں گے میرے بچے کو۔ میں سارے حمل کے دوران میں پٹتی رہی۔ لاتوں سے، گھونسوں سے۔ کبھی پلنگ پر لٹا کر کبھی زمین پر گرا کر۔ نہ جانے کیوں حمل کی خبر کے بعد سے انہوں نے، میرے شوہر نے میری زندگی کو لہولہان کر کے رکھ دیا تھا۔ میں جوان تھی بالکل کسی کونپل کی طرح سادہ، تمہاری طرح معصوم، کچھ کر نہ سکی، کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ مجھے مارتا رہا اور ساتھ ساتھ میری کوکھ کے اندر باقر بھی پٹتا رہا، چوٹ کھاتا رہا، شاید روتا بھی ہوگا مگر میں ناکام ہو گئی اسے بچانے میں۔ اپنی کوکھ میں حفاظت نہیں کر سکی اس کی۔ وہ درد لیے لیے گھومتا رہا کبھی گھر میں، کبھی گھر کے باہر، یہاں تک کہ پھانسی پر چڑھ گیا میرا لعل۔ اس کے بعد پھر میں بیوی نہیں تھی رکھیل تھی، میری پامالی ہوتی رہی۔ پر میں نے سب کچھ اپنے پر سہا، تم تینوں کو بچاتی رہی اس سے۔ کوکھ سے گود تک اور گود سے گھر تک اپنے ہاتھوں کو ڈھال بنا کر، اپنے جسم کو پامال کر کے، روز روز اس کے مرنے کی دعائیں کرتی رہی اور میرا باقر درد کے داغ لیے درد اٹھاتا رہا۔ درد سہتا رہا، اپنے زخمی جسم کے ایک ایک انگ سے اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو جھیلتا رہا۔ اب وہ نہیں ہے، صرف درد ہے، بیٹا بہت درد ہے۔"

میں اپنا سر ان کی چھاتیوں پر رکھ کر بے قرار ہو کر رو دی۔ مجھے پہلی دفعہ پتا لگا کہ میری ماں کی انگلیاں ٹیڑھی کیوں ہیں۔ ان کے کاندھے ڈھلے ہوئے ہیں، کیونکہ انہیں میرے باپ نے تشدد کر کے توڑا تھا پھر وہ صحیح طریقے سے جڑے ہی نہیں، ہماری پھول جیسی ماں کو کچلا گیا، توڑا گیا، مروڑا گیا، میرے باپ کا ہر ظلم وہ سہتی رہیں، اپنے جسم کو قربان کر کے ہمیں بچاتی رہیں۔ حفاظت کی ہماری۔ کوکھ کے اندر بھی کوکھ سے باہر بھی۔ وہ شخص جو ہمارا باپ تھا وہ میری ماں پر جسمانی تشدد کرتا رہا۔ انہوں نے ڈھال بن کر ہمیں بچایا اور اپنا سب کچھ تڑوا بیٹھیں۔ اگلے تین دن میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور ایک صبح وہ خاموشی سے ہمیں چھوڑ گئیں، باقر بھیا کا، ہمارا اپنا درد لیے، ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔

اب امی کو گئے ہوئے سال ہونے کو آ گیا ہے، ابھی بھی کبھی کبھی رات گئے خواب میں وہ مجھے نظر آتی ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں دیوار سے لگی ہوئی اپنے ہاتھوں، بازوؤں، شانوں پر ڈنڈے کھاتی ہوئی اپنی انگلیوں، ہتھیلیوں سے انہیں روکتی ہوئی، اپنی کوکھ میں موجود مجھے بچاتی ہوئی، ڈھال بن کر شانے تڑا کر، انگلیاں بکھری ہوئی، خون میں نہائی ہوئی۔ میں جاگ جاتی ہوں، ماں، میری ماں کتنے دکھ اٹھائے تو نے!





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

# محفلِ شعروسخن

❊ جنید احمد ملک ...... گلستان جوہر، کراچی
کوئی ہنر، کوئی روش، کوئی طریقہ تو بتاؤ
کہ دل بھی نہ ٹوٹے، وہ بھی نہ ملے اور چین آجائے

❊ زوہیب احمد خان ...... ناظم آباد، کراچی
بے جواب کیا کرتے رازِ دل بتاتے کیا
کہانی مختصر سی تھی سناتے کیا چھپاتے کیا
بستی جل کے راکھ ہوئی کچھ تدبیر نہ کی ہم نے
درد کے سوا کیا تھا جلاتے کیا بچاتے کیا

❊ محمد اشفاق سیال ...... شورکوٹ سٹی
جو بے نیاز ہیں خود اپنے حسن سے محسن
کہاں وہ مجھ سے میرا انتخاب پوچھتے ہیں

❊ ڈاکٹر ناہید شیخ ...... سرگودھا
کیسی لذت تھی تیری چاہت میں
روگ دل کو لگا لیا میں نے
اتنی قسمت خراب تھی اپنی
اپنا سب کچھ لٹا لیا میں نے

❊ اظہر حسین بچار ...... ہزاروی، چونکی
مخصوص دلوں پہ عشق کے الہام ہوتے ہیں
محبت معجزہ ہے معجزے کب عام ہوتے ہیں

❊ محمد اسلم ...... تحصیل وضلع خانیوال
لوگ بھوکے ہوں تو عقدہ کھلے
کون کتنا صاحبِ کردار ہے

❊ محمد جاوید عباسی ...... نیوسینٹرل جیل ملتان
شب بھر تنہائی میں قیامت سی ٹوٹتی ہے مجھ پر
اپنی یاد سے کہہ دو صنم مجھے آکے ستایا نہ کرے

❊ محمد صفدر معاویہ ...... خانیوال
ہمارے بس میں اگر ہوتا
تو کب کے گھروں کو لوٹ گئے ہوتے
کوئی تو چراغ جلتا ہمارے نام پر
کسی زباں پر ہمارے بھی تذکرے ہوتے

❊ محمد امجد ریاض ...... اقبال نگر تحصیل چیچہ وطنی
ملوثِ روز مجھ سے لوگ چاہے جو بھی مطلب لیں
یہاں محفوظ تہمت سے نہ مریم ہے نہ یوسف ہے

❊ محمد زمان ...... محکمہ فشریز پیرووال
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیر کے دیکھا تو اک قطرۂ خوں نکلا

❊ ایم فیصل ربانی ...... سرگودھا
اب نہ مجھ پہ تیری الفت کا چلے گا جادو
میں تیرے پیار کے انداز کو اب جان گیا ہوں
اب تیرے جال میں صیاد میں آؤں کیسے
میں تیرے دامِ زمیں رنگ کو پہچان گیا ہوں

❊ محمد عقیل چٹھہ ...... حافظ آباد
میں تہی دست نہ تھا حشر کے میداں میں قتیل
چند اشکوں کا میرے پاس اثاثہ بھی تھا



❊ ادریس احمد خان ...... ناظم آباد، کراچی
آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

❊ تبسم فاطمہ ...... راولپنڈی
گزرا وقت اور بہتا دریا لوٹ کے پھر نہ آئے گا
نقش پا کیوں تکتے ہو، یہ ہوا چلی مٹ جائے گا
کچے رنگ سے کب تک اپنے دل پہ لکھو گے پیار کے گیت
دھوپ پڑے گی جب کاغذ پر تو سادہ رہ جائے گا

❊ طالب حسین طلحہ ...... نیوسینٹرل جیل ملتان
ہم اپنے زخم دکھاتے کیسے زمانے میں
کسی نے قصۂ غم شوق سے سنا ہی نہیں
ملے جو اشک تو ہم پی گئے خاموشی سے
ہمارا درد نمایاں کبھی ہوا ہی نہیں

❊ ایم رشید سیال ...... روہڑی ضلع سکھر
چشم پُرنم خرید سکتا ہوں زلفِ برہم خرید سکتا ہوں
میری خوشیاں گر بک جائیں تیرے سارے غم خرید سکتا ہوں

❊ راجہ ابرار خان ...... نیوسینٹرل جیل ملتان
چومیں گے رسن دار کو ہم مات کریں گے
ہم ہادیٔ دوراں ہیں عجب بات کریں گے
دیکھو گے مقتل کی طرف تم ہر روز پلٹ کر
ہم جانبِ منزل ہیں فتوحات کریں گے

❊ محمد ممتاز ...... سرگودھا
ملے ہیں زخم زمانے میں اس قدر ہم کو
اداس اتنے ہوئے مرہموں کو بھول گئے
بہت قریب سے گزرے ہیں دشت کے جھونکے
ہوائے صبح کی ہم لذتوں کو بھول گئے

❊ متین سلطان ...... کراچی
اسے یہ کون بتائے، اسے یہ کون سمجھائے
بہت خاموش رہنے سے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں

❊ رضوان تنولی کریڑوی ...... اورنگی ٹاؤن، کراچی
مجھ کو معلوم نہیں انسان کی تعریف مگر
میری نظروں میں وہی اچھا ہے جو آپ جیسا ہو

❊ ریاض بٹ ...... حسن ابدال
پھولوں کی طرح چاک گریباں ہی رہے ہم
ہمکا نہ ہم پہ کبھی پیار کی شبنم

❊ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر ...... نئی منڈی سکھیکی
بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کے کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا
اک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم جیسے وفاداروں کو خفا سوچ کے کرنا

❊ اعجاز احمد راحیل ...... ماہی، ساہیوال
بڑے درختوں کی شاخوں کا کیا بگڑ سکتا تھا
ہوا کا زور تو چڑیوں کے آشیاں تک تھا
مجھے زمین کے مسافر کیا شکست دیتے
مرا ضمیر بلندی میں آسمان تک تھا

❊ تفسیر عباس بابر ...... اوکاڑہ
نیند پوری نہ ہوئی خواب مکمل نہ ہوا
ادھورا ہی رہا وصل کا باب مکمل نہ ہوا
ہر شب بیتے رنگ سے مجھ پر ٹوٹا
تا عمر تیرے غم کا عذاب مکمل نہ ہوا

❊ ظفر عباس زیدی ...... بھوآنہ
دل نے اک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
تو نے ایک بات کہی لاکھ فسانے نکلے

❊ امتیاز شاہ ...... جیل سرگودھا
کتنا سادہ ہے وہ آداب سمجھتا ہی نہیں
مجھ سے ملنے کو گھر پہ بھی آجاتا ہے

❊ افتخار احمد ملک ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کسی پہ ترکِ تعلق کا بھید کھل نہ سکا
تیری نگاہ سے ہم یوں اتر گئے چپ چاپ

❊ حنا عروج ...... کورنگی، کراچی
تمہارے حسن کے جلوے نئے رنگوں میں ڈھالیں گے
ہمیں کچھ ہوش تو آئے تمہیں تصویر کرنے تک
ذرا میں بھی تو یہ دیکھوں، کہاں تک جاؤ گے آخر
بہت ہیں پستیاں حائل مری تحقیر کرنے تک

❊ مناظر علی گوندل ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہزاروں اسبابِ راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
قفس میں آہی جاتا ہے خیالِ آشیاں اکثر

❊ گڑیا ...... سرگودھا
اتنا تھا نازک دل میرا، تو نے ستم کیا کر دیا
خوشیاں تمام چھین لیں جی بھر کے درد بھر دیا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

❁ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
اب خاک اڑ رہی ہے گلابوں کے شہر میں
وہ لُو چلی ہے اب کے سے پتھر جھلس گئے

❁ اشوک کمار..... میرپورخاص
اچھے ہوتے ہیں یہ بُرے لوگ
اچھا ہونے کا دکھاوا تو نہیں کرتے

❁ عاصم اقبال جسپال..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اس کی محبت بھی کرایے کے گھر کی طرح ہے
جتنا بھی سجایا لیکن میرا نہ ہوا

❁ عرفان احمد عاجز..... آرہ، چوآسیدن شاہ
یہ آنسوؤں کی زکوٰۃ مجھ پہ ہی فرض کیوں؟
تجھ پہ تو وہ بھی ادا کرے محبت لے بھی تھی

❁ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
پہلے عشق پھر اس میں شرک پھر مجھ سے بیزاری
بڑی ترتیب سے اک شخص نے توڑا ہے مجھے

❁ سلیم کامریڈ..... کھاناں
کتاب ماضی کبھی جو کھولو تو بتانا
کیا یاد کرنے کے دعوے صرف میرے ہی تھے؟

❁ امتیاز علی اللہ..... سرگودھا
بھول جانے کی ایک حد ہوتی ہے نا!
اس حد کو چھو رہے ہو تم

❁ محمد اشرف تبسم..... بحریہ ٹاؤن، پنڈی
ہزاروں عیب دیکھتے ہیں دوسروں کی ذات میں
اپنے کردار میں ہم فرشتے ہوں جیسے

❁ البیلی..... کراچی
خوشبو جیسے لوگ ہیں ہم
بکھرے بکھرے رہتے ہیں

❁ سوہاجی..... لاہور
جب کبھی تم ٹوٹ کر بکھرو تو بتانا ہم کو
ہم تمہیں ریت کے ذروں سے بھی چن سکتے ہیں

❁ مہرین ناز ڈوگر..... حیدرآباد
کاتب تقدیر سے کیا شکوہ لے دل ناداں
جب ہر شے نے مٹ جانا ہے تو پھر یہ خواہش کیسی

❁ محمد لطیف ساحل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
مدت ہوئی ترستے نہ دیکھا کچھ پیاروں کا
یاالٰہی کب ہوگا یہ مقدر ہم گناہ گاروں کا

❁ عون عباس بابر..... اوکاڑہ
تیری باتیں تیرے سوال کرتے ہیں
لوگ بھی ناں..... کمال کرتے ہیں

❁ راجہ افتخار علی افقی..... چوآسیدن شاہ
اس سے کہو کہ میری سزا کو کچھ کم کردے
میں عادی مجرم نہیں ہوں غلطی سے عشق ہوا تھا

❁ فرحان شیخ..... پاک کالونی، کراچی
کیا خوب تھا ان کا انداز قتل بھی.....
زہر دیا مجھ کو وہ بھی ہونٹوں پہ لگا کر

❁ ؟ ماہا ایمان..... حافظ آباد
اب یہ عالم ہے کہ تنہائی سے تنگ آکر
خود ہی دروازے کی زنجیر ہلا دیتے ہیں

❁ زاہد چودھری..... چھئور کینٹ
بھلا ہو ان خوابوں کا اے دوست
ہم تمہیں دیکھ تو لیتے ہیں.....

❁ ملک محمد رمضان ساہمل..... پشاور
روایت کے تقدس کا یہ پہلو ذہن میں رکھنا
کہ تحفہ چاہے ارزاں ہو لوٹایا نہیں کرتے

❁ محمد اکرام صدیقی..... اٹک سٹی
یہ انتہا ہے کرب کی میرے کہ اے عدم
اس کا وجود ہوکے بھی اس سے جدا ہوں میں

❁ عبدالغفور خان ساغری خٹک..... چھب ضلع اٹک
شکایت تو بس بدلتے ہوئے لہجوں سے ہے
ہوا پتے، موسم تو دل نہیں توڑا کرتے

کوپن
برائے
شمارہ
اگست
2014

محفلِ شعر و سخن

نام : ..................................................

پتا : ..................................................



مغربی دنیا میں جرائم کے نرالے انداز اور بچاؤ کی دلچسپ کہانی

بعض کانٹے دل میں اتنی خاموشی سے اتر جاتے ہیں کہ زخم تا عمر رستے رہتے ہیں لیکن ان کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا۔ وہ بھی نگاہوں میں خار بن کر رہ گیا تھا لہٰذا آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل والا معاملہ اس کے حق میں مفید تھا۔ اگر اس پر عمل کرنے میں لمحے بھر کی تاخیر کرتا تو تمام عمر تحقیر میں بسر کرتا۔

# فرار

تنویر ریاض

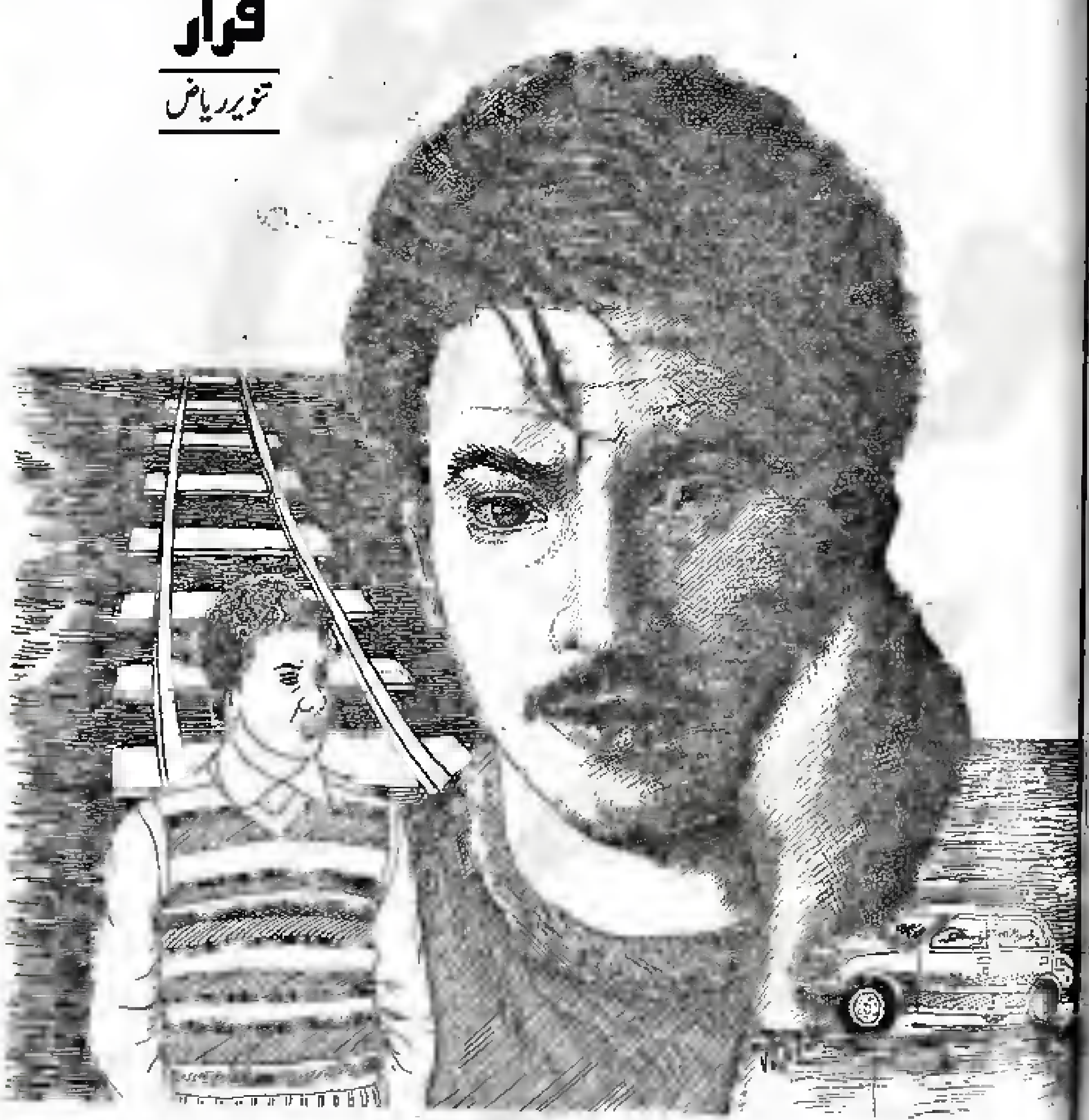

دادا کا کہنا تھا کہ بدھ کی شب جب وہ باہر کے ٹائلٹ میں گئے تو انہیں عقبی صحن میں ایک لاش نظر آئی جو باڑھ کے ساتھ مرغیوں کے ڈربے کے پاس پڑی ہوئی تھی کیونکہ دادا کے پاس ٹیلی فون کی سہولت نہ تھی۔ اس لیے وہ ڈیڈی کو اطلاع نہ دے سکے اور انہیں اس واقعہ کا علم تب ہوا جب وہ معمول کے مطابق ہفتہ کے روز خریداری کے لیے گئے۔ کیونکہ میرے دادا، دادی اتنے ضعیف ہوچکے تھے کہ وہ گھر سے باہر نہیں جاتے تھے بلکہ ان کی ضرورت کا سارا سامان

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈیڈی کو ہی پہنچانا ہوتا تھا۔

گو کہ اس واقعہ کو چالیس برس گزر چکے ہیں لیکن مجھے وہ دن آج بھی اچھی طرح یاد ہے جب ہم ڈیڈی کے ساتھ ان کے سالے کی گاڑی میں دادا کے گھر کی طرف جا رہے تھے جو ویسٹ ہیم گراؤنڈ کے بالمقابل رہائش پذیر تھے۔ ہم نے اپنے گھر کے قریبی اسٹور سے ہفتہ بھر کا سامان خریدا اور راستے میں ایک دکان پر رک کر گیس لیمپ میں استعمال ہونے والی جالیاں بھی خرید لیں کیونکہ دادا کے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ اس لیے گیس لیمپ سے ہی گزارہ ہو رہا تھا۔

راستے میں گاڑی خراب ہو گئی اور ہمیں سارا سامان اٹھا کر بقیہ راستہ پیدل طے کرنا پڑا۔ دروازے پر پہنچ کر ڈیڈی نے دروازے پر دستک دی اور پوری قوت سے آواز لگائی۔ ”مائیکل!“

دادا نے پورا مکان کرایہ پر نہیں لے رکھا تھا بلکہ وہ نچلی منزل پر رہتے تھے جبکہ اوپر کی منزل پر مائیکل کی رہائش تھی جس کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی لیکن باہر کے سارے کام وہی کرتا تھا اور کسی ملاقاتی کے آنے پر دروازہ بھی وہی کھولتا تھا۔ دادا کو اس سے بڑی ڈھارس تھی لیکن اسے پینے کی عادت تھی اور اکثر وہ ضرورت سے زیادہ پینے کے بعد مدہوش ہو جاتا تو توڑ پھوڑ کرنے لگتا۔ ایسی حالت میں اکثر اس کا کسی نہ کسی سے جھگڑا بھی ہو جاتا۔ بہرحال وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

دادا ہاتھ میں بیلچہ لیے ہوئے کھڑے تھے۔ کوئلے کی بوری سیڑھیوں کے نیچے رکھی ہوئی تھی اور وہ اس بیلچہ کی مدد سے آتش دان میں کوئلہ ڈال رہے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولے۔ ”باہر بہت سردی ہے؟“

ڈیڈی نے ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”راستے میں کار خراب ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ہارڈ ویئر کی دکان سے پیدل آ رہے ہیں۔“

دادا نے بیلچہ کی مدد سے آتش دان میں کوئلہ ڈالنا شروع کر دیا۔ مائیکل نے دروازہ میں جھانکا اور بولا۔ ”جارج، انہیں قتل کے بارے میں بتا دو۔“

”قتل!“ ڈیڈی کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ دادا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے لیکن ان کی توجہ کہیں اور تھی۔

”کوئی اجنبی شخص تھا۔“ مائیکل نے بتایا۔ ”تمہارے باپ کو اس کی لاش عقبی صحن میں ملی تھی۔“

ڈیڈی نے ایک بار پھر دادا کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔

”تمہاری بہنیں چاہتی تھیں کہ تمہیں پریشان کیا جائے۔“

”مجھے کیا پریشانی ہو سکتی تھی۔“ ڈیڈی نے منہ بناتے ہوئے کہا اور دادی سے ملنے چلے گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ دادی کچن میں برتن دھو رہی تھیں۔ مجھے یہ جگہ ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھی کیونکہ یہاں باہر سے آنے والی آوازوں کا شور نہیں سنائی دیتا تھا اور ایک عجیب سی پراسرار خاموشی چھائی رہتی، البتہ آتش دان میں کوئلوں کے چٹخنے اور گیس لیمپ کی شوں شوں ضرور سنائی دیتی۔

دادی نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ ان کی عمر ستر سے زیادہ اور اسی سے کم تھی جبکہ اب میری ماں کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی ہے لیکن وہ ٹی شرٹ اور جینز پہننا پسند کرتی ہے۔ دادی کے بال بہت لمبے اور پیروں تک آتے تھے جنہیں وہ پنوں سے باندھ کر رکھتی تھیں۔ وہ ڈیڈی سے دھیمے مگر ناراض لہجہ میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

میں مینٹل پیس پر لگی اپنے آباؤ اجداد کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت دادا بھی وہاں آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک تصویر نیچے زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دادا سے پوچھا۔

”یہ تصویر نیچے کیوں پڑی ہوئی ہے؟“

دادا نے دیوار کی طرف دیکھا اور ان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے آتش دان میں مزید کوئلہ ڈالا اور بولے۔ ”تمہاری دادی نے اس جگہ کی صفائی کی ہو گی تبھی یہ تصویر نیچے گر گئی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے وہ تصویر اٹھا لی۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ یہ دادا کے بھائی ہیر اللہ کی تصویر تھی جو عرصہ ہوا لڑائی میں مارا گیا تھا۔ وہ دادا کا اکلوتا بھائی تھا جو ملک کی خاطر لڑتے ہوئے جوانی میں ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

میں وہیں بیٹھ کر چائے اور ڈبل روٹی کا انتظار کرنے لگا جس سے دادی ہمیشہ ہماری خاطر تواضع کیا کرتی تھیں۔ دادا نے چائے کی کیتلی چولہے پر رکھ دی۔ میں ان سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ مائیکل صحن سے ملنے والی لاش کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا لیکن میری ہمت نہیں ہوئی، وہ بہت غصے والے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیا کرتے تھے لیکن میرے ذہن میں مائیکل کی کہی ہوئی بات جم کر رہ گئی تھی۔

دادی اور ڈیڈی معمول کے خلاف صحن میں تھے، شاید انہیں کوئی ضروری بات کرنا ہوگی جو وہ دادا کی موجودگی میں نہیں کر سکتے تھے۔ دادا مسکرا کر رہ گئے۔ میں نے ان



سے پوچھا کہ کیا میں اپنے کھلونوں سے کھیل سکتا ہوں۔ اس باکس میں بہت سارے کھلونے تھے جن سے میرے علاوہ دادا کے کئی نواسے نواسیاں، پوتے اور پوتیاں بھی کھیلا کرتے تھے۔ ان میں لکڑی کے بنے ہوئے اونٹ، مٹی کی بلیاں، پرانے زیورات کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، گڑیاں اور تصویروں کی دو البم شامل تھیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے یہ البم سب سے زیادہ پسند تھیں۔ ان میں بہت ساری بلیک اینڈ وائٹ تصاویر تھیں جن میں سے بیشتر پر انیسویں صدی کی تاریخیں درج تھیں۔ ان تصویروں میں خاندان کے بزرگوں نے عجیب و غریب لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے وہ کاسٹیوم بہت اچھے لگتے۔ ان البم میں کچھ ایسے نادر مقامات کی تصویریں بھی تھیں جہاں جانے کی ہم حسرت ہی کر سکتے تھے۔

میں ان کھلونوں میں اتنا مگن ہوا کہ مجھے کسی اور بات کا پتا ہی نہ چلا البتہ جب ہم گھر واپس آئے تو ممی نے ڈیڈی سے پوچھا۔ ”کیا پولیس اس شخص کے بارے میں جانتی ہے جس کی لاش تمہارے باپ کو صحن میں ملی تھی؟“

”معلوم نہیں۔“ ڈیڈی نے جواب دیا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہے ہوں۔

☆☆☆

اگلے ہفتے میں اور ڈیڈی معمول کے مطابق پھر دادا، دادی سے ملنے گئے۔ اس بار ہم نے کار سے سفر نہیں کیا کیونکہ پولیس اسے سڑک سے اٹھا کر لے گئی تھی اور انکل برائن ہی اسے واپس لا سکتے تھے۔ نومبر کا مہینا تھا اور سہ پہر سے ہی اندھیرا پھیلنا شروع ہو جاتا تھا۔ ہم جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، گیس لیمپ روشن ہو گیا۔ میں نے دادا کی طرف مسکرا کر دیکھا جو معمول کے مطابق آتش دان کے پاس کرسی ڈالے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ڈائننگ ٹیبل کے آخری سرے پر کھڑکی کے پاس ایک پولیس والا براجمان تھا۔ وہ ڈیڈی کی ہی عمر کا ہو گا۔ اس نے یونیفارم پہن رکھی تھی۔ دادی نے اس سے پوچھا۔

”تم یہ کہہ رہے ہو کہ اس کے خاندان کا کوئی فرد یہاں موجود نہیں ہے اور کوئی بھی اس کی لاش لینے نہیں آیا۔“

میں بے اختیار بول پڑا۔ ”کیا یہ اس شخص کی بات ہو رہی ہے جسے عقبی صحن میں قتل کر دیا گیا تھا۔“

وہ سب میری طرف دیکھنے لگے، کچھ دیر خاموشی رہی پھر پولیس والا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”یہ کچھ نہیں جانتا۔“ دادی نے ناگواری سے کہا۔ ”دراصل مائیکل نے اس کے سامنے قتل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اسے اپنا ہوش نہیں۔ ہر وقت نشے میں رہتا ہے اور معمولی بات کو بھی ڈرامائی انداز میں بیان کرتا ہے۔“

”اوہ...... اچھا میں اسے جانتا ہوں۔“ پولیس والے نے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صحن میں جس شخص کی لاش ملی تھی وہ طبعی موت مرا تھا۔ اسے کسی نے قتل نہیں کیا۔“

”اس کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے خدا نے اسے بلا لیا۔“ دادی نے کہا۔

میں ان کی باتوں سے اکتاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے کھلونوں کا باکس اٹھا کر کھیلنے بیٹھ گیا۔ میں نے تمام چیزیں میز پر پھیلا دیں اور البم دیکھنے لگا۔ میرے ایک جانب ڈیڈی اور دوسری جانب دادی بیٹھی ہوئی تھیں جبکہ پولیس والا میرے بالمقابل میز کی دوسری جانب براجمان تھا۔ دادی غور سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بھی انہیں مسکرا کر دیکھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا پھر اچانک ہی دادی نے وہ دونوں البم مجھ سے چھین کر ایک تھیلے میں رکھ دیے۔ میں نے رونا چاہا لیکن دادی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے آنسو روکنا پڑ گئے۔ وہ کافی غصے میں دکھائی دے رہی تھیں۔

کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ان سے اس بارے میں پوچھتا لیکن ڈیڈی کچھ ناراض دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے تھیلے میں سے البم نکالیں اور ان میں لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگے کیونکہ وہ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے انہیں معلوم تھا کہ جب دادی نے البم میرے ہاتھ سے لی تو میں کون سی تصویر دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والا بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سب بھی اسے گڈ بائی کہنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اس کے جانے کے بعد دادا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہے اور اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔

مجھے یاد ہے کہ پولیس والے کے جانے کے بعد وہ البم مجھے واپس مل گئی تھی لیکن میں کچھ بے چینی محسوس کر رہا تھا جس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ سکی لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ پولیس والے کے جانے کے بعد ڈیڈی اور دادی میں تلخ کلامی ہوئی تھی اور وہ کافی دیر تک سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے الجھتے رہے تھے۔

☆☆☆



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

دادا کا انتقال 1970ء میں تراسی برس کی عمر میں ہوا تھا۔ اس کے پانچ سال بعد دادی بھی 85 سال کی عمر میں چل بسیں۔ ان کا ساز و سامان ڈیڈی اور ان کے بھائیوں میں تقسیم ہوگیا۔ وہ دونوں البم بھی ڈیڈی کے حصہ میں آگئیں۔ میں بیس سال کی عمر کو پہنچنے تک کبھی کبھی وہ خاندانی تصاویر اور البم دیکھا کرتا تھا۔ پھر 1985ء میں یارک شائر چلا گیا تو وہ تصاویر بلکہ دادا، دادی بھی آہستہ آہستہ ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ جب کبھی ڈیڈی اور ان کے بھائی اکٹھے ہوکر بیتی یادیں تازہ کرتے اور میں بھی اس وقت وہاں موجود ہوتا تو میں بھی ان یادوں میں کھو جاتا۔

ڈیڈی اور ان کے بھائی ہمیشہ دادا کے مکان کو ٹائم مشین سے تشبیہ دیا کرتے تھے، اس گھر میں لگا ہوا وال کلاک 1929ء سے بند تھا جب ڈیڈی کی پیدائش ہوئی تھی، دونوں چچاؤں کا کہنا تھا کہ دادی بھی ملکہ میری کی طرح اسکرٹ پہنتیں اور بالوں کو پنوں سے باندھ کر رکھتیں۔ بدلتے وقت کے باوجود ان کی وضع قطع اور طرز زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے گھر میں بجلی بھی نہیں لگوائی۔ وہ وقت کے ساتھ چلنے کے بجائے پرانے دور میں زندہ تھے۔

صرف بجلی ہی نہیں اور بھی کئی معاملات میں انہوں نے جدید سہولتوں سے استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس گھر میں کوئی باتھ روم نہیں تھا بلکہ وہ کچن میں لگے ہوئے نل سے نہاتے تھے۔ گرم پانی کی ضرورت ہوتی تو چولہے پر کیتلی چڑھا دیتے۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اس گھر میں واشنگ مشین، ٹیلی وژن یا ریڈیو نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کے بستر بھی پرانے زمانے کے تھے جو شاید اب کسی عجائب گھر میں بھی نظر نہ آتے۔

ہمارے سبھی رشتے دار سمجھتے تھے کہ ان کے اس طرزِ زندگی کا جنگ عظیم اول سے گہرا تعلق تھا۔ دادا کا خاندان متوسط طبقہ میں شمار ہوتا تھا جنہیں نئی ایجادات سے خاطر خواہ لگاؤ تھا لیکن دادا نے جنگ کی وجہ سے زیادہ وقت خندقوں میں گزارا اور زخمی ہوکر لندن چلے آئے۔ دادی ایک سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ شوہر کے کہنے پر عمل کیا۔ میرے دونوں چچاؤں کی پیدائش بھی زمانہ جنگ میں ہوئی۔

ان لوگوں کی باتیں سن کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ دادا کے اس طرز زندگی کا اصل سبب ان کے بھائی ہیر اللہ کی موت تھی جو صرف سترہ سال کی عمر میں جنگ میں مارا گیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی بٹالین میں تھے اور دادا نے ہمیشہ یہی کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بھائی کو مرتے ہوئے دیکھا۔ چند لمحے پہلے وہ ان کے شانہ بشانہ لڑ رہا تھا پھر اچانک ہی آگ، دھوئیں اور بارود کے بادل میں غائب ہوگیا اور اس کے جسم کا ایک ٹکڑا بھی نہیں ملا جسے دفنایا جا سکتا۔ دادا کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ اسی لیے اتنے عجیب الرز پراسرار ہوگئے تھے۔

وقت تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور وہ خاندانی تصاویر بھی نوادرات کی طرح صندوقوں میں بند ہوگئیں۔ اس وقت تک میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا اور اسی طرح میرے دوسرے کزنز کی بھی کئی اولادیں تھیں۔ ہم سے پہلے والی نسل ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہو رہی تھی۔ میرے دونوں چچا 1980ء میں انتقال کرگئے۔ ان کے بعد ان کی بیویاں بھی یکے بعد دیگرے دنیا سے چلی گئیں۔ میرے بیٹے اے لیول میں پڑھ رہے تھے کہ ایک روز ممی کا فون آیا۔ وہ مجھے لندن بلا رہی تھیں۔

”تمہارے ڈیڈی کی طبیعت گزشتہ دو روز سے خراب ہے، وہ اسپتال میں داخل ہیں اور ڈاکٹروں نے انہیں پھیپھڑوں کا کینسر بتایا ہے۔“

چار گھنٹے کا سفر طے کرکے لندن پہنچا تو میں نے ممی کو صدمے کی کیفیت میں پایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور بولیں۔ ”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب کیسے ہوگیا، وہ ہمیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔“

میں جانتا تھا کہ یہ کیسے ہوا۔ ڈیڈی نے ساری زندگی بے تحاشا سگریٹ نوشی کی تھی۔ وہ چین اسموکر تھے۔ ایک سگریٹ ختم نہیں ہوتی کہ دوسری سلگا لیتے تھے۔ اس کا یہی نتیجہ نکلنا تھا لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں لونگ روم میں بیٹھے رہے۔ اب ہمارے پاس سوچنے اور افسوس کرنے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔

☆☆☆

ڈیڈی کو دیکھنے اسپتال پہنچا تو وہ ہوش میں تھے۔ البتہ ان کا پورا جسم مشینوں میں جکڑا ہوا تھا اور انہیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بہت دبلے اور زرد نظر آئے۔ وہ آئی سی یو میں تھے۔ اس لیے مجھے ان کے پاس جانے کے لیے پلاسٹک کا ایپرن اور دستانے پہننا پڑے انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے رونا آگیا۔ تبھی ڈیڈی نے چونک کر مجھے دیکھا اور مسکراتے ہوئے..... نحیف آواز میں بولے۔

”کیا ہوا کڈو۔ تم بھی ہمت ہار بیٹھے۔“

وہ بچپن میں مجھے اسی نام سے پکارا کرتے تھے لیکن عرصہ ہوا میرے کان یہ نام سننے کو ترس چکے تھے۔

اس کے ساتھ ہی میرا ذہن بچپن کی یادوں میں کھو گیا۔ مجھے انکل برائن اور ان کی کار یاد آگئی جس میں بیٹھ کر ہم دادا کے گھر جا رہے تھے کہ وہ راستے میں خراب ہوگئی اور ہم دونوں کو سارا سامان اٹھا کر پیدل ہی دادا کے گھر تک جانا پڑا تھا۔ مجھے دادا، دادی یاد آئے اور اس گھر کا تصور کرتے ہی میرے ذہن میں ٹائم مشین گھومنے لگی۔ واقعی وہ گھر کسی ٹائم مشین کے مانند ہی تھا جہاں وقت ایک جگہ رک گیا تھا پھر میں فوراً ہی ماضی سے حال کی طرف لوٹ آیا۔ یوں لگا جیسے ڈیڈی مجھے کچھ بتانا چاہ رہے تھے۔ کوئی ایسی بات جس کا جاننا میرے لیے بہت ضروری تھا۔

میں نے جھک کر ان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور ان کے بستر کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ وہ بولے۔ ”ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اب میں نہیں بچوں گا۔“

میں نے ان کی بات کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے والد ہمیشہ سے ہی حقیقت پسند واقع ہوئے تھے۔ ان سے یہ کہنا کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔ ایک طرح سے ان کی بے عزتی کرنے کے مترادف تھا۔

”اس لیے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ”میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم کو وہ سب کچھ بتا دوں جس کا جاننا تمہارے لیے ضروری ہے۔“

مجھے ایسا لگا جیسے انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ بعد میں ممی نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق پھیپھڑے کے کینسر کے مریضوں کو آخر وقت تک سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

”تمہیں وہ دن یاد ہے جب تمہارے دادا کو عقبی صحن میں ایک لاش ملی تھی؟“ ڈیڈی نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ لاش مرغیوں کے ڈربے کے پاس پڑی ہوئی تھی اور مائیکل کا کہنا تھا کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے جبکہ پولیس نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور نہ ہی لاش کی شناخت ہوسکی تھی۔ کیا بعد میں اسے پہچان لیا گیا تھا؟“

مجھے یاد تھا کہ اس کے بعد بھی پولیس والے دادا کے گھر آتے رہے اور اتفاق یہ ہوا کہ ایسے موقع پر میں اور

## لطائف

ایک پینڈو نے فائیو اسٹار ہوٹل میں چائے کا آرڈر دیا۔ ویٹر نے چھوٹے سے کپ میں چائے دی۔

پینڈو ایک سانس میں چائے پی کے بولا۔ ”میٹھا ٹھیک اے ہن چاہ لے آ۔“

❊❊❊

ایک شوہر اپنی ساس سے۔ ”آپ کی بیٹی میں ہزاروں خامیاں ہیں۔“

ساس۔ ”ہاں بیٹا اسی وجہ سے تو اسے اچھا لڑکا نہیں ملا۔“

❊❊❊

ایک لڑکا پارک میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ضعیف آدمی۔ ”بیٹا کیا یہ ہماری تہذیب ہے؟“

لڑکا۔ ”نہیں انکل یہ علی پور والی نایاب تسلیم ہے۔“

❊❊❊

سردار رات کو مچھردانی لگا کے سو رہا تھا، اچانک مچھردانی کے نزدیک اسے ایک جگنو اڑتا ہوا نظر آیا۔

سردار نے دیکھا اور بولا۔ ”یا خدا ہم کو بچا یہ ظالم مچھر آج تو ہم کو ٹارچ لے کر ڈھونڈ رہا ہے۔“

❊❊❊

میاں اور بیوی مارکیٹ گئے تو ایک لڑکی نے ہیلو کہا۔

بیوی۔ ”وہ کون تھی؟“

شوہر۔ ”تم دماغ خراب مت کرو، ابھی اس کو بھی بتانا ہے کہ تم کون ہو؟“

مرسلہ: رضوان تنولی کریزی
اورنگی ٹاؤن، کراچی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈیڈی ہمیشہ وہاں موجود ہوتے ۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس والے جان بوجھ کر ہفتے کے دن آتے ہوں تاکہ ڈیڈی کی موجودگی میں تفتیش کرسکیں کیونکہ دادا سے انہیں کسی قسم کے تعاون کی امید نہیں تھی پھر آخری بار انہوں نے بتایا کہ اس نامعلوم لاش کا کوئی وارث بھی نہیں آیا۔ اس لیے اسے دفنا دیا گیا ہے۔

ڈیڈی نے میرا سوال سن کر آہستہ سے کہا۔ ''نہیں، اس لاش کی شناخت نہیں ہوسکی۔''

''اگر موجودہ دور میں یہ واقعہ پیش آتا تو لاش کی شناخت ہوسکتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو ڈی این اے اور دیگر سہولتیں دستیاب ہیں۔''

''ہاں یہ ممکن ہے۔'' ڈیڈی نے کہا پھر میرا ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھا؟''

''آپ؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''تمہاری دادی نے بتایا تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''یہ بہت بعد کی بات ہے، تمہارے دادا کا انتقال ہوچکا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتی ہیں۔ البتہ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنے سالوں تک کیوں خاموش رہیں۔''

انہیں کھانسی کا ہلکا سا دورہ پڑا پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں یاد ہے کہ جب وہ پولیس والا اس لاش کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا اور دادی نے تم سے وہ پرانی البم چھین لی تھی۔''

وہ واقعہ میرے ذہن میں اچھی طرح نقش تھا کیونکہ دادی نے اس سے پہلے یا بعد میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس واقعہ کے بعد ڈیڈی اور دادی کے درمیان تلخی ختم ہوگئی تھی اور ڈیڈی خاصی حد تک پرسکون ہوگئے تھے۔

''انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ تم وہ صفحہ کھولے بیٹھے ہوئے تھے جس پر اس شخص کی تصویر چسپاں تھی جس کی لاش صحن میں ملی تھی۔ وہ ایک پرانی تصویر تھی لیکن تمہاری دادی کو ڈر تھا کہ پولیس والے کی نظر اس تصویر پر چلی گئی تو وہ لاش کو شناخت کرلے گا اور طرح طرح کے سوالات شروع کردے گا۔''

مجھے ڈیڈی کی یہ کیفیت دیکھ کر صدمہ ہوا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی انہیں اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی سے ڈیڈی کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔

''اس وقت میں پوری بات نہ سمجھ سکا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ تمہاری دادی نے ایسا کیوں کیا تھا لیکن مجھے ان کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی اور میرے دل میں شک بیٹھ گیا اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوگیا کہ اس لاش کا البم کی تصویروں سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے اور تمہاری دادی اس بارے میں جانتی ہیں۔ میں کسی مناسب موقع پر ان سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ ایک دن وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں تو میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ انہوں نے تم سے وہ البم کیوں چھینی تھی۔ انہوں نے کہا وہ مجھے سب کچھ بتانے کو تیار ہیں بشرطیکہ میں جیف اور ایرک سے کچھ نہ کہوں اور نہ ہی پولیس کو اس بارے میں کچھ بتاؤں۔''

''پولیس؟'' میں چونک پڑا۔

ڈیڈی ایک بار پھر مسکرا دیے۔ ان کے نحیف چہرے پر یہ مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ بولے۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم چاہو تو پولیس کو سب کچھ بتا سکتے ہو کیونکہ اس کہانی کے سب کردار دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں اور میں بھی چند دنوں یا گھنٹوں کا مہمان ہوں۔''

میں نے رونا شروع کردیا۔ ان کی زبان سے مرنے کی بات سن کر میرا دل بھر آیا اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ عین اسی وقت مما کمرے میں داخل ہوئیں تو میں سنبھل گیا۔ ڈیڈی بھی نارمل ہوگئے۔ مما بتا رہی تھیں کہ ڈیڈی کی غیر موجودگی میں ان کے باغ کی دیکھ بھال پوری توجہ سے کی جارہی ہے لہٰذا وہ اس سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں اور نہ ہی کسی اور معاملے میں اپنے ذہن پر زور دیں۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے اور جب وہ صحت یاب ہوکر آئیں گے تو دیکھیں گے کہ ان کی غیر موجودگی میں معمولات زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

مما چند منٹ بیٹھ کر چلی گئیں۔ وہ ڈیڈی کی صحت کے بارے میں پوری طرح باخبر تھیں اور جانتی تھیں کہ جھوٹی تسلیوں سے ان کی زندگی کے دن نہیں بڑھائے جاسکتے۔ ان کے جانے کے بعد ڈیڈی نے کہانی دوبارہ بیان کرنا شروع کردی۔

''جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو تمہارے دادا فوج میں بھرتی ہوچکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس اور بتیس کے درمیان ہوگی۔ تم جانتے ہو کہ ان کی کئی بہنیں اور ایک بھائی بھی تھے جن کی عمریں... بہت کم تھیں۔''



''انکل ہیراللہ'' میں بے ساختہ بول اٹھا۔

اس وقت ہیراللہ سترہ سال کا تھا۔ بے حد پیارا، خاندان کے سبھی افراد اس سے محبت کرتے تھے۔ تمہارے دادا کا خیال تھا کہ جنگ بہت عرصہ تک جاری رہے گی اور اس میں بہت خون خرابہ ہوگا۔ انہوں نے ہیراللہ کو بھرتی کرنے والے افسروں سے دور رہنے کی ہدایت کی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہیراللہ بھی فوج میں جائے لیکن اس نے تمہارے دادا کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ اس پر تو دوسرے نوجوانوں کی طرح حب الوطنی کا بھوت سوار تھا چنانچہ وہ بھی دوستوں کے بہکائے میں آکر فوج میں بھرتی ہونے چلا گیا۔ اتفاق سے اُسے بھی وہی رجمنٹ ملی جس میں تمہارے دادا تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان واقعات کا لاش سے کیا تعلق؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی سب کچھ واضح ہوجائے گا۔'' ڈیڈی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوگئے۔ ان کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا۔ ایک نرس دوڑی ہوئی آئی۔ اس نے انہیں پانی پلایا اور پیٹھ سہلانے لگی پھر انہیں ایک گولی دی تو وہ کچھ پرسکون ہوگئے۔ نرس نے مجھ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاؤں اور انہیں تنہا چھوڑ دوں کیونکہ مسلسل بولنا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔ میں اٹھنے لگا تو ڈیڈی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کی پوری بات سنے بغیر وہاں سے اٹھ جاؤں۔ شاید وہ جان گئے تھے کہ اس کے بعد یہ موقع نہیں ملے گا۔

کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئے تو انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''23 اگست 1914ء کو تمہارے دادا کی رجمنٹ جنگ کے لیے روانہ ہوئی۔ انہیں موئس کے میدان میں بھیجا گیا تھا۔ اس لڑائی میں ان کے کئی ساتھی مارے گئے اور تمہارے دادا کی ٹانگ بھی زخمی ہوگئی لہٰذا انہیں علاج کے لیے گھر واپس بھیج دیا گیا۔ سب لوگوں نے ان سے اظہار ہمدردی کیا کیونکہ وہ ملک کی خاطر لڑتے ہوئے زخمی ہوگئے تھے بلکہ ان کا بھائی ہیراللہ بھی اس جنگ میں مارا گیا۔ کم از کم اس وقت لوگ یہی سمجھ رہے تھے۔

میری تیوری پر بل پڑگئے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈیڈی کیا کہہ رہے تھے۔ انکل ہیراللہ کی بہادری اور بے وقت موت ہمارے خاندان کے لیے باعث فخر تھی جس کا تذکرہ ہمارے سبھی جاننے والے بڑے احترام سے کیا کرتے تھے۔ میں نے ڈیڈی کی طرف دیکھا جیسے ان کی بات کا مطلب سمجھنا چاہ رہا ہوں۔

''انکل ہیراللہ میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے۔'' ڈیڈی نے آہستہ سے کہا۔

میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ ان کے بارے میں ایسی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی تھی گو کہ وہ کبھی بھی میری یادوں کا حصہ نہیں رہے لیکن ان کی دلیرانہ موت کے بارے میں سن کر میرے دل میں ان کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات پیدا ہوگئے تھے اور میں نے انہیں ایک ہیرو کا درجہ دے رکھا تھا لہٰذا ان کے بارے میں ایسی بات سن کر میرا چونک جانا فطری امر تھا۔

''تمہاری طرح مجھے بھی یہ سن کر حیرت ہوئی تھی۔'' ڈیڈی نے کہا اور دوبارہ میرا ہاتھ تھام لیا۔

''کیا وہ فرار کی کوشش کے دوران فوجیوں کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے؟'' میں نے ان کی موت کی وجہ جاننا چاہی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بہت سے فوجی محاذ سے بھاگنے کی کوشش کے دوران مارے گئے تھے اور ان میں سے کچھ زیادہ دور نہ جاسکے۔ اس لیے واپس آگئے لیکن ان کا بھی انجام بہت برا ہوا۔ دادا بتایا کرتے تھے کہ ایسے بھگوڑے فوجیوں کو برہنہ کرکے تپتی دھوپ میں کھلے ٹرکوں میں لٹا کر باندھ دیا جاتا تھا اور وہ پسینے میں شرابور ہوکر نیم پاگل ہوجاتے تھے۔

ڈیڈی نے نفی میں سر ہلایا اور بولے۔ ''نہیں۔ ہیراللہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا حالانکہ اس وقت وہ ایک نادان اور کم عمر نوجوان تھا لیکن تمہارے دادا نے ایسا بندوبست کردیا کہ ہیراللہ بخیر و عافیت وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجائے۔ وہ اس کے مقابلے میں کافی سمجھ دار تھے۔''

''کیسے؟'' مجھے یقین نہ آیا حالانکہ اتنا تو مجھے بھی پتا تھا کہ میدان جنگ میں افراتفری کا عالم ہوتا ہے اور وہاں کسی کو ایک دوسرے کی خبر نہیں ہوتی۔ سارے سپاہیوں اور افسروں کی توجہ اپنا دفاع کرنے اور دشمن کو نقصان پہنچانے پر ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں محاذ سے کھسک جانا زیادہ مشکل نہیں لیکن میں نے ایسے کئی قصے سن رکھے تھے کہ ایسے زیادہ تر بھگوڑے اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکے تھے اور انہیں فوجی افسروں نے گولی ماردی تھی۔ ڈیڈی کی زبانی انکل ہیراللہ کے فرار کی کہانی سن کر میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوگیا کہ وہ اپنی اس جدوجہد میں کیسے کامیاب



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے۔

''انکل ہیر اللہ جنگ پر چلے تو گئے لیکن وہ بہت خوفزدہ تھے اور اکثر بیمار رہنے لگے۔ تمہارے دادا نے ان کی بہت دیکھ بھال کی تاکہ وہ جنگ ختم ہونے پر بخیر وعافیت گھر واپس جا سکیں لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح انکل ہیر اللہ کو وہاں سے نکال دیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک منصوبہ تیار کیا جو بہت آسان اور سادہ تھا لیکن ناکام ہو گیا۔ شاید تمہارے دادا یہی سمجھے تھے۔ جب ہیر اللہ کو گولی لگی تو وہ زمین پر گر پڑا۔ جنگ میں کسی کو اتنا ہوش نہیں ہوتا کہ مرنے یا زخمی ہونے والے سپاہی کی فکر کرے چنانچہ دوسرے سپاہی ان کے پاس سے گزرتے رہے اور تمہارے دادا نے بھی یہی ظاہر کیا جیسے ہیر اللہ کی موت واقع ہو چکی ہے۔ جب شام ہوئی تو ہیر اللہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔''

''اگر وہ وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو کہاں چلے گئے؟ وہ اپنے گھر کیوں نہیں آئے؟ دادا نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی''

''وہ ان سے کیسے رابطہ کر سکتے تھے۔'' ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ان کا کام نہیں تھا بلکہ ان کی تو ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کسی کو بھی حقیقت کا علم نہ ہو سکے۔ تمہیں یاد ہوگا کنڈو کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران محاذ سے بھاگ کر آنے والے فوجیوں کو ان کے گھر والے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ تمہارے دادا اپنے بھائی کی جان بچانا چاہتے تھے لیکن وہ یہ بات کسی کو نہیں بتا سکتے تھے۔ ان دونوں میں یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ اگر ہیر اللہ پکڑا گیا تو جارج یعنی تمہارے دادا، اس کے فرار کے بارے میں لاعلمی ظاہر کریں گے اور اگر محفوظ رہا تو ہمیشہ غائب رہے گا۔ کیونکہ دنیا والوں کی نظروں میں وہ مر چکا تھا اور اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ کئی سال گزر جانے کے بعد بھی اگر تمہارے دادا خاندان والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تو ان کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ ہیر اللہ کو مردہ قرار دیا جا چکا تھا۔ اسے بعد از مرگ تمغوں اور اعزازات سے نوازا گیا اور غالباً کسی جنگی قبرستان میں اس کی قبر بھی موجود ہوگی۔ وہ مر چکا تھا اور نومبر 1967ء کی اس رات کو وہ مردہ ہی تھا۔''

ہیر اللہ انکل واپس آ گئے تھے، یہ سنتے ہی میرے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنے بازوؤں کو سہلانا شروع کر دیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈیڈی کو دیکھنے لگا جن کے چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''تمہیں وہ شخص مائیکل یاد ہے جو ڈیڈی کے گھر میں اوپر کی منزل پر رہا کرتا تھا؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ وہ بعض اوقات بالکل بچوں جیسی حرکتیں کرتا تھا اور ہر وقت متحرک رہتا تھا۔

''اس رات مائیکل شراب خانے گیا تو سامنے کا دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ تمہاری دادی برتن دھو رہی تھیں جب ایک نامعلوم شخص بیٹھک میں داخل ہوا۔ پہلے تو وہ اسے پہچان نہ سکیں کیونکہ کم روشنی میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ تمہارے دادا کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا اور نہ ہی وہ شخص کچھ بولا۔ تمہاری دادی کے کہنے کے مطابق جب وہ بیٹھک میں گئیں تو وہ آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہیر اللہ کا چہرہ دوسری جانب تھا لیکن دادی تمہارے دادا کے چہرے کے تاثرات دیکھ سکتی تھیں۔ وہ سخت غصہ کے عالم میں تھیں۔ تمہاری دادی گھوم کر اس شخص کے سامنے آئیں اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی حیرت زدہ رہ گئیں۔

''کیا واقعی انہوں نے انکل ہیر اللہ کو پہچان لیا؟''

میرے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی کیونکہ انہوں نے انکل کو پچاس سال پہلے اس وقت دیکھا ہوگا جب وہ لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔

ڈیڈی میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ ''تمہارے دادا غصہ سے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہیر اللہ نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ وہ جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جائے اور دوبارہ لوٹ کر نہ آئے جبکہ ہیر اللہ یہی کہتا رہا کہ وہ تنہا ہے اور مزید اس طرح نہیں رہ سکتا لہٰذا وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ زندگی کے بقیہ دن پورے کرنا چاہتا ہے۔ یہ سن کر تمہارے دادا اور بھی مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے کوئلے والا بیلچہ اٹھایا اور اپنے بھائی کے سر پر وار کیا۔ عین اسی وقت مائیکل بیٹھک میں داخل ہوا۔ وہ پوری طرح نشے میں تھا۔''

میرے پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگے۔ میں نے بے صبری سے پوچھا۔ ''کیا دادا نے انہیں مار ڈالا؟''

''ان کا یہ مقصد نہیں تھا۔ البتہ وہ غصے میں آ گئے تھے۔''

''اور مائیکل نے انہیں ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا؟''

مجھے یاد آیا کہ مائیکل نے اس رات کے واقعہ کے بارے میں قتل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور نہ ہی میں نے اس بارے میں اس سے کوئی سوال کیا۔ ویسے بھی وہ ہر وقت نشے میں دھت رہا کرتا تھا۔ اس لیے اس کی بات پر لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ اس پولیس والے نے بھی مائیکل کی بات کو اہمیت نہیں دی اور ہیر اللہ کی موت کو طبعی قرار دے دیا لیکن اب پوری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مائیکل اس دنیا میں نہیں تھا۔ وہ دادا کے انتقال سے پہلے 1969ء میں شراب پیتے ہوئے مر چکا تھا۔

''مائیکل نے اس لاش کو صحن تک گھسیٹ کر لے جانے میں تمہارے دادا کی مدد کی تھی۔'' ڈیڈی نے انکشاف کیا۔

''اس نے یہ بات پولیس کو کیوں نہیں بتائی؟''

''تم جانتے ہو کہ وہ ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا اور بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل جاتی تھیں۔ اس نے نادانستگی میں ہمیں تو بتا دیا لیکن پولیس سے کبھی کچھ نہ کہا۔ شاید اس لیے کہ وہ خود بھی واقعہ کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، دوسری بات یہ کہ وہ مکان میرے والدین نے کرایہ پر لے رکھا تھا اگر انہیں وہاں سے جانا پڑتا تو مالک مکان مائیکل کو بھی نکال دیتا اور اس کی اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اپنے لیے کسی دوسرے مکان کا بندوبست کر سکتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس عمر میں دادا جیل کی ہوا کھائیں لہٰذا اس نے اپنی زبان بند رکھی۔''

''دادا نے ہیر اللہ کو قتل کیا تھا؟'' میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ نہ جانے مجھے اس پر یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ان کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔''

''لیکن انہوں نے ایسا کیا؟''

''میرے بیٹے بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' ڈیڈی بولے۔ ''وہ اسے دیکھ کر غصہ میں آ گئے تھے اور اس کی آمد ان کے لیے کسی صدمہ سے کم نہیں تھی۔ پولیس کے مطابق اس نامعلوم شخص کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی۔ وہ پہلے سے دل کا مریض تھا۔ پولیس والوں کا یہی کہنا ہے۔''

''لیکن اس کی موت بیلچہ لگنے سے واقع ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی۔ بیلچے کی ضرب اتنی مہلک نہیں ہوتی جس سے انسان مر جائے۔''

''مان لیا کہ وہ دل کا مریض تھا۔'' میں نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دادا کا عمل جائز تھا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ان کے پاس اپنے غصہ کے اظہار کا یہی راستہ تھا۔'' ڈیڈی بولے۔

ڈیڈی نہیں جانتے تھے کہ پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد ہیر اللہ اتنا عرصہ کہاں رہا اور کیا کرتا رہا شاید اس نے شادی کر لی ہو اور اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی یا مر چکی ہو۔ اسی لیے وہ تنہائی محسوس کر رہا تھا اور نومبر کی اس اداس شام وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور دادا سے ملنے چلا آیا۔

دو دن بعد ڈیڈی کوما میں چلے گئے اور ان کا انتقال ہو گیا۔ خاندان کے لوگ اور دوست ان کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے آئے۔ میں بھی اکثر ویشتر مشرقی لندن کے قبرستان میں ان کی قبر پر جاتا رہتا ہوں لیکن میں نے ہیر اللہ کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ خاندان میں جو پرانے لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ انہیں پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ آج بھی لوگ پہلی جنگ عظیم کے بارے میں گہرے جذبات رکھتے ہیں۔ سب کو یہی معلوم ہے کہ انکل ہیر اللہ نے سترہ سال کی عمر میں وطن کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ انہیں خاندان اور علاقے کے لوگ ایک ہیرو کا درجہ دیتے ہیں اور ان کی اسی قربانی کی وجہ سے ہمارے خاندان کو عزت واحترام سے دیکھا جاتا ہے۔ جب میں ان سب باتوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے دادا کا عمل جائز نظر آتا ہے۔ اگر وہ ہیر اللہ کو اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیتے تو ان کی عزت دو کوڑی کی رہ جاتی۔ لوگ دادا کو جھوٹا اور ہیر اللہ کو بھگوڑا سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگتے۔ ممکن ہے کہ دادا پر دروغ گوئی کے الزام میں مقدمہ چلتا اور انہیں سزا ہو جاتی۔ اس کے ساتھ ہی دادا کو وہ تمام اعزازات اور تمغے واپس کرنا پڑتے جو ہیر اللہ کی شجاعت اور بہادری کے صلے میں ملے تھے۔ یقیناً یہ انکل ہیر اللہ کی جذباتی لغزش تھی کہ وہ پچاس سال روپوش رہنے کے بعد دادا سے ملنے چلے آئے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کے کتنے بھیانک نتائج برآمد ہوں گے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دادا نے ٹھیک ہی کیا۔ خاندان کی عزت وآبرو کی خاطر ہیر اللہ کو واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ ایک بھگوڑے کو پناہ دے کر دادا گلے میں ہمیشہ کے لیے رسوائی کا طوق تو نہیں ڈال سکتے تھے۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

# ماروی

محی الدین نواب

آٹھویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

**ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی چاہتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دلربا سلسلہ**

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے سندھ دھرتی کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمیرو اور چاچی فتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ اس رات زلیخا نے اسے ایک قیمتی ہار بھی تحفتاً دیا تھا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون ہے لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا۔ ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف مگسی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد کو شادی کے لیے ایک لاکھ کی ضرورت تھی۔ محبوب نے زلیخا کے دیے ہوئے ہار کو ایک لاکھ میں خریدنے کی پیشکش کی لیکن مراد راضی نہ ہوا۔ اسی دوران مراد کے گھر چوری کی واردات ہوئی اور چور نقد رقم کے ساتھ زلیخا کا دیا ہار بھی لے گئے لیکن پکڑے گئے یوں مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ساس رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچی نتیجتاً چانڈیو مستعفی ہو کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ جو کہ جیلر کی بیٹی ہے دیگر دو ساتھی بہرام اور دارا اکبر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی اور اس سے شادی اسے ورغلا کر ماروی سے دور کررہی تھی جبکہ ماروی پر بھی دباؤ تھا کہ وہ محبوب سے شادی کرلے لیکن دونوں اپنے عشق پر قائم تھے۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ جب ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی جس میں میرا بھرپور مدد کررہی تھی تاکہ محبوب ماروی کی مدد سے باز آجائے مگر اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور مگسی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ایک موقع پر مرینہ مراد کا پیچھا کرتے ہوئے راستے میں ماروی تک پہنچ گئی اور محبوب سے فون پر اپنے باپ کے ذریعے رابطہ کرایا تو اسی خبر سے محبوب میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ اتفاق سے راستے میں ماروی چاچی اور چاچا کے ساتھ اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوجاتا ہے کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے اور یہ صورت حال محبوب اور مراد دونوں کے لیے پریشان کن ہوتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے مگر یہ بات جیلر یا مرینہ کسی کو کان و کان پتا نہیں ہوتی۔ البتہ مگسی صاحب اور میرا کے علم میں یہ بات آجاتی ہے۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

انسان بدل جاتا ہے۔ نیت بدل جاتی ہے اور پتا نہیں چلتا۔ پھر وہاں کسی کو کیا معلوم ہوتا کہ وہ دونوں بند دروازے کے پیچھے جاتے ہی ادھر سے ادھر ہوگئے ہیں۔ جو اصل قیدی تھا۔ وہ اپنی جگہ واپس آگیا تھا۔ جیلر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے سیل میں پہنچا دیا جائے۔ سپاہی اسے وہاں سے لے گئے۔ معروف نے جیلر سے مصافحہ کرتے ہوئے قیدی سے ملانے کا شکریہ ادا کیا پھر محبوب کے ساتھ جیل کی عمارت سے باہر احاطے میں آگیا۔ معروف آگے آگے تھا۔ محبوب سر جھکائے مراد کے انداز میں پیچھے چل رہا تھا۔

وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنی کار کے پاس آئے۔ معروف نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آکر دروازہ کھولنا چاہا تو





محبوب نے کہا۔ "Please let me drive it..."

معروف حیرت سے اچھل پڑا۔ اس کی طرف پلٹ کر دیکھتے وقت لڑکھڑا گیا۔ پھر اسے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

"محبوب... تم... ؟"

وہ شدید حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ محبوب نے مسکرا کر کہا۔ "مراد انگریزی نہیں بولتا۔"

معروف نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اس نے کہا۔ "آپ مجھے بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ جیلر کے سامنے بے اختیار جذباتی ہو کر بولنے لگے تھے۔"

"کیا کروں؟ باپ کی جگہ سمجھتے ہو اور اپنے پیچھے پاگل بنا کر دوڑاتے رہتے ہو۔"

"اب ایسا نہیں ہوگا میں وعدہ کرتا ہوں۔ آج کے بعد آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔"

"اس لیے نہیں کرو گے کہ ماروی آگئی ہے۔ اب کہیں نہیں جاؤ گے لیکن..."

وہ محبوب سے الگ ہو کر بولا۔ "تم باہر نہ آتے تو اچھا ہوتا۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ میرے جیل میں رہنے سے خوش تھے؟"

"ہاں آج کل میں ماروی کی یادداشت واپس آجائے گی۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ تم مراد کی جگہ اب تک قیدی بنے ہوئے تھے اور وہ قیدی بڑی بے حسی اور خود غرضی سے آزاد گھوم رہا ہے۔ وہ ماروی کی نظروں سے گر جاتا اور تم اس کے سر میں سما جاتے۔ وہ تم پر فخر کرتی۔ آپ ہی آپ بازی پلٹ جاتی۔"

"پلیز معروف صاحب! ایسا نہ سوچیں۔ وہ بے حس اور خود غرض نہیں ہے اور خدا نہ کرے کہ میں بھی اس کے خلاف کوئی سازشی لفظ زبان سے نکالوں۔"

"میں بھی جو کہہ رہا ہوں۔ وہ سازش نہیں ہوگی۔ صرف پانچ دنوں کی بات تھی۔ کوئی کام کرو تو پورا کرو۔ جب اس کی جگہ جیل گئے تھے اور ماروی کی خاطر گئے تھے تو عدالتی فیصلے کے بعد ہی باہر آتے۔ جو قربانی دے رہے تھے اسے آخر تک نباہنا چاہیے تھا۔"

"ایک سیدھی سی بات ہے۔ میں مراد کو اس کی ماروی کی نظروں سے گرانا نہیں چاہتا تھا۔"

"جب اسے مراد کی ماروی کہتے ہو تو پھر اس کے پیار میں کیوں اپنی زندگی برباد کررہے ہو؟"

"ضروری نہیں ہے کہ جسے ہم چاہیں وہ حاصل ہوجائے اور وہ حاصل نہ ہو تو اسے چاہنا اور اس کی قدر کرنا چھوڑ دیں۔ میں آپ کو کیا سمجھاؤں آپ نہیں سمجھیں گے معروف صاحب! آئیں بیٹھیں۔ چلیں۔"

معروف دوسری طرف سے گھوم کر اگلی سیٹ پر آگیا۔ محبوب نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں اس کی یادداشت کب واپس آئے گی؟ جب تک نہیں آئے گی تب تک ہم اس کے کوئی نہیں ہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ اس کے دل کے کورے کاغذ پر اب کس کی تصویر پہلے چھپے گی؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "عشق کی یہ داستان پھر سے شروع ہونے والی ہے۔"

اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پچھلے عشق کی تمام تیز رفتاری دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

☆☆☆

موت سے پہلے شامت آتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مارتی ہے۔ منہ کے بل گراتی ہے پھر بستر پر چاروں شانے چت کردیتی ہے۔ اس کا سلیو پوائزن خود اسے ہی مار رہا تھا۔ علاج کے لیے کئی ڈاکٹرز تبدیل ہوچکے تھے۔ بار بار لیبارٹری کی رپورٹ کے باوجود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اعصابی کمزوری کا سبب کیا ہے۔ اب وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آنے تک تھک جاتا تھا۔ کمزوری کے باعث زیادہ بولتا نہیں تھا۔

وہ ہانپتا کانپتا رہتا تھا۔ دشمنوں کو للکارنے کے لیے پہلے جیسا دم خم نہیں رہا تھا۔ مقدمہ ختم کرانے کے سلسلے میں وکیل نے جتنے کاغذات تیار کیے تھے ان پر دستخط کرچکا تھا۔ آخری فیصلہ کن سماعت کی تاریخ مقرر ہوچکی تھی اور اعصابی کمزوریاں دھمکی دے رہی تھیں کہ اس تاریخ سے پہلے زندگی کی آخری تاریخ بھی مقرر ہوچکی ہے۔

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ وہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ رابعہ نے کمرے میں آکر اسے دیکھا۔ پھر بیڈ کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ "کیسا لگ رہا ہے؟"

وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں کیسی کمزوری ہے۔ چلتا پھرتا نہیں ہوں۔ پھر بھی ہانپنے لگتا ہوں۔"

"یہ خیال تو آتا ہی ہوگا کہ موت کا جو وقت مقرر ہے وہ شاید آگیا ہے؟"

"تم جب بھی آتی ہو میری موت کی بات کرنے لگتی ہو۔"

"کیوں نہ کروں؟ کیا مرنا نہیں ہے؟ کیا اب بھی یہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوش فہمی ہے کہ رہتی دنیا تک رہنے آئے ہو؟"

وہ بڑی نقاہت سے بولا۔ "مرنا تو سب کو ہے لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔"

"آج تک پتا نہیں کتنے ہاریوں اور کھیت مزدوروں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ وہ بھی تمہاری طرح مرنا نہیں چاہتے تھے۔"

"کیوں دشمنوں کی طرح بولنے لگی ہو؟"

اس نے پوچھا۔ "ظالموں کو اپنی موت کے وقت بھی اپنے مظالم کیوں یاد نہیں آتے؟ یاد دلاؤ تب بھی نہ پچھتاتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں۔ بلکہ طیش میں آجاتے ہیں۔"

"میری بیماری اور کمزوریوں سے خوش ہو رہی ہو۔ دیکھ رہا ہوں خوب مزے لے رہی ہو۔"

"ابھی میں تمہاری جگہ پڑی رہتی اور تم میری جگہ یہاں کھڑے رہتے تو میری طرح مزے لیتے رہتے۔ ہم ایک لمبی عمر تک ایک دوسرے کے شریک حیات رہے اور ایک دوسرے کی حیات کے دشمن بھی رہے۔ اس تمنا میں جیتے رہے کہ کوئی مرجائے۔ اب میری تمنا پوری ہو رہی ہے تو کیا میں مزے نہ لوں؟"

دونوں بیٹے دروازہ کھول کر اندر آئے وہ کمزوری سے کراہتے ہوئے بولا۔ "بیٹے! یہاں آؤ۔ اس عورت کو یہاں سے لے جاؤ۔ یہ مجھے جینے نہیں دے گی۔ اپنی باتوں سے مار ڈالے گی۔"

برکت نے کہا۔ "ابا! ہماری سمجھ میں نہیں آتا' کیا ہو رہا ہے؟ پہلے اماں بیمار تھیں۔ ہم سمجھ رہے تھے۔ یہ جانے والی ہیں لیکن یہ تو چلنے پھرنے لگیں، تم جارہے ہو۔"

رحمت نے کہا۔ "اماں کی بیماری کو ڈاکٹر نہ سمجھ سکے یہ خود ہی اچھی ہوگئیں۔ انسان کو اچھا ہونا چاہیے۔ تم بھی اچھے ہوجاؤ۔ یا جلدی چلے جاؤ۔ خواہ مخواہ انتظار کرارہے ہو۔"

وہ غصہ سے کانپنے لگا۔ بیٹے بھی اپنی ماں کی طرح مزے لے رہے تھے۔ جب ماں بیمار تھی تب بھی تمام زمینیں ان کے نام ہوسکتی تھیں۔ اب باپ کی زمینیں ملنے کی سو فیصد امید تھی۔

اکثر دولت مند گھرانوں میں بوڑھے والدین کی الوداعی ہو تو جوان اولاد کی عید ہوجاتی ہے۔ یہ عجیب گھرانے ہوتے ہیں۔ کوئی رشتہ نہیں بچتا۔ زندہ رشتوں کی فصل کاٹتے رہو تو ان کے کھیت سونا اگلتے رہتے ہیں۔

حشمت جلالی نے غصہ سے بیٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک دن تمہاری اولادیں بھی جوان ہوں گی۔ تم موت کے بستر پر پڑے رہو گے پھر وہ بھی تم سے ایسی ہی باتیں کریں گی۔ اس دن سے ڈرو۔ توبہ کرو۔"

"کیا تم نے ہمارے بیمار دادا کے سرہانے کھڑے ہو کر توبہ کی تھی یا ہماری طرح زمینوں کا حساب کررہے تھے۔ تم بھی دادا کی موت کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔"

رابعہ نے کہا۔ "بیچارے مال و دولت والے مرتے وقت بہت ہی مجبور ہوتے ہیں۔ اپنی ناخلف اولاد کو سب کچھ دے کر جانے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

"اولاد جتنی بھی ذلالت دکھائے اسے کنگال نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہی خاندان کا نام آگے بڑھاتی رہتی ہے۔"

ان کی پوری ہسٹری دیکھی جائے تو وڈیرے اور سرمایہ دار مال و دولت کے ساتھ اپنی خاندانی کمینگی اور ذلالت بھی ورثے میں چھوڑ جاتے ہیں۔

بیڈ کے سرہانے حشمت جلالی کا وہ چھوٹا سا بیگ پڑا تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ رابعہ نے اسے اٹھا کر بڑے معنی خیز انداز میں دیکھا۔ انہیں بھی دکھایا پھر اسے کھولا۔

وہ باپ بیٹے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس بیگ میں حشمت کی اہم چیزیں تھیں اور وہ اہم سلیو پوائزن کی شیشی بھی تھی۔

اس نے وہ شیشی نکالی تو باپ بیٹوں نے ایک ذرا پریشان ہو کر پھر ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا۔ وہ تینوں اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ شیشی زہریلی ہے۔ جبکہ شیشی وہی تھی رابعہ نے اس کا زہر نکال دیا تھا۔

اس نے اسے روشنی کی طرف اٹھا کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کئی دنوں سے تمہارے بیگ میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس شیشی میں کیا ہے؟"

حشمت نے کہا۔ "دوا ہے۔ اسے رکھ دو۔ کیوں میرے بیگ کی تلاشی لے رہی ہو؟"

"یونہی خیال آیا کہ اور کوئی دوا ساتھ نہیں رکھتے اسے بیگ میں ایسے رکھتے ہیں جیسے کلیجے سے لگا رکھا ہو۔"

اس نے تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ضرور اس میں کوئی خاص دوا ہے یا کوئی مزے کی چیز ہے۔"

برکت نے کہا۔ "تم دیکھ رہی ہو۔ یہ کتنے کمزور ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں طاقت کی ٹانک دی ہے۔"

وہ بولی۔ "ٹانک تو کوئی بھی طاقت کے لیے پی سکتا ہے۔ میں بھی پی سکتی ہوں۔ تم بھی پی سکتے ہو۔"

اس نے شیشی کھول کر اسے سونگھتے ہوئے کہا۔ "ہائے کتنی اچھی خوشبو ہے۔"





اس نے برکت کے پاس آکر اس کی ناک کی طرف شیشی بڑھا کر کہا۔ "سونگھ کر دیکھو۔"

وہ منہ پھیر کر کتراتے ہوئے بولا۔ "دوا کو کیا سونگھنا۔ یہ کوئی شربت نہیں ہے۔"

وہ رحمت کی طرف گھوم کر بولی۔ "ٹانک تو شربت ہی ہوتی ہے۔ رحمت...! لو دو قطرے پی کر بولو۔ شربت جیسی ہے یا نہیں؟"

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ "میں کیا پاگل ہوں کہ ابا کی دوا پینے کی حماقت کروں گا۔"

وہ برکت کی طرف گھوم کر بولی۔ "تم پیئو۔"

وہ دور ہو کر بولا۔ "کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئی ہو؟ تمہیں خوشبو اچھی لگ رہی ہے۔ تم ہی پیئو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تم لوگ تو ایسے بھاگ رہے ہو جیسے یہ زہر ہے۔ واہ کیا اولاد ہے۔ کیا تمہارا باپ پاگل ہے کہ اپنے بیگ میں زہر رکھے گا۔"

وہ شیشی کو حشمت کی طرف لاتے ہوئے بولی۔ "لو جی...! تم پیئو۔ ان گدھوں کو دکھاؤ کہ یہ زہر نہیں ہے۔ امرت دھارا ہے۔"

وہ گھبرا گیا۔ لیٹے ہی لیٹے دور ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا پاگل ہوگئی ہو؟ کیوں ہمیں ٹانک پلا رہی ہو۔ پینے کا جو وقت ہے پیا اسی وقت پی جائے گی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اسے تماشا کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ اس نے پھر شیشی کو بڑے بیٹے کی طرف بڑھایا۔ وہ پھر دور ہوگیا۔ وہ مزے سے ہنستی ہوئی رحمت کی طرف آئی۔ وہ بیڈ کے ایک طرف سے دوسری طرف چلا گیا۔

پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس کا شیشی والا ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ وہ تینوں اسے دیکھ رہے تھے۔ فضا میں جیسے شراب کا جام بلند تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے ہونٹوں تک آیا۔ اس کا منہ کھلا اور شیشی کا عرق قطرہ قطرہ اس کے حلق میں جانے لگا۔

حشمت کمزوری کے باوجود ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جسے ختم کردینا چاہتا تھا وہ خود اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی۔

دونوں بیٹے ایک ایک قدم بڑھتے ہوئے ماں کے قریب آنے لگے کہ کاش گرے گی تو اسے سنبھال لیں گے۔ آخر ماں کا دودھ پیا تھا۔ کیا ایسے وقت بھی نہ سنبھالتے؟

وہ نہیں گری۔ ذرا لڑکھڑائی جیسے نشے میں ڈگمگا گئی ہو۔ پھر ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "مجھ! مجھے معاف کرو۔ میں نشے میں ہوں۔ قسمت کی ہے خرابی......

.... سانپوں کو زہر پلایا ہے میں نشے میں ہوں۔"

وہ مستی میں جھومتی ہوئی' گھومتی ہوئی حشمت کے پاس آئی اس نے منہ اٹھا کر پھر چند قطرے حلق میں ٹپکائے۔ ان سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

اس نے پیتے وقت ہچکی لی۔ جیسے آخری ہچکی ہو۔ پھر ایک جھٹکا کھا کر پیچھے گئی۔ پھر ہنسنے لگی۔

وہ پریشان تھے۔ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ زہر کے قطرے حلق سے اتر چکے تھے اور وہ پیروں پر کھڑی تھی۔ اِدھر سے اُدھر ڈگمگا رہی تھی۔ موت نشہ بن گئی تھی۔ مار نہیں رہی تھی۔ مستی میں لا رہی تھی۔

وہ قریب آکر اس پر جھک کر بولی۔ "میرے پیارے شوہر...! یہ بتاؤ' کیوں مجازی خدا کہلاتے ہو...؟ کیوں خدا کا نام اپنے ساتھ لگاتے ہو...؟"

وہ شیشی کو اس کے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اے ...! اے میرے مجازی خدا...

تیرے اندر ایک ذرا سی بھی خدائی خاصیت ہے تو یہ بھید معلوم کر... کہ یہ میرے لیے امرت دھارا کیسے بن گئی؟"

وہ سیدھی ہو کر تن کر بولی۔ "اور... اور ذرا سوچ کہ تو بستر مرگ پر کیوں ہے...؟

پیتے پیتے کبھی کبھی یہ جام بدل جاتے ہیں۔
حیات و موت کے پیغام بدل جاتے ہیں۔"

وہ منہ پھیر کر فاتحانہ انداز میں چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ دونوں بیٹے حیرانی سے قریب آکر اس شیشی کو دیکھنے لگے۔ جو باپ کے سینے پر رکھی ہوئی تھی اور وہ بھی جیسے سکتے کی حالت میں اسے پکڑے ہوئے چاروں شانے چت پڑا تھا۔

☆☆☆

وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہیڈ لائٹس کی روشنی تھی اور ونڈ اسکرین کے پار ماروی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ ابھی کوٹھی میں پہنچ کر جیسے صدیوں کے بعد اسے روبرو دیکھنے والا تھا۔ اور وہ اسے دیکھ کر بھی جیسے نہ دیکھتی۔ جب اسے پہچان نہ پاتی تو دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہوتا۔

معروف ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہم نے ماروی کو سی ویو والی کوٹھی میں پہنچایا ہے۔ آئندہ اس کی مستقل رہائش کہاں ہوگی؟"

"اسی کوٹھی میں اپنی چاچی اور چاچا کے ساتھ رہے گی۔"

"آج سے پانچویں دن مراد رہائی پا کر آئے گا۔ وہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماروی کے قریب رہنا چاہے گا۔"

"دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ دن رات اس کے قریب رہوں۔ میں بھی مراد بھی دونوں ہی دل سے مجبور ہوں گے۔"

معروف نے کہا۔ "یہ اچھا موقع ہے۔ خدا کرے مراد کے آنے تک ماروی کی یادداشت واپس آجائے۔ تم دونوں اس کے سامنے رہو اور وہ فیصلہ سنادے کہ کس کے نکاح میں آئے گی۔"

وہ محبوب کی طرف گھوم کر بولا۔ "یہ عشق تم سب کے لیے عذاب بن رہا ہے۔ تمہارے بزنس کے لیے۔ ماروی کے تحفظ اور سلامتی کے لیے۔ اس کی عزت اور نیک نامی کے لیے۔ وہ کسی ایک کی منکوحہ بنے گی۔ تب ہی اس کی نیک نامی بحال ہوگی۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور تم مراد کی بھی بہتری چاہتے ہو کیونکہ وہ ماروی کا پیار ہے مگر شاید تم نہیں جانتے...."

محبوب نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ "اس کا من مزاج اس کے تیور بدل گئے ہیں۔ اس کی سادگی بارود بن گئی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں گن آگئی ہے۔"

محبوب نے کار کو دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ "جب میں جیل میں تھا تو جیلر دلاور جان نے سکھر سے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ مراد نے اس کی بیٹی کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس وقت جیلر اسے گالیاں دے رہا تھا۔ قسمیں کھا رہا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

"وہ غصہ میں بتا رہا تھا کہ مراد نے کھنڈر میں اور کئی لاشیں گرائی ہیں۔ اس نے خضدار کے ایک خطرناک ویران علاقہ میں تنہا سات ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

محبوب نے بڑے دکھ سے کہا۔ "حالات نے اس غریب اور شریف آدمی کو کیا سے کیا بنادیا ہے۔"

معروف نے کہا۔ "یہ سوچو کہ اب اس کا مستقبل کیا ہوگا؟"

"معروف صاحب! اس کے متعلق غلط رائے قائم نہ کریں۔ اگر اس نے اپنی سلامتی کے لیے گن پکڑی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ غنڈہ بدمعاش بن گیا ہے۔"

"جب ہاتھ میں گن آجائے تو ارادے اور طور طریقے، رویے اور راستے سب بدل جاتے ہیں۔"

"میں نے بھی ماروی کے لیے گن اٹھائی تھی۔ گولیاں چلائی تھیں۔ دوسروں کو زخمی کیا تھا۔ خود زخمی ہوا تھا۔ کیا میرے ارادے اور طور طریقے بدل گئے ہیں؟"

وہ منہ پھیر کر بولا۔ "میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ پتا نہیں کیا عشق ہے تمہارا؟ کئی مواقع ایسے آئے کہ تم ماروی کو تحفظ دینے کی خاطر اسے اپنی منکوحہ بنا سکتے تھے۔"

وہ اپنی سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "کئی ایسے مواقع آئے کہ بدنامی سے بچانے کے لیے اسے اپنی دلہن بنا سکتے تھے لیکن تمہیں کون سمجھائے؟ تمہارے دماغ میں یہ دیانتداری سمائی رہی کہ وہ مراد کی امانت ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "وہ بے شک مراد کی امانت ہے۔ حقیقتاً میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ خود اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں اس کے دل پر کبھی جبر نہیں کروں گا۔

"اب تو اس کی مرضی کا اور اس کے دل و جان سے چاہنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اب مراد اس کے دل و دماغ میں نہیں ہے۔ ماروی اب کسی کی نہیں ہے۔ وہ کسی کو جانتی پہچانتی نہیں ہے۔ خود اسے کسی سے لگاؤ نہیں ہے۔ جس سے اس کا رشتہ کیا جائے گا اسی سے راضی ہوجائے گی۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ اب وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ ہماری محبوبہ، معشوقہ اور مطلوبہ ہوتے ہوئے بھی غیر جانبدار ہے۔ نہ میری ہے نہ اس کی ہے۔ ابھی اس کا نکاح مجھ سے پڑھایا جائے گا تو شاید وہ قبول کرلے گی۔"

"یہی میں کہتا ہوں۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ میں علاقہ کے قاضی صاحب کو فون کرتا ہوں۔ وہ ابھی آجائیں گے۔"

"نہیں۔ ایسی... بھی... جلدی... نہ... کریں معروف صاحب! یہ مراد سے بے ایمانی ہوگی۔"

وہ غصہ سے سیٹ پر اچھل پڑا۔ "فضول باتیں نہ کرو۔ تم کوئی بے ایمانی نہیں کرو گے۔ یہ سب ہی دیکھیں گے کہ ایک لڑکی جیتی جاگتی آنکھوں سے تمہیں دیکھ کر پورے ہوش و حواس میں رہ کر تمہیں قبول کرے گی۔"

"پلیز تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھیں۔ وہ بہ ظاہر ہوش و حواس میں رہے گی لیکن یادداشت کی تاریکیوں میں نہ دیکھتے ہوئے نہ سمجھتے ہوئے مجھے قبول کرلے گی اور جب...."

اور جب اس کی یادداشت واپس آئے گی تو وہ مراد کو ڈھونڈے گی اور پوچھے گی کہ میں نے اس کی یادداشت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اندھیرے میں رکھ کر اپنی زوجہ کیوں بنالیا؟"

وہ ناراض ہو کر کھڑکی کی طرف منہ کرکے بولا۔ "میں تم سے نہیں بولوں گا۔"

کار کی محدود فضا میں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر محبوب نے کہا۔ "جب اس کی یادداشت گم نہیں ہوئی تھی اور





میں جیل میں تھا جب اس نے فون پر مجھ سے کھل کر محبت کا اظہار کیا تھا۔ میں اسے جیت چکا ہوں معروف صاحب...!"

معروف نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "ایک مدت کے بعد جیسے صدیاں گزارنے کے بعد اس کے منہ سے میرے لیے عقیدت اور محبت بھرے الفاظ ادا ہوئے تھے۔"

معروف نے کہا۔ "مجھے یقین نہیں ہورہا ہے۔ کیا وہ تم سے راضی ہوگئی ہے؟"

"اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ہار گئی ہے۔ اب میں اس کے دل میں دھڑکنے لگا ہوں۔ یہ نہیں کہا ہے کہ مراد کو چھوڑ کر میری دلہن بن جائے گی۔ فی الحال میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میں اس کے دل میں بیٹھ گیا ہوں۔"

"تم اسے اس حد تک جیت چکے ہو تو موجودہ حالات میں نکاح قبول کراسکتے ہو۔"

"ایمان کی بات یہ ہے کہ جس ذہن سے اس نے میری محبت کو قبول کیا تھا، وہ ذہن اب اس کے پاس نہیں ہے۔ مجھے اس کی یادداشت کے بحال ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ سب کچھ یاد کرنے کے بعد مراد کے سامنے مجھے قبول کرے گی تو وہی حقیقتاً ایمانداری سے قبولیت ہوگی۔"

معروف پھر ناگواری سے منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ وہ بولا "معروف صاحب...! صرف پانچ دنوں کی بات ہے۔ انتظار کرلیتے ہیں۔ جب مراد آجائے گا۔ تب آپ ہم دونوں کا رشتہ ماروی کے پاس لے جائیں۔"

"تم دونوں ہم شکل ہو۔ وہ مال و دولت کی لالچی نہیں ہے۔ اگر وہ مراد کو تم پر ترجیح دے گی۔ اسے بھول جانے کے باوجود اسی کے نکاح میں آنا چاہے گی تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔ بہت غلط ہوگا۔"

"غلط ہوگا تو ہمیں صبر و تحمل سے پہلے اس کا علاج کرانا ہوگا۔ جب یادداشت واپس آجائے گی تو وہ خود ہی اپنی قسمت کا فیصلہ سنادے گی۔"

وہ ناگواری سے منہ بنا کر بولا۔ "خوامخواہ کی بحث ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اس کا فیصلہ کیا ہوگا۔"

"ہم اور آپ تقدیر سے نہیں لڑسکیں گے اور تقدیر تو سب کی دوست ہوتی ہے۔ سب کی دشمن ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے میری دوست بن جائے۔"

حالات اچانک بدلتے ہیں۔ اچانک کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے۔ واقعی تقدیر دشمن سے دوست ہوسکتی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ ڈرائیو کرتا رہا سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "مراد کی رہائش کا کہیں بندوبست کیا جائے۔ ہم دونوں ماروی سے دور رہیں گے۔ حسب ضرورت اس سے ملتے رہیں گے۔ اس کا علاج ہوتا رہے گا۔ وہ ہم سے ملتی رہے گی۔ یہ ہم سب دیکھیں گے کہ وہ رفتہ رفتہ کس سے متاثر ہوگی اور لائف پارٹنر کے لیے کسے قبول کرے گی۔"

کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئی۔ تمام راستے محبوب کے دل میں یہ خوشیاں مچل رہی تھیں کہ ایک طویل عرصے کے بعد ابھی ماروی کو روبرو دیکھے گا۔

آدھی رات ہوچکی تھی۔ وہ اسی وقت اسے نہ دیکھ سکا۔ سب ہی سکھر سے طویل فاصلہ طے کرکے شام کو وہاں آئے تھے۔ ماروی سوگئی تھی۔ سمیرا بھی دوسرے بیڈروم میں تھی۔ چاچا ڈرائنگ روم کے صوفے پر پڑا تھا۔ چاچی مراد کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ محبوب کو دیکھ کر بولی۔ "سائیں سے ملاقات ہوگئی؟"

معروف نے کہا۔ "یہ سائیں ہیں۔"

چاچی نے چونک کر اسے دیکھا پھر پیشانی پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "آپ میری اتی جیسی ہیں۔ آپ کی پیشانی کو میں سلام کرتا ہوں۔" اس نے السلام علیکم کہتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ وہ خوش ہو کر دعائیں دینے لگی۔

اس نے پوچھا۔ "ماروی کہاں ہے؟"

"کمرے میں ہے۔ شاید سو رہی ہے۔ کوئی بات نہیں جاگ جائے گی، آؤ اس سے ملو۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "اگر سو رہی ہوگی تو اسے نہ جگانا۔ آپ سب لمبے سفر کے تھکے ہوئے ہیں۔"

پھر اس نے معروف سے کہا۔ "پلیز آپ بھی جائیں اور آرام کریں۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

معروف اس کے شانے کو تھپک کر چلا گیا۔ وہ سب اسی کوٹھی میں رات گزارنے والے تھے۔ چاچی نے دروازے کے پاس آکر اسے آہستگی سے کھولا۔ ماروی بیڈ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اپنے آپ کو بھی بھولنے کے بعد پتا نہیں خواب میں کیا دیکھ رہی ہوگی؟

چاچی آگے بڑھ کر اس کے بدن پر چادر درست کرنے لگی۔ محبوب سحر زدہ سا ہو کر خوابیدہ حسن کو دیکھنے لگا۔ بہت دنوں کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحات یاد آرہے تھے جب اسے اپنے شانے پر لاد کر گولیوں کی بوچھار سے گزرتا گیا تھا۔ مکھن جیسے بدن کی ملائمت اسے اپنے شانے کے سینے پر محسوس ہو رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں پوچھ رہی تھیں۔ کیا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

بدن کا وہی لطیف لمس پھر نہیں ملے گا؟

وہ فوراً ہی سر جھکا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ کیونکہ دل بے ایمان ہو رہا تھا۔

متقی نے باہر آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کھانا گرم کروں؟“

”نہیں۔ بھوک نہیں ہے۔ آپ آرام کریں۔“

معروف نے سمیرا کے دروازے پر آ کر دستک دی تھی۔ وہ سو رہی تھی۔ اس کے دل کا معاملہ محبوب کے ساتھ تھا۔ مراد کے اور معروف کے انتظار میں جاگنا ضروری نہیں تھا۔

وہ دستک کی آواز پر آنکھیں ملتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آئی۔ معروف نے اس کے چہرے پر بیزاری دیکھی پھر مسکرا کر کہا۔ ”ابھی تمہاری نیند اڑ جائے گی... محبوب آیا ہے۔“

وہ ایکدم سے چونک گئی۔ آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ خوش ہو کر بولی۔ ”سچ...؟ اور وہ مراد...؟“

”اپنی جگہ پہنچ گیا ہے۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

وہ تیزی سے اس کمرے کی طرف جانے لگی جہاں وہ ماروی کو چھوڑ کر آئی تھی۔ یہ سمجھ گئی تھی کہ دیوانہ اُدھر گیا ہوگا۔

اور واقعی وہ اسی کمرے کے سامنے متقی سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ بڑی توجہ سے اسے دیکھنے لگی ...... وہ مسکرا کر بولا۔ ”اے وہاٹ مین ہیز کم بیک۔“

وہ ایکدم سے تڑپ کر اس کے بازو سے آ کر لگ گئی۔ خوشی کے مارے رونے لگی۔ ان کے درمیان ایک دوسرے کو چھو لینے کی بے تکلفی نہیں تھی۔ ویسے تو وہ ریزرو رہتی تھی لیکن اس وقت دل بے قابو ہو گیا تھا۔ ایسی تڑپا دینے والی جدائی جذبات کو بے لگام کر دیتی ہے۔ وہ پھر بھی ایک حد تک سنبھلی ہوئی تھی۔

محبوب نے کہا۔ ”تم بہت اچھی ہو سمیرا! بہت وفادار ہو۔ میرے تمام معاملات میں بہت ذمہ دار ہو۔ میری کتنی ہی مشکلیں آسان کرتی رہتی ہو۔“ وہ اس کے دونوں شانوں کو تھام کر بولا۔ ”اور میں کیا کرتا ہوں۔ تمہیں دکھ پہنچاتا رہتا ہوں۔“

”آپ ایسا نہ کہیں۔ آپ کی طرف سے ملنے والا دکھ بھی بہت پیارا لگتا ہے۔“

”میں کیا کروں۔ ابھی سوری بولوں گا پھر جنون میں کہیں نکل جاؤں گا۔ پھر بھی تمہارا خیال آئے گا تو پھر تمہاری وفائیں شرمندہ کریں گی۔ تم چاہو تو مجھے شرمندگی سے بچا سکتی ہو۔“

سمیرا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اگر آپ کو شرمندگی سے بچا سکتی ہوں تو ضرور بچاؤں گی؟“

”شادی کر لو۔ اپنا گھر بسا لو۔“

اس نے نظریں جھکائیں پھر نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”آپ ماروی کو بھول سکتے ہیں؟ میں جواب جانتی ہوں۔ اسی طرح آپ کو بھی میرا جواب معلوم ہونا چاہیے۔“

”تمہیں بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ماروی میرے لیے کیا ہے...؟ لاحاصل ہے۔ لیکن ایک آس ہے۔ ایک امید ہے۔“

”آپ بھی میرے لیے کیا ہیں...؟ لاحاصل ہیں لیکن ایک آس ہیں۔ ایک امید ہیں۔“

پھر وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”آئیں۔ آرام سے بیٹھیں۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔“

”بھوک نہیں ہے۔ رہنے دو۔“

”آپ کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے نہیں۔ جیل سے آئے ہیں۔ زیادہ نہیں کچھ تو کھا کر سونا چاہیے۔“

وہ اس کے ساتھ کچن میں آ گیا۔ یوں ذرا سا تھوڑا کر اس کا دل رکھنا چاہتا تھا۔ دل سے اس کی قدر کرتا تھا۔ وہ واقعی فرض شناس اور وفا شعار تھی۔ اس لیے قابل قدر تھی۔

☆☆☆

مراد پھر اسی لباس میں اسی کوٹھری میں آہنی سلاخوں کے پیچھے آ گیا تھا۔ محبوب نے اسے اپنا سیل فون دے کر سمجھایا تھا کہ اس نمبر پر جیلر اور مرینہ کال کر سکتے ہیں۔ لنگڑا جانی بھی ضرورت کے وقت کال کرے گا۔

جب تک جیلر اور مرینہ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ قیدی پھر بدل گیا ہے اور اب محبوب نہیں مراد ہے تب تک وہ باپ بیٹی اسے محبوب سمجھ کر اس کے دباؤ میں رہیں گے۔

جیلر تو اب سہا ہوا رہتا تھا کہ کسی وقت بھی محبوب اس کی مخالفت کرے گا جیل میں چیخ پکار کرے گا کہ وہ مراد نہیں محبوب ہے تو اس کی ملازمت بھی جائے گی اور سزا بھی ہوگی۔

مراد کو وہاں پانچ دنوں تک بہت محتاط رہ کر محبوب بن کر رہنا تھا۔ اسے ہاتھ جوڑ کر بات کرنے اور جیلر کو سائیں کہنے کی عادت سے باز رہنا تھا۔

رات کے ایک بجے اس کے فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”سر! میں جانی بول رہا ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق یہاں سکھر میں...“





مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ”ایک منٹ جانی! سر کا نمبر بدل گیا ہے۔ دوسرا نمبر نوٹ کرو۔“

اس نے محبوب کا نمبر نوٹ کرایا۔ جانی نے اس نمبر پر رابطہ کیا۔ اس وقت محبوب سمیرا کے ساتھ کچن میں تھا۔ اس نے کالنگ ٹون سن کر ننھی سی اسکرین پر نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں جانی...! بولو؟“

اس نے کہا۔ ”میں یہاں اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ ہوں۔ آپ کے حکم کے مطابق مرینہ پر نظر رکھتا رہا۔ دو دن پہلے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ہم اسے تلاش کرتے رہے۔ آج پتا چلا کہ وہ گولیاں کھا کر بری طرح زخمی ہو کر اسپتال میں پڑی ہے۔ شہر کے باہر ایک تاریخی کھنڈر میں کسی سے کاؤنٹر فائرنگ ہوئی تھی۔“

محبوب نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں۔ وہ ہمیں نقصان پہنچانے والی تھی۔ میں نے تمہیں اس کے پیچھے لگایا تھا۔ وہ میرے ہم شکل مراد کے ہاتھوں زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئی ہے۔“

”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”اب بھی اسے اپنی نظروں میں رکھو۔ اس کا باپ کراچی واپس آ رہا ہے۔ پتا نہیں بیمار بیٹی کو چھوڑ کر واپس کیوں آ رہا ہے۔ کل صبح یہاں پہنچے گا۔ جیل میں میرے ہم شکل سے ملے گا تو شاید باپ بیٹی کے متعلق معلوم ہو سکے گا کہ وہ کراچی سے سکھر تک پھر سکھر سے کراچی تک کیا کرتے پھر رہے ہیں۔“

محبوب نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کچھ کر رہے ہیں لیکن یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ کیا کر رہے ہیں؟

یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ اب سے تیس گھنٹے بعد برنارڈ ان کی مدد سے فرار ہونے والا تھا۔ مرینہ کو چھ ماہ کے لیے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اس کی ملازمت کو بحال کرنے کی خاطر اس کا باپ برنارڈ کو جیل سے فرار کرانے کے لیے دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ کراچی آ رہا تھا۔

مرینہ اسپتال میں تنہا تھی۔ باپ اپنے دو مسلح ماتحتوں کو اس کی حفاظت کے لیے چھوڑ کر گیا تھا۔ لنگڑا جانی اپنی محدود معلومات کے مطابق یہ دیکھ رہا تھا کہ اس شہر کے پولیس افسران نے مرینہ کے لیے سیکورٹی فراہم کی ہے۔ اگر کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہ لندن کی میٹ آفیسر نہیں رہی ہے تو وہ لنگڑا اس اسپتال میں ہی اس کا جینا حرام کر دیتا۔

جیلر صبح آٹھ بجے کراچی پہنچ گیا۔ جیل میں آتے ہی سیدھا قیدی نمبر سات سو سات سے ملنے آیا۔ وہ غصہ میں

## کھلکھلاہٹیں

ایک شخص کی دو بیویاں تھیں۔ ایک دن آپس میں جھگڑ رہی تھیں۔ ایک کہہ رہی تھی۔ ”آج بدھ ہے“ دوسری نے کہا۔ ”آج جمعرات ہے۔“ اتنے میں شوہر گھر میں آیا۔ جب اس نے یہ باتیں سنیں تو اس نے کہا۔ ”کیا میں ہی بے وقوف ہوں جو جمعہ کی نماز پڑھ کر آ رہا ہوں۔“

☆☆☆

ایک نو بیاہتا دلہن نے اپنے ہاتھوں سے پکایا ہوا کھانا شوہر کو کھلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اگر میں آپ کو اسی طرح کھانا کھلاتی رہی تو مجھے کیا انعام ملے گا؟“

”میری انشورنس کے پچاس ہزار روپے۔“ شوہر نے جواب دیا۔

☆☆☆

پہاڑی علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک شخص، گھر والوں کے ساتھ موٹر وے پر گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ میں سیٹ بیلٹ بھی باندھے ہوئے تھا۔

موٹر وے پولیس کے آفیسر نے دیکھا تو حیران ہوا اور خوش بھی۔ اسے روکا۔ داد دی اور بطور انعام کچھ رقم دی۔ پھر کہا ”آپ کیا کریں گے؟“

اس آدمی نے کہا۔ ”گاڑی کا لائسنس بناؤں گا۔“

پاس بیٹھے باپ نے عجلت میں کہا۔ ”تمہیں کہا تھا نشے کی حالت میں گاڑی مت چلاؤ۔“

پچھلی سیٹ پر بیٹھی والدہ بولی۔ ”میں نے بھی کہا تھا۔ چوری کی گاڑی میں مت لے جاؤ۔ پکڑے گئے ناں۔“

ٹریفک آفیسر ہکا بکا رہ گیا۔

چند ثانیے بعد ڈگی سے بھائی کی آواز بلند ہوئی۔

”گاڑی سرحد پار کر گئی ہے یا نہیں؟“

مرسلہ: سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھرا ہوا تھا۔ مراد نے سوچ لیا تھا کہ اس سے سامنا ہوگا تو کم سے کم بولے گا تاکہ باتوں سے پکڑا نہ جائے۔

اس نے آہنی سلاخوں کے پاس آکر اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بھی اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ محبوب نے سمجھا دیا تھا کہ اپنا پلڑا بھاری ہے جیلر کے دباؤ میں کبھی نہ آنا۔

وہ غصّہ سے بولا۔ ”تمہارے اس ہم شکل کتے نے میری بیٹی کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

جسے زندہ نہ چھوڑنے کی بات کہہ رہا تھا۔ وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اسے پکڑو گے تب مارو گے۔ یہاں میرے سامنے کیوں اچھل رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”ماروی یہاں کراچی آگئی ہے۔ اس کے پاس مراد کا فون نمبر ہے۔ معروف تجلی کے پاس بھی ہوسکتا ہے۔ تم ابھی ان سے نمبر لو اور مجھے دو۔“

”کیا گھاس کھا کر آئے ہو؟ میں اپنے ہی آدمی کے پیچھے تمہیں لگا دوں گا۔ یہ کس دماغ سے سوچ رہے ہو؟“

وہ پاؤں پٹختا ہوا سلاخوں سے ذرا دور گیا پھر پلٹ کر آتے ہوئے بولا۔ ”میں نے غصّہ میں کہا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیٹی اس کی موت نہیں چاہتی ہے۔ اس کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کر بھی اسی کے ساتھ جینا مرنا چاہتی ہے۔“ اس نے ایک ذرا التجا سے کہا۔ ”مجھے اس کا نمبر دو۔ اس سے بات کرنے دو۔ میں اپنی بیٹی سے اس کی صلح کراؤں گا۔“

”نہ وہ احمق ہے نہ ہم نادان ہیں۔ نہ وہ صلح کرے گا۔ نہ ہم کرنے دیں گے۔ دوسری بات کرو۔“

وہ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ”تم مجھے غصّہ دلا رہے ہو۔“

”ہاں اتنی دیر سے یہی کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں غصّہ سے پاؤں پٹختے ہوئے یہاں سے چلے جاؤ۔“

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ”محبوب! یہ نہ سمجھو کہ مراد کی جگہ تمہیں یہاں لا کر پھنس گیا ہوں۔ اگر میری بیٹی چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئی تو میں خود ہی عدالت میں بیان دوں گا کہ میں مراد کو فرار کرانے کا مجرم ہوں اور تم نے مفرور مجرم کی جگہ آنے کا سنگین جرم کیا ہے۔“

وہ مراد کو گھونسا دکھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں لمبی سزا ہوگی۔ ارب پتی محبوب علی چانڈیو کی عزت اور شہرت خاک میں مل جائے گی۔ مجھے اپنے خلاف کچھ کرنے پر مجبور نہ کرو۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”جتنی جلدی ہوسکے یہی کر دو اور بولو یہ ڈراما کب کرو گے؟“

اس نے غصّہ سے گالی دی۔ مراد نے چیخ کر کہا۔ ”میں محبوب علی چانڈیو ہوں۔“

دلاور جان کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یکبارگی سارا غصّہ ہوا ہوگیا۔ جس جیل کا جیلر تھا وہاں خود کو قیدی کے روم میں دیکھنے لگا۔ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”چپ ہوجا۔ میں غصّہ میں تھا۔ اب کچھ نہیں بولوں گا۔“

مراد نے کہا۔ ”تو نے مجھے گالی دی ہے۔ ابھی جو گالی دی ہے۔ ایسی ہی دس گالیاں اپنے آپ کو دے۔ ورنہ کرے گا تو اپنے نام کا ڈنکا پٹنے لگوں گا۔“

وہ جلدی جلدی ایک ایک انگلی گنتے ہوئے خود کو گالیاں دینے لگا۔ مراد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بس اب جا یہاں سے...“

وہ فوراً ہی پلٹ کر وہاں سے تیزی سے چلتا ہوا جیل کے دوسرے حصّے میں آیا پھر تنہائی میں مراد کو جی بھر کے گالیاں دینے لگا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے رہائشی کمرے کی طرف جانے لگا۔ یہ بات دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی کہ بیٹی مراد کے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ کر ذلیل ہوئی ہے اور وہ محبوب کے ہاتھوں ذلیل ہو کر اپنے آپ کو گالیاں دیتا رہا ہے۔ بیٹی کی شکست اور اپنی ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ اسے محبوب سمجھ کر سوچ رہا تھا کہ مراد کبھی ہاتھ آئے نہ آئے۔ محبوب ہاتھ میں ہے اس سے انتقام لینا چاہیے۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا ایک موقع ہاتھ آنے والا تھا۔ اب سے بائیس گھنٹے بعد برنارڈ جیل سے فرار ہونے والا تھا۔ گولیاں چلنے والی تھیں۔ دھماکے ہونے والے تھے۔ ایسے ہنگامے میں ایک گولی قیدی نمبر سات سو سات کو آ کر لگ سکتی تھی۔ اس کا قصّہ تمام کر سکتی تھی۔

وہ سوچتا ہوا دفتری کمرے میں آیا۔ وہاں قائم مقام جیلر اس کی کرسی چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اس کی عدم موجودگی میں جیل کے جو اہم معاملات درپیش ہوئے ان کا ذکر کرنے لگا۔ پھر ایک فائل اٹھا کر اسے دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ مراد علی منگی قیدی نمبر سات سو سات کی فائل ہے عدالت سے نوٹس آیا ہے۔ آج سے چوتھے دن آخری پیشی ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ کی صلح صفائی کو اور سمجھوتے کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس روز مراد کو رہائی مل جائے گی۔“

یہ ایک نئی اطلاع تھی اور جیلر کو اس کی رہائی منظور نہیں



تھی۔ اگرچہ یہ اس کے حق میں بہتر تھا۔ چار دنوں کے بعد اس اندیشے سے نجات مل جاتی کہ وہ بھی قیدیوں کو تبدیل کرنے کے الزام میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

وہ آرام سے بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اگر رہائی سے پہلے محبوب بائیس گھنٹے بعد مارا جائے تو باپ بیٹی کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے۔

ایک اور آئیڈیا ذہن میں آیا کہ اسے ہلاک نہ کرایا جائے۔ برنارڈ کے ساتھ فرار کرایا جائے تو جیل توڑنے اور فرار ہونے کے جرم میں چار دنوں بعد ملنے والی رہائی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔ محبوب کو پھر نئے سرے سے سزا ملے گی اس بار وہ قیدی بن کر رہے گا تو جیلر کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ نہیں ہوگی تب وہ اس قیدی سے گن گن کر بدلے لے سکے گا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ برنارڈ کے سیل کی طرف جانے لگا۔ وہاں دارا اکبر اور بہرام تھے۔ برنارڈ کی خدمت کرنے اور فرار کی پلاننگ کو ہر پہلو سے مستحکم بنانے کے لیے آتے رہتے تھے۔ اس روز تو وہ جیلر کے ساتھ سکھر سے ایک گاڑی میں آئے تھے اور برنارڈ کے سیل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

برنارڈ نے جیلر کو دیکھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کم آن مسٹر جان! اب میری الوداع کے لیے اٹھارہ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ کیا آپ ہماری پلاننگ سے مطمئن ہیں۔“

”بالکل مطمئن ہوں۔ پلاننگ ایسی ہے کہ جیل توڑنے اور فرار ہونے کا الزام مجھ پر نہیں آئے گا۔“

”آپ اور کوئی تجویز دینا چاہتے ہیں؟“

اس نے دارا اکبر اور بہرام کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے پرسنل معاملے میں کچھ کہنے آیا ہوں۔ قیدی نمبر سات سو سات کو بھی یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔“

ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اس سے پوچھا۔ ”اسے ہم کہاں لے جائیں گے؟“

اس نے کہا۔ ”پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اپنے سر پر بوجھ نہ لو۔ اسے صرف باہر تک لے جاؤ۔ راستے میں جہاں مناسب سمجھو اسے زخمی کر کے پھینک دو تاکہ وہ پھر گرفتار ہو کر یہاں میرے پاس واپس آئے۔“

برنارڈ نے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ ہمیں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہیے۔“

”کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا تم لوگوں نے سات خطرناک قیدیوں کو اپنی پلاننگ میں شامل کیا ہے۔ ان کے بغیر تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے جہاں وہ سات ہوں گے وہاں میرا ایک آٹھواں قیدی بھی ہوگا۔“

دارا نے کہا۔ ”وہ ساتوں قیدی اپنی اپنی راہ نکل جائیں گے۔ وہ تمہارا قیدی ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔“

”پیچھے نہیں لگے گا۔ بلکہ یہاں سے بھاگنا بھی نہیں چاہے گا۔ تم اسے جبراً کسی بھی طرح لے جاؤ گے۔“

”وہ کوئی معصوم بچہ نہیں ہے کہ اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ مرینہ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ بہت ہی خطرناک ہے۔ اس نے تنہا سات ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور مرینہ کو بھی اسپتال پہنچایا ہے۔“

دلاور جان نے کہا۔ ”یہ وہ قیدی نہیں ہے۔ وہ تو آزاد گھوم رہا ہے۔ یہاں اس کا ہم شکل ہے۔ میں ایسی پلاننگ سے انتقام لینا چاہتا ہوں کہ وہ جو آزاد گھوم رہا ہے اور جو میری بیٹی کا دشمن ہے وہ ہمارے شکنجے میں آجائے۔“

”تم اس قیدی کو یہاں سے فرار کرانے کے بعد گرفتار کراؤ گے تو وہ دوسرا تمہارے شکنجے میں کیسے آئے گا۔“

اس نے ان تینوں کو دیکھا پھر کہا۔ ”اس جیل میں ایسا کھیل کھیلا جا چکا ہے۔ جسے کوئی نہیں جانتا۔ یہاں آج جو قیدی نمبر سات سو سات ہے اس کا نام محبوب ہے لیکن اصلی مجرم اصلی قیدی اس کا ہم شکل مراد تھا۔ میں نے انہیں بدل دیا تھا۔ مراد کو باہر نکال کر محبوب کو اندر لے آیا تھا۔“

وہ تینوں اسے حیرانی سے اور تعریفی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بہرام نے کہا۔ ”تم نے دو ہم شکل سے ایسا کھیل کھیلا ہے کہ کوئی یہاں شبہ بھی نہیں کرتا ہوگا کہ قیدی بدل گئے ہیں۔“

”کسی کا باپ بھی شبہ نہیں کرے گا۔ اب میں چاہتا ہوں میری بیٹی کا دشمن مراد یہاں اپنی جگہ واپس آجائے۔ آج سے چوتھے دن مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں ہوگا اور محبوب کو یہاں سے رہائی مل جائے گی۔ یہ اُبھی ہوئی بات سمجھو کہ حقیقتاً مراد مجرم اور قیدی ہے اسے رہائی مل جائے گی۔ ہم چاہیں تو اس کی رہائی قید بامشقت میں تبدیل ہو جائے گی۔ تم لوگ محبوب کو جبراً یہاں سے لے جاؤ گے۔ باہر لے جا کر کہیں بھی زخمی کر کے پھینک دو گے۔“

”تمہاری اس پلاننگ سے محبوب یہاں واپس آئے گا۔ تمہاری بیٹی کا دشمن مراد تو نہیں آئے گا۔“

”آئے گا۔ مراد اس طرح آئے گا کہ محبوب کا احسان مند ہے۔ اپنی جگہ سزا کاٹنے والے کو یہاں سے نکالنے کے لیے پھر یہاں آئے گا۔ میں خوب سوچ سمجھ کر بول رہا ہوں۔ محبوب کو یہاں سے نکال کر مراد کو اندر لے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

آؤں گا۔''

ان تینوں نے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر انکار میں سر ہلایا۔ برنارڈ نے کہا۔ ''سوری۔ ابھی ہماری پلاننگ میں کوئی خامی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ تم کمزوری پیدا نہ کرو۔ یہ ایک انٹرنیشنل کرمنل گیم ہے۔ اس میں اپنا پرسنل معاملہ شامل نہ کرو۔ اپنا پرسنل گیم پھر کسی وقت کھیلو۔''

دلاور جان نے تن کر کہا۔ ''کھیلنا تو ابھی ہے۔ تمہارے ساتھ اسے باہر نکالنا ہے۔ اس نے میری بیٹی کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا ہے۔ اس کی ملازمت چھین لی ہے۔ اس کی صحت اس کی شخصیت اور اس کا کیریئر برباد کر دیا ہے۔ میں اسے بھی یہاں لا کر ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دوں گا۔''

دارا نے کہا۔ ''ہم برنارڈ کو یہاں سے نکالنے کے بعد تمہارے کام آئیں گے۔ مرینہ ہماری سینئر آفیسر ہے۔ ہم مراد سے اس کا انتقام لیں گے۔ اسے کتے کی طرح دوڑاتے ہوئے تمہارے قدموں میں لائیں گے۔''

جیلر نے کہا۔ ''کسے سمجھا رہے ہو؟ کیا تمہاری تمام پلاننگ مجھے معلوم نہیں ہے۔ تم تینوں میرے سامنے پلان کرتے رہے ہو اپنے سینئر افسران سے فون پر بولتے رہے ہو۔ بائیس تاریخ کی رات یعنی اب سے اٹھارہ گھنٹے بعد ائیرپورٹ کے ایک پرائیویٹ رن وے پر ایک طیارہ پرواز کے لیے تیار رہے گا۔ تم تینوں یہاں سے نکل کر سیدھے وہاں جاؤ گے۔''

وہ تینوں اسے گھورتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جیلر کہہ رہا تھا۔ ''برنارڈ کو قتل کے مقدمے سے اور سزائے موت سے بچانے کے لیے صرف مجھ جیسا ایک جیلر ہی اپنے ملک سے دشمنی نہیں کر رہا ہے اور بھی بڑے بڑے لوگ اسے یہاں سے اڑا لے جانے کے انتظامات کر چکے ہیں۔''

برنارڈ نے غصے سے کہا۔ ''اور تم اتنے بڑے کرائم آپریشن کو ناکام بنا دینا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ناکامی تو اس وقت ہوگی' جب میرا کام نہیں ہوگا پھر میں بھی تمہارے کام نہیں آؤں گا۔''

بہرام نے کہا۔ ''جانتے ہو' اس کا انجام کیا ہوگا۔ تمہاری برسوں کی ملازمت چلی جائے گی۔''

''میری بیٹی کی ملازمت چلی گئی ہے۔ میری بھی چلی جائے گی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''اوپر والوں کی طرف سے تم پر جو عذاب نازل ہوگا' اس کا اندازہ تمہیں ہے؟''

''میں تیار بیٹھا ہوں۔ فوراً ہی پلٹا کھاؤں گا۔ میرا سروس ریکارڈ بے داغ ہے۔ میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعہ بیان دوں گا کہ میں نامعلوم افراد کے دباؤ میں نہیں آیا۔ میں نے رشوت کے لاکھوں ڈالرز کو ٹھکرا دیا۔ میں محب وطن ہوں۔ میں نے برنارڈ کے فرار ہونے کے مشن کو ناکام بنایا ہے۔''

وہ تینوں اسے پریشان ہو کر دیکھنے لگے۔ وہ بول رہا تھا۔ ''ذرا سوچو' پھر تو میرے نام کے ڈنکے بجنے لگیں گے۔ میں اپنے ملک کا ایک ہیرو' ایک دیانتدار افسر کہلاؤں گا۔''

وہ بڑے ہی فیصلہ کن انداز میں بول رہا تھا جو بول رہا تھا وہی کرنے والا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے مشورے کرنے لگے۔ ویسے کرنا تو وہی تھا' جو وہ کہہ رہا تھا۔ وہی جیل کا حکمران تھا۔

آخر وہ تینوں راضی ہو گئے۔

☆☆☆

وہ سمیرا کے ساتھ کچھ وقت کچن میں گزار کر دو چار لقمے کھانے کے بعد ایک کمرے میں سونے کے لیے آگیا تھا۔ سمیرا نے ابھی اپنی موجودگی سے کسی حد تک اسے بہلا دیا تھا۔ تنہا ہوتے ہی پھر اس کے حواس پر وہی چھا گئی۔

اس نے سوئچ آف کر کے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ ''وہ گہری نیند میں ہوگی۔'' اس نے اپنے بند دروازے کو دیکھا۔ ''نہیں۔۔۔ شاید کسی وجہ سے آنکھ کھل گئی ہوگی۔'' اس نے پھر کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔ ''شاید میری طرح کروٹیں بدل رہی ہوگی۔ وہ کمرے میں اکیلی ہے۔ یہ نئی جگہ ہے۔ وہ پچھلی باتیں بھول چکی ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ کیا کرے گی؟''

وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ دماغ شور مچا رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر آئی ہے۔

وہ فوراً ہی بیڈ سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ باہر کوئی نہیں تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے کے تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ سامنے والے کمرے میں سو رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ بند دروازے کو یوں تکتا رہا جیسے وہ تقدیر کی طرح کھلنے والا ہو۔ خوش فہمی اسے نچا رہی تھی۔ پھر عقل نے سمجھایا۔ ''یہ تیری نادانی ہے اور دنیا کی نظروں میں دیوانگی ہے۔ کل صبح اسے دیکھ لینا۔ جا سو جا۔''

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اسے بھی سونا ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔





وہ دماغی کمزوریوں کا شکار ہونے والی بھی سو رہی تھی۔ پرسکون سے آئے تو خواب ضرور آتے ہیں۔ کیا وہ خواب دیکھ رہی ہوگی؟ جو پچھلی باتیں یاد ہوتی ہیں۔ انہی کے حوالے سے ہم متاثر ہو کر جذباتی ہو کر خواب دیکھتے ہیں۔ اسے تو نہ کچھ یاد تھا نہ وہ کسی سے متاثر تھی اور نہ ہی کسی کے لیے اس کے جذبات تھے پھر وہ خواب میں کسے دیکھ رہی ہوگی؟

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کچھ دیکھا تھا۔ وہ ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگی' کیا دیکھا تھا؟

وہ بے چین ہوگئی۔ لیٹے ہی لیٹے کسمسانے لگی۔ خواب کی اسکرین پر جو نظر آیا تھا۔ وہ بجھ گیا تھا۔ دماغ اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ حافظے میں کوئی بات نہیں رہتی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دیکھا ہوا خواب بھول گئی تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ادھر سے ادھر تک کمرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''میں کہاں ہوں؟ پہلے کسی دوسرے شہر میں تھی۔ یہ لوگ مجھے یہاں لے آئے۔ پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں۔ سب ہی پیار اور اپنایت دے رہے ہیں۔''

اس نے تصور میں ممی کو دیکھا پھر سوچا۔ ''مجھے چاچی بہت اچھی لگتی ہیں۔ کیا میری کوئی ماں ہوگی تو ایسی ہی ہوگی؟''

وہ بیڈ سے اتر کر دروازے تک آئی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں محبوب تھا۔ اب کوئی نہیں تھا۔ تمام دروازے بند تھے۔ اس نے سوچا۔ ''کیا میں پہلے بھی اس کوٹھی میں آ چکی ہوں۔ اگر یہ لوگ میرے رشتے دار ہیں تو میں یہاں ضرور آ کر رہ چکی ہوں۔''

اس نے آگے بڑھ کر ایک دروازے کو آہستگی سے کھولا۔ وہ پوری طرح کھلتا چلا گیا سامنے بیڈ پر چاچی ممی سو رہی تھیں۔ وہ بیڈ کے قریب آ کر اسے دیکھنے لگی۔

ممی نے اسپتال میں اس سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔ اسے بچپن کی اور جوانی کی بہت سی باتیں یاد دلانے کی کوششیں کرتی رہی تھیں۔ اسے کچھ یاد تو نہیں آیا لیکن دل نے کہا۔ ''یہ چاچی سچ کہہ رہی ہے۔ بھلا جھوٹ کیوں کہے گی؟''

وہ بڑے جذبے سے آگے کو جھک کر اس کے سفید بالوں پر ہاتھ رکھ کر دل ہی دل میں بولی۔ ''تم اچھی لگتی ہو۔ تمہیں تو اپنا سمجھنا ہوگا۔ اور کون ہے میرا۔۔۔؟ میں کہاں جاؤں گی۔۔۔؟

یا خدا اتنی بڑی دنیا میں کیسی اکیلی ہوں۔ یوں لگتا ہے آسمان سے آ گری ہوں زمین پر میرا کوئی نہیں ہے۔''

ممی نیند میں ذرا کسمسائی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ الٹے قدموں چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔

پتا نہیں کتنی رات گزر چکی تھی۔ ایسی گہری خاموشی تھی جیسے اتنی بڑی کوٹھی میں کوئی رہتا نہ ہو۔ اس نے سر گھما کر دوسرے دروازے کو دیکھا اور سوچا۔ ''کیا وہاں ایسی چیز ہوگی جسے دیکھ کر مجھے بھولی ہوئی کوئی بات یاد آ جائے؟''

وہ دروازے پر آگئی۔ اس کے ہینڈل پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ پوری طرح کھلتا چلا گیا۔ ایک بیڈ پر سمیرا سو رہی تھی۔ اس سے اچھی طرح شناسائی ہو چکی تھی۔ وہ سکھر سے اس کے ساتھ ہی آئی تھی۔

اس نے سمیرا کے متعلق سوچا۔ ''یہ بھی اچھی ہے۔ مجھ سے زیادہ باتیں تو نہیں کیں لیکن بہت پڑھی لکھی ہے۔ مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتی رہتی ہے۔''

وہ کمرے کے اندر نہیں گئی۔ دروازے سے دور تک اندر دیکھتی رہی۔ شاید کوئی چیز اس کی یادوں کو پکارے۔ لیکن نہیں کسی چیز نے یادداشت کے بند دروازے پر دستک نہیں دی۔

اس نے وہاں سے پلٹ کر تیسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک ایک قدم چلتی ہوئی وہاں آگئی۔ کوئی تو ایسا دروازہ کھلتا کہ وہ کسی اپنے تک پہنچ جاتی۔ سب ہی انجانے اور اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے دروازے کو آہستگی سے کھول کر چھوڑ دیا۔ وہ بھی دھیرے دھیرے پوری طرح کھل گیا۔ سامنے وہ قدآور گبرو شخص بیڈ پر سو رہا تھا۔ وہ ایسا ہی چہرہ اسپتال میں دیکھ چکی تھی۔ چاچی نے بتایا تھا کہ اس کا نام مراد ہے۔

اس کی نظریں محبوب کے ننگے بازو پر آ کر ٹھہر گئیں۔ وہاں ایک بڑے سے زخم کا نشان تھا۔ یکبارگی اس کے کانوں میں تڑاتڑ۔ تڑاتڑ فائرنگ کی آواز گونجی پھر تھم گئی۔

وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''کہیں گولیاں نہیں چل رہی تھیں۔ کہیں سے آواز نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں کیوں ایسا لگا کہ گولیاں چلی ہیں۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بازو کے مندمل ہونے والے زخم کے نشان کو دیکھ رہی تھی۔ حافظہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں انہی بازوؤں میں رہ کر اس کے سینے سے لگ کر سفر کرتی رہی تھی۔ پھر کار کے اندر فرسٹ ایڈ بکس کی دواؤں کے ذریعہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اناڑی پن سے اس کی مرہم پٹی کرتی رہی تھی۔ اس نے اس کے زخمی بازو کو تھاما تھا۔ اس سے لگ کر روئی بھی تھی۔

آہ... !کہاں ہو گزرے ہوئے لمحو...! اپنی ایک ذرا سی جھلک تو دکھا دو۔

وہ گم صم سی کھڑی محبوب کو تک رہی تھی۔ کوئی ایک بات کوئی گزرا ہوا ایک لمحہ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ جانے کیسے فائرنگ کی آواز گونجتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ایک ذرا سی شناسائی نہیں تھی کہ کبھی اس شخص کو دور سے بھی دیکھا ہو۔

وہ باہر آگئی، تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آکر دروازے کو بند کر کے بستر پر گر پڑی۔

آخر وہ رات گزر گئی۔ دن نکل آیا۔ سب ہی تھکے ماندے غفلت کی نیند میں تھے۔ پھر محبوب کی آنکھ پہلے کھلی۔ وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ یہ سوچ کر سویا تھا کہ صبح ماروی سے پہلے بیدار ہوگا پھر غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر لباس بدل کر اس کے سامنے جائے گا۔

اس نے گھڑی دیکھی دن کے آٹھ بجے تھے۔ وہ بیڈ سے اتر کر باتھ روم کی طرف جانے لگا۔ پھر رک گیا۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ ”اسے تو سونے سے پہلے بند کیا تھا۔ اگرچہ چٹخنی نہیں لگائی تھی۔ تاہم یہ آپ ہی آپ نہیں کھل سکتا تھا۔ مگر یہ تو پوری طرح کھلا ہوا ہے۔“

یہ معما فوراً ہی حل ہونے والا نہیں تھا۔ وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ سمیرا کی آنکھ کھلی تو وہ بھی دروازے کو کھلا دیکھ کر حیران ہوئی۔ چاچی حنی نے آکر پوچھا۔ ”اے بیٹی! کیا تم میرے کمرے میں آئی تھیں؟“

”نہیں۔ کیا بات ہے؟“

”اے بیٹی... !کیا بتاؤں۔ میں نے رات کو دروازہ بند کیا تھا۔ ابھی دیکھا تو کھلا ہوا ہے۔“

وہ چونک کر بولی۔ ”میرا دروازہ بھی دیکھیں کھلا ہوا ہے۔“

چاچی نے کہا۔ ”پھر تو ماروی آئی ہوگی۔“

وہ دونوں ماروی کے دروازے پر آئیں۔ اسے کھول کر دیکھا۔ وہ اپنے بیڈ پر سو رہی تھی۔ آہٹ سن کر آنکھ کھل گئی۔ چاچی نے پوچھا۔ ”بیٹی! تم ہمارے کمرے میں آئی تھیں؟“

اس کا ذہن نیند سے بوجھل تھا۔ یادداشت ماشاء اللہ تھی۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”نہیں...“

سمیرا نے حیرانی سے کہا۔ ”تعجب ہے۔ دروازے آپ ہی آپ کیسے کھل جائیں گے؟“

چاچی نے سمیرا کے ساتھ جاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! آرام کرو۔ ناشتا آئے گا تو تمہیں جگاؤں گی۔“

آنکھ تو کھل ہی گئی تھی۔ اب کیا آرام کرتی اور سوتی۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ سمیرا اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ہوم ڈلیوری سروس کو ناشتا لانے کے لیے فون کر رہی تھی اور محبوب کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دھیان تو اسی کی طرف لگا رہتا تھا۔

ایسے وقت وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ شیو کرنے کے بعد نہا دھو کر لباس بدل کر نکھر گیا تھا۔ وہ بولی۔ ”ہوں! آپ تو بالکل فریش ہو گئے ہیں اور میں ابھی کی اٹھی ہوئی ہوں۔ جسٹ اے منٹ ابھی چینج ہو کر آتی ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”جسٹ اے منٹ کہہ رہی ہو جبکہ دنیا کی کوئی لڑکی ایک گھنٹے میں بھی فریش نہیں ہو سکتی۔“

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ”پھر بھی کوشش کروں گی۔“

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر جانا چاہتی تھی۔ محبوب نے آواز دی۔ ”سمیرا...!“

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ محبوب کا آواز دینا اچھا لگا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم میرے کمرے میں آئی تھیں؟“

”میں...؟“ اس نے تعجب سے کہا۔ ”نہیں تو... یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”وہ بات یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے دروازہ بند کیا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو یہ کھلا ہوا تھا۔“

سمیرا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بولی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

محبوب نے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرے اور چاچی کے کمرے کے دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہ آپ ہی آپ کیسے کھل گئے؟“

محبوب کی نظریں سیدھی ماروی کے کمرے کی طرف گئیں۔ سمیرا نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم نے ماروی سے پوچھا ہے۔ وہ تو گہری نیند میں تھی۔ اس نے دروازے نہیں کھولے۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جادو سے کھل گئے ہوں گے یا کسی جن یا بھوت نے آکر کھول دیا ہوگا اور معروف صاحب تو کبھی ایسی حرکت کریں گے نہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ اسکرین پر ایک میسج کی اطلاع تھی۔ اس نے بٹن کو دبایا تو معروف تجلی کی طرف سے میسج تھا۔ ”میں گھر جا رہا ہوں پھر دفتر





جاؤں گا۔ صبح دس بجے سے پہلے بیدار ہو جاؤ۔ دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر حق آنے والے ہیں۔ جب جاگ جاؤ تو مجھے کال کرو۔“

سمیرا نے کہا۔ ”انہوں نے مجھے بھی میسج دیا ہوگا۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔ ناشتا آنے والا ہے۔ ابھی تیار ہو کر آجاؤں گی۔“

اس نے کمرے میں جا کر دروازے کو بند کر لیا۔ وہ ماروی کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس سے ملنے کے لیے جیسے صدیوں سے ترس رہا تھا۔ دروازے نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی اور دل دھڑکتا رہا پھر وہ ذرا کھل گیا۔ پھر اسے دیکھ کر دروازے کو کھولتے ہوئے ایک طرف ہو گئی۔

اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”جیسا کہ یہاں سب تمہیں جانتے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتیں، اسی طرح میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم مجھے نہیں جانتیں۔“

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ”جانتی ہوں۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا سچ؟ تم مجھے جانتی ہو؟“

”ہاں۔ کل ہی تو اسپتال میں ملے تھے۔ یہاں ہمارے ساتھ آئے ہو۔ پھر کیسے نہیں جانوں گی۔“

محبوب کی خوشی اور خوش فہمی ختم ہو گئی۔ وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں وہ نہیں ہوں۔ اس کا ہم شکل ہوں۔“

وہ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم اس کے ہم شکل ہو؟ چاچی نے کہا تھا‘ وہ جو مراد ہے اس کا ایک ہم شکل بھی ہے۔ ہو بہو ویسا ہی ہے۔ اس کا نام... وہ اس کا نام۔“

وہ بولا۔ ”محبوب۔“

”ہاں۔ ایسا ہی کوئی نام بتایا تھا۔“

حنی نے کمرے میں آکر کہا۔ ”بیٹی! یہی نام ہے اور تم انہیں تم نہیں، آپ کہو۔ یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔ انسان نہیں فرشتے ہیں۔“

ماروی نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا یہ انسان نہیں ہیں؟“

”میرا مطلب ہے یہ انسان ہیں مگر فرشتے ہیں۔“

محبوب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پلیز چاچی! نہ میں فرشتہ ہوں نہ بڑا آدمی ہوں۔ آپ جائیں۔“

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ ”تم مجھے تم ہی کہو گی اور مائی محبوب نہیں‘ محبوب صاحب نہیں‘ صرف محبوب کہو گی۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”اچھا میں تو کچھ جانتی ہوں۔ نہ کسی کو پہچانتی ہوں۔ جو کہو گے‘ وہ کہوں گی۔ وہ... وہ کہاں ہے؟“

محبوب نے پوچھا۔ ”کون...؟“

”وہ جو تمہارا ہم شکل ہے؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا وہ تمہیں یاد آرہا ہے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں تمہیں دیکھ کر وہ یاد آرہا ہے۔ ایک ہی جیسے ہو۔“ وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ”جب تم نہیں رہو گے وہ رہے گا تو اسے دیکھ کر تم یاد آؤ گے۔“ پھر وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”ایک بات تو سمجھ میں آگئی ہے۔ میری یادداشت جتنی بھی خراب ہو۔ میں تم دونوں کو نہیں بھلا سکوں گی۔ تمہیں دیکھوں گی تو وہ یاد آجائے گا۔ اسے دیکھوں گی تو تم فوراً دماغ میں آجاؤ گے۔ یہ بہت اچھا ہے۔ بھولنے کی یا یاد کرنے کی جھنجھٹ ہی ختم ہو گئی۔“

حنی نے آکر کہا۔ ”چلو بیٹی... ناشتا آگیا ہے آجاؤ۔ میں میز پر لگا رہی ہوں۔“

سمیرا نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر کہا۔ ”محبوب صاحب! کہاں ہیں؟“

محبوب‘ ماروی کے کمرے میں تھا۔ یہ سمیرا کو مرجھا دینے والی بات تھی۔ جبکہ وہ آئینے کے سامنے اسی کے لیے نکھر رہی تھی۔ وہ اس کمرے سے نکل کر بولا۔ ”ہاں بولو۔ کیا بات ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر حق نے ابھی فون کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے‘ ابھی آرہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے‘ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ محبوب سمجھ گیا کہ وہ آئینے کے سامنے ہے۔ یہی کہتی رہے گی کہ بس ابھی آئی۔

اس نے چاچی سے کہا۔ ”چاچی...! آپ ماروی کے پاس جائیں۔ اسے شاور دیں۔ لباس تبدیل کرائیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے‘ ابھی آدھے گھنٹے میں آرہا ہے۔“

ایسے وقت گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے میڈم روزی آگئی تھی۔ سب ہی اپنے اپنے طور پر معروف ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر ڈاکٹر آگیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چاچی اور محبوب سے ماروی کی ہسٹری سننے لگا۔

پھر سمیرا نے ایک فائل لا کر ڈاکٹر کو دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ سکھر کے ڈاکٹروں کی میڈیکل رپورٹس ہیں۔“

وہ فائل کو کھول کر توجہ سے پڑھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”مریضہ کو یہاں لائیں۔“

چاچی حنی اسے لانے چلی گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ AMNESIA کا کیس ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کسی بیماری کی شدت سے یا نفسیاتی جذباتی صدمے سے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

یا۔۔۔ دماغ کو چوٹ پہنچنے سے یادداشت گم ہوجاتی ہے۔''

وہ فائل کا ایک ورق الٹ کر پڑھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''نفسیاتی معالج کی بھی یہی رپورٹ ہے۔ مریضہ پچھلی تمام باتیں یا تو مکمل طور پر بھول چکی ہے یا آئندہ اسے بھی کچھ یاد آتا رہے گا۔ اور بھی کچھ بھولتی رہے گی۔''

وہ فائل بند کرکے بولا۔ ''کیا آپ لوگوں نے اس کی اسٹڈی کی ہے؟ اسے پچھلی کوئی بات یاد آئی ہے؟''

سمیرا نے اور چاچا نے باری باری کہا کہ اسے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔ ایسے وقت منی اسے لے آئی۔

وہ ایک سادے سے لباس میں بہت ہی اجلی اور نکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی محبوب کی آنکھیں خواب خواب سی ہونے لگیں۔ ڈاکٹر نے ایک صوفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ۔ یہاں بیٹھو۔''

وہ بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ماروی۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ارے واہ! تمہیں تو اپنا نام معلوم ہے۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔ ''میں سب کے نام جانتی ہوں۔ یہ چاچی منی ہیں۔ یہ چاچا ہیں۔ یہ سمیرا بہت اچھی ہیں اور یہ۔۔۔''

اس نے محبوب کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ محبوب مراد ہیں۔''

''محبوب مراد۔۔۔؟'' سب نے تعجب سے ماروی کو دیکھا۔ وہ خود نام بتانے کے بعد پریشان سی ہوکر سوچ رہی تھی اور محبوب کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

محبوب نے کہا۔ ''ڈاکٹر! میرا ایک ہم شکل ہے۔ اس میں اور مجھ میں ایک ذرا سا فرق نہیں ہے۔ اس کا نام مراد ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ماروی نے اسے بھی دیکھا ہے۔ مجھے بھی دیکھا ہے۔ دونوں کے نام جانتی ہے۔ ان لمحات میں بھول گئی ہے۔''

وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے ڈاکٹر۔۔۔! اس کی زبان پر محبوب اور مراد کے نام گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ یہ مجھے محبوب مراد کہہ رہی ہیں۔''

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ''Here is the perplexity of memory due to amnesia (یہ امنیسیا کے باعث یادداشت کی الجھنیں ہیں)''

ماروی یکبارگی چونک گئی۔ صوفہ پر سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''یاد آگیا۔ ان کا نام مراد ہے۔''

اسے اچانک ہی مراد کا نام یاد آیا تھا۔ محبوب نے ایک ذرا دکھ سے کہا۔ ''میرا نام محبوب ہے۔''

ماروی کا خوشی سے کھلا ہوا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ سمجھاتی ہوئی بولی۔ ''ہاں۔ تم نے بتایا تھا۔ اتنی جلدی کیسے بھول گئی؟''

ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''ڈونٹ وری۔ ایسا ہوگا۔''

پھر اس نے محبوب سے کہا۔ ''رفتہ رفتہ ذہنی طور پر تبدیلیاں آئیں گی۔ یادداشت کے متعلق انکشافات ہوتے رہیں گے۔ ان حالات میں ان کی دن رات اسٹڈی کرنی لازمی ہے۔ میں نے معروف صاحب سے کہا تھا کہ انہیں راؤنڈ دی کلاک آبزرویشن میں رکھنا ہوگا۔ لیکن وہ انہیں اسپتال میں رکھنا نہیں چاہتے۔''

محبوب نے کہا۔ ''یس ڈاکٹر! ہم چاہتے ہیں ماروی کو گھر کا ماحول ملتا رہے اور یہیں علاج ہوتا رہے۔''

''تو پھر ایسے سائیکاٹرسٹ کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی جو کم از کم آٹھ دس گھنٹے ان کے قریب رہ کر ان کا مشاہدہ کرتا رہے اور ضروری ٹریٹمنٹ دیتا رہے۔''

''پتا نہیں کب تک اس کی یادداشت واپس آئے گی اور کب تک ٹریٹمنٹ چلتا رہے گا۔ ہم کسی لیڈی سائیکاٹرسٹ کی خدمات چاہیں گے۔ اس سلسلے میں آپ ان کے لیے کسی بہترین ماہر نفسیات کا انتخاب کریں۔''

''کل جب معروف صاحب نے کہا تھا تب ہی میرے ذہن میں ڈاکٹر عدیلہ رحمان کا نام آیا تھا۔ یوں تو عدیلہ ابھی ایک اسٹوڈنٹ ہیں لیکن ناتجربہ کار نہیں ہیں۔ وہ کلینیکل سائیکولوجسٹ کی ڈپلومہ ہولڈر ہیں۔ انٹرن شپ کے ذریعہ experience حاصل کرنا چاہتی ہیں۔''

''آپ بہتر سمجھتے ہیں تو ان سے ملاقات کرائیں۔''

''وہ پرسوں لندن سے آرہی ہیں۔ میں عدیلہ سے بات کرکے ملاقات کا وقت مقرر کرلوں گا۔''

اس نے صوفہ سے اٹھ کر ماروی سے کہا۔ ''بالکل ایزی رہو۔ یہ نہ سمجھو کہ یادداشت کی کمزوری سے سب گم ہو گئے ہیں۔ نہیں سب تمہارے آس پاس موجود ہیں۔''

وہ اپنے طور پر اسے اچھی طرح سمجھا رہا تھا۔ ''یہ کبھی نہ سوچو کہ سب نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ دیکھ رہی ہو سب ہی دن رات تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ دل سے سوچو کہ تم اکیلی نہیں ہو۔ یہ سب تمہارے اپنے ہیں۔ علاج جاری رہے گا۔ دوائیں کھاتی رہو گی تو یہ رشتے دار جلد ہی تمہارے حافظہ میں واپس آجائیں گے۔''





وہ محبوب سے اور چاچا سے مصافحہ کرکے چلا گیا۔

☆☆☆

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ نیم تاریکی میں ماروی کو دیکھتے ہوئے اس سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ اس دلنواز محبوبہ نے خواب میں آکر اس سے وعدہ کیا تھا کہ جب اسے رہائی ملے گی اور وہ اس کے سامنے آئے گا تو وہ ساری دنیا کو بھول جانے کے باوجود اسے پہچان لے گی۔

اور مراد نے کہا تھا۔ ''جب مجھے پہچان لوگی تو میری آنکھوں سے دنیا کو دیکھو گی اور پہچانو گی۔ صرف میرے ہی ذریعہ سب کو جاننے اور پہچاننے لگو گی۔''

وہ ایسے ہی دل بہلانے والے خواب میں گم تھا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی اور وہ اپنے آپ سے بے خبر پڑا ہوا تھا۔ تب سیل کے قریب راہداری کے موڑ پر لائٹ بجھ گئی۔ ہر سو گہری تاریکی چھا گئی۔ اندھیرا ہوتا تھا۔ پورے جیل کی بجلی کاٹ دی گئی تھی، مراد کی چھٹی حس نے اسے جگا دیا۔ آنکھ کھلی تو تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ سامنے راہداری کا بلب بجھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کبھی ایسا ہوتا تھا۔ لائٹ چلی جاتی تھی تو جنریٹر کے ذریعہ روشنی بحال کی جاتی تھی۔ وہ جنریٹر کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ دس منٹ، پندرہ منٹ گزر گئے۔ پتا نہیں کیا بات تھی؟ نہ جنریٹر چل رہا تھا۔ نہ روشنی ہو رہی تھی۔ پھر اس نے راہداری میں دھیمی سی محدود روشنی دیکھی۔ موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی میں کچھ سائے نظر آرہے تھے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آنے والے سلاخوں کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا وہ تین تھے۔

آگے جیلر تھا۔ وہ آہنی سلاخوں والے دروازے کا تالا کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''چلو خوش ہوجاؤ۔ پنجرے کا دروازہ کھل رہا ہے۔ تمہاری چھٹی ہونے والی ہے۔''

مراد نے حیرانی سے پیچھے ہٹ کر پوچھا۔ ''چھٹی۔۔۔؟''

وہ تینوں دروازہ کھول کر اندر آگئے۔ مراد نے اپنے فون کی روشنی میں دیکھا جیلر کے ساتھ دو گن مین تھے اور وہ قیدیوں کے لباس میں تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو برنارڈ کو جیل سے نکال کر لے جانے والے تھے۔ جیلر نے ذرا پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''اب یہ فون تمہارے کسی کام کا نہیں رہا۔ اسے پھینکو۔''

یہ کہتے ہی اس نے مراد کے ہاتھ پر ایک زور کی لات ماری۔ فون اس کی گرفت سے نکل کر اندھیرے میں چلا گیا۔

## ادبی چٹکلہ

ایک شاعر کو ایک بار بہت تیز بخار چڑھا جس کی شدت سے وہ بے ہوش ہوگئے، جب ہوش آیا تو پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟ کیا میں جنت میں ہوں؟''

سامنے کھڑی بیوی نے فوراً کہا۔ ''اللہ نہ کرے، کیا ہوگیا آپ کو دیکھتے نہیں میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔''

✲✲✲

☆میت کا منہ دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''سبحان اللہ'' یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی سویا ہو۔ کیا مبارک دن ملا، کیا مہینا، کیا نور برس رہا ہے، بہتا خون، پرسکون چہرہ، نرم بدن۔ ساری علامتیں شہیدوں کی ہیں، کون ہے یہ؟ کیا ہوا تھا؟

ہجوم سے آواز آئی۔ ''ڈاکو ہے، پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔''

(عطاالحق قاسمی کے کالم سے اقتباس)

✲✲✲

شکیب جلالی نے محض 32 سال کی عمر میں سرگودھا اسٹیشن کے پاس چلتی گاڑی کے سامنے کود کر خودکشی کرلی، مرنے کے بعد ان کی جیب سے کاغذ کا ٹکڑا ملا جس پر ان کا اپنا ہی ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

جبکہ بعض کا خیال ہے کہ وہ شعر یہ تھا۔

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا چٹان پر

مرسلہ: رضوان تنولی کریڈوی
اورنگی ٹاؤن، کراچی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

جیلر کے تیور، اس کا انداز اور قیدیوں کے ہاتھوں میں اسلحہ بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی خطرناک کھیل کھیلا جانے والا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ یہاں سے چلو اور ہاں اگر یہاں چیخ چیخ کر محبوب علی چانڈیو ہونے کا اعلان کرنا چاہتے ہو تو میں اجازت دیتا ہوں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔“

مراد نے سوچا۔ ”یہ بڑی بے باکی سے کہہ رہا ہے۔ یہ اب خوفزدہ نہیں ہے کہ بھید کھل جائے گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

جیلر نے قیدیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اس کے اطراف آ کر اس کی ایک ایک بغل میں ہاتھ ڈال کر جکڑ لیا۔ اپنی اپنی گن اس کی پسلیوں سے لگا دی۔ ایک نے بڑے بدمعاشوں کے انداز میں بڑی سفاکی سے کہا۔ ”چپ چاپ چلو۔ منہ سے آواز نکالو گے تو ہمیں ٹھونک بجا کر چلے جاؤ گے۔“

وہ نادان نہیں تھا۔ چپ چاپ ان کے ساتھ سیل سے باہر آ کر راہداری سے گزرتے ہوئے جانے لگا۔ اتنی تو عقل تھی کہ جیلر جان کا دشمن نہیں بن سکے گا۔ وہاں کے تمام قیدیوں کو زندہ سلامت رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اگر جیل کی چار دیواری میں کوئی بھی قیدی مر جائے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اس لیے مراد کو اطمینان تھا کہ اسے جانی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

یہ مجبوری بھی تھی کہ جیلر سے اور ان کے اسلحہ برداروں سے ہاتھا پائی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دونوں اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اسے دوڑاتے لیے جا رہے تھے۔ وہ جہاں سے گزر رہے تھے وہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ انہیں روکنے والا ایک سپاہی بھی نہیں تھا۔ ایسے وقت جیلر بھی کسی دوسری سمت چلا گیا تھا۔

وہ مراد کو دوڑاتے ہوئے جیلر کے آفس کے قریب ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے۔ وہاں اس نے برنارڈ کو دیکھا۔ اسی جیل میں پہلے بھی اسے دور سے دوبارہ دیکھ چکا تھا۔

وہاں برنارڈ کے ساتھ اور پانچ قیدی تھے۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ایک نے مراد کے ہاتھ میں ایک پستول رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔“

مراد نے پستول کو پھینکتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نہیں نکلوں گا۔ مجھے رہائی ملنے والی ہے۔“

ایک نے کلاشنکوف کے ہتھے سے اس کی پشت پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھے رہائی دلا رہے ہیں۔ سیدھی طرح نہیں چلے گا تو یہاں سے تیری لاش لے جائیں گے۔ یہ ثابت کر دیں گے کہ تو جیل توڑ کے نکلا تھا۔“

وہ مار کھا کر اوندھے منہ گرتے گرتے سنبھل گیا۔ پھر اس نے زمین پر پڑے ہوئے پستول کو اٹھا کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا پھر برنارڈ کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”خبردار! کوئی بھی میرے قریب آئے گا تو میں اس انگریز کو گولی مار دوں گا۔“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ برنارڈ بھی ہنس رہا تھا۔ ایک قیدی نے کہا۔ ”ابے او گدھے کی اولاد…… ہم کیا پاگل کے بچے ہیں کہ تجھے بھرا ہوا پستول دیں گے؟ تجھے اس لیے خالی کر کے دیا ہے کہ فرار ہونے والے کے پاس کچھ تو ہونا چاہیے۔“

دوسرے قیدی نے کہا۔ ”ارے یہ جیلر نے کس بزدل چھرے کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔“

تیسرے نے کہا۔ ”یہ ہمارے لیے مصیبت بن رہا ہے۔ ہم بھاگنے سے پہلے پکڑے جائیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”اسے کسی طرح یہاں سے لے چلو۔ باہر دارا اور بہرام اسے سنبھال لیں گے۔“

برنارڈ گھڑی دیکھ رہا تھا۔ فون پر کسی سے بول رہا تھا۔ پھر اس نے چیخ کر مسلح قیدیوں سے کہا۔ ”ہوشیار! بھاگو۔ دھماکا ہونے والا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی ان سب کو اس کمرے سے نکل کر جیلر کے آفس کی طرف سے مین گیٹ کی طرف بھاگنا تھا۔ گیٹ کے باہر دارا اکبر اور بہرام ایک ویگن کار کے پاس برنارڈ کے منتظر کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ اور دو گاڑیاں اور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔

ایک قیدی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے جس طرح سیل سے باہر لائے ہو۔ اسی طرح جیل سے باہر دارا کے پاس پہنچا دو۔“

دو قیدی پھر اس کے دائیں بائیں آ گئے۔ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ایسے ہی وقت ایک زبردست دھماکا ہوا۔ چار دیواریاں لرز گئیں۔ انہوں نے مین گیٹ کو بم سے اڑا دیا تھا۔ جیلر وہ گیٹ ان کے لیے کھول سکتا تھا لیکن یہ دکھانا تھا کہ برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا ہے۔

دھماکا ہوتے ہی وہ سب اس کمرے سے نکل کر گیٹ کی طرف بھاگنے لگے۔ کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ گئے تھے۔ ایک طرف کی دیوار گر رہی تھی۔ جو قیدی مراد کو جکڑ کر لے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے سر پر ٹوٹی ہوئی





دیوار کی اینٹ آ کر لگی۔ وہ گرا تو دوسرا اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ مراد نے ایکدم سے جھک کر اسے اپنے اوپر لاد کر دوسری طرف پھینک دیا۔ اس نے خالی پستول کو پھینک دیا۔ پھر اس کی گن اٹھا کر دوسرے بھاگنے والوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔

اب وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ جیلر کوئی نئی دشمنی شروع کر دیتا۔ اس وقت برنارڈ کچھ دور بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مراد کو اب اس کی پروا نہیں تھی کہ اس کا اپنا انجام کیا ہونے والا ہے؟ دماغ نے سمجھایا کیوں نہ مرتے مرتے وطن کے دشمن کو مارے یا اسے فرار ہونے سے باز رکھے۔

مراد ان سب سے پیچھے تھا۔ آگے بھاگنے والوں پر گولیاں چلا رہا تھا۔ ان میں سے ایک گر کر مر گیا تھا۔ دوسرا زخمی ہو کر بھاگنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

برنارڈ بہت آگے نکل چکا تھا۔ ٹوٹتے ہوئے گیٹ سے گزر کر ویگن کار میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ دو قیدی ایک گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی بدنصیبی سے کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

اور ایک قیدی فرار ہونے کے لیے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا۔ مراد نے قریب پہنچ کر اسے گولی ماری۔ اسے صرف زخمی کر کے نیچے گرا دیا پھر اس گاڑی پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے برنارڈ کے پیچھے جانے لگا۔

بہرام تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ برنارڈ اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ دارا اکبر نے پچھلی سیٹ سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا وہ ساتوں قیدی نکل آئے ہیں؟“

بہرام نے بیزاری سے کہا۔ ”ساتوں نہیں آٹھوں۔ مراد کو کیوں بھول رہے ہو۔“

دارا نے برنارڈ سے پوچھا۔ ”ہاں مراد کا کیا بنا؟ کیا وہ بھی ساتوں قیدیوں کے ساتھ تھا؟“

برنارڈ نے اسے گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہمارے لیے مصیبت بن رہا تھا۔ اگر میں بھاگنے میں پیچھے رہ جاتا تو وہ مجھے پھر گرفتار کرا دیتا۔ میں اس کتے جیلر کے خلاف رپورٹ لکھوں گا۔“

دارا نے کہا۔ ”غصہ تھوک دو۔ مراد کو جہنم میں جانے دو۔ تم تو نکل آئے ہو۔ ہم اپنے مشن میں کامیاب رہے ہیں۔“

رات کا پچھلا پہر تھا۔ راستے سنسان تھے۔ کبھی ایک آدھ گاڑی گزرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ بہرام نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پتا نہیں یہ کون ہے؟ بڑی دیر سے ایک موٹر سائیکل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔“

## مہکتی کلیاں

☆ بعض اوقات جدائی دوستی میں رس گھول دیتی ہے اور اسے مزید میٹھا بنا دیتی ہے۔

☆ دوستی ایک پانی کی طرح ہے جو دل اور دماغ کو سیراب کرتی ہے۔

☆ دوسروں کے عیب کا تعاقب کرنے سے بہتر ہے کہ اپنے عیب پر نظر ثانی کرو۔

☆ اپنی زبان سے اتنے میٹھے الفاظ بولیں کہ اگر کبھی واپس بھی لینے پڑیں تو کڑوے نہ لگیں۔

☆ اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔

مرسلہ۔ محمد حسان انصاری، نیو سینٹرل جیل ملتان

☆ اللہ کا خوف ہی سب سے بڑی دانائی ہے۔

☆ حرص سے روزی میں اضافہ نہیں ہوتا مگر آدمی کی قدر میں کمی ہو جاتی ہے۔

☆ عقل مند وہ ہے جو ہر کام میں میانہ روی اختیار کرے۔

☆ ہنر انسان کا بہترین دوست ہے۔

☆ تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے ہم نشین تھا۔

مرسلہ۔ عاطف نواز شاہین۔ اڈا اروتی

انہوں نے پیچھے گھوم کر بیک اسکرین سے دیکھا۔ رات کی نیم تاریکی میں ایک موٹر سائیکل سوار دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا۔ حد نظر تک اور کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

بہرام نے کہا۔ ”میں بڑی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ ہم جہاں بھی مڑتے ہیں وہاں یہ بھی مڑتا ہے ہم جس سڑک پر جاتے ہیں۔ یہ بھی اسی سڑک پر آ جاتا ہے۔“

برنارڈ نے کہا۔ ”اگر یہ تعاقب کر رہا ہے تو رفتار بڑھا کر قریب کیوں نہیں آ رہا ہے؟“

دارا نے کہا۔ ”اس کی گاڑی میں کوئی خرابی ہو گی۔“

بہرام نے کہا۔ ”میں اور رفتار بڑھاتا ہوں۔“

ویگن کار کی رفتار بڑھ گئی۔ وہ آندھی کی رفتار سے جانے لگے۔ دارا فون پر کسی سے بولنے لگا۔ ”ہم آ رہے ہیں۔ ایئر پورٹ کے پچھلے ویران راستے سے آئیں گے۔ ہاں۔ ہاں مسٹر برنارڈ ہمارے ساتھ خیریت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔ہاں۔کیا کہا...؟ پرابلم....؟"

اس نے پیچھے آنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"ہاں۔ایک پرابلم ہے۔کوئی موٹر سائیکل پر ہمارا تعاقب کررہا ہے۔اکیلا ہے۔اس لیے قریب نہیں آرہا ہے۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔"اس سے دور نہ بھاگو۔اسے قریب آنے دو۔وہ اکیلا ہے اسے گولی سے اُڑا دو۔"

یہی مناسب تھا۔اس تعاقب کرنے والے کی اپنی مجبوری ہوگی۔وہ اکیلا ہونے کے باعث تعاقب بھی کررہا تھا اوران سے کترا بھی رہا تھا۔

یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ پولیس یا انٹیلی جنس کا بندہ ہے۔شاید دور ہی دور سے دیکھتے ہوئے پیغام بھیج رہا ہوگا کہ وہ فرار ہونے والا غیر ملکی سیکریٹ ایجنٹ کہاں جارہا ہے؟

بہرام نے گاڑی کی رفتار دھیمی کردی۔دارا پچھلی سیٹ کی کھڑکی سے اور برنارڈ اگلی سیٹ کی کھڑکی سے اپنی اپنی گنیں نکال کر آنے والے کو دیکھنے لگے۔انتظار کرنے لگے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قریب شوٹنگ رینج میں آجائے۔

برنارڈ نے کہا۔"اس دشمن سے کوئی سوال نہ کرنا۔رینج میں آتے ہی فائرنگ شروع کردینا۔"

ایک کی گن گاڑی کے دائیں طرف والی کھڑکی کے باہر تھی۔دوسرے کی گن بائیں طرف والی کھڑکی کے باہر مراد کی منتظر تھی۔وہ کسی طرف سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔

وہ شوٹنگ رینج پر آرہا تھا۔ٹریگرز پر انگلیاں تیار تھیں۔موت کا کھیل تھا۔سچویشن کہہ رہی تھی کہ آنے والے کی موت لازمی ہے۔لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ بندوق کی گولی سے زیادہ ذہانت اپنی تیز رفتاری دکھاتی ہے۔اس نے ذہانت دکھائی تو گولیاں بندوق میں ہی رہ گئیں۔وہ اچانک ہی پختہ سڑک سے اتر کر کھیتوں کی طرف جانے لگا۔انہوں نے گاڑی روک دی۔بڑی پھرتی سے اپنی اپنی طرف کے دروازے کھول کر باہر آگئے۔موٹر سائیکل کھڑی فصل کی طرف جارہی تھی۔وہ تینوں دوڑتے ہوئے فائر کرتے ہوئے ادھر جانے لگے۔پھر رک گئے۔

وہ رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے لہلہاتی فصل کے پیچھے جاکر گم ہوگیا۔اس کی گاڑی کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔وہ اسے دھمکیاں دینے اوراپنے سے دور بھگانے کے لیے اندازے سے ادھر فائر کرنے لگے جہاں وہ جاکر چھپ گیا تھا۔

برنارڈ نے غصے سے کہا۔"دیر ہورہی ہے۔میں پکڑا جاؤں گا۔یہ خبر پھیل چکی ہوگی کہ جیل توڑ کر فرار ہوا ہوں۔اسے جہنم میں جانے دو۔آگے چلو۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑاتڑ گولیاں چلتی ہوئی آئیں۔برنارڈ کے حلق سے چیخ نکلی۔وہ اچھل کر زمین پر گرا۔اس نے تاریکی میں بولنے کی غلطی کی تھی۔مراد نے آواز کی سمت تین گولیاں چلائی تھیں۔ایک گولی کمر کی ہڈی کو توڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔وہ زندہ تھا لیکن کمر کی ہڈی کو نقصان پہنچنے کا مطلب یہ تھا کہ نہ وہ سیدھا کھڑا ہوسکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔صرف لیٹا ہی رہ سکتا تھا۔وہ چیخ رہا تھا۔"مجھے اٹھاؤ۔یہاں سے فوراً لے چلو۔ہم کسی وقت بھی پکڑے جائیں گے۔"

دارا اور بہرام بھی زمین پر لیٹ گئے تھے۔یہ اندیشہ تھا کہ کھیت کی طرف سے آنے والی کوئی گولی انہیں لگ سکتی ہے۔انہوں نے لیٹے ہی لیٹے ادھر کئی گولیاں چلائیں۔

برنارڈ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔کہہ رہا تھا۔"یہاں کیوں پڑے ہو؟ کیا گرفتاری کا انتظار کررہے ہو؟"

دارا نے جھنجلا کر کہا۔"صبر کرو برنارڈ! ہم تمہیں یہاں سے لے جانے کے لیے اٹھیں گے تو وہ پھر گولیاں چلائے گا۔کیا ہم بھی تمہاری طرح زخمی اور بے بس ہوجائیں۔"

مراد اُدھر نہیں تھا۔انہیں اندیشوں میں جکڑ کر فصلوں کے درمیان جھکتا ہوا چھپتا ہوا آگے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں سڑک پر ویگن کار کھڑی ہوئی تھی۔میدان جنگ میں فائرنگ اچانک بند ہوجائے اور دشمن کی آہٹ بھی نہ سنائی دے تو اندیشے دہلاتے ہیں۔موت چاروں طرف سے آتی دکھائی دیتی ہے۔انہیں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا کہ مراد اچانک گولیاں چلاتا ہوا ان کے سروں پر پہنچ جائے گا۔

بہرام نے پریشان ہوکر کہا۔"کئی منٹ ہوگئے۔وہ چپ ہے۔گولی نہیں چلا رہا ہے۔"

دارا نے کہا۔"ہمارے یہاں سے اٹھنے کا انتظار کر رہا ہے۔"

گولی کا زخم برنارڈ کو تڑپا رہا تھا۔وہ بول رہا تھا۔"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔مجھے لیٹے ہی لیٹے یہاں سے کھینچتے ہوئے لے چلو۔کسی طرح نکلو یہاں سے۔"

یہی ایک طریقہ تھا۔وہ دونوں خود کو بچاتے ہوئے لیٹے ہی لیٹے اسے گاڑی تک کھینچ کر لے جاسکتے تھے۔بہت وقت گزر رہا تھا۔ان کی گرفتاری یقینی ہورہی تھی۔

ان دونوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا پھر خود پیچھے گھسٹتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔اس طرح وہ





گاڑی تک پہنچ سکتے تھے لیکن وہ دوسری بار اسے کھینچ نہ سکے۔رات کے سناٹے میں اچانک ہی زوردار دھماکے نے انہیں لرزادیا۔

انہوں نے چاروں شانے چت ہوکر سر اٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔تاریکی میں اس کا سایہ دکھائی دے رہا تھا۔وہ گاڑی کے پیچھے چھپتے ہوئے بولا۔"وہ انگریز کتا تھا۔اسے لے جا نہیں سکوگے...گاڑی کا پہیہ گیا۔اسے چلا نہیں سکوگے...میں فرار کے تمام راستے بند کرچکا ہوں۔اپنے ہتھیار میری طرف پھینک دو۔"

بہرام نے تڑپ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔"یہ تو ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔نہ برنارڈ کو لے جاسکیں گے۔نہ خود جاسکیں گے۔ہمیں یہاں سے پیروں پر بھاگنا ہوگا۔"

برنارڈ نے کہا۔"یو شٹ اپ۔کیا مجھے چھوڑ کر بھاگوگے؟"

"اور کیا تمہارے ساتھ مرجائیں؟ ہمارے فاضل ہتھیار اور تمہارے موجودہ مشن کے تمام ڈوکومنٹس گاڑی میں ہیں اور گاڑی اس کے قبضے میں ہے۔"

وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔"اس سے بارگیننگ کرو۔اس کو بڑی آفر دو۔"

دارا نے مراد کو مخاطب کیا۔"اے! تم کون ہو؟ ہم سے سمجھوتا کرو۔ہمیں جانے دو۔ہم تمہیں منہ مانگی رقم دیں گے۔بائی گاڈ ابھی کیش دیں گے۔"

جواب میں دو گولیاں شور مچاتی ہوئی آئیں۔ان کے قریب کولتار کی سڑک کو چھوتی ہوئی چنگاریاں اڑاتی ہوئی دیوالی مناتی ہوئی دوسری طرف نکل گئیں۔

تینوں نے چند لمحوں تک دم سادھ لیے۔بہرام نے کہا۔"میں اتنی جلدی مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہوں۔وہ جان نہیں چھوڑے گا۔گولیوں کی زبان سے بولتا رہے گا۔مجھے نہ مرنا ہے نہ گرفتار ہونا ہے۔میں جارہا ہوں۔"

دارا نے پوچھا۔"کیسے جاؤ گے۔یہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہوگے تو گولی لگے گی۔"

وہ بولا۔"میں سڑک کے دوسرے کنارے تک لڑھکتا ہوا جاؤں گا۔اُدھر کھیتوں کی طرف ڈھلان میں لڑھک جاؤں گا پھر فصلوں کے درمیان چھپتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ لڑھکتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے کی سمت جانے لگا۔برنارڈ نے فوراً ہی اپنی گن سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے گولی چلاتے ہوئے کہا۔"یو باسٹرڈ! مجھ سے غداری کرتا ہے۔مجھے مرنے کے لیے چھوڑ کر جارہا ہے۔"

اسے گولی لگی۔وہ لڑھکتے لڑھکتے تھم گیا۔ایک ذرا تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔دارا نے ایکدم سے چیخ کر کہا۔"برنارڈ...! پاگل کے بچے...! یہ تو نے کیا کیا؟"

اس نے کہا۔"وہ ایگریمنٹ کے خلاف مجھے چھوڑ کر بھاگ رہا تھا۔کیا نہیں جانتے کہ MET نے ہمارے ملک سے معاہدہ کیا ہے۔تم لوگ مجھے پاکستانی قانون کے شکنجے سے نکال کر لے جانے آئے ہو۔ایسے چھوڑ کر بھاگوگے تو کیا میں جانے دوں گا؟"

"یو نان سنس...! تم نے میرے دوست کو گولی کیوں ماری؟ ابھی ہم بالکل ہی بے بس نہیں ہوئے ہیں۔ہم کسی بھی طرح تمہیں نکال کر لے جاتے۔"

کیا اس طرح نکالتے ہیں؟ مرینہ پہلے ہی ساتھ چھوڑ کر چلی گئی۔یہ بہرام بھی بھاگ رہا تھا۔اب تم رہ گئے ہو۔"

دارا اکبر نے کہا۔"میں تو رہ جاؤں گا۔تم نہیں رہوگے۔تم جہنم میں جاؤ۔میں اپنا راستہ بنالوں گا۔"

اس سے پہلے کہ برنارڈ اپنی گن سیدھی کرتا' دارا نے اسے گولی ماردی۔قانون کے مطابق ایک قاتل کو اور ملک دشمن سیکریٹ ایجنٹ کو سزائے موت ملنی تھی۔غیر قانونی طور پر مل ہی گئی۔

دارا نے سر اٹھا کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ادھر مراد نظر نہیں آرہا تھا۔اس نے آواز دی۔"اے! تم کہاں

## پاکستانی ذہانت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جاپان میں ایک صابن بنانے والی فیکٹری میں غلطی سے ایک پیکٹ بغیر صابن کے پیک ہوگیا۔

انہوں نے اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ لاکھوں ڈالر لگا کے ایک ایکسرے مشین خریدلی جو یہ چیک کرتی تھی کہ پیکٹ کے اندر صابن موجود ہے یا نہیں؟

یہی مسئلہ پاکستان میں ہوا تو انہوں نے کیا، کیا؟ انہوں نے اسمبلی لائن کے پیچھے ایک پنکھا لگادیا خالی پیکٹ خودبخود اڑ کر دور جا کرتے۔

"پاکستان زندہ باد"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی
اورنگی ٹاؤن، کراچی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو؟'' اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر پکارا۔ ''کہاں ہو؟ دیکھ رہے ہو۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔'' وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''یہ دیکھو میں اپنی گن پھینک رہا ہوں۔''

اس نے دور گاڑی کی طرف اپنی گن پھینک دی۔ مراد گاڑی کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے اور دارا کے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم چاہو تو مجھے گولی مار سکتے ہو اور چاہو تو ان واقعات کا چشم دید گواہ بنانے کے لیے زندگی دے سکتے ہو۔''

وہ اور ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے گواہ بنا کر احسان کرو گے۔ میری سزا کم ہو جائے گی۔ مجھے موت نہیں ملے گی۔ عمر قید کی سزا ہو گی۔''

مراد نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رک جاؤ۔ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنا۔ جہاں ہو وہیں بیٹھ جاؤ۔''

وہ رک گیا۔ وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔ اس کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ مراد نے اسے گولی نہیں ماری تھی۔

وہ گاڑی کے اندر دیکھ چکا تھا۔ پچھلی سیٹ پر برنارڈ کا موبائل فون پڑا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے اٹھایا۔ پھر باہر گاڑی سے ٹیک لگا کر ماروی کے نمبر پنچ کیے۔

اب ماروی نہ کسی کو جانتی تھی نہ کسی کو کال کرتی تھی۔ چاچی فتی اس کا فون اپنے پاس رکھتی تھی۔ اس فون سے کالنگ ٹون ابھری تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہیلو۔ کون ہے بھائی؟ اتنی رات کو...''

مراد نے چیخنے کے انداز میں کہا۔ ''چاچی! میں ہوں مراد۔ کیا وہاں سائیں محبوب یا معروف صاحب ہیں؟''

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں سائیں اپنے کمرے میں سو رہے ہیں۔''

''فوراً انہیں جگائیں مجھ سے بات کرائیں۔''

''ابھی بات کراتی ہوں۔''

وہ بیڈ سے اتر کر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر چلی گئی۔ مراد گاڑی سے ٹیک لگائے فون کو کان سے لگائے دور سڑک پر بیٹھے ہوئے دارا کو دیکھ رہا تھا۔

اس نے سوچا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچھل کر بھاگتے ہوئے سڑک کے کنارے کھیتوں میں جا کر چھپ سکتا ہے۔ اس نے حکم دیا۔ ''اے! بیٹھو نہیں۔ لیٹ جاؤ۔''

اس نے زندہ رہنے کے لیے حکم کی تعمیل کی۔ فوراً سڑک پر لیٹ گیا۔ ایسے ہی وقت محبوب کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو مراد! کیا بات ہے؟ خیریت سے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں بہت مشکل میں ہوں۔ برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا تھا۔ جیلر نے میرے لیے بھی ایسے حالات پیدا کیے کہ مجھے ان مجرموں کے ساتھ فرار ہونا پڑا لیکن میں نے ان مجرموں کے فرار کی کوشش ناکام بنا دی ہے۔ ائیر پورٹ کے پچھلے حصے کی سڑک پر برنارڈ اور اس کے ایک ساتھی کی لاش پڑی ہیں۔ ایک زندہ ساتھی میرے نشانے پر سڑک پر پڑا ہے۔ میں جیل توڑنے اور فرار ہونے کے جرم میں پھنس سکتا ہوں جبکہ میں نے بہت بڑے مجرم کو فرار ہونے نہیں دیا ہے۔ آپ مجھے بتائیں کیا کرنا ہے؟''

''تم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میرے شیر...! میرے دلیر...! حوصلہ رکھو انتظار کرو۔ ابھی انٹیلی جنس والے وہاں پہنچ جائیں گے۔ میں بھی آ رہا ہوں۔''

اس نے رابطہ ختم کر کے سراغرساں حماد صدیقی کے نمبر پنچ کیے۔ پھر اس سے رابطہ ہونے پر پوچھا۔ ''کیا یہ جانتے ہو برنارڈ جیل توڑ کر فرار ہوا ہے؟''

حماد نے کہا۔ ''ہاں۔ میں اپنے سینئر افسر کے ساتھ یہاں ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ابھی خبروں کا وقت نہیں ہوا ہے۔ بریکنگ نیوز میں یہ اطلاع دی جا رہی ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''دوڑو مراد چال قیامت کی چل گیا۔ فوراً اٹھو۔ میرے ہم شکل مراد نے برنارڈ کو مار گرایا ہے۔ ائیر پورٹ کے پچھلے راستے پر پوری فورس لے کر جاؤ۔ مراد کو سیکورٹی دو۔''

یہ ایسی اطلاع تھی کہ انٹیلی جنس کے تمام افسران بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ سڑک اور وہاں کا علاقہ روشنی میں نہا گیا۔ جب مسلح سپاہی اس سڑک پر پہنچے تو انہیں برنارڈ اور دارا کی لاشیں ملیں۔ انہوں نے فی الحال مراد کو بھی دارا کے ساتھ حراست میں لے لیا۔

محبوب وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے اور حماد صدیقی نے مراد کو تسلی دی کہ وہ مجرم ٹھہرایا نہیں جائے گا۔ اسے اس کی حب الوطنی کا انعام ضرور ملے گا۔

برنارڈ کو فرار کرانے کا سب سے اہم مجرم جیلر دلاور جان تھا۔ اسے فرار کرانے کے بعد وہ سکون سے نہیں تھا۔ دارا اکبر اور بہرام نے وعدہ کیا تھا کہ پرائیویٹ طیارے سے پرواز کرنے تک اس سے فون پر رابطہ رکھیں گے اور اپنی خیریت سے آگاہ کرتے رہیں گے لیکن جیل سے نکلتے ہی انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

اسے مراد کے سلسلے میں زیادہ تشویش تھی۔ وہ یہ خبر سنتا





[...] تھا کہ وہ لوگ اسے جیل کے باہر لے گئے ہیں اور اسے ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے گرفتار کرائیں گے۔ یا دارا فرار ہوتے وقت اسے گولی مار چکے ہوں گے۔ ایسی [...] کرنے والی کوئی اطلاع کہیں سے نہیں مل رہی تھی۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا والے پہنچ گئے تھے [...] اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔

وہ ان سے جان چھڑا کر کار میں بیٹھ کر اپنی رہائشی کوٹھی میں آ گیا تھا۔ وہاں اس نے ٹی وی کو آن کیا تو خبریں سنائی جا رہی تھیں۔ وہ جھکے ہوئے انداز میں دھپ سے صوفے پر بیٹھ کر سننے لگا۔

نیوز ریڈر کہہ رہا تھا کہ فرار ہونے والا مجرم برنارڈ اپنے ایک ساتھی سمیت مارا گیا ہے۔ اس کا دوسرا ساتھی زندہ ہے۔ اسی جیل کے ایک قیدی نمبر سات سو سات نے ان کے فرار ہونے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا ہے۔

دلاور جان حیرت سے دم سادھے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول کر خبریں یوں سن رہا تھا جیسے آنکھوں سے نہیں منہ سے دیکھ رہا ہو اور منہ سے سن رہا ہو۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر دانت پیس کر غصے سے کہہ رہا تھا۔ ''کون کہتا ہے کہ یہ گدھا گاڑی والا ہے؟ اس کتے نے ذلیل کمینے برنارڈ جیسے بیرونی ملک کے خطرناک سیکریٹ ایجنٹ کو ایک پھونک میں اڑا دیا ہے۔''

وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''اس حرام زادے نے میری بیٹی کو توڑ پھوڑ کر اسپتال پہنچا دیا ہے۔ میں دن رات مجرموں سے نمٹتا رہتا ہوں۔ ان کی نفسیات کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ اس نے میرے تیس برس کے تجربات کو جھٹلا دیا ہے۔''

وہ بہت ہی مضطرب تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اِدھر سے اُدھر جانے آنے لگا۔ وہ بے اختیار بڑبڑا رہا تھا۔ ''اس نے میری بیٹی کی زبردست ٹھکائی کی... اب مجھے بھی برسوں کی ملازمت سے اکھاڑنے والا ہے۔ میں جس جیل کا بادشاہ ہوں اس جیل میں مجھے قیدی بنانے والا ہے۔''

نیوز کے دوران برنارڈ اور بہرام کی لاشیں دکھائی جا رہی تھیں۔ وہ فکر و پریشانی اور شدید ہیجان میں مبتلا تھا۔ اور ٹی وی پر بھی نظریں تھیں۔ وہاں اسکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ دارا اور مراد کو بھی پولیس کسٹڈی میں لیا جا رہا تھا۔

مراد کی زندگی اس کی موت تھی۔ یقیناً وہ جیلر کے خلاف بیان دینے والا تھا۔ دارا بھی اپنی سزا کم سے کم کرنے کے لیے اس کے خلاف بیان دیتا کہ وہ جیلر برنارڈ کے فرار ہونے کے منصوبے میں کس طرح ان کی مدد کرتا رہا ہے۔ اس کے اندر جیسے بجلی بھر گئی۔ وہ بھاگم بھاگ اپنے سفری بیگ میں ضروری سامان رکھنے لگا۔ جرائم کی دنیا میں رہنے والے کو معلوم تھا کہ فوری طور پر کہاں چھپنا ہے پھر کن راستوں سے گزرتے ہوئے علاقہ غیر میں جا کر پناہ لینی ہے۔

☆☆☆

محبوب کی اس کوٹھی میں سب ہی کی زندگیاں ہنگاموں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ مراد نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا' جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ اس نے سب ہی کے اندر حیرت' مسرت' تجسس اور فخریہ جذبات بھر دیے تھے۔

دوسرے دن اخبارات کی سرخیاں اور ٹی وی کے تمام چینلز اس کی حمایت میں کہہ رہے تھے کہ ایک محب وطن قیدی نمبر سات سو سات مراد علی منگی نے ایک بڑے ملک کے سیکریٹ ایجنٹ کو پاکستان سے دشمنی کی سزا دی ہے۔ وہ قابل ستائش ہے اور بہت بڑے اعزاز اور انعام کا حقدار ہے۔

خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ بدنام زمانہ سیکریٹ ایجنٹ برنارڈ ہائٹ یہاں فوجی راز چرانے آیا تھا۔ اسے اسلام آباد کے دو اہم افراد کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں پاکستانی عدالت سزائے موت دینے والی تھی۔ برنارڈ ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق پچھلی رات جیل توڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ ایسے وقت اسی جیل کا قیدی نمبر سات سو سات اس کی موت بن گیا تھا۔ مزید اہم معلومات یہ فراہم کی جا رہی تھیں کہ برنارڈ کو فرار کرانے کے ناپاک منصوبے میں جیلر دلاور جان اور اس کی بیٹی مرینہ دلاور پیش پیش رہے ہیں۔

یہ بتایا جا رہا تھا کہ مرینہ لندن کی MET آفیسر ہے۔ وہ اپنے دو معاون دارا اکبر اور بہرام کے ساتھ ایک زبردست مجرمانہ منصوبے پر عمل کرنے آئی تھی۔ بہرام برنارڈ کے ساتھ حرام موت مر چکا ہے۔ دارا اکبر نے اپنی گرفتاری پیش کی ہے۔ مرینہ سکھر کے ایک اسپتال میں پڑی ہے۔ اسے پولیس کسٹڈی میں لے لیا گیا ہے۔ جیلر دلاور جان فرار ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔

مراد کے متعلق یہ عام رائے قائم کی جا رہی تھی کہ ایسا دلیر اور محب وطن کسی زلیخا کا قاتل نہیں ہو سکتا۔ اس پر جھوٹے قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ محبوب نے' سراغرساں حماد صدیقی نے اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران نے عدالت سے سفارش کی تھی کہ مقررہ تاریخ میں اس مقدمہ کو ختم کر دیا جائے۔ اسے طول نہ دیا جائے۔ مراد کو باعزت طور پر بری کر دیا جائے اور ان سب کو پوری امید تھی کہ وہ رہائی پا کر



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنوں میں واپس آئے گا۔

اور اپنوں میں اس کا کون تھا؟ لہو کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ایک ماروی تھی جس سے پیار کا کبھی نہ ٹوٹنے والا مستحکم رشتہ تھا لیکن تقدیر مذاق کر رہی تھی۔ اس ایک چاہنے والی کے بھی دماغ سے اور دل سے مٹا دیا تھا۔

یہ سدا سے سنتے آئے ہیں اور دیکھتے بھی آئے ہیں کہ جب تک جان نہ جائے پیار دل سے نہیں جاتا۔ یہ عجیب سانحہ تھا کہ وہ جان سے نہیں گئی تھی۔ زندہ تھی اور اس نامراد کے دھڑکتے ہوئے دل کو چھوڑ گئی تھی۔

منی دن رات ماروی کے ساتھ رہتی تھی۔ اسے اٹھنے بیٹھنے، نہانے دھونے کپڑے پہننے اور پکانے کھانے کے متعلق سمجھاتی اور سکھاتی رہتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن ماہر نفسیات ڈاکٹر عدیلہ رحمان آنے والی تھی۔ اس کے ساتھ روزانہ آٹھ دس گھنٹے رہ کر اس کی اسٹڈی کرنے والی تھی۔ اپنے طور پر نفسیاتی ٹریٹمنٹ کے ذریعہ اس کی یادداشت واپس لانے والی تھی۔

تب تک منی اس کی پچھلی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں اسے بتاتی رہتی تھی۔ تین چار دنوں میں مراد بھی آنے والا تھا۔ اس کے دونوں چاہنے والے اس کا سامنا کرنے والے تھے۔ منی دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی کہ دونوں کے بیک وقت روبرو ہونے سے پہلے ماروی کو ان سے تعلق رکھنے والی تمام باتیں یاد آجائیں۔

وہ کند ذہن ہو چکی تھی۔ اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ منی نے ایک رات اس سے پوچھا۔ ”بیٹی۔۔۔! میں تمہیں دیکھتی رہتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں، نہ جانے تمہارے معصوم سے دل میں کتنے ارمان ہوں گے؟“

اس نے بڑے ارمانوں سے کہا۔ ”ابھی تو ایک ہی ارمان ہے کہ مجھے اپنی پچھلی زندگی یاد آجائے۔“

”تم جوان لڑکی ہو۔ کیا تمہارے دل میں یہ ارمان نہیں ہے کہ مراد اور محبوب جیسا تمہارا چاہنے والا ہو؟“

”میں تو ایسی الجھی ہوئی ہوں کہ اب تک ایسے کسی چاہنے والے کی طرف دھیان نہیں جا رہا ہے۔ تم مراد اور محبوب کے بارے میں اتنی باتیں بولتی ہو۔ پھر بھی وہ مجھے اجنبی لگتے ہیں۔“

منی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”کبھی یہ ہاتھ سائیں محبوب کے ہاتھوں میں آیا ہوگا۔ کبھی مراد نے بڑے جذبوں سے تمہیں تھام لیا ہوگا۔ ایسے لمحات ایک کنواری لڑکی کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ وہ ایسے دھڑکتے ہوئے خوبصورت لمحات کبھی بھلا نہیں پاتی۔“

”اور میں بھول گئی ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی خوبصورت لمحہ میری زندگی میں نہیں آیا ہے۔ مراد اور محبوب نے مجھے ہاتھ لگایا ہوتا تو وہ میرے دل پر نقش ہوتا۔ ابھی میرا دماغ ناکارہ ہوا ہے، دل تو نہیں ہوا ہے۔“

وہ اپنے حالات کے مطابق درست کہہ رہی تھی۔ دل پر کچھ نہیں لکھا ہوتا۔ جو ہوتا ہے وہ دماغ کے ساتھ روشن رہتا ہے اور دماغ کے ساتھ بجھ کر رہ جاتا ہے۔

فی الحال تو مراد دور تھا اور محبوب اس کے قریب آتا جاتا رہتا تھا۔ وہ اس عاشق کے لیے دنیا کی سب سے خاص و سب سے اہم ہستی تھی لیکن ماروی ایسی سادگی اور معصومیت سے اس کے سامنے آتی تھی اور اس سے باتیں کرتی تھی جیسے وہ اس کی نظروں میں دنیا والوں کی طرح ایک عام سا آدمی ہو۔

سمیرا اپنے گھر نہیں جا رہی تھی۔ اسی کوٹھی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ محبوب بھی وہیں تھا اور ماروی کے پاس تھا۔ محبوب سے دل کے معاملات تھے اور اس کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے قریب رہنے کا موقع مل رہا تھا۔

سمیرا نے چپ چاپ مراد کے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ماروی کو اسی کی طرف مائل کرتی رہے گی۔ وہ مراد کے حق میں اچھی تھی اور محبوب کے لیے اس سے زیادہ کیا اچھی ہوگی کہ دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی، اس کے کاروبار کو پوری دیانتداری اور ذمہ داریوں سے سنبھال رہی تھی۔

اگر کسی کو دشمن بننے کا موقع نہ دیا جائے تو وہ ہمیشہ دوست بن کر رہتا ہے۔ ماروی اگر محبوب کی طرف کبھی مائل نہیں ہوگی۔ رقابت پیدا نہیں کرے گی تو سمیرا کبھی حسد، جلن اور عداوت میں مبتلا نہیں ہوگی۔

اور سمیرا یہی کوشش کر رہی تھی کہ ہمیشہ ماروی کی دوست بن کر رہے اور ہر اچھے برے وقت میں اس کے کام آتی رہے۔

شام کو معروف بجلی آیا۔ سمیرا نے اس کے اور محبوب کے ساتھ لان میں چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم روزی آگئی ہے۔ چاچی دن رات ماروی کا خیال رکھتی ہیں۔ کل یا پرسوں تک ڈاکٹر عدیلہ بھی آجائیں گی۔ پھر میں چلی جاؤں گی۔“

محبوب نے کہا۔ ”تھینک یو سمیرا! تم نے ماروی کا بہت خیال رکھا ہے۔ وہ تمہیں بھولنے کے باوجود تم سے مانوس ہو گئی ہے۔“





اس نے پوچھا۔ ”ماروی کی مستقل رہائش کہاں ہوگی؟“

معروف نے کہا۔ ”ہم اسے کسی دماغی امراض کے اسپتال میں نہیں رکھیں گے۔ اس وسیع و عریض کوٹھی میں وہ ڈاکٹر عدیلہ کے زیر علاج رہے گی۔“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ یہ اچھی کھلی جگہ ہے۔ سمندر کا کنارہ ہے۔ ادھر شہری ہنگامے نہیں ہیں۔“

معروف نے اچانک سمیرا کے دل کی بات محبوب سے کہی۔ ”عدیلہ آجائے تو تمہیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ یہ سوچو کہ مراد بھی آرہا ہے۔ تم دونوں کو ماروی کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہنا چاہیے۔“

محبوب نے مسکرا کر پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں۔ ماروی ہم سے پردہ کرے؟“

وہ بولا۔ ”تم اور پردہ کراؤ گے؟ وہ ایک بار پردے میں گئی تو گھر اور کاروبار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ تم دونوں کو ماروی سے دور رہنا چاہیے۔ ہاں قریب بھی نہیں رہنا چاہیے۔

یہ نہ بھولو کہ پہلے بھی کسی رشتے کے بغیر وہ تمہاری پناہ میں رہ کر بری طرح بدنام ہو چکی ہے۔ اور وہ۔۔۔ اب ایک نہیں دو چاہنے والے یہاں اس کے ساتھ رہیں گے تو اس بے چاری کے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔“

محبوب نے کہا۔ ”یہ بات میرے ذہن میں ہے۔ میں اس کی نیک نامی پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ میں ہمیشہ کی طرح اپنی کوٹھی میں رہوں گا۔ دن میں ایک بار ماروی سے ملنے آؤں گا۔ مراد میرے ساتھ رہ سکتا ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو کسی کرائے کے مکان میں رہے گا۔ وہ بھی دن میں ایک بار اس سے ملنے آئے گا۔“

وہ دونوں موجودہ حالات میں ماروی کے لیے اجنبی تھے۔ دونوں کو نئے سرے سے اس کے دل میں جگہ بنانی تھی۔

کوئی بھی کسی کے بھی دل میں بہترین رویے سے جگہ بنا لیتا ہے۔ لیکن کسی کے دل میں اپنے نام کی دھڑکنیں کوئی کوئی پیدا کر پاتا ہے۔ ان میں سے کون اس کی آنکھوں میں سمائے گا اور دل میں آباد ہوگا، یہ تو وہ دل والی بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

عبدالرحمان کا کاروبار لندن میں تھا۔ اس کی بیٹی عدیلہ رحمان پاکستان میں رہنا چاہتی تھی۔ لاڈلی بیٹی کی خواہش کے مطابق ماں باپ نے کراچی آکر برسوں کی ویران کوٹھی کو آباد کیا تھا۔ اس کی رہائش کے انتظامات کیے تھے۔ آئندہ وہ یہیں رہنے والی تھی اور والدین واپس جانے والے تھے۔ اس کی ممی رخشی مغربی سوسائٹی اور وہاں کے ماحول کی دلدادہ تھی۔ بیٹی ماں کے مزاج کے خلاف مشرقی ماحول میں رہنے کا تجربہ کرنے آرہی تھی۔

معروف بجلی نے ایئرپورٹ میں آکر عبدالرحمان سے ملاقات کی۔ دونوں برسوں کے شناسا تھے۔ کاروباری معاملات میں کبھی کبھی ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ عبدالرحمان نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میری بیٹی تمہارے گھر کی فیملی ڈاکٹر بن رہی ہے۔ اب تو اکثر ملاقات ہوتی رہے گی۔“

معروف نے رخشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بائیس یا چوبیس برس پہلے تم دونوں بے اولاد تھے۔ پریشان رہتے تھے کہ اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ اب بتاؤ، کتنی بیٹیاں اور بیٹے ہیں۔“

اس سوال پر دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ رحمان نے کہا۔ ”ایک بیٹا ہے اور۔۔۔“

رخشی نے کہا۔ ”ایک بیٹی۔ یہ جو ابھی آرہی ہے۔ بہت ہی شوخ اور چنچل ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”میرا بیٹا بھی بہت ہی زندہ دل ہے۔“

رخشی نے کہا۔ ”میری بیٹی کے جیسا اسمارٹ نہیں ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”وہ تو اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ ہے کہ لندن کی لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔“

”وہ ایسا بھی گلفام نہیں ہے۔“

”تمہاری بیٹی کون سی حور پری ہے؟“

معروف دونوں میاں بیوی کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم دونوں میں ایسی نوک جھوک ہو رہی ہے جیسے تمہارا جو بیٹا ہے وہ رخشی کا بیٹا نہیں ہے اور رخشی کی جو بیٹی آرہی ہے وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔“

رحمان نے کہا۔ ”ہاں یہی حقیقت ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ تم نے دوسری شادی کی ہے۔ اس بیوی سے بیٹا ہوا ہے۔“

”میں نے دو بیویاں پالنے کی حماقت نہیں کی ہے۔ یہ میری اکلوتی بیوی ہے۔“

رخشی نے تائید کی۔ ”میری کوئی سوکن نہیں ہے۔ اس بیٹے کو پیدا کرنے کی غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ مائیں تو بیٹوں کی تمنا کرتی رہتی ہیں۔“

رخشی نے کہا۔ ”اور باپ بیٹیوں کو چاہتے ہیں۔ کلیجے سے لگاتے ہیں۔ ان سے پوچھیں کیا یہ میری عدیلہ کو چاہتے ہیں؟“



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

رحمان نے کہا۔ ''یہی سوال میں کرتا ہوں۔ معروف کے سامنے جواب دو۔ کیا میرے عادل کو جانتی ہو؟''

معروف نے پوچھا۔ ''اچھا تو بیٹے کا نام عادل ہے؟''

''ہاں عادل رحمان ہے۔ میرا پورا بزنس سنبھالتا ہے۔ ابھی آئے گا تو اس سے مل کر خوش ہو جاؤ گے۔''

رخشی نے کہا۔ ''وہ تو کبھی نہیں آئے گا۔ دیکھ لینا' صرف میری عدیلہ آرہی ہے۔''

رحمان نے کہا۔ ''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ آئے گا۔ اس نے مجھ سے فون پر کہا ہے۔''

رخشی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''دونوں بھائی بہن میں بنتی نہیں ہے۔ وہ ایک ساتھ کبھی نہیں آئیں گے۔''

جہاز رن وے پر اتر چکا تھا۔ مسافروں کے لیے سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں۔ معروف نے کہا۔ ''آپ دونوں جھگڑا نہ کریں۔ مسافر جہاز سے نکل رہے ہیں۔ ابھی وہ بھائی بہن دکھائی دیں گے۔''

وہ تینوں بالکونی میں کھڑے ہوئے سر جھکائے نیچے دیکھ رہے تھے۔ جہاز سے اتر کر آنے والے مسافر بالکونی کے نچلے حصے سے گزرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

معروف ان میاں بیوی کے متعلق سوچ کر حیران ہو رہا تھا۔ دونوں لندن کے پروردہ تھے۔ ذہین تھے بڑی کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن بیٹی اور بیٹے کے بارے میں جھگڑتے وقت بالکل ابنارمل لگ رہے تھے۔

وہ دونوں گزرتے ہوئے مسافروں کو توجہ سے دیکھ رہے تھے ابھی تک بیٹی اور بیٹا نظر نہیں آئے تھے۔ رخشی نے کہا۔ ''اللہ کرے تمہارا بیٹا نہ آئے۔''

وہ مٹھی بھینچ کر بڑے اعتماد سے بولا۔ ''چلو شرط لگاؤ' تمہاری بیٹی نہیں آئے گی۔''

معروف نے کہا۔ ''ایسے نہ بولو رحمان! میں یہاں عدیلہ سے ہی ملنے آیا ہوں۔ وہ ہمارے لیے ڈاکٹر ہے۔ ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔''

رخشی نے فخر سے کہا۔ ''میری بیٹی جہاں جاتی ہے' لوگوں کی ضرورت بن جاتی ہے۔''

رحمان نے کہا۔ ''جب آئے گی۔ تب ضرورت بنے گی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔ جہاز کا آخری مسافر بھی گزر گیا ہے۔ نہ بیٹی آئی ہے نہ بیٹا...''

رخشی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کسی کو تو آنا چاہیے تھا۔ اس نے لندن سے روانہ ہوتے وقت فون پر کہا تھا کہ اسی فلائٹ سے آرہی ہے۔''

رحمان نے کہا۔ ''ہمیں لگیج ہال کی طرف جا کر دیکھنا چاہیے۔ ان میں سے کوئی تو ضرور آیا ہوگا۔''

وہ ہوٹل کی بالکونی سے نکل کے نیچے وزیٹرز لاؤنج میں آگئے۔ وہاں سے باہر آنے والے مسافروں کو دیکھنے لگے۔ بیٹا بیٹی نے آنے کا وعدہ کیا تھا' وہ یا تو نہیں آئے تھے یا پھر ماں باپ سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ معروف کو ایسا لگ رہا تھا جیسے صرف ماں باپ ہی نہیں' بچے بھی ابنارمل ہیں۔

اس نے کہا۔ ''رحمان! دونوں نہیں آئے۔ کوئی ایک تو آسکتا تھا۔ تمہارے بچے ابنارمل تو نہیں ہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ آچکے ہیں۔ ابھی لگیج ہال سے نکلیں گے۔ تم دیکھ لینا۔''

رخشی کے فون سے کال بیل سنائی دی۔ وہ ننھی سی اسکرین کو دیکھتے ہوئے خوش ہو کر بولی۔ ''عدیلہ ہے...!''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہائے عادی! کہاں ہو تم؟''

وہ بولی۔ ''میں نہیں بتاؤں گی۔ آپ دونوں کی لڑائی سے میرا سر دُکھنے لگتا ہے۔''

''بیٹی! ہم لڑائی نہیں کر رہے ہیں۔ تم آکر دیکھ لو۔ تمہارے انکل معروف بھی تمہیں ویل کم کہنے آئے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''یہ فون انکل معروف کو دیں۔''

''تم ان سے کیا بات کرو گی یہاں آجاؤ نا۔''

''نہیں۔ پہلے ان سے بات کروں گی۔''

''تم بہت ضدی ہو۔''

اس نے معروف کی طرف فون بڑھا کر کہا۔ ''پتا نہیں اس کے سر میں کیا سمایا ہے۔ پہلے تم سے فون پر بات کرے گی۔''

معروف نے فون لے کر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو عدیلہ!''

اس نے سلام کیا۔ معروف نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے لندن کے ماحول سے آکر سلام کیا ہے۔ خوش رہو بیٹی! کہاں ہو تم؟ یہاں آتو گئی ہو نا؟''

''یس انکل! آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں گی۔ پلیز ذرا مام اور پاپا سے دور ہو کر باتیں کریں۔''

وہ ایک طرف گھوم کر ذرا دور جاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ دور آگیا ہوں۔ بولو۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا آپ اپنی کار میں آئے ہیں یا مام اور پاپا کے ساتھ ہیں؟''

''میں اپنی کار میں آیا ہوں۔''

''کہاں پارک کی ہے؟ اس کا نمبر کیا ہے؟''





اس نے نمبر بتائے' پارکنگ کی جگہ بتائی پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''ہماری بیٹی کچھ پُراسرار بن رہی ہے۔''

''ہاں انکل! ابھی آپ انجوائے کریں گے۔ جو کہتی ہوں' وہ کریں۔ انکار نہ کریں۔''

''بھئی کیا کروں؟''

''آپ یہ فون مام کو دیں۔ میں ان سے کچھ بولوں گی یعنی یہی کہ میں یہاں ان سے نہیں مل رہی ہوں۔ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ جارہی ہوں۔ آپ کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے ان سے الگ ہو جائیں۔ میں آپ کی کار کے پاس ملوں گی۔''

''بھئی میں تو تم سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ اگر اسی طرح ملاقات ہو رہی ہے تو یہی سہی۔''

اس نے پلٹ کر واپس آکر فون رخشی کو دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولنے لگی۔ رحمان نے پوچھا۔ ''یہ ہے کہاں؟ یہاں کیوں نہیں آرہی ہے؟''

رخشی نے فون پر کہا۔ ''کیوں سہیلی کے ساتھ جارہی ہو؟ ہمیں نظر انداز کر کے ہماری انسلٹ کر رہی ہو۔ معروف صاحب کیا سوچیں گے۔''

وہ بولی۔ ''میں انکل سے معذرت کر چکی ہوں۔''

معروف نے کہا۔ ''رخشی... امیں مائنڈ نہیں کروں گا۔ اسے سہیلی کے ساتھ جانے دو۔ مجھے بھی ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ مجھے اجازت دو۔''

اس نے رخشی اور رحمان سے مصافحہ کیا پھر وہاں سے چلتا ہوا عمارت کے باہر ایک جگہ اپنی کار کے پاس آگیا۔ اس نے دور تک نظریں دوڑائیں پھر دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ساتھ والی سیٹ کے دروازے کو اَن لاک کر دیا۔

عدیلہ اور اس کے ماں باپ کچھ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ تقریباً چوبیس برس پہلے وہ بہت ہی ذہین اور بہت ہی مستقل مزاج تھے اور بڑی محبت اور اعتماد سے رہتے تھے۔ اس وقت ان کی نہ بیٹی ہوئی تھی نہ بیٹا ہوا تھا۔ اور نہ ہی وہ ابنارمل ہو کر مضحکہ خیز انداز میں جھگڑتے تھے۔

بڑی تبدیلی آئی تھی۔ اب ان میں وہ پہلے والی ذہانت اور خود اعتمادی نہیں رہی تھی۔ وہ جاہل گنوار میاں بیوی کی طرح ایسی بات پر لڑ رہے تھے کہ حیرت ہو رہی تھی۔

رحمان اپنی بیٹی کو ناپسند کرتا تھا اور اپنے بیٹے کو زیادہ چاہتا تھا۔ رخشی نے جس بیٹے کو جنم دیا تھا اس سے جیسے نفرت کرتی تھی۔ جب کہ کوئی بھی نارمل رہنے والی ماں ایسا نہیں کرتی۔ لیکن معروف کی آنکھوں کے سامنے ایسا ہو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک لڑکی نے کھڑکی پر جھک کر پوچھا۔ ''آپ انکل معروف ہیں؟''

اس نے پوچھا۔ ''اور تم عدیلہ ہو؟''

''او یس انکل...!''

اس نے آگے کو جھک کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''کم آن بے بی... ! تم بہت زندہ دل لڑکی ہو۔''

اس نے اندر آکر دروازے کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ زندہ دلی سے انجوائے کرتے ہیں۔ چلیں۔''

کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ اس نے عبا پہنی تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم نے اسے پہن کر آئینہ دیکھ کر کہا ہوگا۔ 'میرا باپ بھی مجھے پہچان نہیں سکے گا۔'''

وہ جواباً ہنستی ہوئی بولی۔ ''میرا کونفیڈنس دیکھ لیں انکل... ! مام اور پاپا پہچان نہ سکے۔''

''تم نے اور تمہارے مام اور پاپا نے حیران کر دیا ہے۔ بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے یہ بتاؤ۔ کہاں چلنا ہے؟ اپنے گھر یا میرے گھر؟''

''تفریح بھی ہو اور کام بھی ہو۔ وہاں چلیں' جہاں میری پیشنٹ ہے۔ کیا ہے نام ہے اس کا؟''

''ماروی...!''

''ہاں۔ یہ میری پہلی پیشنٹ ہے۔ جسے میں تنہا ہینڈل کروں گی۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ اناڑی ہوں۔ بائی دا وے کبھی ضروری ہوا تو اپنے سینئرز سے راہنمائی حاصل کروں گی۔''

وہ سیٹ پر اس کی طرف گھوم کر بولی۔ ''میں اپنے کام کے معاملے میں کریزی ہوں۔ آپ دیکھیں کہ شروع کرنے سے پہلے ہی شروع کر رہی ہوں۔ کسی اپائنٹمنٹ کے بغیر جا رہی ہوں... کیا بتاؤں' ماروی کی پچھلی تمام ہسٹری جاننے کے لیے اس کے اندر کی باتیں معلوم کرنے کے لیے کتنی بے چین ہوں۔

''یقین کریں۔ لندن سے سوچتی آرہی ہوں کہ اس کی یادداشت واپس لانے کے لیے کیسے طریقے اختیار کروں گی۔ کیسی کیسی ڈرامائی سچویشن پیدا کروں گی۔ ہائے مزہ آجائے گا۔''

معروف نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے فون نکال کر کہا۔ ''تم یہاں آنے سے پہلے ہی ماروی سے Involve ہو چکی ہو۔ یہ ہمارے لیے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت اچھی بات ہے۔"

اس نے نمبر پنچ کیے۔ پھر رابطہ ہوتے ہی کہا۔ "محبوب! ایک اچھی بات سنو'ڈاکٹر عدیلہ'ماروی کے معاملہ میں بہت ہی Serious ہیں۔ یہ ابھی آرہی ہیں۔ہم اندازاً ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جائیں گے...اوکے؟"

محبوب نے خوش ہو کر کہا۔"اوکے...!"

اس نے فون بند کرتے ہوئے عدیلہ سے کہا۔"میری حیرانی دور کرو۔تمہاری مام اور پاپا کی رائے تمہارے متعلق الگ الگ ہے۔مام تمہیں بہت چاہتی ہیں اور پاپا تم سے بیزار نظر آتے ہیں۔"

وہ نقاب اور عبا اتارتے ہوئے بولی۔"پاپا کو بیٹی پسند نہیں ہے اور میں پیدا ہو گئی ہوں۔وہ مجھے مجبوراً برداشت کررہے ہیں۔"

"اور میں نے دیکھا ہے کہ تمہاری مام کو بیٹا پسند نہیں ہے جبکہ اسے اپنی کوکھ سے پیدا کیا ہے۔" وہ کار کو دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔"اپنی کوکھ کی اولاد سے نفرت...؟ یقین نہیں آتا۔"

"وہ نفرت نہیں کرتی ہیں۔بس اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔یہ کہہ لیں کہ اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔"

"وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

وہ چپ رہ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔معروف نے اسے کن انکھیوں سے دیکھا پھر پوچھا۔"وہ تم سے بڑا ہے؟ یا تم پہلے پیدا ہوئی تھیں۔کچھ اس کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ چپ تھی۔اس کی نظریں ونڈ اسکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔معروف نے پھر اسے سر گھما کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔"یہ ایکدم سے چپ ہو گئیں۔کیا سوچ رہی ہو؟"

"سوچ رہی ہوں۔آپ کے سوال کا کیا جواب دوں؟ آپ پوچھ رہے ہیں۔وہ میرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"ہاں میں یہی پوچھ رہا ہوں۔"

وہ اس کی طرف جھک کر مسکراتے ہوئے'بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔"وہ ہوگا تو آئے گا نا؟"

معروف نے چونک کر اسے دیکھا۔فوراً ہی کار کی رفتار سست کی پھر پوچھا۔"کیا کہا تم نے...؟"

وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔"انکل...! میں مام اور پاپا کی ایک ہی اولاد ہوں۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔"کیا کہہ رہی ہو؟"

"آپ سے مام اور پاپا جو نہیں کہیں گے'وہ کہہ رہی ہوں۔میری پیدائش کے بعد مام ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھیں۔تب سے وہ دونوں کسی قدر ابنارمل رہنے لگے ہیں۔"

معروف نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔"میں دیکھ رہا تھا'ان کے ابنارمل ہونے کا کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔"

وہ کہہ رہی تھی۔"ڈاکٹروں نے میری پیدائش کے بعد کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ ماں نہیں بن سکیں گی اور پاپا ایک بیٹا چاہتے تھے۔وہ بیٹا جو پیدا نہیں ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔وہ اسے میرے اندر دیکھتے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔"کیا بتاؤں کہ اپنے ہی گھر میں کیسا تماشا بن گئی ہوں۔وہ بچپن سے مجھے لڑکوں کا لباس پہناتے ہیں اور لڑکوں کی طرح بولنے کو کہتے ہیں۔مام اعتراض کرتی آئی ہیں۔میں لڑکی ہوں میری پرورش لڑکیوں جیسی کرتی آرہی ہیں۔

"یہ سلسلہ بچپن سے ہے۔میں کچی عمر سے انہیں لڑتے جھگڑتے دیکھتی آرہی ہوں۔پاپا لندن میں رہتے ہیں تو اپنے شناساؤں سے کہتے ہیں کہ ان کا بیٹا عادل رحمان پاکستان میں ہے اور پاکستان میں رہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بیٹا لندن میں رہ کر کاروبار سنبھال رہا ہے۔"

معروف نے کہا۔"یہ تو اچھا ہی ہوا ہے کہ تم کلینکل سائیکولوجسٹ بن گئی ہو۔اپنی مام اور پاپا کو آسانی سے ٹریٹ کرتی ہوگی۔"

"یہ جو میں نے ایئرپورٹ میں انہیں اپنی صورت نہیں دکھائی ہے اور آئندہ کئی گھنٹوں تک ان سے دور رہوں گی تو سمجھیں کہ یہ بھی ایک طریقہ علاج ہے۔

میرے اس طریقہ کار کے نتیجے میں وہ سوچیں گے اور سمجھیں گے کہ لندن سے آنے والی بیٹی کیوں نہیں مل رہی ہے؟ وہ لڑائی جھگڑوں کو اپنی غلطیوں کو خود سمجھیں گے۔ میں ان لمحات میں ان کی بیٹی نہیں معالج ہوں۔

"یہ وضاحت کر دوں کہ میرے مام اور پاپا دماغی مریض'پاگل یا نیم پاگل نہیں ہیں۔صرف ایک صدمہ ہے کہ کبھی ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکیں گے۔صرف اسی ایک پہلو سے ابنارمل ہیں ورنہ باقی تمام دنیاوی معاملات میں ذہین اور حاضر دماغ ہیں۔"

ان کی کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی، سیکورٹی گارڈ نے انٹرکام کے ذریعہ اطلاع دی تھی۔سمیرا اور محبوب نے باہر آکر عدیلہ کا استقبال کیا۔وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی۔وہاں ماروی'چاچی اور میڈم زوزی تھیں۔سمیرا نے عدیلہ کو ان سے متعارف کرایا۔عدیلہ نے





بڑی اپنائیت سے ماروی کا ہاتھ تھام لیا۔اسے بڑے پیار سے نظر بھر کر دیکھنے لگی۔

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔پھر عدیلہ نے کہا۔"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری پیشنٹ اتنی حسین ہوگی اور میں کھلتے ہوئے گلاب کے ساتھ رہا کروں گی۔مجھ سے دوستی کرو گی؟"

ماروی نے کہا۔"میں پچھلے پانچ دنوں سے دوستی کرتی آرہی ہوں۔جو بھی آتا ہے'اسے نہ پہچانتے ہوئے بھی بڑے اعتماد سے دوستی کرنے لگتی ہوں۔یہ میری چاچی بن گئی ہیں۔یہ سمیرا ہیں۔میری سہیلی بن گئی ہیں۔"

اس نے محبوب کی طرف اشارہ کیا۔"یہ میرے مہربان ہیں میرے سرپرست ہیں۔مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ مجھے چاہتے ہیں۔مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" وہ عدیلہ کی طرف گھوم کر بولی۔"ان کے ایک ہم شکل ہیں بالکل ایسے ہی ہیں۔وہ آئیں گے تو آپ دیکھیں گی'ان میں ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔یہ چاچی میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔یہ کہتی ہیں کہ میں اس ہم شکل مراد کی منگیتر ہوں۔آج تم آگئی ہو تو میں تمہاری بھی دوست بن جاؤں گی۔"

وہ بول رہی تھی۔عدیلہ اس کی مترنم آواز اور لہجے کی مٹھاس کو سن رہی تھی پھر اس نے کہا۔"میں تم سے تنہائی میں بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔بہت سی باتیں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔"

"میرے پاس کہنے کے لیے صرف پانچ دن کی باتیں ہیں۔اس سے پہلے یہ دنیا کہاں تھی؟ میں کہاں تھی'نہیں جانتی۔"

وہ اس کے ہاتھ کو تھپک کر بولی۔"میں تمہیں تمام بھولی ہوئی باتیں یاد دلاؤں گی۔آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو۔"

وہ دونوں ایک صوفہ پر بیٹھ گئیں۔عدیلہ نے محبوب سے پوچھا۔"کیا آپ اس کے سرپرست ہیں؟"

اس نے کہا۔"ہاں اس حد تک سرپرست ہوں کہ دکھ سکھ میں کام آتا رہتا ہوں۔ورنہ یہ چاچی فتی ہیں۔انہوں نے بچپن سے اس کی پرورش کی ہے۔اب تک اسے ماں کا پیار دیتی آرہی ہیں۔یہ ماروی کی زندگی کی ایک ایک بات آپ کو بتا سکیں گی۔"

وہ چاچی سے بولی۔"میں یہاں کسی جگہ آپ سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

فتی نے فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔"میں حاضر ہوں۔ابھی میرے کمرے میں چلو۔"

عدیلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔"مجھے ضروری باتیں نوٹ کرنے کے لیے قلم اور سادے کاغذات کی ضرورت ہے۔"

معروف نے کہا۔"یہ چیزیں مل جائیں گی۔پہلے کچھ ریفریشمنٹ اور چائے ہو جائے۔"

"میں اسی کمرے میں چائے پیوں گی۔"

اس نے ماروی کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔"آؤ۔آج سے تم میرے ساتھ رہا کرو گی۔کیونکہ میں یہاں تمہارے ہی علاج کے لیے آئی ہوں۔"

ماروی نے صوفہ سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔اس کے ساتھ چلتی ہوئی چاچی فتی کے کمرے میں آگئی۔وہاں اس نے کمرے کی تمام چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔پھر ماروی کا ہاتھ پکڑ کر قد آدم آئینے کے سامنے آگئی۔

عدیلہ نوجوان'صحت مند اور خوبصورت تھی۔آئینے میں خود کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔"قدرت نے ہمیں خوب سے خوب تر ہونے'بننے سنورنے اور نکھرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔کیوں ماروی! ٹھیک کہتی ہوں نا؟ میری ہر بات کو سنا کرو۔سوال بھی کیا کرو اور جواب بھی دیا کرو۔

چاچی نے کہا۔"میں اسے بچپن سے دیکھتی آئی ہوں۔عجیب لڑکی ہے'آئینے کے سامنے نہیں جاتی۔کبھی بال سنوارتے وقت آئینہ دیکھ لیتی ہے ورنہ ادھر منہ بھی نہیں کرتی۔"

عدیلہ نے کہا۔"تعجب ہے۔آئینہ تو ہر عورت کی ضرورت ہے۔میں تو کہتی ہوں'اگر آئینہ نہ ہو اور عورت کو اپنی صورت نظر نہ آئے تو وہ مر ہی جائے گی۔"

وہ ماروی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آئینے کے سامنے لاکر بولی۔"دیکھو تم کتنی حسین ہو؟ تمہارے سامنے حسینہ عالم بننے والیاں پھیکی پڑ جائیں گی۔اے...! میں تمہاری تعریفیں کر رہی ہوں۔مسکراؤ۔کیا تمہیں خوشی نہیں ہو رہی ہے۔فخر حاصل نہیں ہو رہا ہے۔"

ماروی نے اسے معصومیت سے دیکھا پھر پوچھا۔"مجھے کیوں خوش ہونا چاہیے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ لڑکی جتنی حسین ہوتی ہے اتنے ہی اس کے چاہنے والے پیدا ہوتے ہیں۔"

ماروی نے پوچھا۔"بہت سے چاہنے والے...؟"

"ہاں۔جتنے چاہنے والے ہوتے ہیں'عورت اتنی ہی زیادہ حسین کہلاتی ہے۔"

"چاہنے والا ایک نہیں ہوگا۔کئی ہوں گے۔تو یہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراسر بےحیائی اور بےغیرتی ہوگی۔"

عدیلہ کو چپ لگ گئی۔ وہ ایسے معصوم سے جواب کی کبھی توقع نہیں کرسکتی تھی۔

پھر اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی تعریف ہوتی رہے اور لڑکیاں تو قدرتی طور پر آرزو کرتی ہیں کہ جو دیکھے ان کی قدر کرے۔"

"میں تو ایسی آرزو نہیں کرتی۔"

چاچی نے عدیلہ سے کہا۔ "بیٹی! یہ اور طرح کی لڑکی ہے۔ مراد اسے بچپن سے چاہتا ہے یہ صرف اسی کی آرزو کرتی ہے لیکن اسے بھی اپنا ہاتھ کبھی پکڑنے نہیں دیا۔"

عدیلہ نے اس کے قریب ہو کر کہا۔ "ایک بار کوئی مرد چھولے تو تم بار بار اس کے ہاتھ کی گرفت میں آنا چاہوگی۔"

وہ بولی۔ "میں نے ان پانچ دنوں میں صرف عورتوں سے ہاتھ ملایا ہے اور یہ حیا کا تقاضا ہے۔ شادی سے پہلے مجھے عورتوں کے ہی ہاتھوں میں رہنا چاہیے۔"

عدیلہ نے کہا۔ "میں تمہاری طرح لڑکی ہوں۔ دو بار تمہارا ہاتھ پکڑ چکی ہوں۔ کیا تم نے الگ سے کوئی بات محسوس کی ہے؟"

ماروی نے انکار میں سر ہلایا۔ عدیلہ نے کہا۔ "میں ورزش کرتی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں اور انگلیوں میں لڑکیوں والی نزاکت اور نرمی نہیں ہے۔ کیا تم نے مردانہ گرفت محسوس کی تھی؟"

اس نے معصومیت سے پوچھا۔ "مردانہ گرفت کیسی ہوتی ہے؟ میں نہیں جانتی پھر کیسے محسوس کرتی؟"

"دیکھو۔ تمہیں پچھلی زندگی کو یاد کرنا ہے۔ ابھی باتیں کرتے وقت ذہن کے کسی گوشے میں جاتی رہو۔ کوشش کرتی رہو کہ شاید کوئی بھولی ہوئی گرفت تمہیں یاد آجائے۔"

وہ درست کہہ رہی تھی اسے یاد آسکتا تھا کہ مراد نے میمن گوٹھ کے تھانے میں حوالات کے اندر رہ کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ محبوب گولیوں کی بوچھاڑ میں اسے بازوؤں میں اٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ مردانہ لمس سے اور ان کی گرفت سے آشنا تھی۔ کلینکل سائیکولوجسٹ اسے صحیح سمت لے جارہی تھی۔

کمرے میں ایک چھوٹی سی میز لائی گئی تھی، کاغذ قلم لاکر رکھا گیا تھا۔ عدیلہ، ماروی اور چاچی میز کے اطراف بیٹھ گئی تھیں۔ چاچی شروع سے ماروی کی زندگی کے حالات بیان کررہی تھی۔ ایسے وقت عدیلہ سر جھکائے توجہ سے سن رہی تھی اور اہم پوائنٹس نوٹ کرتی جارہی تھی۔

محبوب، معروف اور سمیرا ڈرائنگ روم میں منتظر تھے۔ عدیلہ وہاں آتی تو وہ اس سے ماروی کی پہلی ریڈنگ اور پہلی رپورٹ کے بارے میں بہت کچھ سن سکتے تھے۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ سمیرا اور معروف وہیں بیٹھے بیٹھے فون کے ذریعہ دفتری معاملات نمٹا رہے تھے۔ معروف عدیلہ کی تعریفیں کررہا تھا۔ محبوب اور سمیرا سے کہہ رہا تھا کہ وہ ماروی کے معاملے میں بڑی دلچسپی سے وابستہ ہوئی ہے۔

وہ انہیں بتارہا تھا کہ کس طرح عدیلہ نے طیارے سے اتر کر اپنے ماں باپ کو بھی اپنی صورت نہیں دکھائی ہے۔ بہت شوخ اور چنچل ہے۔ سیدھی یہاں آکر اپنا کام شروع کرچکی ہے۔

واقعی اس کی یہ مصروفیات ان سب کو متاثر کررہی تھیں۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد عدیلہ ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کے پیچھے ماروی اور چاچی تھیں۔ محبوب نے اسے جھکی جھکی نظروں سے ایسے دیکھا جیسے برسوں بعد دیکھ رہا ہو۔ تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اسے دور ہی سے دیکھتا آرہا تھا۔ قریب ہونے والی کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔

عدیلہ نے ایک صوفہ پر بیٹھتے ہوئے معروف کو سمیرا کو اور محبوب کو دیکھا پھر کہا۔ "میں ماروی کی ہسٹری سن رہی ہوں۔ چاچی نے پوری تفصیل سے اس کے بچپن اور جوانی کی ایک ایک بات بتائی ہے اور میں اہم باتیں نوٹ کرچکی ہوں لیکن..."

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ اس نے محبوب کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "ایک جوان لڑکی کی زندگی میں کبھی چوری چھپے کبھی میٹھی میٹھی رازداری سے پیار بھرے واقعات یا چند لمحات کیسے گزر جاتے ہیں یہ چاچی یا کوئی دوسرے بزرگ نہ دیکھ سکتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔"

وہ محبوب سے بولی۔ "میں ابھی تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔"

محبوب نے ماروی کو دیکھا۔ پھر عدیلہ سے پوچھا۔ "مجھ سے...؟ آپ مجھ سے کیا بات کریں گی؟"

"میری معلومات کے مطابق ماروی کے پہلے عاشق مراد علی منگی ہیں اور دوسرے آپ ہیں۔"

وہ بولا۔ "ہاں۔ مگر میں ماروی کے متعلق شاید کوئی ایسی بات نہیں بتاسکوں گا جو..."

عدیلہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ پریشان کیوں ہوگئے؟ کیا اس لیے کہ جب یہ مراد سے جیل میں ملنے کے بعد واپس جارہی تھی تو آپ اسے اغوا ہونے سے نہ بچا سکے؟"

اس بات پر سمیرا اور معروف نے ایک دوسرے کو





چور نظروں سے دیکھا۔ (انہوں نے اسے اغوا کرایا تھا۔)

عدیلہ نے محبوب سے پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ ماروی کو کس نے اغوا کیا تھا۔ یہ چاچی اور چاچا کے ساتھ کہاں ٹھوکریں کھاتی رہی تھی اور کس طرح واپس آئی ہے؟"

یہ ایسے سوالات تھے جن کے جوابات سے بھید کھل جاتا کہ سمیرا اور معروف نے ماروی کو محبوب سے دور کیا تھا۔ وہ ان دونوں پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور یہ عجیب وفاداری تھی کہ انہوں نے اعتماد کو قائم رکھتے ہوئے اسے دھوکا دیا تھا۔

معروف نے صوفہ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "عدیلہ! تمہاری پیشنٹ دماغی کمزوری میں مبتلا ہے۔ تم اس کی گمشدہ یادداشت واپس لانے کے لیے ایک اچھی ابتدا کررہی ہو۔ لیکن ماروی کے اغوا سے یادداشت کا کیا تعلق ہے؟"

وہ بولی۔ "بڑا ہی رومانٹک تعلق ہے۔ انسانی نفسیات یہ ہے کہ جوانی کے رنگین و سنگین لمحات ہماری زندگی میں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ویری ویری سوری۔ آپ بوڑھے ہیں اور میں جوانی کے حوالے سے بات کررہی ہوں۔ آپ یہ سمجھیں کہ دماغ کمزور ہو۔ یادداشت بحال نہ ہورہی ہو تو ایسے میں جوانی کا کوئی طوفانی لمحہ حافظے کی چنگاری کو راکھ تلے سے نکال کر بھڑکا دیتا ہے۔"

سمیرا اور معروف نے پھر چور نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عدیلہ نے کہا۔ "میں ابھی چاچی سے ماروی کی بہت ہی دلچسپ ہسٹری سن رہی تھی۔ اس کی روداد یہاں آکر رک گئی ہے کہ اسے کس نے اغوا کیا تھا؟

پھر یہ اغوا کی جانے والی اپنی چاچی چاچا سے کیسے مل گئی؟ پھر یہ خضدار کے علاقہ تک جاکر واپس آنے لگی تو وہ مراد اس کے پاس کیسے پہنچ گیا، جو ابھی جیل میں ہے؟"

وہ نوجوان، خوبصورت سی ڈاکٹر اور ماہر نفسیات اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے کے انداز میں ان سب سے ذرا دور گئی۔ پھر وہاں رک کر ان سب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بولی۔

"انسان مرجائے تو اس کے لیے ساری دنیا مر جاتی ہے۔ اس کی اچھائی برائی، اس کی شرافت و ذلالت اور اس کے تمام راز و نیاز قبر میں سوجاتے ہیں۔"

وہ ٹہلنے کے انداز میں واپس آتے ہوئے بولی۔ "کہتے ہیں کہ گڑے مردے نہ اکھاڑو۔ اُن کی ہڈیاں بھی بول اٹھتی ہیں۔"

وہ ماروی کو دیکھ کر بولی۔ "یہ کتنی خوبصورت، کتنی پیاری سی ہستی ہے۔ اسے دیکھو تو دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ آج اس کا دماغ بھولی ہوئی یادوں کا قبرستان بن چکا ہے اور..." اس نے سب پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر کہا۔ "اور اس قبرستان سے گڑے مردے نکالے جائیں گے تب ہی اس کی یادداشت واپس آئے گی۔"

وہ بڑے ٹھوس دلائل کے ساتھ بول رہی تھی اور وہ سب خاموشی سے سن رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "ماروی تمام بھید ابھی کھول سکتی تھی، لیکن افسوس...! کیا کیا جائے، یہ ناموافق حالات کے اندھیرے میں بھٹکی ہوئی ہے۔

چاچی نے اتنا بتایا ہے کہ کسی نامعلوم شخص نے ان سے اور چاچا سے فون پر کہا تھا کہ ماروی کی عزت آبرو اور سلامتی چاہتے ہو تو ہائی وے پر آجاؤ۔ وہ تمہیں زندہ سلامت ملے گی۔

اور واقعی ماروی انہیں وہاں مل گئی تھی۔ ان تینوں کو تاکید کی گئی تھی کہ کراچی واپس نہ آئیں۔ لہٰذا وہ بس میں بیٹھ کر آگے ریتی کی طرف چلی گئیں۔"

اس وقت چاچی سر جھکائے کبھی معروف کو اور کبھی سمیرا کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے عدیلہ کو ماروی کی ہسٹری سناتے وقت اس حد تک سچ کہا تھا کہ کسی نے انہیں ماروی کے ساتھ کراچی سے جانے کو کہا تھا۔ جس نے کہا تھا اس کا نام نہیں بتایا تھا۔

عدیلہ نے کہا۔ "مسٹر محبوب! کس نے ماروی کو آپ سے دور کیا ہوگا؟ اور دور کرکے اس نے کیا فائدہ اُٹھایا ہوگا؟ کیا آپ کو معلوم ہے؟ اگر نہیں تو آپ کو معلوم کرنا چاہیے۔

"میں ڈاکٹر ہوں۔ یہ صرف میرا ہی نہیں آپ کا بھی فرض ہے کہ حقائق معلوم کریں۔ ماروی کو یہ حقیقت اور اسی طرح کی بھولی ہوئی دوسری باتیں یاد دلائیں۔"

محبوب صوفہ پر ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "حقیقت یہ ہے کہ ماروی یہاں میری سرپرستی میں رہ کر بدنام ہورہی تھی۔ وہ اتنی گھبرائی تھی کہ میری لاعلمی میں مجھ سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے سمجھا منا کر کہیں جانے سے روک رکھا تھا۔"

وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ چلی گئی۔ عقل کہتی ہے کہ وہ خود نہیں گئی تھی۔ کیونکہ سمیرا اس کے ساتھ تھی۔ اغوا کرنے والے اسے بیہوش کرکے ماروی کو لے گئے تھے۔ ابھی چاچی کے بیان سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انہیں فون کرکے ہائی وے پر بلانے والوں نے پہلے سمیرا کو بیہوش کیا تھا پھر ماروی کو لے گئے تھے۔"

سمیرا نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اس کے سر سے الزام ٹل رہا تھا۔ محبوب نے کہا۔ "ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ کس نے ماروی کو اغوا کر کے اسے مجھ سے دور کیا تھا؟ ماروی تو اسے اچھی طرح جانتی ہوگی۔ اب ہمیں جاننے کے لیے اس کی یادداشت کے بحال ہونے تک انتظار کرنا ہوگا۔‘‘

عدیلہ کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس کی مام کال کر رہی تھی۔ وہ کال اٹینڈ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ’’یس مام؟‘‘

ماں نے پوچھا۔ ’’کہاں ہو؟ کیوں پریشان کر رہی ہو؟‘‘

’’جب تک آپ دونوں بیٹی اور بیٹے کے معاملے میں الجھتے رہیں گے‘ میں دور دور رہوں گی۔‘‘

وہ فون کو کان سے لگائے وہاں سے اٹھ کر ان سب سے دور چلی گئی۔ اس بار باپ کی آوز سنائی دی۔

’’بیٹے! میں وعدہ کرتا ہوں۔ نہ ہم الجھیں گے نہ تمہیں الجھائیں گے۔ آجاؤ۔‘‘

ماں کی آواز سنائی دی۔ ’’بیٹی! میں وعدہ کرتی ہوں تمہاری موجودگی میں ریحان سے جھگڑا نہیں کروں گی۔‘‘

’’میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔ یقین کرو‘ اپنے بیٹے کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔‘‘

وہ دونوں اسے یقین دلا رہے تھے کہ اس کے لیے مسئلہ نہیں بنیں گے اور اپنے اپنے طور پر اسے بیٹی اور بیٹا بھی کہتے جا رہے تھے۔

آخر والدین تھے ان سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے میں آرہی ہوں۔‘‘

ادھر سے باپ نے کہا۔ ’’مجھے بھی کہو کہ آرہے ہو۔‘‘

وہ پریشانی سے ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ’’یس پاپا! میں آرہا ہوں۔‘‘

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ان سب کے قریب آتے ہوئے محبوب سے بولی۔ ’’میں آپ کے پندرہ منٹ چاہتی ہوں پھر اپنے گھر جاؤں گی۔ محبوب نے اٹھ کر کہا۔ ’’آئیں۔ ہم ادھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھیں گے۔‘‘

وہ اس کے ساتھ لاؤنج میں آکر ایک صوفہ پر بیٹھ گیا۔ عدیلہ نے کہا۔ ’’ماروی کی یادداشت واپس لانے کے لیے آپ اور ماروی اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔‘‘

’’آپ مجھے بتائیں کہ کیا کرنا ہے‘ وہ ہر حال میں کروں گا۔‘‘

اس نے کہا۔ ’’چاچی نے ماروی کی جو ہسٹری سنائی ہے۔ اس کے مطابق مراد جیل میں ہے۔‘‘

’’انشاء اللہ وہ آج سے تیسرے یا چوتھے دن رہائی پا کر آئے گا۔ وہ بھی ماروی کی بہتری کے لیے وہی کرے گا جو آپ علاج کے طور پر چاہیں گی۔‘‘

’’فی الحال تو آپ اپنی اور ماروی کی لو اسٹوری سنائیں۔‘‘

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ’’ایسی تو کوئی لو اسٹوری نہیں ہے۔ میری محبت یک طرفہ ہے۔ میں اسے دیوانہ وار چاہتا ہوں اور وہ مراد کی دیوانی ہے۔‘‘

وہ ہمدردی سے بولی۔ ’’so sad تمہارا دل دکھتا ہوگا۔‘‘

’’بالکل نہیں۔ عشق نے سکھایا ہے کہ معشوق کو خوش دیکھتے رہنے سے پیار کی سچی مسرتیں ملتی ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔ میں بہت مسرور رہتا ہوں۔‘‘

’’پھر بھی آپ ماروی کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اپنے طور پر کوششیں کرتے ہوں گے۔‘‘

’’دنیا کہتی ہے کہ میں نے اسے جیتنے کے لیے کوٹھی‘ کار اور بینک بیلنس دیے ہیں اور خدا جانتا ہے۔ میں نے مراد کی غیر موجودگی میں سہارا بننے کے لیے اسے تحفظ اور سلامتی دی ہے۔

خدا مجھے موقع پرست نہ بنائے۔ میں نے ماروی کو دباؤ میں لانے کے لیے کبھی اس پر احسان نہیں جتایا ہے۔ ایک بیوپاری کی طرح یہ معاہدہ نہیں کیا ہے۔ ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی ہے کہ وہ میری منکوحہ بنے گی تو میں اسے تحفظ اور سلامتی دوں گا اور اس کے مراد کا مقدمہ لڑتا رہوں گا۔ خدا کا شکر ہے۔ میں ان تمام آزمائشی مراحل سے گزر چکا ہوں۔ وہ رہائی پا کر آنے والا ہے پھر وہ میرا محتاج نہیں رہے گا۔‘‘

’’یہ آپ کی شرافت اور نیکیاں ہیں لیکن ان باتوں سے اس کے علاج میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ آپ اس سے عشق کرتے ہیں‘ اس سے انکار نہیں ہے۔ مجھے تو اس کے ساتھ ہونے والی ایسی کوئی بات‘ کوئی ایسا واقعہ بتائیں جو ٹریٹمنٹ کے دوران ماروی کے دماغ کو چھو سکے۔ اس کی یادداشت کو ایک ذرا بیدار کر سکے۔‘‘

اس نے ایک ذرا سوچا پھر کہا۔ ’’ایک بار ایسا ہوا کہ دشمن ماروی کو مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اس پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ میں اسے بازوؤں میں اٹھا کر وہاں سے نکال لایا تھا۔‘‘

’’کیا پہلی بار اس کے قریب آئے تھے؟‘‘

’’نہیں پہلے بھی اس کی قربت اس طرح حاصل ہوتی رہی کہ ہمارے درمیان فاصلہ قائم رہا۔ اس روز پہلی بار میں نے اسے چھو لیا تھا۔ بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔‘‘

’’کیا آپ وہ لمحات بھی بھلا سکتے ہیں؟‘‘





’’کبھی نہیں۔ اس وقت بھی بول رہا ہوں تو میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ گئی ہیں۔‘‘

’’کیا آپ عورتوں سے مصافحہ کرتے ہیں؟‘‘

’’پاکستان سے باہر یورپ اور امریکا میں وہاں کے ماحول کے مطابق مصافحہ کرتا ہوں۔‘‘

’’مردوں اور عورتوں کے مصافحہ کی نرمی اور سختی واضح طور سے محسوس کرتے ہیں؟‘‘

’’ہاں فرق صاف ظاہر ہوتا ہے۔‘‘

وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔ ’’مجھ سے مصافحہ کریں۔‘‘

اس نے عدیلہ کے دعوت دینے والے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر مصافحہ کے طور پر اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بولی۔ ’’محسوس کریں۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ کیا میرے بدن کی نزاکت اس ہاتھ کے لمس میں ہے؟‘‘

’’ہاں ہے۔ مگر...‘‘

وہ سوچنے اور محسوس کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ’’میں اسے مردانہ سختی تو نہیں کہوں گا لیکن مضبوطی ہے۔ نزاکت نہیں ہے۔‘‘

’’میں اپنی باڈی کو پرفیکٹ رکھنے کی کوششیں کرتی ہوں۔ ہاتھوں کی اور انگلیوں کی بھی ورزش کرتی ہوں۔ اس لیے انگلیاں ایک ذرا سخت ہیں۔‘‘

’’پلیز وضاحت کریں کہ آپ کے ان ہاتھوں کا ماروی کے علاج سے کیا تعلق ہے؟‘‘

’’تعلق یہ ہے کہ آپ اسے بازوؤں میں اٹھا کر لے گئے تھے۔ آپ کے بازوؤں کی مردانہ گرفت اب بھی اس لڑکی کے تحت الشعور میں چھپی ہوگی۔ اگر میں بھی سائیکوڈراما کروں گی اور آپ اسے اپنی گرفت میں لیں گے تو اسے آپ کی پہلی گرفت ضرور یاد آئے گی۔‘‘

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ’’سوری۔ وہ مراد کی امانت ہے۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں اور اس سے جنون کی حد تک پیار کرتا رہوں گا لیکن اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔‘‘

عدیلہ نے اسے حیرانی سے دیکھا پھر کہا۔ ’’آپ عجیب قسم کے عاشق ہیں۔ بلکہ بے مثال عاشق ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی لیکن... ماروی سے جنون کی حد تک عشق کا دعویٰ ہے تو اس کی بہتری کے لیے آپ کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔‘‘

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ ’’ابھی تو مجھے جانا ہے۔ مام اور پاپا انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

وہ ڈرائنگ روم میں آکر ان سب سے رخصت ہونے لگی۔ محبوب وہاں آکر ماروی کو دیکھنے اور سوچنے لگا۔ عدیلہ نے ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے دل کو لگنے والا حکم دیا تھا کہ ماروی کے علاج کی خاطر کبھی کسی ڈرامائی سچویشن میں اسے چھونا ہوگا۔ اسے اپنی گرفت میں لینا ہوگا۔

ادھر عدیلہ نے ماروی سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ’’جانے کو تو جی نہیں چاہتا۔ مگر جانا ہوگا۔ کل سے صبح دس بجے آیا کروں گی اور رات دس بجے تک رہا کروں گی۔‘‘

ماروی نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت میں دیکھا۔ پھر کہا۔ ’’آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔‘‘

عدیلہ نے کہا۔ ’’ہاں آؤ۔ اُدھر چلو۔‘‘

وہ دونوں دوسروں سے ذرا دور ہو گئیں۔ ماروی نے کہا۔ ’’آپ نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے کہا تھا کہ کبھی کوئی تبدیلی محسوس کروں تو آپ کو فوراً بتاؤں۔‘‘

وہ خوش ہو کر بولی۔ ’’ہاں بولو۔ کیا محسوس کر رہی ہو؟‘‘

’’آپ نے چاچی کے کمرے میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا تھا کیا میں نے مردانہ گرفت محسوس کی ہے؟‘‘

’’تم نے محسوس نہیں کی تھی۔‘‘

وہ بولی۔ ’’اس وقت محسوس نہیں ہوئی تھی پھر میں نے وہاں سے یہاں تک کئی گھنٹوں کے بعد اچانک ہی آپ کے لمس کو یاد کیا تو ایک ذرا تبدیلی محسوس کی۔ تعجب ہے ایسی مضبوطی محسوس کی جو عورتوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتی۔‘‘

عدیلہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ’’یعنی میرے ہاتھوں میں نسوانی نزاکت نہیں ہے۔‘‘

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ’’شاباش! سوچ ذرا بھی تبدیل ہو۔ احساسات کچھ نئے سے لگیں تو فوراً مجھ سے بولا کرو۔ میں جا رہی ہوں۔ کل آؤں گی۔‘‘

وہ باہر آکر محبوب کی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور اسے گھر پہنچانے جا رہا تھا۔

☆☆☆

رخشی آرام دہ کرسی پر بیٹھی سوچ میں گم تھی۔ وہ کرسی اسے ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ اس کی سوچ کی طرح اسے آگے پیچھے لے جا رہی تھی۔ بیٹی نے فون پر کہا تھا کہ ابھی آرہی ہے۔

تصور میں بیٹا دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ لیکن تنہائی میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بدن سے لڑکیوں والا لباس اتر رہا تھا اور لڑکوں والا لباس اسے بیٹا بنا رہا تھا۔

حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ بیٹی بھی تھی اور بیٹا بھی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ کیونکہ ماں نے ایک ہی اولاد کو جنم دیا تھا۔ دوسری کوئی اولاد نہیں تھی جو بھی تھی وہی بیٹی اور بیٹا بن جایا کرتی تھی۔

اس کے قریب ہی ایک کمرے میں رحمان کمپیوٹر پر بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے سے مانیٹر پر اس کا بیٹا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ باپ گرافک کے ذریعہ اسے بیٹی بنا رہا تھا۔ اس کے بدن کے ایک ایک حصے کی ایڈیٹنگ کر رہا تھا۔

وہ کیا تھی؟ وہ کون تھا؟ عدیلہ رحمان یا عادل رحمان؟

کار کا ہارن سنائی دیا۔ وہ آ گئی...؟ وہ آ گیا...؟

باپ اپنے کمرے میں رہا۔ ماں نے آ کر بیرونی دروازے کو کھولا۔ وہ شانے سے بیگ لٹکائے کھڑی تھی۔ ماں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چوم کر گلے سے لگایا۔ پھر کہا۔ ”تم بیٹی بن کر آئیں۔ دل خوش کر دیا۔ اب اپنے پاپا کے پاس جاؤ۔“

وہ اس کمرے سے گزر کر ایک کوریڈور میں آئی۔ وہاں باپ کھڑا تھا۔ وہ بولی۔ ”ہائے پاپا...!“

وہ دوسری طرف منہ پھیر کر بولا۔ ”تمہیں معلوم ہے میں تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے بیٹے بن جاؤ۔“

وہ آگے بڑھ کر سامنے والا دروازہ کھول کر کمرے میں گئی۔ عبدالرحمان دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے شانے سے بیگ کو اتار کر ایک طرف پھینکا۔ پھر باپ کو دیکھتے ہوئے بلاؤز اتارنے لگی۔ دیکھا جائے تو یہ سراسر بے حیائی تھی۔ لیکن حیا کی کوئی بات ہوتی تو بے حیائی ہوتی۔ اس نے بریسٹ فارم والے بریزر کو اتارا تو وہاں سینہ سپاٹ تھا۔ وہ لڑکی نہیں تھی۔ لڑکا تھا۔ عدیلہ نہیں تھی۔ عادل رحمان تھا۔

عبدالرحمان نے آگے بڑھ کر اسے پیار کیا پھر گلے سے لگا لیا۔ کیونکہ وہ بیٹی نہیں تھی، پیدائشی طور پر بیٹا تھا۔

اب یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ ابنارمل افراد کا گھرانہ ہے۔ تیس برس پہلے عبدالرحمان نے رخشی سے شادی کی تھی۔ پھر اولاد کے انتظار میں چھ برس گزار دیے۔ انہیں مایوسی ہوتی رہی کہ شاید کبھی ایک بچے کے بھی ماں باپ نہیں بن پائیں گے۔

رحمان دل و جان سے رخشی کو چاہتا تھا۔ بچے پیدا کرنے کے لیے اس پر سوکن نہیں لانا چاہتا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر انتظار کر رہا تھا۔ آخر ان کی محبت رنگ لائی۔ ایک روز لیڈی ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی کہ رخشی ماں بننے والی ہے۔

دونوں میاں بیوی خوشی سے جیسے پاگل ہو گئے۔ رخشی شروع سے کہتی آ رہی تھی کہ اسے بیٹی کا شوق ہے اور رحمان کہتا تھا کہ بیٹا ہونا چاہیے۔ اب اولاد متنازعہ ہو گئی کہ کیا ہو...؟ بیٹی یا بیٹا...؟

جب ماں بننے کے آثار پیدا ہوئے تو وہ بولی۔ ”میں اپنی حسرت پوری کروں گی۔ پہلے بیٹی پیدا کروں گی۔“

وہ بولا۔ ”نہیں تمہیں بیٹا پیدا کرنا چاہیے۔ پہلے بیٹا ہوگا تو جلدی جوان ہو کر کاروبار سنبھالے گا۔“

وہ بولی۔ ”بیٹا برس دو برس بعد بھی ہوگا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے بیٹی ہونی چاہیے۔ بیٹی سے گھر میں رونق ہوتی ہے۔ وہ ہنستی ہے تو اس کی سریلی ہنسی سے سات سروں کی برسات ہوتی ہے اس کی اداؤں سے پھول کھلتے ہیں اور اس کے حسن و جمال سے رنگ بکھرتے رہتے ہیں۔“

وہ اپنی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ رحمان نے ایک ننھے سے بچے کی تصویر بیڈ کے سامنے والی دیوار پر لگا دی تاکہ رخشی سوتے جاگتے ایک بیٹے کی تصویر دیکھتی رہے اور اس نفسیاتی حربے کے باعث ایک بیٹا پیدا کرے۔ رخشی نے اس بچے کے برابر ایک خوبصورت سی بچی کی تصویر لگا دی۔ صرف اتنا ہی نہیں، کمپیوٹر اور موبائل فون کے وال پیپر بھی وہی بچی نظر آنے لگی۔ بیٹی اور بیٹے کے لیے ان کا یہ دیوانہ پن دیکھ کر فیملی ڈاکٹر نے سمجھایا اولاد کے معاملے میں اتنے کریزی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جنون بڑھتا رہے گا تو بیٹی ہو یا بیٹا اس کی زندگی پر برا اثر پڑے گا۔

ڈاکٹر کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ واقعی جنون اس قدر بڑھ گیا تھا کہ زچگی کا کیس بگڑ گیا۔ بچہ پیدا ہی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ بعد میں میجر آپریشن کے ذریعہ ایک بیٹا پیدا ہوا تھا۔ یہ قدرتی مجبوری تھی۔ وہ خود کو سمجھا لیتی ’اس بار نہ سہی‘ دوسری بار بیٹا ہوگا۔ لیکن یہ ڈاکٹری رپورٹ پڑھ کر اس کے دل پر بجلی گر پڑی کہ وہ آئندہ ماں نہیں بن سکے گی۔

آئندہ بیٹی پیدا کرنے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ وہ ماں بن ہی نہیں سکتی تھی۔ اس ناکامی و نامرادی نے اسے ذہنی مریضہ بنا دیا۔

وہ اپنے حواس میں نہیں رہتی تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر کہتی تھی کہ وہ بیٹی ہے۔ ابتدا میں اسے نارمل رکھنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی گئی کہ وہ بیٹا نہیں بیٹی ہے۔

چند ماہ بعد رخشی نے تسلیم کیا کہ وہ بیٹا ہے۔ لیکن اسے بیٹی بنا کر رکھے گی۔ رحمان نے اعتراض کیا اور کہا۔ ”یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی پرورش مرد بچے کی طرح ہونی چاہیے۔“

وہ اصولاً درست کہہ رہا تھا۔ لیکن پرورش کی ذمہ داریاں تو ماں پر ہوتی ہے۔ باپ تو کمانے کے لیے گھر سے باہر رہتا ہے۔ رحمان کاروباری دورے پر نگری نگری جاتا





تھا۔ واپس آ کر ایک گڑیا جیسی بیٹی کو پونی ٹیل اور لڑکیوں کے رنگا رنگ لباس میں دیکھتا تھا۔ جھنجلاتا تھا پھر اس کا لباس بدل کر اسے بیٹا بناتا تھا۔

وہ ماں کے ساتھ لڑکیوں کے انداز میں بولتا تھا اور بڑی اداؤں سے لہرا کر چلتا تھا۔ رحمان اسے اپنی طرح بولنا اور چلنا پھرنا سکھاتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں اسے اپنے مزاج اور اپنی پسند کے مطابق ڈھالتے رہتے تھے۔ لیکن باپ کی کلاس گھنٹے دو گھنٹے رہتی تھی۔ وہ چلا جاتا تھا۔ ماں کا اسکول دن رات کھلا رہتا تھا۔ اسے ایک لڑکی کے مزاج میں ڈھالنے کی پکی تربیت ہو رہی تھی۔

دو یا تین برس کی عمر میں ہی یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ وہ لڑکی ہے۔ اس کے ذہن میں نسوانی حسن اور نزاکت رچ بس گئی تھی۔ ماں سمجھاتی تھی کہ وہ غلطی سے لڑکے کے جسم میں سما گئی ہے۔ وہ جیسے جیسے عمر کی منزلیں طے کرتا گیا۔ یہ تسلیم کرتا گیا کہ اصل حسن و جمال عورتوں میں ہوتا ہے۔ ساری دنیا مرد کو پتھر اور عورت کو پھول کہتی ہے۔ دیکھنے والی ہر آنکھ عورت کا ہی حسن دیکھنا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ دیکھے جانے والی اور داد حاصل کرنے والی چیز بنتا چلا گیا۔

وہ اپنے چہرے اور جسم کو حسین اور دلنشین بنائے رکھنے کے جدید مراحل سے گزرتا رہتا تھا۔ اس سلسلے میں ماں اسے ہر پہلو سے گائڈ کرتی رہتی تھی۔ کئی ماہر نفسیات لیڈی ڈاکٹرز کی بھی خدمات حاصل کرتی رہی تھی

جوانی میں مونچھیں ڈاڑھی نکلنے والی تھیں۔ اس سے پہلے رخشی اسے Feminizing hormones نامی دوا کھلایا کرتی تھی۔ یوں بھی اس کی جلد چکنی تھی۔ بال برائے نام تھے۔ اس دوا کے اثر سے بالکل ہی ختم ہو گئے۔

اپنے جسم میں نسوانی نزاکت اور نرمی پیدا کرنے کے لیے بازار میں کئی طرح کی فیمی نائزنگ ڈرگس دستیاب ہیں وہ ان کے ذریعہ رفتہ رفتہ تبدیل ہوتا رہا تھا۔ اور باپ کی پریشانیاں بڑھتی رہی تھیں۔ اس نے بیٹے سے پوچھا۔ ”کیا تم سچ مچ دل سے اور دماغ سے عورت بن گئے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”نو پاپا! میں مرد ہوں مرد ہی رہوں گا۔“

”پھر تم سر سے پاؤں تک لڑکی بن کر کیوں رہتے ہو؟“

”پاپا! میں علم نفسیات کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ آپ کو یہ بتاؤں کہ انسان میں کسی کو چاہنے کی اور کسی سے چاہے جانے کی خواہش رہتی ہے۔ میرے اندر چاہے جانے کی خواہش زیادہ ہے۔ میں چاہتا ہوں سب ہی مجھ پر صدقے واری جائیں۔“

وہ ایک ادا سے ہاتھ نچا کر بولا۔ ”اور آپ تو جانتے ہیں کہ ساری دنیا نسوانی حسن اور اس کی اداؤں پر مرتی رہتی ہے۔ جب میں عدیلہ بن کر باہر جاتی ہوں۔ کسی محفل میں پہنچتی ہوں تو کتنے ہی مرد مجھ سے دوستی کرنے کے لیے مچل جاتے ہیں اور میں یہ کہہ کر انہیں مایوس کر دیتی ہوں کہ میرا آئیڈیل کوئی اور ہے۔“

”کیا کبھی کسی کو شبہ نہیں ہوتا ہے کہ تم ایک لڑکے ہو؟“

”آج تک کسی کو ایک ذرا سا شبہ نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا۔“

”آخر یہ ناٹک کب تک کرتے رہو گے؟“

”یہ ناٹک نہیں ہے۔ میں تو ساری زندگی ایسی ہی رہوں گی۔ میرا مطلب ہے رہوں گا۔ آپ کے سامنے مجبور ہو کر لڑکوں کی طرح بولنا پڑتا ہے۔“

رحمان نے بڑے صدمے سے کہا۔ ”میرے بیٹے...! کیا میرے پوتے پوتیاں نہیں ہوں گے؟ کیا میں اپنی آئندہ نسل کو پھلتے پھولتے بھی نہیں دیکھ سکوں گا۔“

اس نے باپ کے دکھ کو سمجھا پھر کہا۔ ”کئی بار میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ شادی نہیں کروں گا۔ اولاد نہیں ہوگی تو آپ صدمے سے ٹوٹتے رہیں گے۔ پاپا! میں آپ کو بہت چاہتا ہوں۔ آپ کی خوشی پوری کرنے کے لیے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا دل کسی لڑکی کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ جبکہ میں لڑکیوں کے ہجوم میں رہتا ہوں۔“

رخشی دروازے پر کھڑی باپ بیٹے کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کمرے میں آ کر بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی بیٹا بن جائے۔ لیکن کروڑوں کی جائداد اور کاروبار سنبھالنے کے لیے پوتی اور پوتے ضروری ہیں۔“

وہ بیٹے کے پاس بیٹھ کر بولی۔ ”تمہیں اتنی چھوٹ ضرور دوں گی کہ تم ایک بہو لاؤ اور عبدالرحمان کی نسل آگے بڑھاؤ۔“

اس نے کہا۔ ”یہاں لندن سے پاکستان تک یہ جھوٹ بولا گیا ہے کہ میں عدیلہ ہوں اور میرا ایک بھائی عدیل لندن میں ہے۔

اسے سچ ثابت کرنے کے لیے میں دو برس پہلے عدیل رحمان بن کر پاکستان گیا تھا۔ لیکن میں تو مستقل طور پر عدیلہ ہی بن کر رہوں گا کیونکہ میں نے کلینکل سائیکولوجسٹ کا ڈپلومہ عدیلہ رحمان کے نام سے حاصل کیا ہے۔ عدیلہ ہی کے نام سے مجھے اپنا کیریئر بنانا ہے اور آپ بھی مجھے عدیلہ بنائے رکھنا چاہتی ہیں۔“



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

رخشی نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اور کیا تم ہمیشہ میری بیٹی بن کر رہنا نہیں چاہتیں؟''

''چاہتی ہوں۔ یہی روپ میرے دل و دماغ میں' میری رگ رگ میں بسا گیا ہے۔''

رحمان نے کہا۔ ''مجھے اس بات سے دلچسپی نہیں ہے کہ تم ماں بیٹی کیا چاہتی ہو۔ رخشی! مجھ پر اتنا احسان کرو کہ اسے کچھ عرصہ تک بیٹا بن کر بہو لانے دو۔ یہ مجھے ایک پوتا اور ایک پوتی دے اور بس۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہوں گا۔''

رخشی نے کہا۔ ''ایسا بڑی رازداری سے ہوگا۔ یہ جس لڑکی کو پسند کرے گا۔ اسے اپنی رازدار بنا کر ہمارا اپنا عادل رحمان بن کر اس سے شادی کرے گا اور اولاد پیدا کرے گا۔''

رحمان نے کہا۔ ''ایسا ہوسکتا ہے صرف ہماری بہو کو معلوم ہوگا کہ اس گھر میں کوئی بیٹی عدیلہ نہیں ہے۔ صرف عدیل ہے۔''

صرف رخشی کے ذہنی مریضہ بن جانے سے وہاں خلاف فطرت باتیں ہورہی تھیں۔ اس مریضہ نے بیٹے کو دنیا کی نظروں میں بیٹی بنا دیا تھا۔ وہ اسکول سے لے کر ماہر نفسیات کی سند حاصل کرنے تک بیٹی ہی بن کر رہا تھا۔

وہ لندن سے پاکستان تک کی سوسائٹی میں اور دور کے رشتے داروں میں عدیلہ رحمان ہی تھا۔ عادل رحمان کو کبھی کسی نے ماں باپ کے ساتھ لندن یا پاکستان میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ضرورتاً عارضی طور پر بیٹا بن جایا کرتا تھا۔ یہ ناٹک برسوں سے کھیلا جارہا تھا۔

عبدالرحمان بعض اوقات جھنجلا جاتا تھا۔ وہ بھی غصہ میں ابنارمل ہو جاتا تھا اور کہتا تھا۔ ''تمہاری بیٹی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میرا صرف ایک بیٹا ہے۔''

اور وہ بیٹا گھر کی چار دیواری میں عادل رحمان بن کر باپ کو خوش کر دیتا تھا۔ باپ بھی کبھی بڑے اعتماد سے کہتا تھا۔ ''تمہاری ماں تمہیں کچھ بھی بنا ڈالے۔ میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم تو وہی رہو گے' جو خدا نے تمہیں بنایا ہے۔''

بہر حال رخشی نے یہ سمجھوتا کیا کہ عبدالرحمان کے وارثوں کو جنم لینا چاہیے۔ اس نے وعدہ کیا کہ بہو آئے گی تو اس کے سامنے بیٹے کو عدیلہ نہیں کہا کرے گی اور بیٹا کوشش کرنے لگا کہ جلد ہی کوئی لڑکی اسے پسند آجائے۔ اس نے دو چار لڑکیوں کی طرف مائل ہونے کی کوشش کی پھر پریشان ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ خود پر جبر کر رہا ہے۔ اس کے اندر کسی شریک حیات کی طلب نہیں ہے۔

وہ بحیثیت ایک لڑکی کسی چاہنے والے کا طلب گار نہیں تھا۔ اسے خسرا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ مرد پیدا ہوا تھا۔ مرد ہی تھا۔ ماں نے اسے ایک نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ اب شادی کرنے کا مرحلہ آیا تو پریشان ہورہا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے دل کو جبراً کسی لڑکی کی طرف مائل کرنا ہوگا۔ ورنہ اس خاندان میں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ اپنی نسل بڑھانے کی خاطر اسے کچھ عرصہ تک مرد بن کر کسی منکوحہ کے ساتھ ازدواجی دن رات گزارنے ہوں گے۔

وہ خود کو اندر سے اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ شادی کے بعد ازدواجی لمحات گزار سکے گا۔

ان دنوں وہ ایک مینٹل اسپتال میں انٹرنی کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہاں ایک نرس جولی اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے پہلے اس سے دوستی کی پھر اس سے بے تکلف ہونے لگا۔ اس نے جولی کو ایک بار سینے سے لگا کر یقین کیا۔ اس کے سینے میں ایک مرد کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اُدھر جولی کچھ پریشان ہوگئی۔ جلدی سے الگ ہو کر بولی۔ ''تمہاری قربت سے ڈر بھی لگتا ہے اور اچھا بھی لگتا ہے۔''

اس نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ''میری جان... ! مجھے بتاؤ۔ اچھا کیوں لگتا ہے؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں کیا بتاؤں؟ مجھے شرم آتی ہے۔''

اس کے شرمانے کی ادا میں ایسی دلکشی تھی کہ وہ اور زیادہ اس کا طلب گار بن گیا۔ اس کے قریب آکر اس سے لگ گیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگتی ہوئی بولی۔ ''پلیز مجھ سے دور رہو۔''

اس نے جھک کر پوچھا۔ ''قریب کیوں نہ رہوں؟''

وہ گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کچھ ہورہا ہے۔''

وہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اسے کیا ہورہا ہے؟ اس نے ضد کی۔ ''کچھ معلوم تو ہو کیا ہورہا ہے؟''

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ''ابھی تم نے سینے سے لگایا تو میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں اپنے آئیڈیل کے بازوؤں میں آگئی ہوں۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میری جان... ! آنکھیں بند کرو۔ پھر وہی جادو جگاؤں گا۔''

وہ بھی اُلجھن میں تھی۔ معلوم کرنا چاہتی تھی' کیا یہ پھر سینے سے لگائے گا تو پھر وہی جذبے ہلچل مچائیں گے؟





وہ سرگوشی میں بولا۔ ''آنکھیں بند کرو۔''

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر اس کے اُجلے تمتماتے ہوئے چہرے پر جھک گیا۔ بڑے پیار سے اس کے لبوں پر اتر گیا۔

جولی حیرانی سے ذرا کسمسائی۔ ایسے جادوئی حملے کے باوجود اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ان لمحات میں دماغ نے سمجھایا' آنکھیں نہ کھولنا ورنہ جادو بھاگ جائے گا۔

اس کنواری کے لیے واقعی جادوئی لمحات تھے۔ ایسا سحر طاری ہورہا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر ڈاکٹر عدیلہ کو نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے ایک کان کو چومتے ہوئے پوچھا۔ ''میری جان جولی... ! مجھ سے محبت کروگی؟''

وہ ایک ہائے کے انداز میں بولی۔ ہائے نے ہاں۔''

''میری رازدار بن کر رہوگی۔ میں اپنی زندگی کا ایک بہت اہم راز تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔''

''مجھے لگتا ہے' میرا آئیڈیل مجھے مل گیا ہے۔ میں تمہارے راز کو اپنی دھڑکنوں کی طرح چھپا کر رکھوں گی۔''

''تو پھر آنکھیں کھولو۔ میں تمہاری طرح لڑکی نہیں ہوں۔ ایک مرد ہوں۔''

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بولا۔ ''میرے بلاؤز اور اسکرٹ کو نہ دیکھو۔ میں عدیلہ نہیں عدیل ہوں۔

اس نے اپنی مختصری ہسٹری اسے بتائی۔ جولی اس کی رازدار بننے پر راضی ہوگئی۔ وہ ایک یتیم لڑکی تھی اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کے مصداق کورٹ میرج کے بعد عبدالرحمان کی بہو بن کر لندن والے بنگلے میں آگئی۔ پھر دو برس کے اندر ہی اس نے باپ بننے کی سند حاصل کرلی۔ رخشی کی برسوں کی تمنا پوری ہوگئی۔ وہ خود تو بیٹی پیدا نہیں کرسکی تھی۔ اسے ایک پوتی مل گئی تھی۔

یہ سب کچھ تین برسوں میں ہوا۔ تیسرے برس جولی کچھ عرصہ بیمار رہ کر وفات پاگئی۔ اب اس کی بیٹی تین برس کی تھی اور لندن کی ایک مہنگی نرسری میں پرورش پارہی تھی۔

جھوٹ اور فریب کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ عادل رحمان عدیلہ بن کر اتنی دور نکل گیا تھا کہ ہمیشہ عادل بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

اس سلسلے میں دو باتیں اہم تھیں ایک تو یہ کہ اسے خود عدیلہ کی شخصیت بچپن سے پسند تھی۔ ماں نے یہ شخصیت اس کی گھٹی میں پلا دی تھی۔ وہ خود کو پیدائشی طور پر عدیلہ سمجھتے ہوئے بڑے مزے سے لائف انجوائے کر رہا تھا۔

دوسری بات یہ کہ جولی نے اسے ایک بیٹی کا باپ بنا کر مرد ہونے کا سرٹیفکیٹ دیدیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح صرف ایک لڑکی نہیں رہا تھا۔ اسے مرد بننے کا بھی چسکا پڑ گیا تھا۔ اس کے دل میں آئندہ ازدواجی زندگی گزارنے کی خواہش نہیں تھی۔ لیکن اب کبھی کبھی کسی لڑکی کی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ عدیلہ رحمان بن کر تعلیم حاصل کر تا رہا تھا۔ اسی نام سے اس نے ایک ڈاکٹر اور سائیکولوجسٹ ہونے کا ڈپلومہ حاصل کیا تھا اور اسی نام سے وہ مستقبل میں سماجی و معاشرتی زندگی گزار سکتا تھا۔ لہٰذا وہ مستقل مرد بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ اب تک بڑے مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ بہت خوش تھا۔ عدیلہ بہن اور عدیلہ سہیلی بن کر خوب انجوائے کر رہا تھا اور کبھی کبھی کسی من پسند سہیلی کے ساتھ سہیلا بھی بن جایا کرتا تھا۔

اور اب... اب وہ عادل، وہ ڈاکٹر عدیلہ پاکستان آکر گڑ بڑا گئی تھی۔ اس کی نئی پیشنٹ گڑ بڑ کر رہی تھی۔ اس کے اندر یہ ہلچل پیدا کر رہی تھی کہ ایسی ہستی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا چاہیے۔ وہ مرد ہے اسے اب مرد بن کر رہنا ہوگا۔

اس نے نسل بڑھانے کی خاطر جولی کو ضرورتاً پسند کیا تھا۔ لیکن ماروی کسی ضرورت' کسی طلب اور کسی خواہش سے پہلے ہی اس کے مردانہ احساسات پر دستک دے رہی تھی۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے تھے۔ ماروی اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ اپنے بیڈ پر لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کی مدھم سی روشنی تھی اور اس کی یادداشت کے خانے میں زیرو پاور تو کیا ایک جگنو کی لمحاتی روشنی بھی نہیں تھی۔

موجودہ خالی ذہن میں جو سوچ آتی تھی۔ سامنے جو کچھ دیکھتی تھی اسی کو سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ چاچی کے ساتھ بیٹھی ٹی وی پر ایک ڈراما دیکھ رہی تھی۔ ڈراما کی ہیروئن فضیلہ اس کی طرح ایک سیدھی سی ان پڑھ اور دیہاتی لڑکی تھی۔ اس کی زندگی میں ایک چاہنے والا نوجوان شیرازی آتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔

فضیلہ شرم و حیا کے باعث اس سے کتراتی ہے۔ اس



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے دور دور رہتی ہے۔ایک بار شیرازی اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔وہ شرماتی ہے گھبراتی ہے پھر فوراً ہاتھ چھڑا کر چلی آتی ہے۔لیکن۔۔۔

۔۔۔لیکن تنہائی میں اس کے ہاتھوں کی گرفت کو محسوس کرتی ہے۔بہت بے چین ہوتی ہے۔رات کو بستر پر۔۔۔۔ کروٹیں بدلتی ہے۔

ایسے وقت ماروی اس کی بے چینی کو محسوس کر رہی تھی۔زندگی میں پہلی بار ایک مرد چھو لے تو پتا نہیں کیا ہونے لگتا ہے؟

ماروی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیسے چور احساسات ہوتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے اور بے چین کرتے رہتے ہیں۔

ابھی وہ صرف پانچ دنوں کی کوری کنواری لڑکی تھی۔ماضی میں کیا ہوا تھا۔بھول گئی تھی۔ان پانچ دنوں میں چاچی اور سمیرا نے اسے ہاتھ لگایا تھا کوئی اپنا یا پرایا اسے چھونے نہیں آیا تھا۔اس کے باوجود ڈراما دیکھنے کے دوران ایک بار ڈاکٹر عدیلہ اس کے تصور میں جھلکی تھی پھر گم ہوگئی تھی۔

اب اس نے ڈراما کی ہیروئن فضیلہ کو تصور میں دیکھا۔پہلے تو وہ کروٹیں بدل رہی تھی پھر اس نے اپنے اس ہاتھ کو دیکھا جسے شیرازی نے تھام لیا تھا۔وہ الجھی ہوئی تھی اس نے اپنے اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے تھام کر اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھ لیا۔پھر ذرا سی دیر میں اسے نیند آگئی۔

ماروی حیران ہوگئی۔یہ کیا جادو ہوتا ہے؟ اس ہاتھ نے شیرازی کے لمس نے اسے سلا دیا تھا۔کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟ ایک چاہنے والا چھو لے تو رت جگا ختم ہو جاتا ہے اور نیند آجاتی ہے؟

ڈاکٹر عدیلہ نے جس ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ماروی نے اسے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر اسے اپنی دھڑکنوں پر رکھ لیا۔آنکھیں بند کرلیں۔کمرے کی خاموشی اور نیم تاریکی میں لمحات گزرنے لگے۔اس نے آنکھیں کھول دیں۔عدیلہ کے لمس نے جادو نہیں جگایا تھا۔فضیلہ کی طرح اسے نہیں سلایا تھا۔

ماروی سوچ میں پڑ گئی پھر سمجھ گئی کہ فضیلہ کو ایک مرد کی گرفت نے متاثر کیا تھا۔جادو مرد کا چلتا ہے۔عدیلہ عورت ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ اس کی گرفت عورتوں سے کچھ الگ سی تھی لیکن وہ عورت ہی تھی۔اس کی گرفت جادو جگانے والی نہیں تھی۔

شام کو عدیلہ کے جانے کے بعد سمیرا اور معروف نے کہا تھا ''انہیں بھی اپنے گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔محبوب نے بڑی حسرت سے ماروی کو دیکھا تھا۔دل اس سے دور نہیں جانا چاہتا تھا۔لیکن مجبوری تھی۔ایک ہی چھت کے نیچے ساتھ رہنے والا کوئی رشتہ نہیں تھا۔اب سے پہلے وہ قریب نہ رہتے ہوئے بھی اس کی بدنامی کا باعث بن چکا تھا۔

اس نے کہا۔''میں کل دن کے دس بجے عدیلہ کو یہاں لاؤں گا۔یوں ماروی کی خیر خیریت بھی معلوم کروں گا۔''

سمیرا نے کن انکھیوں سے ماروی کو دیکھا پھر کہا۔''آپ کو دن میں ایک بار یہاں آنا چاہیے۔''

وہ بولا۔''کیا حرج ہے؟ دو بار آجاؤں گا۔رات دس بجے عدیلہ کو اس کے گھر پہنچاؤں گا۔''

معروف نے کہا۔''اس طرح تم دو بار یہاں آؤ گے۔یہ مناسب نہیں ہے۔یہ کام ہمارے ڈرائیور کا ہے۔''

معروف نے قریب آکر اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔''میری بات کو سمجھو جو کام ڈرائیور کا ہے اسے ڈرائیور کو کرنے دو۔اپنی شخصیت کو ہلکا نہ کرو۔پھر یہ کہ مراد کو آنے دو۔دونوں مل کر یہ طے کرو کہ تم میں سے کس کو کتنی بار یہاں آنا چاہیے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عدیلہ بہتر مشورے دے گی۔''

محبوب نے کہا۔''ٹھیک ہے۔کل صبح ڈرائیور عدیلہ کو یہاں لائے گا۔میں اسے رات کو واپس پہنچانے یہاں سے جاؤں گا۔آپ درست فرماتے ہیں، عدیلہ معالج ہے۔ہمیں اس کے مشوروں کے مطابق چلنا چاہیے۔''

اس نے ماروی پر ایک الوداعی نظر ڈالی پھر سمیرا اور معروف کے ساتھ چلا گیا۔جب سے اس کی یادداشت گم ہوئی تھی۔تب سے مراد پہلے اس کے سامنے آیا تھا پھر چلا گیا تھا۔اس کے بعد محبوب آتا تھا پھر چلا جاتا تھا۔وہ انہیں دوسرے دن تک بھول جایا کرتی تھی۔لیکن پہلی بار۔۔۔

ہاں پہلی بار عدیلہ کے جانے کے بعد اسے نہیں بھول رہی تھی۔پہلی بار کسی نیم مرد نے ہی سہی اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

جیت اسی کی ہوتی ہے جو چھو لیتا ہے۔

وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو تھام کر دیکھ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔اس کی نئی زندگی میں نئی یادوں میں وہی ایک ہاتھ اسے چھو کر گیا تھا۔

عبرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

# لاوا

بابر نعیم

محبت اور یادیں ہر زندہ انسان کے لیے کسی آکسیجن سے کم نہیں ہوتیں۔۔۔ عمر کا کوئی بھی حصہ ہو دل میں قیمتی لمحات کی گمشدگی پر ایک کسک سی ضرور محسوس ہوتی ہے۔۔۔ وہ بھی ایک ایسے ہی موڑ پر آمنے سامنے کھڑے تھے۔

**حال کے آئینے میں ماضی کے بکھرے عکس در عکس**

اس بوڑھے نے اپنی بیوک ایک خوب صورت مکان کے سامنے پارک کردی اور کار کا انجن بند کرنے کے بعد پسینجر سیٹ پر رکھے ہوئے خستہ اخبار پر نظریں جمادیں۔وفات کی اطلاع کی حاشیہ بردار خبر اسے اپنی طرف گھورتی محسوس ہوئی۔

مکان کے ڈرائیو وے میں ایک اکلوتی کار کھڑی ہوئی تھی۔بے شک اس وقت وہاں لوگوں کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا کیونکہ تدفین کو دو ہفتے گزر چکے تھے۔۔۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوڑھے نے زبان پر انگلیاں پھیرتے ہوئے انہیں گیلا کیا اور سر کے اڑتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں جما دیا۔ پھر عقبی نشست پر رکھی ہوئی گلابی رنگ کے پھولوں کی ٹوکری اٹھائی اور کار سے اتر کر آگے چل دیا۔

دروازے پر پہنچ کر وہ کئی سیکنڈ کھڑا رہا پھر دروازے پر دستک دی۔ ایک نوجوان عورت نے دروازہ کھولا۔ پھولوں کی ٹوکری پر نگاہ پڑتے ہی اس عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟'' اس نے ملائم لہجے میں پوچھا۔

''میں نے کلین کی وفات کے بارے میں سنا۔ میں مخل تو نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرین کے ساتھ چند خیالات شیئر کرنے کی ضرورت ہے۔ سو میں حاضر ہو گیا۔''

''اندر آجائیں۔'' نوجوان عورت نے اسکرین ڈور کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں ان کی نواسی کیرن ہوں۔ میں انہیں آپ کی آمد کی اطلاع کرتی ہوں، مسٹر......؟''

بوڑھے نے منہ ہی منہ میں اپنا نام بڑبڑایا اور پھر بولا۔ ''میں میرین کا ایک پرانا دوست ہوں۔''

''اچھا ہوا آپ گزرتے ہوئے یہاں رک گئے۔ میں نانی کو لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ نوجوان عورت زینے سے اوپر چلی گئی۔

بوڑھے نے پھولوں کی ٹوکری داخلی دروازے کے قریب موجود میز پر رکھ دی اور پھر ساکت کھڑا ہو گیا۔

اسے اوپری منزل سے آوازیں سنائی دیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ پھر قالین پر کسی شے کے گرنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ایک بلند آواز سنائی دی۔

برسوں گزرنے کے باوجود اس نے وہ آواز پہچان لی۔ وہ میرین کی آواز تھی بالآخر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو دھیرے دھیرے زینے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ پھر ایک دبلی پتلی بوڑھی عورت زینے سے نیچے اترنے لگی۔ اس کی نظریں بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں۔ جب وہ نیچے آگئی تو بوڑھے کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ ''اوہ خدایا، یہ تم ہو۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہم کتنے عرصے بعد مل رہے ہیں؟''

بوڑھے نے نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''اکیاون سال، سات مہینے اور گیارہ دن بعد۔''

''یہ تو اچھی خاصی مدت ہے۔'' بوڑھی عورت نے کہا۔ ''حیرت ہے تمہیں کیا چیز یہاں کھینچ لائی؟''

بوڑھے نے یوں محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہتے ہوئے شرما رہا ہو۔ ''میرین، میں نے یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دینے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن ناکام رہا، اب میں یہ بات زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر میں نے اپنی زندگی میں اس بات کا اظہار نہیں کیا تو میری روح اگلے جہان میں بھٹکتی پھرے گی۔ بات یہ ہے میرین کہ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو اسی وقت تم سے محبت ہو گئی تھی۔ ہم نے جو بھی لمحات ساتھ گزارے وہ میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میں تمہیں کبھی یہ نہیں بتا سکا کہ اس دور میں، میں حقیقت میں کیا محسوس کرتا تھا۔ اس لیے کہ میں اس وقت نوعمر تھا...... اور میرا خیال ہے کہ میرے اندر وہ حوصلہ بھی نہیں تھا۔'' یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی آنکھ سے ایک آنسو بہہ نکلا اور اس کے رخسار پر آگیا۔ ''آخر میں میری کیفیت اس گمشدہ بچے کی سی ہو گئی تھی جو اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا ہو۔ تمہیں کھو کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ جو بات میں تم سے پہلے کبھی نہ کہہ سکا تھا وہ آج کہنے آیا ہوں۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی ہے، میرین۔ تم سے اور صرف تم سے! اور ہمیشہ! اور میں یہ بات کہے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اب میرے دل کو قرار آگیا ہے۔ اب میں اطمینان سے مر سکتا ہوں۔''

یہ کہہ کر بوڑھے نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور پلٹ کر تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

بوڑھی میرین کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ اس نے اپنی محبت کے اظہار میں بہت دیر لگا دی۔ اس کی نگاہیں اسی بوڑھے پر جمی ہوئی تھیں جو لنگڑاتا ہوا ڈرائیو وے سے گزر کر اپنی بیوک کار میں سوار ہو رہا تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور پلٹ کر میرین کی طرف دیکھے بغیر اتنی تیزی سے اپنی کار آگے بڑھائی کہ اس کے ٹائر چرچرا اٹھے۔

میرین دیر تک کھڑی خالی نگاہوں سے اس راہ کو تکتی رہی۔



# جل جھوٹی

منظر امام

بعض اوقات زندگی ختم ہو جاتی ہے اور نہ ختم ہونے والی یادیں رہ جاتی ہیں لہٰذا بہت ضروری ہے کہ زندگی کے یادوں میں ڈھل جانے سے قبل یادوں کے احاطے میں کچھ اچھی باتیں محفوظ ہو جائیں تاکہ حالات کے گھٹن زدہ لمحات کی اذیت خوشگوار احساس کے لبادے میں قید رہے... یہی سوچ ان کے دلوں میں تلاطم برپا کیے ہوئے تھی تب ہی وہ ایک منظر بار بار سب کو دھوکا دے رہا تھا۔

میری بیوی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی۔

یا کم از کم اس وقت تک جھوٹ نہیں بولتی۔ جب تک اسے یقین نہ آجائے کہ کوئی اسے جھوٹا نہیں سمجھتا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں اب بھی بہت خوبصورت ہوں؟''

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں یہ بیان دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''اس لیے کہ آپ میری قدر نہیں کرتے۔''

''تو پھر کون تمہاری قدر کرتا ہے؟''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہ ایک آدمی۔" اس نے اٹھلاتے ہوئے بتایا۔ "میں جب بھی باہر نکلتی ہوں، وہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ کباڑیا ہوگا۔ پرانی چیزوں کا بیوپاری۔"

"آپ تو خیر ایسی باتیں کریں گے۔" راحیلہ نے کہا۔ "لیکن یہ مذاق نہیں ہے۔ وہ شخص مجھے گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے اور دیکھنے میں بھی بدمعاش معلوم ہوتا ہے۔"

"اچھا۔" اب میں سنجیدہ ہوگیا تھا۔ "کہاں کھڑا رہتا ہے؟"

"اسکول سے کچھ فاصلے پر۔" راحیلہ نے بتایا۔

راحیلہ اسکول میں ٹیچر تھی اور اسکول چونکہ قریب تھا۔ اس لیے پیدل ہی آیا جایا کرتی تھی۔ وہ میری بیوی تھی اور میں یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ کسی کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہیں۔

میں تو خیر اس سے مذاق کرتا تھا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شادی کے تین برسوں کے بعد بھی وہ شادی شدہ نہیں معلوم ہوتی تھی، اس کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی۔ اکثر لوگ اسے دیکھ کر رک جاتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ کوئی ہاتھ دھو کر پیچھے ہی پڑ جائے۔

دوسری صبح میں خود راحیلہ کو پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ گیا۔ اسکول کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا اور وہ شخص اسی درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ راحیلہ نے اشارے سے بتایا کہ یہ وہی آدمی ہے۔

وہ واقعی ایک بدمعاش صورت آدمی تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ اس سے ڈر کر خاموش رہا جائے۔ راحیلہ نے اسکول کے گیٹ کے پاس پہنچ کر مجھ سے کہا۔ "دیکھیں۔ آپ اس سے جھگڑا مت کیجیے گا۔"

"نہیں، تم بے فکر رہو، میں کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف واچ کرتا رہوں گا۔"

اس دن میں نے دفتر سے چھٹی کرلی تھی۔ اسکول ختم ہونے سے پہلے میں راحیلہ کو لینے اسکول پہنچ گیا۔ وہ آدمی اسی طرح اس درخت کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

جب راحیلہ گیٹ سے باہر نکلی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ وہ کم بخت راحیلہ کو دیکھے جا رہا تھا، اس کی نگاہیں راحیلہ پر مرکوز ہوکر رہ گئی تھیں۔

"دیکھ لیا آپ نے۔" راحیلہ نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "کس طرح دیکھ رہا ہے۔ خدا کرے اندھا ہوجائے۔"

"راحیلہ، یہاں قدم قدم پر ایسے لوگ ملتے ہیں۔ ہم کس کس سے جھگڑا کریں گے۔ تم یہ بتاؤ اس نے کبھی تم سے کچھ کہا تو نہیں۔"

"نہیں۔ کہا تو کچھ نہیں۔ بس دیکھتا رہتا ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔

"تو پھر دیکھنے دو۔ تمہارا کیا جاتا ہے۔"

"نہیں، میں یہ برداشت نہیں کرسکتی۔"

"برداشت تو خیر میں بھی نہیں کرسکوں گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے خلاف کیا ایکشن لیا جائے۔ وہ تو صاف انکار کردے گا کہ وہ دیکھتا ہی نہیں ہے۔ ایکشن اسی وقت ہوتا ہے جب اس کی طرف سے کوئی قدم اٹھایا جائے۔"

راحیلہ خاموش ہوگئی۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ فی الحال تو ہم کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ راحیلہ اسکول جاتی رہی اور وہ اسے دیکھتا رہا۔

پھر ایک دن راحیلہ نے بتایا۔ "آج...... آج اس نے ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے۔"

"وہ کیا؟"

"اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔"

یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ صرف دیکھتا ہی رہتا تو نظرانداز کیا جاسکتا تھا۔ لیکن بات کرنے، مخاطب کرنے کی کوشش...... یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔

"کیا کہا تھا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے باقاعدہ آواز دی تھی۔ کہہ رہا تھا محترمہ ذرا بات سنیں۔"

"کیسا تھا اس کا لہجہ، بدمعاشوں والا؟"

"نہیں، بدمعاشوں والا تو نہیں تھا۔" راحیلہ نے بتایا۔ "اس نے بہت مہذب اور شریف آدمیوں کی طرح آواز دی تھی۔"

"ارے بھائی۔ تو پھر اس میں کیا پریشانی ہے؟" میں نے کہا۔ "تم اسے نظرانداز کرکے اپنا راستہ لو۔ ہاں، اس کا لہجہ خراب ہو یا وہ کوئی اور حرکت کرے تو پھر پریشانی کی بات ہے۔"

"پھر بھی، کسی غیر عورت کو اس طرح آواز دے کر بلانا کوئی اچھی حرکت تو نہیں ہے۔"

اس پر میں نے راحیلہ کو ایک طویل لیکچر دے ڈالا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس دور میں اپنی عزت اور شرافت



بچانے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی نظرانداز کرنا سیکھ لے۔ ورنہ پاگل ہوکر رہ جائے۔ کیونکہ یہاں ہر قدم پر ایسے ہی لوگ ملتے ہیں۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ راحیلہ نے کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ البتہ اتنا ضرور بتاتی رہی تھی کہ وہ آدمی اسی طرح کھڑا رہتا ہے اور مخاطب کرنے کی کوشش بھی کرچکا ہے۔ میں نے راحیلہ کو پھر صبر کرنے اور نظرانداز کردینے کی تلقین کی۔

میرا رویہ اس سلسلے میں ایسا اس لیے ہو رہا تھا کہ میں اس شہر میں بے شمار واقعات دیکھ چکا تھا اور سن چکا تھا کہ اس قسم کے غنڈے شریفوں کی زندگی کس طرح عذاب بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

ایک بار پھر وہی واقعہ یاد آگیا۔ جو اکثر یاد آیا کرتا تھا اور میں کئی بار اپنے دوستوں کو سنا چکا ہوں۔

میں جب میٹرک کرکے پہلی بار کالج گیا تو کلاس روم میں استاد نے ہم سب لڑکوں کو انگریزی کا ایک لفظ لکھنے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یاد رکھو، جس کی بھی Spelling غلط ہوگی۔ اسے کلاس سے باہر کردیا جائے گا۔

اتفاق سے پوری کلاس میں سے صرف دو ایسے تھے جن کی Spelling درست تھی۔ باقی سب نے غلط لکھا تھا۔ اس پر استاد نے کہا۔ "چونکہ چالیس لڑکوں میں سے صرف دو نے صحیح لکھا ہے۔ اس لیے پوری کلاس کو تو ہم باہر نہیں نکال سکتے لیکن وہ دونوں کلاس سے باہر چلے جائیں۔"

پھر انہوں نے سمجھایا کہ ہمارا معاشرہ ایسا ہوگیا ہے کہ یہاں صحیح انسان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسی لیے اس معاشرے سے باہر نکل جانا چاہیے یا نظرانداز کردینا چاہیے۔ تو اس وقت میں یہی کر رہا تھا۔

میں برداشت کر رہا تھا۔ کیونکہ میں ایک طرف تو یہ جانتا تھا کہ اس قسم کے بدمعاش لوگ جب بدمعاشی پر اتر آئیں تو بہت پرابلم کھڑی کردیتے ہیں اور دوسری طرف یہ اطمینان تھا کہ اس قسم کے لوگ صرف اسی حد تک جاسکتے ہیں۔

وہ بدمعاش جو کچھ اور کرنا چاہتے ہوں، مثال کے طور پر اغوا وغیرہ۔ وہ اتنی دیر نہیں لگاتے کہ ہفتوں کھڑے دیکھتے رہیں اور ایک دن ہمت کرکے سلام کرلیں۔ یہ معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا تھا اسی لیے مجھے اطمینان تھا۔

ایک دن راحیلہ نے ایک اور انکشاف کیا۔ "سن لیا آپ نے۔ وہ بدمعاش اب میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا تھا۔"

"کیا؟" اس بار میں واقعی پریشان ہوگیا تھا۔ "کیا بات ہوئی تھی۔ پوری بات بتاؤ۔"

"میں اپنے راستے پر واپس آرہی تھی کہ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔"

"اور کیا کیا اس نے؟"

"یہ کہہ رہا تھا کہ آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"تو پھر۔ پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے۔ میں اس سے کترا کر آگے نکل آئی۔"

"تمہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "اس قسم کے لوگوں کو لفٹ نہیں دینی چاہیے اور ویسے بھی یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی کچھ کہنا چاہتا ہے، تو ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی کوئی ضروری بات کرنی چاہتا ہو۔"

## پہلی گولی

ایک سینما ہال میں پاکستانی پنجابی فلم چل رہی تھی۔ ایک سین میں ولن کی ماں بندوق لے کر آتی ہے۔ ولن ایک مٹیار کی عزت لوٹنے کے لیے اس پر حملہ کرتا ہے۔ ولن کی ماں بندوق سیدھی کرکے ولن کو گولی مار دیتی ہے۔ پھر بڑے فخر سے گردن اکڑا کے کہتی ہے۔ سن وے بے غیرتا...... پہلی گولی تینوں ایس لئی ماری اے...... تے دوجی گولی ایس لئی نئیں ماری کہ توں...... اتنا کہہ کر ولن کی ماں خاموش ہوجاتی ہے۔ ولن سینہ تھام کے نیچے گر جاتا ہے اور غیرت مند ماں سے سوال کرتا ہے۔ چھیتی دس ماں۔ تو دوجی گولی مینوں کیوں نئیں ماری۔

سن وے بے غیرتا...... دوجی گولی تینوں ایس لئی نہیں ماری...... ماں پھر خاموش ہوجاتی ہے۔

ولن پھر سوال کرتا ہے۔ وسدی کیوں نئیں ماں۔ توں مینوں دوجی گولی کیوں نئیں ماری؟

ولن کی ماں فخر سے سینہ تان کر کہتی ہے۔ کن کھول کے سن وے بے غیرتا...... دوجی گولی تینوں ایس لئی نئیں ماری۔ بندوق اچ صرف اکو ای گولی سی۔

مرسلہ: بشیر احمد بھٹی، فوجی بستی، بہاولپور



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

''آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔''

''راحیلہ سمجھا کرو۔ یہ معاشرہ ہی ایسا ہو گیا ہے، بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔''

راحیلہ خاموش ہو گئی۔

پھر کچھ بھی نہیں ہوا۔ راحیلہ یہ بتاتی رہی کہ وہ مخاطب کرنے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن وہ اس سے کترا کر نکل آتی ہے۔ میں نے یہ سن کر راحیلہ کو شاباشی دی اور اس کی ہمت کو سراہا۔

پھر ایک دن راحیلہ نے وہ بات کہہ ہی دی جس کا ڈر تھا، اس نے بتایا۔ ''آج اس کم بخت نے مجھ سے محبت کا اظہار کر دیا ہے۔''

''کیا؟'' یہ سن کر مجھے چکر سا آ گیا تھا۔ ''محبت کا اظہار؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

''اس کی یہ مجال، تم یہ بتاؤ۔ کیا اس نے بدمعاشوں والے اسٹائل میں اظہار کیا تھا۔''

''نہیں۔'' راحیلہ نے بتایا۔ ''وہ میرے سامنے آیا اور بہت نرم لہجے میں کہنے لگا کہ میں اسے بہت اچھی لگتی ہوں۔''

''دیکھو راحیلہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس معاشرے میں ہمیں قدم قدم پر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن یہ بے وقوف قسم کے جذباتی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔ صرف محبت کا اظہار کر کے رہ جاتے ہیں۔''

''دیکھیں، یہاں تک تو نوبت آن پہنچی ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ سن کر نظرانداز کر دو۔ اپنا راستہ بدل لو، دیکھ لینا، کچھ بھی نہیں ہوگا۔''

کئی دنوں کے بعد راحیلہ نے پھر بتایا۔ ''آج تو انتہا ہو گئی۔''

''کیا ہوا۔ کیا اس نے پھر کچھ کہہ دیا؟''

''اس نے ہوٹل میں کھانا کھانے کی آفر کی تھی۔'' راحیلہ نے بتایا۔

''آخر اس کا کمینہ پن سامنے آ ہی گیا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ جس معیار کا انسان ہے، تم کو اسی معیار کے ہوٹل میں اپنے ساتھ لے جاتا اور تم وہاں جا کر بدنام ہو جاتیں۔''

''نہیں۔ اس نے .P.C میں کھانا کھلانے کی بات کی تھی۔''

''دیکھو راحیلہ مسئلہ یہ ہے کہ ہوٹل ہوٹل میں فرق ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی گھٹیا قسم کے ہوٹل میں لے جاتا تو وہاں وہ کوئی بھی غلط حرکت کر سکتا تھا لیکن بڑے ہوٹلوں میں بہت سنبھل کر بیٹھنا پڑتا ہے۔''

پھر ایک دن راحیلہ نے مجھ سے کہا۔ ''سنیں، آپ مجھے طلاق دے دیں۔''

''طلاق دے دوں؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں، کیونکہ یہی ہونا تھا۔ پہلے وہ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے باتیں کیں، پھر ہوٹل لے گیا۔ اگلا Step گھر لے جانے کا ہوتا، اس کے بعد کیا رہ جاتا۔ پھر میں آپ سے طلاق کا مطالبہ کرتی، لہٰذا ایڈوانس میں طلاق کا مطالبہ کر رہی ہوں۔''

''راحیلہ'' میں بوکھلا گیا تھا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ میں جان سے مار دوں گا اس کو۔''

''کیا واقعی!''

''ہاں، مار دوں گا اس کو۔''

''غیرت جاگ گئی آپ کی؟''

''ہاں جاگ گئی، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

''تو پھر یہ سن لیں کہ میں نے آپ سے یہ سب جھوٹ کہا تھا۔''

''کیا مطلب۔''

''مطلب یہ کہ آپ یہ کہا کرتے تھے نا کہ مجھ میں کوئی کشش نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے یہ کہانی گڑھ لی تھی، ورنہ وہ بے چارہ تو ابھی تک وہیں کھڑا رہتا ہے اس نے کبھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''اب میں ایک بات بتا دوں؟''

''بتا دیں۔''

''مجھے پہلے دن سے معلوم تھا کہ تم ایک خیالی انسان تراشتی چلی جا رہی ہو، ایسا کچھ بھی نہیں ہے تمہارے ساتھ۔''

''وہ کیوں، یہ کیسے جانتے تھے؟''

''میں اس کے برابر سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ چکا ہوں۔ وہ بے چارہ نابینا ہے۔''

راحیلہ نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اچانک ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا مگر..... ضروری نہیں کہ ہر بار کوئی نابینا ہی ٹکرائے..... اور اتنی آسانی سے سب ہی ٹھیک بھی ہو جائے..... لہٰذا محبت کا اظہار بہت ضروری ہے تاکہ کسی کو کسی کے ساتھ کا احساس ہمیشہ رہے۔



# حکیم الاولیا

ضیا تسنیم بلگرامی

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو ایک مخصوص درجہ اور اپنے قرب سے سرفراز کیا اسی طرح ولیوں میں بھی کچھ کی جگہ اتنی بلند ہے کہ دوسرے اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ کا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے جنہیں اللہ نے ایک خاص مقام عطا کیا اور حکیم الاولیا کا لقب ملا۔ آپ کے رہنما استاد محترم حضرت خضر علیہ السلام تھے تو کیسے آپ کے علم میں تشنگی باقی رہ جاتی... آپ ایسے کامل ولی تھے جن کے علوم سے خلقِ خدا نے بے انتہا فیض پایا۔

**ہر آزمائش میں پورے اترنے والے اللہ کے خاص بندے کا دلگداز ماجرا**

ترمذ کے شیخ محمد بن علی نے اپنے دو ساتھیوں میں بیٹھ کر یہ منصوبہ بنایا کہ تینوں دوستوں کو حصولِ تعلیم کی خاطر بغداد اور ایسے ہی چند دوسرے شہروں کا سفر کرنا چاہیے۔ یہ تجویز محمد بن علی کی تھی۔ ایک دوست نے کہا۔ ''اگر ہم تینوں یہیں ترمذ میں رہ کر تعلیم حاصل کریں تو کیا حرج ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''حرج تو کوئی نہیں، یہاں بس ایک ہی خرابی ہے، وہ یہ کہ بغداد اور دوسرے شہروں میں جیسی یگانہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

روز گار شخصیتیں پائی جاتی ہیں ترمذ ان سے محروم ہے۔ اس لیے ہمیں بھی ان اساتذہ دہر اور یگانہ عالم علما سے تحصیلِ علم کرنی ہے جن کی اس عہد میں دوسری کوئی مثال نہ ملے گی۔"

دوسرے دوست نے کہا۔ "لیکن جناب اس میں ایک قباحت بھی ہے۔ وہ یہ کہ ترمذ سے دور دراز شہروں کا سفر اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا خوش فہمی میں ہم تینوں سمجھ بیٹھے ہیں۔"

محمد بن علی نے جواب دیا۔ "اگر آپ لوگ اس خوش فہمی میں ہیں کہ حصولِ علم کی راہ میں پیش آنے والی صعوبتیں اور مصائب ہمیں تنگ کردیں گے اور ہماری زندگی دوبھر کردیں گے تو میں اس سفر سے آپ کو روک دوں گا کیونکہ علم جیسی نادر اور قیمتی شے کی حصولیابی اتنی آسان نہیں ہے جتنی آپ دونوں سمجھ بیٹھے ہیں۔"

پہلے دوست نے کہا۔ "لیکن ذرا سے علم کے لیے سفر کی صعوبتیں جھیلنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں جو کچھ لکھنا پڑھنا ہے ہمیں ترمذ میں ہی رہ کر لکھ پڑھ لیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ خیال بھی درست ہے، ذرا سے علم کی خاطر سیکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ تو ان فاتحین سے زیادہ احمق نظر آتے ہیں جو ایک ایک شہر یا قصبے کی خاطر ہزاروں میل کے سفر پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

دونوں ساتھی آپ کے استدلال پر شرمندہ ہوگئے، بولے۔ "اچھا جناب، ہم دونوں سفر پر آمادہ ہیں آپ منصوبہ بتائیے۔"

آپ نے کہا۔ "کیسا منصوبہ؟ ہمارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہمیں علم حاصل کرنا ہے اور اس علم کی تحصیل کے لیے شہروں کی خاک چھاننا ہے۔ بس یہی ہمارا منصوبہ ہے اور اسی میں ہمارا مستقبل ہے۔"

تینوں نے آپس میں عہد و پیمان کیے کہ اس وقت جو کچھ طے پایا ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہاں تک کہ حصولِ تعلیم کی راہ میں ہماری جانیں تک چلی جائیں تو ہم اس کی پروا نہیں کریں گے۔

تینوں نے سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔ محمد بن علی بھی تیاریاں کرنے لگے۔ آپ کی تیاریاں دیکھ کر بوڑھی ماں نے پوچھا۔

"بیٹے! یہ سامان کیوں بندھ رہا ہے، خیریت تو ہے، کہاں جانے کی تیاریاں کی جارہی ہیں؟"

محمد بن علی نے جواب دیا۔ "ماں میں آپ کو اپنے اس منصوبے کے بارے میں جانے سے پہلے ضرور بتاتا لیکن اب جبکہ آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میرا جواب بھی سن لیجیے۔ میں حصولِ علم کی خاطر بغداد جارہا ہوں اور بغداد کے بعد کہاں جاؤں گا کچھ پتا نہیں کیونکہ یہ بغداد پہنچ کر ہی معلوم ہوگا۔"

ماں نے پوچھا۔ "بیٹے! اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "ہمیں اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ پانچ سال لگ جائیں، دس سال بھی لگ سکتے ہیں، دس سال سے زیادہ بھی لگ سکتے ہیں۔ ابھی قبل از وقت میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

ماں نے پھر سوال کیا۔ "اور بیٹے! اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟"

بیٹے نے جواب دیا۔ "یہی کوئی ساٹھ پینسٹھ کے لگ بھگ مگر کیوں..... آپ اس قسم کی باتیں کیوں کررہی ہیں؟"

ماں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "تیرے بقول میں ساٹھ پینسٹھ کو پہنچ چکی ہوں۔ زیادہ سے زیادہ دو چار سال اور جی لوں گی۔ اب اگر تو دس پندرہ سال کے لیے میرے پاس سے چلا گیا تو میری دیکھ بھال کون کرے گا؟ آخری وقت میں میرے پاس کون ہوگا؟ میں تجھے دیکھنے اور تجھ سے بات کرنے کو ترسوں گی اور تو سیکڑوں میل دور لاپتا ہوگا۔ بتا کیا اس حالت میں تیرا سفر کرنا درست ہے؟ میں تجھے یہ سفر نہیں کرنے دوں گی۔"

محمد بن علی بڑی مصیبت میں پھنس گئے، سعادت مندی سے جواب دیا۔ "اچھا پھر میں یہ سفر نہیں کروں گا، آپ کے پاس ہی رہوں گا۔"

ماں خوش ہوگئیں اور بیٹے کو دعائیں دینے لگیں۔

دونوں دوست تیاری کرکے آگئے اور کہا۔ "ابن علی! ہمیں کل صبح بغداد روانہ ہونا چاہیے۔"

محمد علی نے سکوت اختیار کیا۔ دونوں دوستوں نے پوچھا۔ "آخر تم کیوں خاموش ہو؟ کیا تم نے ابھی تک تیاری نہیں کی؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے ابھی تک تیاری نہیں کی اور نہ ہی سفر کی تیاری کرنے کا ارادہ ہے۔"

دونوں دوستوں نے حیرت سے پوچھا۔ "آخر کیوں، کیا ہوا؟"





آپ نے جواب دیا۔ "میں نے جب منصوبہ بنایا تھا خود سے بنالیا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ میری ایک ماں بھی ہے جو بہت بوڑھی ہے۔ میں اگر بغداد چلا جاؤں گا تو میری بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میری ماں زندہ ہے میں اس قسم کا مدت العمری سفر نہیں کرسکتا۔"

دونوں دوستوں نے کہا۔ "واہ جناب! ہم دونوں نے مرضی نہ ہونے کے باوجود تمہاری پُرزور دلیلوں پر سفر کا منصوبہ بنایا تھا، اب اگر آپ نہیں جارہے تو نہ جائیے ہم دونوں تو جائیں گے ہی، خدا حافظ۔"

آپ نے بڑے افسوس سے کہا۔ "تمہارا ساتھ نہ دے سکنے میں میرا اپنا نقصان ہے۔ سالوں کے بعد جب تعلیم حاصل کرکے تم دونوں واپس آؤ گے تو میں تم دونوں کے سامنے جاہل ٹھہروں گا۔ کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے مستقبل کا یہ کرب اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے گوارا کیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ دس سال بعد بھی تعلیم حاصل کرسکوں لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنی ماں کو ایک بار کھو کر دوبارہ حاصل کرلوں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ قابلِ تلافی نقصان کو ناقابلِ تلافی نقصان پر قربان کردوں چنانچہ اسی لیے میں تمہارا شریکِ سفر نہیں ہورہا ہوں۔"

دونوں دوست خاموش ہوگئے۔ کچھ سکوت کے بعد کہا۔ "ابن علی ہمارے پاس تمہاری زوردار دلیلوں کا کوئی جواب نہیں لیکن جب ہم فارغ التحصیل ہوکر واپس آئیں گے تو ممکن ہے تمہیں لاجواب کرسکیں۔"

محمد بن علی نے جواب دیا۔ "خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔"

دونوں دوست چلے گئے اور آپ پر غموں نے وہ دباؤ ڈالا کہ بڑی دیر تک طبیعت قابو میں نہیں آئی۔ آپ نے دل کے بوجھ سے تنگ آکر قبرستان کا رخ کیا۔ وہاں بڑی دیر تک گھوم پھر کر آنسو بہاتے رہے۔ انہیں سب سے زیادہ یہ دکھ کھائے جارہا تھا کہ سالوں کے بعد جب ان کے یہ دونوں دوست واپس آئیں گے تو ان پڑھے لکھے دوستوں میں ان کی اپنی کیا حیثیت ہوگی؟ شاید جاہل ٹھہرائے جائیں گے۔ قبرستان میں چونکہ ہر طرف عبرت ہی کا سامان تھا اور وہاں دنیا اور متعلقات دنیا ہیچ نظر آتی تھیں اس لیے یہاں طبیعت ٹھہر گئی اور دل کو کچھ سکون ملا پھر تو آپ نے یہ دستور بنالیا کہ جہاں طبیعت گھبرائی آپ نے قبرستان کا رخ کیا اور جب طبیعت ٹھہر گئی تو پھر گھر واپس آگئے۔

ایک دن حسبِ معمول جو آپ قبرستان تشریف لے گئے تو ایک پرانی قبر کے سرہانے ایک بزرگ کو فاتحہ پڑھتے دیکھا۔ آپ بھی وہیں پہنچ گئے اور فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ آپ نے اپنی دونوں آنکھیں بند کرلی تھیں اور نہایت خشوع و خضوع سے سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا ورد کررہے تھے۔ اسی عالم میں لحہ بھر کے لیے اس شخص کا خیال آیا جو آپ سے پہلے یہاں کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی آپ نے آنکھیں کھول دیں، اب وہ شخص وہاں نہیں تھا۔ آپ نے فاتحہ پڑھ کر جیسے ہی واپسی کے لیے قدم اٹھائے دیکھا وہ شخص اب بھی ان کے پیچھے موجود ہے۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو محمد بن علی نے اپنے دل پر ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔ اجنبی بوڑھا مسکرا رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھا۔ "ابن علی! تو مجھے دیکھ کر گھبرا کیوں گیا؟"

ابن علی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں، خوب اچھی طرح اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو یہاں قبرستان میں کیوں آتا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تو اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ بغداد نہیں جاسکا اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تو نے اس سفر میں اپنے دوستوں کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ میں تیری ماں کے بڑھاپے سے بھی واقف ہوں۔"

آپ کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ آپ نے اس کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا بولے۔ "مجھے حیرت ہے کہ آپ تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور میری ذرا ذرا سی بات آپ کے علم میں ہے لیکن میں آپ کو بالکل نہیں جانتا اور اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا ہوں۔"

اجنبی نے کہا۔ "ابن علی ان باتوں کو چھوڑ دو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارے کیا کام آسکتا ہوں؟"

ابن علی نے جواب دیا۔ "میں آپ سے واقف ہی نہیں تب پھر میں یہ فیصلہ کس طرح کرسکتا ہوں کہ آپ میرے کیا کام آسکتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ آپ میری کیا مدد کرسکتے ہیں؟"

اجنبی بوڑھے کو ہنسی آگئی، کہا۔ "ابن علی! تو باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے اور دلیلیں بھی اچھی دے لیتا ہے۔"

آپ نے کہا۔ "ساری باتیں اپنی جگہ، اب آپ اپنا تعارف کروائیں۔ اس کے بعد اور باتیں ہوں گی۔"



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑے میاں نے جواب دیا۔ "ابن علی! یہ سمجھ لے کہ میں تیرا استاد ہوں اور تجھے وہ سب پڑھا دینا چاہتا ہوں جس کے لیے تیرے دونوں دوستوں نے بغداد کا سفر کیا ہے۔"

ابن علی نے حیرت سے نیچے سے اوپر تک دیکھا، پوچھا۔ "آپ مجھے کیا پڑھا سکتے ہیں؟"

بڑے میاں نے جواب دیا۔ "وہ سب کچھ جو تو پڑھنا چاہتا ہے۔"

"کیا سچ؟"

"میں جھوٹ نہیں بولتا اور یہ بھی ذہن نشین رکھ کہ میں تیرے پاس کیوں آیا؟ تو نے اپنی بوڑھی ماں کی خاطر جو قربانی دی ہے اس کا کم سے کم جو صلہ بحکم خداوندی میں دے سکتا ہوں یہی ہے کہ میں تجھے وہ سب پڑھا دوں جس کے لیے تو سفر کرنا چاہتا ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "آپ کا مبلغ علم کیا ہے؟"

بوڑھے نے جواب دیا۔ "میرا مبلغ علم پوچھتا ہے؟ گستاخ! میرا مبلغ علم اتنا ہے کہ بغداد اور دوسرے شہروں کے سارے علمائے کرام اگر مل کر اپنے مجموعی علم سے میرے علم کا مقابلہ کرنا چاہیں تو وہ مجھ سے ہار جائیں گے۔"

بڑے میاں کی لاف و گزاف ابن علی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے ان سے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد بڑے میاں نے پھر اپنی زبان کھولی، کہا۔ "ابن علی! تو تامل اور سوچ بچار میں اپنا وقت ضائع نہ کر۔ میں تجھے پابندی سے پڑھا دیا کروں گا اور اس کا تجھ سے کوئی معاوضہ بھی نہیں لوں گا۔ بول، کیا تجھے میری یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہی ہیں؟"

ابن علی نے کہا۔ "بڑے میاں! تمہاری عمر تو خاصی اچھی طرح گزری ہوگی۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں ترمذ میں موجود ہو اور میں واقف نہیں۔"

بڑے میاں نے جواب دیا۔ "مجھے بڑے میاں نہ کہو ابن علی کیونکہ میں بڑھاپے سے نفرت کرتا ہوں۔"

ابن علی نے کہا۔ "میں خود بھی تم سے زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہتا۔"

بڑے میاں نے کہا۔ "تجھے یہاں اسی طرح آتے رہنا چاہیے اور میں تجھے یہیں اسی قبرستان میں پڑھا دیا کروں گا۔ علم کے سلسلے میں اس بات کا ہمیشہ خیال رہے کہ جب تو پڑھ لکھ کر فارغ ہو جائے تو تو مغرور نہیں ہوگا اور بے کار بحث مباحثے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا۔"

"میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں اور کچھ؟"

"اور یہ کہ تو ہمیشہ انکسار اور عجز کو اپنا شعار بنائے گا۔"

"میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں۔"

"اور یہ کہ تو اپنے علم سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائے گا۔"

"یہ وعدہ بھی رہا مگر رہا یہ مسئلہ کہ میں خلقِ خدا کو فائدہ پہنچاؤں گا، آخر کس طرح؟"

"اپنے علم سے اور کس طرح۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "وہ اس طرح کہ تو طب پڑھے گا، طب پڑھے گا سے میرا یہ مطلب ہے کہ تو طب بھی پڑھے گا۔"

ابن علی نے حیرت سے سوال کیا۔ "کیا تو طب بھی پڑھا دے گا مجھے؟"

"کیوں نہیں، کیا میں نے پہلے ہی یہ نہیں جتا دیا ہے کہ میں تمہیں وہ سب پڑھا سکتا ہوں جس کے لیے تو بغداد جا رہا تھا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بہر حال میں پڑھنا تو آج ہی سے شروع کر سکتا ہوں لیکن بڑے میاں تم آدمی بے حد دلچسپ ہو اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی ایک شخص میں سارے علوم کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔"

بڑے میاں نے کہا۔ "دیکھنا کیا معنی، وہ تو تو عملاً تجربہ کرے گا اس کا۔"

آپ نے پوچھا۔ "اور کتابوں کا کیا ہوگا، کتابیں کون فراہم کرے گا۔ مجھے لانا پڑیں گی یا تم لاؤ گے؟"

بڑے میاں نے ہنس کر جواب دیا۔ "تو کہے گا تو کتابیں بھی میں ہی لے آؤں گا۔"

ان دونوں میں طے ہو گیا کہ دوسرے دن سے پڑھائی شروع ہو جائے گی۔ محمد بن علی بشاشت اور ایک قسم کا تجسس لیے گھر آ گئے اور بڑے میاں کی بات چیت پر ٹھنڈے دل سے غور کیا کہ یہ بوڑھا واقعی کوئی عالم بے بدل ہے یا سنکی، پاگل؟ وہ رات بڑی فکر اور بڑی جستجو میں گزاری، دوسرے دن صبح ذرا معمول سے پہلے ہی قبرستان پہنچ گئے اور ان بڑے میاں کو ادھر ادھر دیکھنا شروع





کر دیا۔ ان کا کہیں پتا نہ تھا۔ یہ مایوس ہو کر سوچنے لگے کہ اس بوڑھے نے کل خوب بے وقوف بنایا۔ اب وہ کہیں بیٹھا خوب ہنس رہا ہوگا کہ محمد ابن علی کو اچھا بے وقوف بنایا۔ یہ سوچ کر انہیں بڑا غصہ آیا۔

ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ بڑے میاں ان کے پیچھے سے آ گئے۔ ان کی بغل میں کتابیں دبی تھیں اور وہ بالکل تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ قریب آتے ہی بولے۔ "میاں صاحبزادے! آنے میں ذرا سی دیر کیا ہوئی کہ تم نے میرے بارے میں غلط انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مجھے سنکی، دیوانہ سمجھ لیا۔"

یہ بہت شرمندہ ہو گئے، بولے۔ "بابا! میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ کے خلاف اس طرح سوچا اور اس پر حیرت زدہ کہ آپ کو میری سوچ کا علم بھی ہو گیا۔"

بڑے میاں نے ہنس کر کہا۔ "دیکھ لو تم، میں کتنا عجیب انسان ہوں۔"

اس کے بعد اپنی بغل کی کتابیں ان کے سامنے رکھ دیں، کہا۔ "دیکھو میں تمہارے لیے کتنی کتابیں لایا ہوں۔ اب پڑھائی شروع کر دو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ سالوں کے بعد جب تمہارے دونوں دوست پڑھ لکھ کر ترمذ واپس آئیں تو تم ان دونوں میں زیادہ عالم نظر آؤ اور تمہیں ان کے سامنے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

اب تو محمد بن علی میں یارائے گفتگو ہی نہ رہا۔ کتابیں دیکھیں تو اور دنگ رہ گئے۔ تصوف، الٰہیات، حکمت، طب معلوم نہیں کتنے موضوعات پر یہ کتابیں تھیں۔ ان کی پڑھائی شروع ہو گئی اور انہیں پہلے دن ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ بڑے میاں انہیں پڑھا نہیں رہے ہیں بلکہ گھول کے پلائے دے رہے ہیں۔ جو کچھ پڑھا رہے تھے حیرت انگیز طور پر دل و دماغ میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

اب تو آپ کا یہ معمول ہو گیا کہ ہر روز صبح اٹھتے ہی قبرستان چلے جاتے اور وہاں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھائی میں مشغول ہو جاتے۔ کچھ دنوں بعد یہ انکشاف بھی ہوا کہ جب یہ دونوں درس و تدریس میں مشغول ہوتے ہیں اور وہاں کوئی تیسرا شخص آ جاتا ہے تو وہ ان بڑے میاں کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ ہر آنے والا آپ سے تعجب سے سوال کرتا۔ "میاں صاحبزادے! یہ پڑھنے کی کون سی جگہ ہے اور پھر اس طرح کہ نہ کوئی استاد ہے نہ کوئی ساتھی۔ آخر تنہائی میں دل کس طرح لگتا ہے؟"

بڑے میاں اشارے سے محمد بن علی کو منع کر دیتے کہ ان کا ذکر نہ کیا جائے چنانچہ یہ ٹالنے والا جواب دے کر اسے چلتا کر دیتے۔

ان کی ماں کو بڑی تشویش تھی کہ ان کا بیٹا یہ ہر روز صبح صبح جاتا کہاں ہے؟ انہوں نے بڑے میاں سے کہا۔ "کیا میں اپنی ماں کو جو کچھ میں جانتا ہوں، بتا سکتا ہوں یا انہیں بھی ٹالتا رہوں؟"

بڑے میاں نے جواب دیا۔ "نہیں، انہیں بتا دو کہ خدا کا ایک بندہ تمہیں ہر روز بلا معاوضہ پڑھانے آ جاتا ہے اور بس۔"

چنانچہ آپ نے اپنی ماں کو بتا دیا۔ ماں نے اپنے بیٹے کے ساتھ ہی بڑے میاں کو بھی بڑی دعائیں دیں کہ وہ ان کے بیٹے کو بلا معاوضہ پڑھا رہا ہے۔ محمد بن علی تین سال تک ان بڑے میاں سے پڑھتے رہے اور اس عرصے میں انہوں نے کئی علوم حاصل کر لیے اور ان علوم میں علم طب بھی شامل تھا۔

محمد بن علی کو ذہن رسا کے ساتھ ہی حسن بھی وافر ملا تھا۔ اس پر جوانی کا رنگ، جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ عورتیں آپ سے بات چیت کی متمنی رہتیں۔ لڑکیاں آپ کی ایک جھلک کے لیے گھنٹوں چشم براہ رہتیں لیکن خود آپ کا یہ حال تھا کہ کسی پر توجہ ہی نہ دیتے۔ ایک تو طبیعت میں یوں ہی شرم و حیا اور حلم اور سنجیدگی بہت زیادہ تھی۔ اس پر بڑے میاں کی صحبت کا اثر، آپ کو دنیا کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی دلچسپی محسوس ہی نہ ہوتی۔

ایک خوب صورت عورت، بہت دنوں سے آپ سے بات کرنے کی خواہش مند تھی۔ وہ کئی بار سناٹے میں آپ کی راہ میں حائل ہوئی لیکن آپ اس سے بچ کر نکل گئے۔ اس نے ایک آدھ بار آپ کو آواز بھی دی لیکن سنی ان سنی کر گئے۔ عورت بھی بڑی ہمت والی تھی، اس نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ محمد بن علی کو زیر کر کے ہی دم لے گی۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں اس کی ناکامی پر خوش ہوتیں اور مذاق میں کہتیں۔ "تو کچھ بھی کر لے محمد بن علی تجھے دیکھنا تک گوارا نہ کریں گے۔"

عورت کہتی۔ "بس یہی تو مجبوری ہے، اگر ابن علی ایک بار بھی مجھے دیکھ لیں تو میں دعوے سے کہتی ہوں کہ وہ میرا اثر قبول کیے بغیر نہ رہیں گے اور میرے عشق میں بولائے بولائے پھرتے رہیں گے اور پھر میں بھی کنارہ کشی اختیار کر لوں گی اور انہیں اس سے زیادہ ستاؤں گی جتنا یہ مجھے ستا رہے ہیں۔"



SCANNED BY PAKSOCIETYURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

عورتیں طنزاً کہتیں۔ ”ارے! ابن علی تیرے قابو میں نہیں آئیں گے۔ یہ بہت مغرور ہیں۔“

عورت نے کہا۔ ”ابھی میں نے اپنے ترکش کا آخری تیر تو چلایا ہی نہیں۔ جب میں ابن علی سے ہر طرح مایوس ہو جاؤں گی تو اپنا وہ آخری تیر چھوڑوں گی جس کا نشانہ کبھی خطا ہوا ہی نہیں اور جو دنیا کا خطرناک تیر کہلاتا ہے۔ مردوں کے حق میں عورتوں کا مہلک ترین تیر۔“

ایک عورت نے پوچھا۔ ”اپنا وہ آخری تیر مجھے بھی تو بتا تاکہ میں بھی آزما کے دیکھوں۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”واہ، میں کیوں بتاؤں تجھے۔ پہلے میں آزما لوں پھر تجھے بتا دوں گی۔“

عورتوں نے جواب دیا۔ ”اچھا جب وہ آخری تیر لے کر ابن علی کے پاس جانا تو ہمیں بھی دکھا دینا۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”نہ صرف دکھاؤں گی بلکہ بتا بھی دوں گی، تم لوگ فکر نہ کرو۔“

اس کے بعد اس عورت نے بڑی محنت اور جانفشانی سے آپ کے معمولات کا پتا چلانا شروع کر دیا۔ کتنی دیر گھر میں رہتے ہیں۔ گھر سے نکلتے ہیں تو کہاں کہاں، کس کس کے پاس جاتے ہیں اور کتنی کتنی دیر ٹھہرتے ہیں۔ ان معمولات میں اسے ایک ہی عمل کام کا نظر آیا۔ ابن علی ہر روز ترمذ کے ایک ایسے باغ میں ضرور جاتے ہیں جو عموماً ویران رہتا ہے اور اس میں دوسرے لوگ جانا پسند نہیں کرتے۔ ابن علی اس باغ میں گھنٹوں غور و فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اس باغ کو اس عورت نے اپنی کمین گاہ تصور کر لیا اور وہاں پہنچنے اور اپنے منصوبے پر کامیابی سے عمل درآمد کی تدبیریں سوچنے لگی۔

ایک دن اس عورت نے بہترین لباس زیب تن کیا اور ترغیب اور تحریص آرائشیں کر کے اپنی حاسد عورتوں میں پہنچی اور کہا۔ ”ذرا دیکھو تو میں کیسی لگ رہی ہوں؟“

عورتوں نے حسد طور پر جواب دیا۔ ”قیامت، بچارا مرد تو مرد ہم عورتوں پر تیرے حسن اور آرائش کا جادو اثر کر رہا ہے۔“

عورت نے جو لباس پہن رکھا تھا اس میں عریانیت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ نیم عریانیت جو عریانیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس نے کہا۔ ”عورتو! آج میں اپنا آخری تیر آزمانے جا رہی ہوں۔ میرا یہ تیر ترغیبات اور تحریصات کا تیر ہے۔ نیم عریانی کا تیر ہے۔ آنسوؤں کا تیر جو ابن علی کے سامنے چلے گا، ناز و نخرے کا تیر ہے جو ان کے سامنے چھوڑا جائے گا اور خلوت کی کمین گاہ میں جب یہ تیر ایک ساتھ چلیں گے تو میں دیکھوں گی کہ ابن علی ان تیروں سے کس طرح بچتے ہیں۔“

آج ان حاسد عورتوں کو بھی اس عورت کی کامیابی کا کچھ کچھ یقین ہو گیا۔ پہلے وہ اس عورت کی ناکامی پر خوش ہوا کرتی تھیں۔ آج اس کی کامیابی کے خیال سے غمزدہ ہو گئیں اور دل ہی دل میں ناکامی کی دعائیں مانگنے لگیں۔

یہ عورت آپ سے پہلے ہی اس باغ میں پہنچ گئی اور ایک کنج میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ابن علی بھی وہاں پہنچے اور ایک سرو کے نیچے بیٹھ کر کچھ سوچنے لگے۔ ان دنوں ان کا دل معارف و اسرار کا گنجینہ بنتا جا رہا تھا۔ سرو کی جڑ میں تنے سے پشت لگا کر وہ معلوم نہیں کیا سوچتے رہے۔ ان کے آس پاس جھاڑیاں تھیں، ان جھاڑیوں نے آپ کو دنیا والوں کی نظر سے چھپا لیا تھا۔ اس عورت کو اس سے بہتر جگہ نہیں مل سکتی تھی جہاں وہ اپنے تیروں کی بوچھاڑ سے ابن علی کو بے بس اور حواس باختہ کر سکتی۔

وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ آپ کی طرف بڑھی اور بڑھتے بڑھتے بالکل ان کے قریب پہنچ گئی پھر اس نے اپنے دل پر غمگینی اور یاس کا اثر قائم کیا یہاں تک کہ اس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کا چہرہ حسرت و اندوہ کا مرقع بن گیا پھر وہ سسکیاں بھی لینے لگی۔ آپ نے سسکیوں کی آواز جو سنی تو ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے آپ کے قریب پہنچ گئی اور واویلا کرتے ہوئے بولی۔ ”اے نوجوان! خدا کے لیے میری مدد کر، میں بڑی مظلوم عورت ہوں۔“

آپ نے اس عورت کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس کا حسن ہوشربا اور آرائش و زیبائش زہر شکن۔ عورت نے خود کو ابن علی کی گود میں گرا دینے کی کوشش کی، بولی۔ ”مجھے بچا لے اے نوجوان، مجھے بچا لے۔“

آپ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”عورت! ذرا ہوش و حواس میں رہ اور دور سے بات کر، آخر تیرے ساتھ ہوا کیا ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوں اور اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے اپنی آغوش میں لے کر میری پناہ بن تاکہ میرے دل سے ڈر نکلے اور میں اطمینان سے باتیں کر سکوں۔“

آپ نے کہا۔ ”پھر بھی تو مجھ سے دور دہ اور وہیں سے بات کر۔ میری موجودگی میں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

عورت نے جواب دیا۔ ”تو بڑا بے حس نوجوان ہے کہ ایک مظلوم اور مجبور عورت کی بے بسی سے بھی نہیں پسیج رہا ہے۔“





آپ نے کہا۔ ”اچھا تو بیٹھ کر باتیں کر اور یہ بتا کہ کیا یہاں تیرے علاوہ بھی کوئی شخص ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”ہاں ایک شخص اور بھی تھا میرے ساتھ اب معلوم نہیں کہ وہ موجود بھی ہے یا چلا گیا۔“

آپ نے کہا۔ ”اچھا تو بیٹھ جا اور اطمینان سے بتا کہ تیرے ساتھ کیا ہوا؟“

عورت آپ کے سامنے بیٹھ گئی اور بات کیے بغیر آنسو بہانے لگی۔ آپ کو اس کے آنسوؤں پر بڑا رحم آیا اور آپ کو اپنے دل میں اس عورت کے لیے دکھ درد محسوس ہوا۔ آپ نے مزید کہا۔ ”میں تیری حالت پر افسوس کر رہا ہوں۔ بتا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

عورت نے کہا۔ ”پہلے آپ یہ یقین دلا دیں کہ آپ واقعی میری مدد کریں گے ورنہ یوں ہی بلا وجہ حالِ زار سنانے سے فائدہ؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے ایک بار تجھ سے کہہ تو دیا کہ میں جس حد تک تیری مدد کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔“

عورت نے کہا۔ ”میں ایک غمزدہ عورت ہوں۔ میں شادی شدہ تھی لیکن میرا شوہر مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور ایک عورت اسے لے گئی۔ اب میں ہوں اور ایک لمبی تنہائی ہے جس کا بظاہر کوئی علاج نہیں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”اس سانحے کو کتنا عرصہ گزرا؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”تقریباً تین سال ہوا چاہتے ہیں۔“

آپ نے پھر پوچھا۔ ”اور اس دوران تجھے اپنے شوہر کی کوئی خبر بھی نہیں ملی؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”ملی کیوں نہیں، سنتی ہوں اصفہان میں ہے اور اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”اور تو نے کوشش نہیں کی کہ اسے بلوا لے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”میں کیا کوشش کرتی۔ وہ اپنی مرضی سے بتائے بغیر گیا ہے، میں اس کا پیچھا کس طرح کر سکتی ہوں؟“

آپ نے پوچھا۔ ”لیکن اس وقت تو یہاں کس طرح آ گئی؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”یہ ایک الگ داستان ہے۔ میرے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ تیرا شوہر اصفہان سے آیا ہوا ہے اور تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں اس کی باتوں میں آ گئی اور اچھے سے کپڑے پہن کر اپنے کو خوب بنایا سنوارا مگر وہ مجھے بری نیت سے اس باغ میں لے آیا اور چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ زیادتی کرے کہ یہاں تو نظر آ گیا، وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو گیا اور میں بھاگ کر تیرے پاس آ گئی۔“

آپ نے عورت کو سرزنش کی۔ ”تو نے ایک غیر مرد کی باتوں پر اعتبار کیوں کر لیا؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”محمد بن علی! تو ایک عالم ہے اور عالم ہو کر ایسی بات کرتا ہے۔ جس عورت نے شوہر کی مفارقت میں کئی سال گزار دیے ہوں اور اس دوران اس نے دوسرے مرد کی صورت تک نہ دیکھی ہو کیا تو اس کی پریشانیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا؟“

اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی، بولی۔ ”محمد بن علی، کہتے ہیں اضطراری حالت میں حرام شے بھی حلال ہو جاتی ہے، تو یقین کر شوہر کی جدائی کے بعد اب میں اضطراری حالت کا شکار ہو گئی ہوں اور میں اپنے خیال میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اب حرام بھی مجھ پر حلال ہو گیا ہے۔“

آپ نے غصے میں کہا۔ ”اے عورت! تو یہ بک کیا رہی ہے، کیا تو نے اپنی باتوں کے معانی و مطالب بھی سمجھے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”میری باتوں کے معانی و مطالب کوئی مجھ سے بہتر بھی سمجھ سکتا ہے؟“

آپ نے کہا۔ ”باتیں تو بہکی بہکی ہی کر رہی ہے اس وقت۔“

عورت پھر رونے لگی، بولی۔ ”اب میں زندہ ہی معلوم نہیں کیوں ہوں، ورنہ مصائب نے مجھے مردے سے بدتر کر رکھا ہے، اب تو میری مدد کر۔“

آپ نے پوچھا۔ ”عورت! میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”تو میری مدد کر سکتا ہے اور خوب کر سکتا ہے۔“

آپ نے کہا۔ ”بتا، اگر میرے بس کی بات ہوئی تو ضرور کروں گا تیری مدد۔“

عورت نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ”میں تیرا ہاتھ پکڑ رہی ہوں، تو بھی میرا ہاتھ پکڑ لے اور وعدہ کر کہ تو زندگی بھر میرا ساتھ دے گا اور میں بھی عہد کرتی ہوں کہ ہمیشہ تیری وفادار اور فرمانبردار رہوں گی۔“

آپ نے نفرت سے کہا۔ ”تو میرا ہاتھ چھوڑ دے، یہ ہاتھ کیوں پکڑ رکھا ہے۔“



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

عورت نے آپ کو اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگا لینا چاہا، بولی۔ ''ابن علی! میں تیرے فراق میں آہیں بھرتی رہتی ہوں اور تو ہے کہ میری خبر ہی نہیں لیتا۔''

آپ ذرا بھی نہیں گھبرائے، بولے۔ ''واہ اتنی ذرا سی بات کے لیے اتنی لمبی تمہید کا نٹھی تھی تو نے۔ اس کی کیا ضرورت ہے تو اگر کسی تمہید کے بغیر ہی اپنا مطلب واضح کر دیتی تو میں تیری پیش کش پر غور تو ضرور ہی کرتا بہرحال تو مجھ سے جو کچھ چاہتی ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ بآسانی ہو جائے، مجھے غور کرنے کا تو موقع دے۔''

عورت نے کہا۔ ''میں بہت صبر کر چکی، میں نے بہت ضبط کر لیا اب مزید صبر کا یارا نہیں ہے۔''

ابن علی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''تو جو کچھ چاہتی ہے وہ مجھ سے نہیں حاصل کر سکے گی، اس لیے اپنا راستہ لے۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''ابن علی! تو بڑی بے وقوفی کر رہا ہے، ترمذ کے کتنے ہی مرد میرے عشق میں آہیں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک تو ہے کہ میں تیرا پیچھا کر رہی ہوں، اگر تو نے یہ موقع ضائع کر دیا تو زندگی بھر پچھتائے گا۔''

آپ نے کہا۔ ''تو غلط سمجھ رہی ہے بلکہ واقعی یہ ہے کہ اگر میں نے اس وقت تیرا کہنا مان لیا تو زندگی بھر پچھتاؤں گا۔''

عورت نے آپ کو پکڑنا چاہا، آپ نے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ باغ سے باہر آ گئے اور عورت مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے تلے بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد جب یہ عورت مایوس اور غمزدہ ان عورتوں اور لڑکیوں کے سامنے سے گزری جو اس کا انتظار کر رہی تھیں تو ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے تیزی سے گزر کر اپنے گھر چلی گئی اور عورتوں نے اس کی شرمندگی اور ندامت سے اندازہ لگا لیا کہ وہ ناکام رہی ہے چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی منائی۔

☆☆☆

آپ اس عورت سے پیچھا چھڑا کر گھر پہنچے تو بہت پریشان تھے۔ ماں نے پوچھا۔ ''بیٹے! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟''

انہوں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ ماں نے بیٹے کو دعائیں دیں کہ ''خدا تجھے اسی طرح برائیوں سے بچاتا رہے۔''

اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ آپ باہر گئے تو دروازے پر انہی بڑے میاں کو کھڑے دیکھا جن سے وہ قبرستان میں تین سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔ اس وقت خلافِ توقع اپنے دروازے پر دیکھ کر آپ بہت خوش ہوئے، کہا۔ ''زہے نصیب کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف تو لائے۔''

اس کے بعد آپ نے انہیں بیٹھک میں بٹھایا اور باتیں ہونے لگیں۔ بڑے میاں نے کہا۔ ''ابن علی! اس وقت میں خاص طور پر اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں مبارک باد دوں۔''

انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کس بات کی مبارک باد؟''

بڑے میاں نے کہا۔ ''اس بات کی کہ تو زلیخا کے مکر سے بچ گیا۔''

ابن علی نے کہا۔ ''لیکن حضرت یہ بات آپ کو کس نے بتائی؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''مجھے کون بتاتا، میں خود وہاں موجود تھا اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔''

آپ نے سر پکڑ لیا، بولے۔ ''حضرت! میں بہت پریشان ہوں۔ آخر آپ اپنا تعارف کیوں نہیں کرواتے کہ میرے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے آپ کو اس کا بغیر بتائے ہی علم کیسے ہو جاتا ہے، کیا آپ جن ہیں؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔''

آپ نے کہا۔ ''پھر کیا آپ فرشتہ ہیں؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''نہیں میں فرشتہ نہیں ہوں۔''

آپ نے کہا۔ ''نہ آپ جن ہیں اور نہ فرشتہ ہیں پھر آپ ہیں کیا؟''

بڑے میاں نے پوچھا۔ ''کیا میں واقعی یہ بتا دوں کہ میں کیا ہوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر آپ اس وقت بھی اپنا تعارف نہیں کرائیں گے تو مجھے اختلاج ہو جائے گا۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''میں نہ تو جن ہوں نہ فرشتہ بلکہ میں خضر ہوں۔ جسے خدا نے بھولے بھٹکوں کی راہ نمائی کی خدمت سونپی ہے اور ہمیشہ کی زندگی عطا فرمائی ہے۔''

آپ سناٹے میں آ گئے اور خضر کی صورت دیکھتے رہے، بولے۔ ''تو گویا مجھے حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردی کا شرف





حاصل ہے؟''

''ہاں تو میرا شاگرد ہے، خضر کا شاگرد اور خدا نے یہ کام اس لیے میرے سپرد فرمایا تھا کہ تو نے اپنی ماں کے احترام میں تحصیل علوم کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔''

آپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ بڑی دیر تک آپ سے باتیں کرتے رہے۔ آخر میں رخصت ہوتے ہوئے فرمایا۔ ''ابن علی! میں ہفتے میں ایک بار اس غرض سے تمہارے پاس آتا رہوں گا کہ میں نے تمہیں اب تک جو کچھ پڑھایا ہے اس پر علمی مباحثے کر کے مزید اضافہ کر دوں۔''

یہ واقعہ راز نہیں رہا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ابن علی کے پاس خضر آتے ہیں۔ اس کا علم اس عہد کے صوفی ابوبکر وراق کو بھی ہو گیا۔ وہ آپ سے ملنے آئے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عرض کیا۔ ''ابن علی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے پاس خضر تشریف لاتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں یہ درست ہے بلکہ میں نے علم ہی ان سے حاصل کیا ہے۔''

ابوبکر وراق نے کہا۔ ''تب پھر ان سے میری ملاقات کرائیے۔ اس وقت میں یہی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''خضر ہفتہ میں ایک بار میرے پاس آتے ہیں۔ میں ان سے اجازت لے لوں اس کے بعد آپ کو ان سے ملوا دوں گا۔''

ابوبکر وراق چلے گئے۔ اس ہفتے جب حضرت خضر ان سے ملنے آئے تو آپ نے ان کے آگے ابوبکر وراق کی درخواست پیش کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا۔ ''جس باغ میں عورت نے آپ کو مبتلائے معصیت کرنا چاہا تھا۔ آپ جمعے کی شب ابوبکر وراق کو لے کر آ جائیے، وہیں ملاقات ہو جائے گی۔''

آپ نے ابوبکر وراق کو مطلع کر دیا اور جمعہ کی شب یہ دونوں اس باغ میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک درخت کے سائے میں ایک بہت بڑا تخت بچھا ہوا تھا اور وہاں معلوم نہیں کس چیز کی روشنی ہو رہی تھی جس سے پورا باغ روشن ہو رہا تھا۔ تخت پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان دونوں کو دیکھتے ہی تخت چھوڑ دیا۔ نیچے آ گئے اور ان دونوں کی تعظیم کو چند قدم ان کی طرف بڑھے اور ان دونوں کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر لے گئے اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا پھر کچھ دیر بعد یکے بعد دیگرے چالیس بزرگ اور آ گئے۔ ان کے لیے کھانا کہاں سے آیا تھا کسی کو کچھ پتا نہ تھا لیکن ان دونوں نے کھانے کے بعد متفقہ کہا۔ ''ہم نے ایسا کھانا کہیں اور نہیں کھایا۔''

ابوبکر وراق نے سکوت اختیار کیا اور ابن علی اور حضرت خضر آپس میں باتیں کرنے لگے لیکن یہ دونوں کس زبان اور کس موضوع پر باتیں کر رہے تھے ابوبکر وراق نہیں سمجھ سکے۔ اب ابوبکر وراق کو ابن علی کے مرتبے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے ابن علی کی صحبت میں مستقلاً اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

اس دوران آپ کی ماں کا انتقال ہو گیا اور آپ نے خدا کی لو لگا کے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ آپ کبھی کبھی کچھ لکھنا شروع کر دیتے۔ اس طرح کچھ عرصے بعد اچھے خاصے صفحات ہو گئے۔ آپ تنہائی میں ان کا مطالعہ کرتے تو اکتا جاتے اور ان صفحات کو ضائع کرنے کی سوچنے لگتے۔ آخر ایک دن ابوبکر وراق سے کہا۔ ''ابوبکر! میں نے مختلف اوقات میں جو بے کار کام کیا ہے، اب اسے ضائع کرنا چاہتا ہوں۔''

ابوبکر نے پوچھا۔ ''کون سا بے کار کام حضرت؟''

آپ نے اپنے صفحات ابوبکر کے حوالے کر دیے اور کہا۔ ''انہیں دریائے جیحون میں پھینک آیئے۔''

ابوبکر نے پوچھا۔ ''ان صفحات پر لکھا کیا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں مختلف اوقات میں معلوم نہیں کیا کچھ لکھتا رہا ہوں، اب جو پڑھا تو انہیں اس لائق نہیں سمجھتا کہ اپنے پاس رکھوں اور میرے خیال میں ان کی بہترین جگہ دریائے جیحون کی لہریں ہیں۔''

ابوبکر ان صفحات کو اپنے گھر لے گئے اور ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ چند ہی صفحات پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے وہ علم کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اسے دریائے جیحون کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچ کر ابوبکر نے وہ صفحات محفوظ کر لیے۔

کئی دن بعد آپ نے ابوبکر سے پوچھا۔ ''ابوبکر، وہ صفحات کیا ہوئے؟''

ابوبکر نے جواب دیا۔ ''حضرت! دریائے جیحون میں پھینک آیا۔''

آپ نے کہا۔ ''خوب! تمہارا گھر دریائے جیحون ہے، یہ بات آج ہی معلوم ہوئی۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابوبکر آپ کے کشف پر حیران رہ گئے اور شرمندگی سے عرض کیا۔ ''حضرت! مجھے ان صفحات کے مطالعے سے بڑی لذت حاصل ہوئی اس لیے میں نے سوچا کہ انہیں کیوں ضائع کروں، میں خود گاہ بہ گاہ پڑھتا رہوں گا۔''

آپ نے کہا۔ ''نہیں ابوبکر، انہیں اپنے پاس مت رکھو اور دریائے جیحون میں پھینک آؤ کیونکہ اس خرافات کی اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔''

ابوبکر نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی اور وہ صفحات اپنے گھر سے لے کر دریائے جیحون کی طرف روانہ ہو گئے۔

ابوبکر یہ صفحات دریا برد کرتے ہوئے دکھ محسوس کر رہے تھے لیکن حکم کی تعمیل بھی بہت ضروری تھی۔ مجبوراً با دل ناخواستہ انہیں دریا میں پھینک دیا۔ یہ صفحات پانی پر بکھر گئے۔ اسی وقت دریا کی سطح پر ایک صندوق نمودار ہوا، اس کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا۔ یہ سارے اوراق ایک ایک کر کے اس میں چلے گئے اور آخر میں صندوق بند ہو گیا اور صندوق دریا کی تہ میں چلا گیا۔ ابوبکر کو ان صفحات کی غرقابی کا بڑا ملال تھا لیکن اس دکھ میں یہ حیرت بھی شامل تھی کہ یہ صندوق کیسا تھا اور اس کے ڈھکنے کا کھلنا، اوراق کا اس میں سما جانا اور ڈھکنا بند ہو کر صندوق کا دریا کی تہ میں بیٹھ جانا، آخر یہ سب کیا تھا؟ لیکن یہ جو کچھ بھی تھا، اس کا ابن علی کے سامنے ذکر کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

کئی دن بعد آپ نے ابوبکر سے پوچھا۔ ''ابوبکر! وہ صفحات دریا برد کر دیے تھے؟''

ابوبکر نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں نے انہیں اسی دن دریائے جیحون کے حوالے کر دیا تھا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''وہ صفحات پانی کی لہروں پر منتشر ہوئے تھے یا نہیں؟''

ابوبکر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ ''حضرت! میں کیا عرض کروں؟ میں نے وہاں جو منظر دیکھا اسے بیان کرنے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

آپ نے کہا۔ ''نہیں، ڈرو مت۔ جو کہنا چاہتے ہو کہہ دو، میں ناراض نہیں ہوں گا۔''

ابوبکر نے پورا واقعہ دہرا دیا، بولے۔ ''حضرت! یہ واقعہ سمجھ میں نہیں آیا۔''

آپ مسکرانے لگے، اس کے بعد آپ نے کہا۔ ''ابوبکر! اندر جا کر صندوق کھولو اور اس میں سے وہ صفحات نکال لاؤ۔''

ابوبکر اندر گئے اور صندوق سے وہ صفحات نکال لائے۔ یہ وہی صفحات تھے جنہیں وہ دریائے جیحون میں پھینک آئے تھے۔ ابوبکر حیران و پریشان صفحات لے کر آپ کے پاس لے آئے اور کہا۔ ''حضرت! میں تو پاگل ہو جاؤں گا، ایک راز سے پردہ اٹھتا نہیں کہ دوسرا مزید گر جاتا ہے۔ آخر یہ اسرار کیا ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے استاد حضرت خضرؑ ان صفحات کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا آنا نہیں ہو رہا تھا، مجبوراً میں نے ان کو دریائے جیحون کے ذریعے ان کے پاس بھیج دیا چنانچہ جب انہوں نے میرے صفحات پڑھ لیے تو واپس کر دیے۔''

لیکن کچھ عرصہ بعد آپ اپنی تحریروں سے واقعی دل برداشتہ ہو گئے اور ساری تحریریں دریائے جیحون میں پھنکوا دیں لیکن اسی شام کو وہ تحریریں لیے ہوئے حضرت خضرؑ ان کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''ابن علی! یہ تم نے کیا کیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! جب میں ان صفحات کو پڑھتا ہوں تو اپنی بے بضاعتی اور جہالت پر شرمسار ہونے لگتا ہوں اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں دریا برد کروا دوں۔''

حضرت خضرؑ نے کہا۔ ''یہ غلط کیا تم نے، تمہیں اپنے یہ صفحات محفوظ رکھنا چاہئیں کیونکہ یہ کارآمد ہیں اور دوسروں کے لیے بے حد مفید۔ اس لیے میں انہیں تمہارے پاس لے آیا۔''

آپ حج کرنے تشریف لے گئے اور وہاں طواف کعبہ کے دوران گریہ سے بہت برا حال ہو گیا۔ جب واپس تشریف لائے تو ان کی کٹیا میں ایک کتیا نے بچے دے رکھے تھے۔ آپ اس کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگے کہ وہ خود سے چلی جائے تو بہتر ہے انہیں دھتکارنا نہ پڑے لیکن کتیا نہیں ہلی۔ آپ نے پوری رات وہاں کھڑے ہو کر گزار دی۔

اس محلے میں ایک ایسے بزرگ بھی رہتے تھے جو ابن علی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور اس بات سے حسد کرتے تھے کہ لوگ ان کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ ان بزرگ کو سلام کرتے تو وہ منہ پھیر کر نفرت سے سلام کا جواب دیتے۔ ان بزرگ کو جب یہ معلوم ہوا کہ کتیا نے آپ کی جھونپڑی میں بچے دے رکھے ہیں جس کی وجہ سے آپ بے حد پریشان ہیں تو بہت خوش ہوئے۔

آپ نے اپنی رہائش دوسرے حصے میں کر لی اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ کتیا دھتکارے بغیر ہی چلی جائے۔ اسی کشمکش میں ستر دن گزر گئے۔ کتیا کے بچے بڑے بڑے ہو گئے اور جب وہ خود دوڑنے بھاگنے کے لائق ہو گئے تو کتیا انہیں لے کر چلی گئی۔





آپ نے اس حصے کو خوب صاف کیا، دھویا اور اس میں دوبارہ رہائش اختیار کی۔

اسی دن بڑے میاں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ ''اے نادان شخص! تو محمد بن علی سے بلاوجہ نفرت کرتا ہے حالانکہ یہ وہ شخص ہے جو کسی کا برا چاہتا ہی نہیں، یہاں تک کہ اس نے ستر راتیں اسی انتظار میں گزار دیں کہ کتیا کو دھتکارنا نہ پڑے۔ جب وہ خود سے چلی گئی تو ابن علی نے اپنی رہائش گاہ کو دوبارہ کام میں لیا۔'' یہ بزرگ اس خواب کے بعد فوراً آپ کے پاس پہنچے اور قدموں میں گر کر دیر تک معافی مانگتے رہے۔

آپ نے جواب دیا۔ ''بھائی! تم نے کون سا قصور کیا ہے جو میں معاف کر دوں۔ تم نے اپنے دل میں شرمندگی محسوس کر لی، میرے اور تمہارے لیے یہی کافی ہے۔''

☆☆☆

آپ کے دونوں دوست ایک عرصہ بعد سفر سے واپس آئے تو وہ بہت بڑے عالم بن چکے تھے۔ انہیں اپنی علمیت پر بڑا ناز تھا اور ان دونوں نے یہ سوچا تھا کہ ترمذ پہنچ کر محمد بن علی کو شرمندہ کریں گے کہ تم نے منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہے اور ہم دونوں علم حاصل کر کے واپس بھی آ گئے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ اب وہ دلائل سے ابن علی کو لاجواب کر دیا کریں گے لیکن جب ترمذ والوں سے یہ سنا کہ ابن علی کے علوم کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تو حیرت ہوئی اور جب ان دونوں نے آپ سے ملاقات کی اور ابن علی کو اس سے کہیں زیادہ پایا جتنا سنا تھا تو بہت شرمندہ ہوئے۔ دونوں دوستوں کا علم منقولی اور معقولی تھا جبکہ ابن علی منقولی اور معقولی علوم کے ساتھ ہی باطنی علوم بھی رکھتے تھے۔

دونوں دوستوں میں سے ایک نے آپ کے ساتھ حسد کا سلوک کیا اور اس کوشش میں رہنے لگا کہ کوئی موقع ہاتھ آئے تو ابن علی کو شرمندہ کیا جائے لیکن اس قسم کا موقع ہاتھ آنا آسان نہیں تھا۔ وہ دوست آپ کے پاس آنے جانے والوں کو ورغلانے لگا۔ وہ کہتا۔ ''ابن علی کو آتا ہی کیا ہے؟ میں نے تو علوم کی تحصیل میں بغداد اور دوسرے کئی شہروں کا سفر کیا ہے، مصیبتیں اٹھائی ہیں اور سختیاں جھیلی ہیں لیکن ابن علی ترمذ سے باہر تک نہیں نکلے پھر ان کی علمیت میرے مقابلے میں کیا ہو سکتی ہے اور تم لوگ اپنی اندھی عقیدت سے انہیں معلوم نہیں کیا کچھ سمجھنے لگے ہو۔''

لوگ آپ کے دوست کی باتیں سنتے اور آپ کے گوش گزار کر دیتے کہ آپ نے اپنی آستین میں ایک خطرناک سانپ پال رکھا ہے، اس سے جلد از جلد پیچھا چھڑا لیجیے ورنہ یہ کسی روز بری طرح آپ کو ڈس لے گا۔

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا دوست اگر سانپ ہے تو یہ سانپ مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا اور نہ ہی میں اس سانپ سے ڈرتا ہوں۔''

مریدوں اور ارادت مندوں نے خاموشی اختیار کر لی اور دوست آپ کی کاٹ میں رہا۔ اب آپ اپنے دوست پر بہت زیادہ مہربان رہنے لگے تھے۔ اس کا بڑا خیال رکھتے اور یہ کوشش کرتے کہ وہ آپ کی کسی بات پر آزردہ نہ ہو۔

آخر ایک دن وہ بہت شرمندہ ہوا اور کہا۔ ''ابن علی! میں تمہارا دوست ہوں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ کب کہا کہ تم میرے دشمن ہو؟''

دوست نے شرمندگی سے کہا۔ ''لیکن کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے پاس رہائش کیوں اختیار کی؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں۔''

دوست نے پوچھا۔ ''تم کیا جانتے ہو؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں یہ جانتا ہوں کہ تم اپنے دنیاوی علوم کے زہر کا شکار ہو گئے ہو اور چاہتے ہو کہ مجھے میرے مریدوں اور ارادت مندوں میں کسی بات پر شرمندہ کرو۔''

دوست نے کہا۔ ''جب تمہیں میرے ارادوں کا علم تھا تو تم نے خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی بلکہ تم نے اس دوران میری زیادہ عزت کی ہے، آخر کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم نے مجھ سے حسد کیا، معلوم نہیں کس چیز پر۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر مجھ میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو میرے دوست میں نہیں ہے تو مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ میں نے تمہاری ناراضی کا جواب ناراضی سے کیوں نہیں دیا؟ کیا میں تم سے حسد کرتا؟ اگر کرتا تو کس بات پر حسد کرتا؟ ان حالات میں میرے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ محبت سے پیش آؤں۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوست آپ کی باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔

آپ سجدے میں گر کر مناجات کرنے لگے۔ "خدایا! اگر میں نے اپنے کسی فعل سے تجھ کو ناراض کیا ہے اور تو نے مجھے عذاب پر آمادہ کر دیا ہے تو تو مجھ سے اس مصیبت کو دور فرما دے اور جس کو میری بات ناگوار گزری ہو اس کو اس سے دور فرما دے۔"

آپ نے کئی بار یہ محسوس کیا کہ آپ جو عبادت کرتے ہیں اس میں آپ کا نفس پورا ساتھ نہیں دیتا۔ انہوں نے پورے ذوق و شوق اور انہماک سے عبادت گزاری شروع کر دی اور نفس کے خلاف جدوجہد کرتے رہے لیکن ہر بار یہی محسوس ہوا کہ وہ کامیاب نہیں رہے۔ آخر عاجز آ کر آپ دریائے جیحون کے کنارے پہنچ گئے اور وہاں رات کے سناٹے میں عبادت میں مشغول ہو گئے۔ نصف رات کے بعد وہ مایوس ہو گئے کیونکہ نفس برابر سرکشی پر مائل رہا۔ آپ نے اس سلسلے میں حضرت خضرؑ کی راہنمائی چاہی لیکن کچھ دیر کے لیے انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حضرت خضرؑ نے بھی دست کشی اختیار کر لی ہے۔ آپ نے عاجز آ کر دریا میں چھلانگ لگا دی کہ اس سے تو موت ہی بہتر ہے لیکن جیسے جیسے آپ ڈوب جانے کی کوشش فرماتے موجیں آپ کو اوپر ہی اوپر رکھتی تھیں یہاں تک کہ دریا کی چند سرکش اور تیز لہروں نے آپ کو ساحل پر لا ڈالا۔ آپ نے بڑی رقت کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اے اللہ! اے رب العالمین! تیری ذات کتنی پاکیزہ ہے کہ جس نے میرے نفس کو نہ تو فردوس ہی کے لائق چھوڑا اور نہ ہی جہنم کے لائق۔ میں تیرا شکریہ کس طرح ادا کروں۔"

آپ نے شادی کر لی کہ شاید نفس اسی طرح قابو میں آ جائے لیکن وسوسے اور اس نوع کے دوسرے خیالات آپ کو پریشان کرتے رہتے۔ آپ بے حد پریشان رہنے لگے۔ آپ کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور اس نام کی نسبت سے آپ کی کنیت ابوعبداللہ قرار پائی۔

آپ کے ضبط و احتیاط کا یہ حال تھا کہ اپنی بیوی کے سامنے بھی ناک وغیرہ صاف نہیں کرتے تھے۔ کسی بزرگ نے آپ کے ضبط و احتیاط کا ذکر کسی شخص سے کیا تو وہ آپ کو دیکھنے چلا آیا۔ آپ سے مل کر وہ آپ کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور کسی قسم کی بات چیت نہیں کی۔

آپ چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ "تیرا مجھ سے کوئی کام ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، بس یونہی دیدار کو چلا آیا۔"

آپ نے کہا۔ "تیری صورت پر تو کچھ اور ہی لکھا ہے۔"

اس شخص نے پوچھا۔ "میری صورت پر کیا لکھا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو معلوم ہو۔"

آپ نے اسی وقت اس کے سامنے اپنی ناک صاف کی اور کہا۔ "اے شخص! تو نے میرے بارے میں جو کچھ سنا ہے، درست ہے اور اب یہ جو کچھ دیکھ رہا ہے یہ ظاہر ہے، میرا ظاہر کیونکہ اسرار شاہی ظاہر کر دینے والا مقرب بارگاہ نہیں رہتا۔"

ایک بار آپ سخت بیمار ہو گئے۔ اس بیماری نے آپ کو اس لائق بھی نہ رکھا کہ اوراد و وظائف کے معمولات کو بخیر جاری رکھ سکتے۔ ایک دن بڑی بے بسی سے سوچا کہ اگر میں بیمار نہ ہوتا تو میرے اوراد و وظائف میں کمی نہ ہوتی، کچھ اضافہ ہی ہوتا۔ آپ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ آپ ان سیٹیوں کی آواز میں کھو گئے اور اس دوران یہ محسوس کیا کہ ان سیٹیوں کی آوازوں میں کوئی ان سے کہہ رہا ہے۔ "اے ابن علی! تو کتنا نادان انسان ہے جو اللہ کی مصالح پر اعتراض کر رہا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ تیرا کام کیا اور میرا کام راستی پر منحصر ہے۔"

آپ اس آواز سے بہت شرمندہ ہوئے اور توبہ و استغفار کرنے لگے۔ اس کے بعد آپ نے عبادت و ریاضت میں اضافہ کر دیا۔ اس وقت آپ کی عمر کافی ہو چکی تھی اور عورت والے واقعے کو چالیس سال گزر چکے تھے۔ آپ خلق خدا کو فائدے پہنچانے کے لیے طبابت کرنے لگے تھے۔ صبح، دوپہر، شام غرضیکہ جب دیکھیے لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے اور لوگ آپ سے دعاؤں کی خواہش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایک دن آپ تخلیے میں بیٹھے ماضی کی سیر کر رہے تھے، یکے بعد دیگرے سارے ہی مناظر سلسلے وار گزرنے لگے۔ ان میں اس عورت کا بھی خیال آیا۔ آپ نے گھبرا کر سوچنا چھوڑ دیا اور اللہ اللہ کرنے لگے۔ اسی دن شام سے ذرا پہلے مریضوں نے آپ کو گھیر لیا تھا۔ آپ نہایت توجہ سے ان کا حال پوچھنے پر معائنہ کرتے اور اس سے فارغ ہو کر نسخہ لکھ دیتے۔ انہی مریضوں میں ایک عورت بھی تھی۔ یہ عورت ہذیان جیسی کیفیت کا شکار تھی اور اس وقت اس کی عمر ساٹھ یا اکسٹھ سال سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ آپ نے عورت سے پوچھا۔ "تیری یہ کیفیت کب سے ہے؟"





عورت نے آپ کو غور سے دیکھا، بولی۔ "یہ مجھ سے پوچھتے ہو کہ میری یہ حالت کب سے ہے؟ یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میں اپنی عمر کے کس حصے میں ہذیان کا شکار نہیں تھی۔"

آپ نے کہا۔ "اچھا یہی بتا دیجیے۔"

عورت نے کہا۔ "ابن علی! مجھے تو تم بہت ہی سیدھے معلوم ہوتے ہو، کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے تجھے پہچانا کیوں نہیں، تو وہی زلیخا ہے جس نے جوانی میں مجھے گناہ کی ترغیب دی تھی اور میں بچ نکلا تھا۔"

عورت ہنسنے لگی، بولی۔ "وہ بھی کیا دن تھے؟ بخدا میں آج بھی انہی دنوں کے لطف اور لذیذ تصورات کے سہارے زندگی کے بقیہ شب و روز گزار رہی ہوں ورنہ اب رہ کیا گیا ہے مجھ میں؟"

آپ نے کہا۔ "اچھا اب تو ایک بات بتا مجھے۔ چالیس سال پہلے باغ میں، میں نے خود کو بہ مشکل بچایا تھا۔ اب جب تو خود اپنی اس حرکت پر غور کرتی ہے تو کیسا محسوس کرتی ہے؟ شرمندہ ہوتی ہے یا نہیں؟"

عورت زور زور سے ہنسنے لگی، بولی۔ "شرمندگی؟ کیسی شرمندگی، کس بات کی شرمندگی؟ میں تو آج تک اس ناکامی پر افسوس کرتی رہتی ہوں کہ آخر میری تدبیر میں وہ کون سا نقص باقی رہ گیا تھا کہ جس نے مجھے ناکام رکھا تھا۔ خواہش وصال جس نے مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ میں تنہا اس باغ تک چلی گئی تھی۔ آج بھی حسرت بن کر میرے دل میں جاگزیں ہے۔"

آپ نے لاحول پڑھی اور کہا۔ "اس کا یہ مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دل پر واقعی مہر لگا دی ہے اور اس کو بدل دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔"

اس عورت نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔ "کیا تو نے اس ناکامی پر جو میری ہی نہیں، تیری بھی ناکامی تھی، آج تک کوئی افسوس محسوس نہیں کیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی ناکامی پر نہیں، اس غلطی پر ضرور افسوس کیا تھا کہ میں نے اس دن تجھے اتنا وقت کیوں دیا تھا آخر؟ فوراً ہی کیوں نہیں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

عورت نے کہا۔ "اگر تو اب بھی راہ راست پر نہیں آیا اور اسی انداز میں سوچ رہا ہے جس طرح چالیس سال پہلے سوچا کرتا تھا تو میں تجھ سے اپنا علاج نہیں کرواؤں گی کیونکہ میرے خیال میں تو خود ایک کہنہ مرض کا شکار ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا تجھے شفا دے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اور تیرا مرض یہ ہے کہ تو اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہے، جس سے صحت یابی کو بیماری اور بیماری کو صحت یابی سمجھتی رہتی ہے۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔"

عورت ہنستی، قہقہے مارتی چلی گئی لیکن آپ کے دل میں ایک طوفان برپا کر گئی۔ پُرسکون تالاب میں پتھر پھینک کر ہلکورے پیدا کر گئی۔ اس دن آپ بہت پریشان رہے۔ آپ کے نفس نے ایک بار پھر سرکشی اختیار کی اور آپ غیر ارادی طور پر سوچنے لگے۔ "کیا یہ عورت درست کہتی تھی کہ چالیس سال پہلے مجھے جو ایک شاندار موقع ملا تھا کہ میں اس سے حظ وصل اٹھاؤں اور میں گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ کیا میں نے بھاگ کر غلطی نہیں کی تھی؟ اگر میں لطف اندوز ہو لیتا اور اس کے بعد توبہ کر لیتا تو کیسا رہتا؟ شاید یہ میری بہت بڑی غلطی اور بھول تھی۔ یہ عورت درست ہی کہتی تھی کہ میں نے غلطی ہی کی تھی جو فائدہ اٹھائے بغیر ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔"

رات دیر تک اسی طرح سوچتے رہے لیکن جب صبح بیدار ہوئے اور رات کی باتوں کا خیال آیا تو اپنے دل میں بے حد نادم ہوئے۔ وہ خود پر لعنت ملامت کرنے لگے کہ انہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ وہ اسے ایک بڑا گناہ خیال کر کے گھر سے نکل گئے اور تین دن تک پاگلوں کی طرح مارے مارے پھرتے رہے۔ آخر چوتھے دن آپ نے خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ "اے ابن علی! تمہاری خجالت اور پشیمانی ہمیں بہت پسند آئی اور اسی صلے میں تمہیں اتنا بڑا مرتبہ ملا ہے۔ اب تو تمہیں اس پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ تم اداس اور ملول نظر آ رہے ہو۔"

ابن علی نے کہا۔ "میں خوش ہوں اور اس لیے خوش ہوں کہ میرا رب خوش ہے۔"

اسی دن شام کو آپ نے وعظ میں فرمایا۔ "لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ خناس کیا چیز ہے؟"

لوگوں نے جواب دیا۔ "نہیں، ہم لوگ نہیں جانتے کہ یہ خناس کیا چیز ہے۔ آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔"

آپ نے کہا۔ "میں ضرورت بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ تم سب کو خناس کی بابت کچھ بتا دیا جائے۔"



SCANNED BY PAKSOCIETY / FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگ خاموشی سے آپ کا وعظ سننے لگے۔

آپ نے فرمایا۔ ''لوگو! کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابلیس لعین کہاں رہتا ہے؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''ہمیں نہیں معلوم، آپ ہی ارشاد فرمائیں۔''

آپ نے کہا۔ ''ابلیس کی جائے قیام نفس ہے۔ اس لیے سارے ہی برگزیدہ لوگ ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کی خطائیں معاف کردی تھیں اور یہ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے تھے تو ابلیس آدمی کی شکل میں حوا کے پاس پہنچا تھا کہ اے نیک بی بی! چند دنوں کے لیے میرے بیٹے خناس کو اپنے پاس رکھ لے، میں سفر پر جارہا ہوں جب واپس آؤں گا تو اسے اپنے پاس ہی رکھ لوں گا۔''

حوا نے اسے رکھ لیا اور جب آدم آئے اور حوا کے پاس خناس دیکھا تو پوچھا۔ ''اے حوا یہ کون ہے؟''

حوا نے جواب دیا۔ ''خناس، ایک شخص اسے چھوڑ گیا ہے جب واپس آئے گا تو لے جائے گا۔''

آدم نے کہا۔ ''حوا! یہ تو نے بہت برا کیا جو خناس کو اپنا مہمان بنا لیا۔'' اس کے بعد آدم نے خناس کو قتل کردیا اور اس کے جسم کے ٹکڑوں کو ادھر اُدھر ڈال دیا۔ شام کو جب ابلیس گھر میں داخل ہوا تو داخل ہوتے ہی اس نے خناس کی بابت پوچھا۔ ''حوا! یہ خناس کہاں چلا گیا؟''

حوا نے بڑے افسوس سے کہا۔ ''افسوس کہ اسے ضائع کردیا گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''

ابلیس نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا، میرے خناس کو کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

اس کے بعد ابلیس نے خناس کو آواز دی، خناس کی طرف سے فوراً ہی جواب ملا۔ ''بابا جان! میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔'' اس کے بعد وہ واقعی ابلیس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ حوا حیران رہ گئیں۔

دوبارہ حوا نے خناس کو پھر رکھ لیا اور آدم نے ایک بار پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے درختوں میں ان ٹکڑوں کو لٹکا دیا۔ ابلیس نے پھر آواز دی اور خناس ایک بار پھر دوڑتا ہوا ابلیس کے پاس پہنچا اور خوشی میں اچھلنے کودنے لگا۔

تیسری بار پھر ابلیس نے خناس کو حوا کے حوالے کردیا اور چلا گیا۔ اس بار آدمؑ نے خناس کے ساتھ پھر وہی سلوک کیا کہ اس کے ٹکڑے کرکے جلا دیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا لیکن اس دن ابلیس نے جیسے ہی آواز دی راکھ نے خناس کی شکل اختیار کرلی اور ابلیس کے سینے سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

آخری بار خناس جب گھر میں پھر نظر آیا تو آدمؑ نے ذرا زیادہ سختی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے خناس کو قتل کرکے پکایا اور پھر حوا اور آدمؑ نے مل جل کر اسے کھا لیا۔

جب ابلیس کو یہ معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا، بولا۔ ''اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں، میں بھی یہی چاہتا تھا کہ خناس تمہارے جسموں میں داخل ہوجائے سو داخل ہوچکا۔ اب یہ انسانوں کو تباہ و برباد کرتا رہے گا۔''

یہ داستان سنا چکنے کے بعد ابن علی نے کہا۔ ''وہی خناس ہم سب کے سینوں میں موجود ہمیں ورغلاتا، ستاتا رہتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خناس کے بارے میں فرمایا۔ ''الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس (وہ خناس جو انسانی سینوں میں وسوسے کرتا رہتا ہے)

اس کے بعد آپ دیر تک لاحول پڑھتے رہے کیونکہ سینے کا خناس آپ کو بہت پریشان کرنے لگا تھا۔ آپ اکثر فرمایا کرتے کہ ''سو بھیڑیے بکریوں کے گلے کو اتنا پریشان نہیں کرسکتے جتنا ایک شیطان پوری جماعت کو تباہ کرکے نقصان پہنچا دیتا ہے۔'' آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ''خدا کے سوا کسی اور کا شکر نہ کرو اور نہ ہی کسی کے آگے عاجز ہو۔''

آپ جب تک زندہ رہے لوگوں کی روحانی اور جسمانی تکالیف کا علاج کرتے رہے اور جب رخصت ہوئے تو ایک زمانے کو رلا کر رخصت ہوئے چونکہ آپ حکیم بھی تھے اس لیے بعد میں صوفیوں میں ایک فرقہ حکیمیہ کے نام سے پیدا ہوا۔ یہ حکیمیہ، محمد بن علی کے مسلک سے تعلق رکھتا ہے اور انہی کے نام پر اس فرقہ کا نام رکھا گیا اور خود آپ کو حکیم الاولیاء کا لقب دیا گیا۔

**ماخذات**

الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضتہ الریاحین، ابی محمد عبداللہ
سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارشکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار



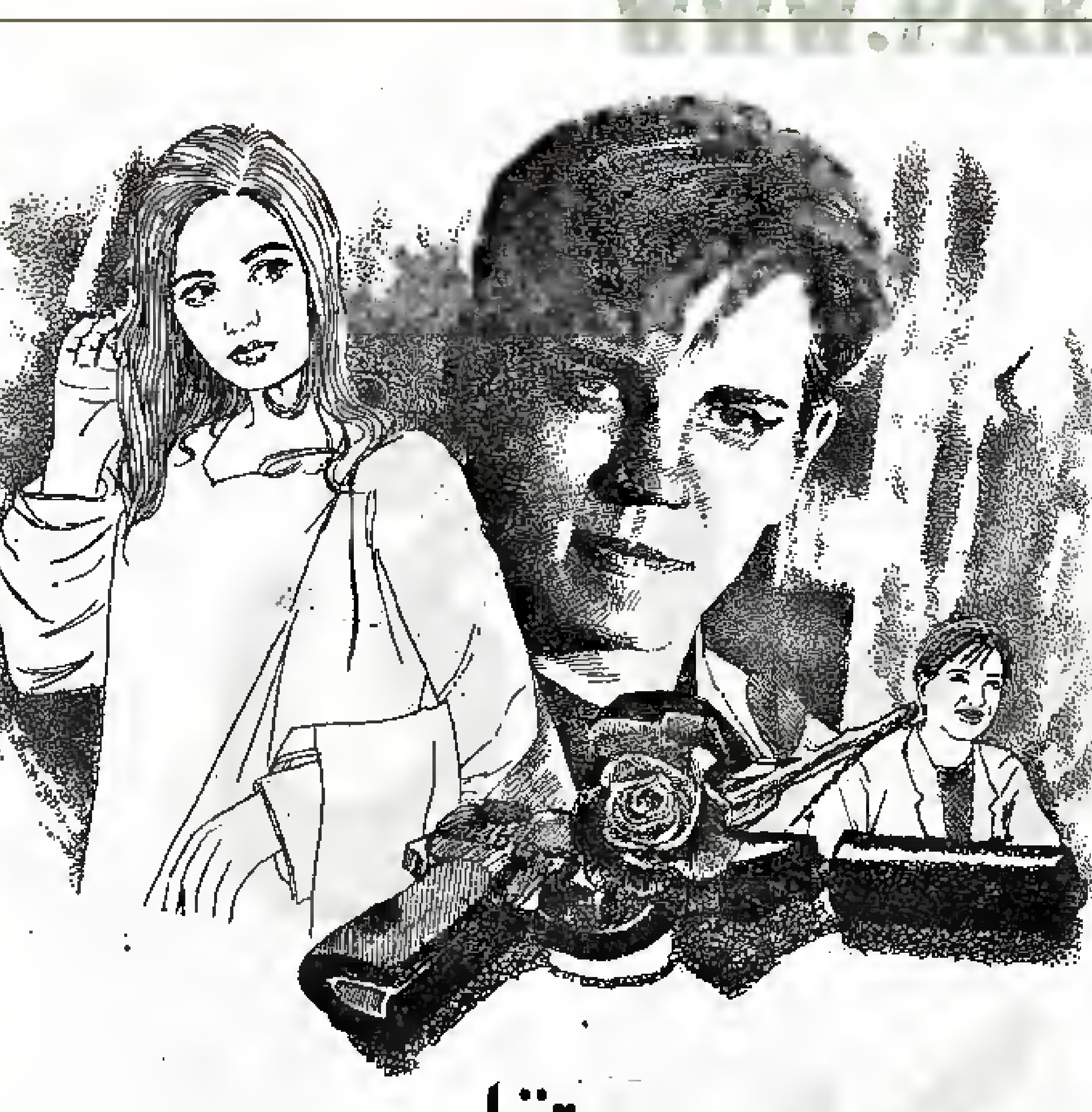

# مستقبل

مریم کے خان

مستقبل ہمیشہ حال کا آئینہ ہوتا ہے گویا.. مستقبل کی کمزوری حال کی تباہی کا کھلا اشارہ ہے... مغربی معاشرے کی آزاد خیالی جہاں ترقی کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے وہاں مستقبل کے معماروں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہے مگر... کیا کیجیے کہ اپنے پیروں پر کلہاڑی بھی تو انہی بڑوں نے ماری ہے۔ ان معماروں کو اگرچہ جرم کا ادراک تو نہ تھا مگر لمحاتی تسکین کی خاطر وہ ایک جنون میں مبتلا تھے اور اچھا نظر آنے کے دھوکے میں مسلسل برائی کی جانب محوِ سفر تھے۔

**عقلمندوں کی سرزمین پر مندی عقل کے عجب تماشے**

وین اسکول بس سے اترا اور سست قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ چونکہ اسکول کے آخری سال کا طالب علم تھا اور سولہ سال کا ہوچکا تھا اس لیے اسکول بس اسے گھر کے سامنے اتارنے کی پابند نہیں تھی۔ وہ اسے گھر کے نزدیکی بس اسٹاپ پر اتارتی اور صبح وہیں سے پک کرتی تھی۔ وین رتھ فورڈ کے گھر والے پچھلے سال ہی کیلی فورنیا کے ایک چھوٹے قصبے سے لاس اینجلس منتقل ہوئے تھے۔ یہ بڑا شہر تھا اور نصف امریکا کے خوابوں کا شہر تھا، کیونکہ ان کی



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پسندیدہ ترین سیلی برٹیز اسی شہر میں رہتی تھیں۔ وین کا باپ جون رتھ فورڈ ایک بینک میں ملازم تھا اور اس کا یہاں تبادلہ ہوا تھا حالانکہ وہ اپنے پرسکون قصبے کو چھوڑ کر یہاں نہیں آنا چاہتا تھا مگر وہ بینک برانچ ہی بند ہو گئی جس میں جون کام کرتا تھا اور اس کا فاضل عملہ لاس اینجلس منتقل کر دیا گیا تھا۔ کساد بازاری کے اس دور میں جون ملازمت چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجبوراً اسے لاس اینجلس آنا پڑا تھا۔

خود وین کو یہ قصبہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ تنہائی پسند اور خود میں گم رہنے والا شرمیلا لڑکا تھا اور آبائی قصبے میں اس نے چند دوست بنا لیے تھے لیکن یہاں پر ابھی تک وہ ایک بھی دوست نہیں بنا سکا تھا۔ اسکول پارٹیوں اور دوسری تقریبات میں بھی وہ اکیلا رہتا تھا۔ ان کا گھر ڈیلو اسٹریٹ پر تھا۔ یہ خوب صورت سا مکان تھا جس کے آگے بڑا سا لان اور بڑی سڑک کے ساتھ دیوقامت درخت لگے ہوئے تھے۔ نیچے ایک بیڈ روم کے ساتھ لیونگ روم اور کچن کے ساتھ ڈائننگ ایریا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا گیسٹ روم بھی تھا۔ اوپر تین بیڈ روم تھے۔ وین کی صرف ایک چھوٹی بہن میری تھی اور وہ بارہ سال کی تھی۔ میری بہت تیز اور شوخ تھی اور اسے اپنا چپ چاپ رہنے والا بھائی بالکل پسند نہیں تھا۔ خود وین بھی اپنی شور مچانے والی بہن کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ اس کا شکر گزار بھی تھا کہ وہ ماں باپ کی توجہ خود پر رکھتی تھی اور انہیں وین پر توجہ دینے کا موقع کم ملتا تھا، کیونکہ وہ ماں باپ کی توجہ سے بھی الجھن محسوس کرتا تھا۔

اس رات ڈنر پر اچانک ہی جون نے اس سے اسکول کا پوچھ لیا۔ ”تم نے کوئی دوست بنایا؟“

”نہیں پاپا۔“ وہ بولا۔

اس کی ماں ایمی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کوئی دوست نہیں بنایا... مگر کیوں وین؟“

اس نے شانے اچکائے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نے ترخ کر کہا۔ ”ماما اسے کپڑے پہننے کا ڈھنگ نہیں ہے تو کوئی اس کا دوست کیوں بنے گا۔“

”تم اپنے کپڑوں پر دھیان دیا کرو۔“ ایمی نے بیٹی کی تائید کی۔ ”کئی بار تم بالکل مس میچ کپڑے پہنے ہوتے ہو اور بٹن غلط لگا لیتے ہو۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ وین نے جان چھڑانے کے لیے وعدہ کیا لیکن اگلے روز جب وہ اسکول جانے لگا تو اس نے اپنے کپڑے نکال کر دیکھے اور پھر سرمئی پتلون پر ایک ہلکے سرمئی رنگ کی ٹی شرٹ لی جس پر دھاریاں تھیں اور اوپر سے سفید اور ہلکے سرخ رنگ کی چھوٹے چیک والی شرٹ پہن لی۔ اس نے بٹن کھلے رہنے دیے تھے۔ اس نے آئینے میں دیکھا تو اسے اچھا لگا تھا۔ اس روز اسکول کی کئی لڑکیوں نے اسے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ خاص طور سے اس کی کلاس میں پڑھنے والی کیرن اسے بار بار دیکھ رہی تھی۔ کیرن نازک نقوش والی لڑکی تھی لیکن اس کا جسم متناسب اور مضبوط تھا۔ وہ اسکول کی بیڈمنٹن ٹیم میں شامل تھی۔ انٹرویل میں وہ وین کے پیچھے کینٹے ٹیریا تک آئی۔ اپنے لیے لنچ لے کر وہ اسی کی میز پر آ گئی۔

”ہائے...“

”ہائے...“ وین کسی قدر نروس انداز میں بولا۔

”تم کسی کے ساتھ نہیں ہو؟“ کیرن نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“

وین جانتا تھا کیرن کا لونی اور باربرا کے ساتھ گروپ تھا۔ وہ ساتھ ساتھ رہتی تھیں اور لڑکوں کو منہ نہیں لگاتی تھیں۔ حاسد لڑکوں نے انہیں لزبین مشہور کیا ہوا تھا لیکن سب جانتے تھے ان میں ایسا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے وین کو حیرت ہوئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم لڑکوں سے تو دوستی نہیں کرتی ہو؟“

”ہاں لیکن تمہاری بات دوسری ہے۔“ کیرن مسکرائی تو وین سحر زدہ رہ گیا۔ آج تک کسی لڑکی نے اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔

”میں... میں تیار ہوں۔“ وین بولا۔

”آج ایک پارٹی ہے، چلو گے؟“

وین ہچکچایا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں چلوں گا۔“

کیرن خوش ہو گئی۔ ”میں تمہیں پتا ایس ایم ایس کر دوں گی۔“

اس دن وین بہت خوش تھا۔ اسکول سے آنے کے بعد اس نے اپنا موبائل ہاتھ میں رکھا تھا۔ یہ جدید ترین آئی فون تھا جو اس کے باپ نے اس کی سولہویں سالگرہ پر گفٹ کیا تھا۔ شام چھ بجے اسے ایس ایم ایس آیا۔ کیرن نے اسے پتا بھیجا تھا۔ یہ اگلی اسٹریٹ کا تھا جہاں کیرن رہتی تھی۔ اس نے کپڑے پہلے ہی تیار کر لیے تھے، وہ جلدی سے تیار ہو کر باہر آیا اور کیرن کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں کیرن کے ساتھ لونی اور باربرا دونوں موجود تھیں۔ انہوں نے گرم جوشی سے وین کو خوش آمدید کہا اور وہ پارٹی میں روانہ ہو گئے۔ پارٹی ایک بڑے گھر میں تھی جو خاصے پوش علاقے میں تھا۔ یہاں بے شمار لڑکے لڑکیاں پارٹی میں شامل تھے۔ میوزک کے تیز شور کے ساتھ نشے میں دھت نوجوانوں کا شور بھی شامل تھا۔ ایک طرف پول پارٹی جاری تھی اور دوسری طرف مکان کے اندر ڈرنک پارٹی تھی۔ وہ اندر آئے۔ وین پہلے بھی کئی بار اس قسم کی پارٹیوں میں آ چکا تھا مگر اکیلے ہونے کی وجہ سے وہ بور ہو کر واپس چلا گیا۔

مگر آج کیرن کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اسے مزہ آ رہا تھا۔ وہ اس کا تعارف دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں سے کرا رہی تھی اور وین کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سب اسے جانتے تھے اور اس سے بہت اچھے طریقے سے مل رہے تھے۔ کیرن کسی لڑکے سے بھی زیادہ پُر اعتماد تھی۔ وین نے دل میں اعتراف کیا کہ اس میں کیرن کے اعتماد کا دسواں حصہ بھی نہیں تھا۔ وہ وین کو ایک کمرے میں لائی۔ یہاں ایک لمبے بالوں والا نوجوان گھوم رہا تھا اور سب اس سے کوئی چیز لے رہے تھے۔ کیرن اس کی طرف بڑھی اور کچھ نوٹ اس کی مٹھی میں دبا دیے جواب میں اس نے ایک چھوٹی سی پڑیا کیرن کے حوالے کر دی۔ کیرن واپس آئی تو وین نے سوال کیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”کوکین۔“ کیرن نے نارمل لہجے میں کہا۔

”کوکین؟“ وین گھبرا گیا۔ ”یہ نشہ ہوتا ہے۔“

”کم آن، کیا تم نے شراب نہیں پی، اس میں نشہ نہیں ہوتا؟“

”ہوتا ہے۔“ وین نے اعتراف کیا۔

”اسی طرح کوکین بھی نشہ ہے، آؤ میرے ساتھ۔“

کیرن اسے ایک کمرے میں لائی یہاں کئی لڑکے اور لڑکیاں پہلے ہی بے حال پڑے تھے وہاں شیشے کی میز تھی۔ کیرن نے پڑیا کا پاؤڈر میز پر ڈالا اور پھر اسے چار حصوں میں تقسیم کر کے انہیں لائن کی صورت میں سیدھا کر دیا۔ پڑیا کے ساتھ ایک چھوٹی سی نلکی بھی ملی تھی۔ کیرن نے نلکی ناک سے لگائی اور ایک لکیر کے ساتھ اس کا دوسرا سرا لگاتے ہوئے زور سے سانس کھینچی اور ساتھ ہی نلکی کو حرکت بھی دی۔ سارا پاؤڈر ہوا کے ساتھ کھنچ کر کیرن کی ناک میں چلا گیا۔ اس نے سر اوپر کیا اور عجیب سی آواز نکالی پھر سر جھٹکا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ وہ ہنسی اور نلکی وین کی طرف بڑھا دی۔ ”اب تمہاری باری ہے۔“

وین نے نفی میں سر ہلایا۔ مگر کیرن نے اصرار کیا اور نلکی اسے تھما دی۔ وین نے ہچکچاتے ہوئے نلکی ناک سے لگا کر زور سے سانس کھینچا تو اسے لگا جیسے کوئی تیز اور کسیلی سی چیز اس کی ناک سے ہوتی اس کے دماغ میں گھس گئی ہو، اسے جھٹکا لگا اور کچھ دیر کے لیے آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ پھر دماغ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا تو وہ بالکل کیرن کی طرح ہنسا۔ کیرن نے اس سے نلکی لی اور کچھ دیر بعد دوسری لکیر بھی ناک میں اتار لی۔ وہ عادی تھی اس لیے برداشت کر گئی مگر وین کا سر چکرا رہا تھا اس لیے اس نے مزید لینے سے انکار کر دیا۔ کچھ دیر بعد کیرن نے آخری لکیر بھی استعمال کر لی۔ لونی اور باربرا پتا نہیں کہاں تھیں؟

کیرن اور وین کچھ دیر اندر رہے۔ وین نے بیئر لی تھی لیکن کیرن نے اسکاچ لی۔ دو گھنٹے بعد اس نے وین سے کہا۔ ”باہر چلو...“

وین کو مزہ آ رہا تھا اس نے پوچھا۔ ”کیوں...؟ ابھی رکو۔“

”ایک کام ہے۔“

وہ باہر آئے اور ایک سڑک پر چلنے لگے۔ یہاں دونوں طرف عالی شان مکانات تھے اور سڑکوں پر لائن سے مہنگی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کیرن نے چلتے چلتے اچانک ایک گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ لاک تھا، کیرن اگلی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ وین بوکھلا گیا وہ کیرن کے پیچھے لپکا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”دیکھ رہی ہوں کوئی کار کھلی ملے تو کچھ ہاتھ آئے؟“

”کیا مطلب؟“

کیرن نے ایک گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا اس نے اندر گھس کر کلوزٹ چیک کیا پھر بن بلاک ہٹایا تو ایک پرس نیچے گرا۔ اس میں گاڑی کے کاغذات تھے ساتھ ہی کچھ رقم بھی تھی۔ کیرن نے وہ رقم نکال کر پرس واپس رکھ دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے وین کو نوٹ دکھائے۔ ”یہ مطلب!“

”یہ چوری ہے؟“ وین نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

”بے وقوف یہ ہم چندہ لے رہے ہیں۔“ کیرن نے کہا۔ ”تم جانتے ہو جو کوکین میں نے لی تھی اس کی کیا قیمت ادا کی تھی، پورے سو ڈالرز۔ کیا تم سو ڈالرز لا سکتے ہو؟“

وین نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرے پاپا اچھا کماتے ہیں لیکن مجھے کبھی اتنا جیب خرچ نہیں ملتا مجھے پورے ہفتے کے لیے سو ڈالرز ملتے ہیں۔“

”میرے ڈیڈی اتنا بھی نہیں دیتے۔“ کیرن بولی۔ ”لونی اور باربرا بھی ہماری طرح ہیں۔ ہمارے خرچے بہت ہیں، اس طرح پارٹیوں میں آنا، پھر اچھی ڈریسنگ کرنا اور نائٹ کلبس جانا ان سب کے لیے بڑی رقم





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمیں یہ سب کرنا پڑتا ہے۔"

"وہ بھی...... اور تم لوگ اس سے پہلے بھی یہ سب کرتے رہے ہو؟"

"بالکل، ہم ان کاموں کے لیے اسی طرح تو رقم حاصل کرتے ہیں۔"

وین کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ یہ تینوں معصوم اور کمسن لڑکیاں جرم کرکے رقم حاصل کرتی تھیں اور اس رقم کو وہ منشیات اور تفریحات میں خرچ کرتی تھیں۔ کیرن نے اسی پر بس نہیں کیا تھا وہ آگے بھی گاڑیوں کو چیک کرتی رہی۔ اس نے وین سے کہا۔ "تم دوسری طرف سے چیک کرتے رہو بعض اوقات فرنٹ سیٹ کا دروازہ ان لاک رہ جاتا ہے۔"

وین غیر ارادی طور پر اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگا۔ وہ باری باری کاروں کے دروازے کھول کر دیکھ رہا تھا ایک سیاہ مرسیڈیز کا دروازہ کھلا ہوا ملا اور اس سے انہیں ایک جدید قسم کا ٹیب اور ایک لیڈیز پرس ملا تھا۔ کچھ دیر بعد کیرن کو ایک کامیابی اور ملی اور اس بار ملنے والی رقم اچھی خاصی تھی، یہ سو ڈالرز کے سات اور پچاس اور بیس ڈالرز کے چھوٹے نوٹوں پر مشتمل ہزار ڈالرز سے زیادہ کی رقم تھی۔

اس نے خوش ہو کر وین کو گلے لگا لیا۔ "اب مزہ آئے گا۔"

وین کو اس کے گلے لگ کر ہی مزہ آ گیا تھا مگر اس نے پوچھا۔ "کس طرح سے مزہ آئے گا؟"

"کل ہم شاپنگ پر چلیں گے۔ مجھے ایک اچھا سن گلاس اور ایک ہینڈ بیگ چاہیے۔"

اگلے دن وہ ایک مہنگے سپر اسٹور میں گئے جہاں کیرن نے اپنے لیے ڈھائی سو ڈالرز مالیت کا ایک سن گلاس اور ساڑھے تین سو ڈالرز کا ہینڈ بیگ لیا تھا۔ پھر اس نے دو سو ڈالرز کی ایک سینڈل لی۔ باقی رقم سے اس نے وین کے لیے ایک ٹراؤزر اور ٹی شرٹ سوٹ لیا۔ وین خوش ہو گیا تھا اس کے پاس اچھے کپڑے تھے لیکن یہ جدید ترین فیشن اور ڈیزائن کے تھے۔ کیرن سے اس کی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اب اس سے گھر ملنے آتی تھی۔ جون اور ایمی خوش تھے کہ ان کے بیٹے نے سوشل سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ایک دن وہ اور کیرن انٹرنیٹ پر جدید فیشن کی چیزیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں ملبوسات، جوتے، بیگز، گلاسز اور اسی طرح کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ سپر ماڈلز اور سیلی برٹیز ان چیزوں کے لیے ایڈورٹائزنگ کرتی ہیں۔ کیرن نے حسرت سے کہا۔

"یہ ہزاروں ڈالرز والی چیزیں استعمال کرتی ہیں، ہمیں سیکڑوں ڈالرز والی بھی نہیں ملتی ہیں۔"

وین کو حیرت ہوئی۔ "ہزاروں ڈالرز والی چیزیں...؟"

"ہاں یہ دیکھو، کرسٹی روز نے یہ جو جوتے پہن رکھے ہیں ان کی قیمت ساڑھے تین ہزار ڈالرز ہے اور اس کے پاس ایسے درجنوں جوتے ہیں۔ سپر ماڈل ماپیلا کے وارڈ روب میں سیکڑوں قیمتی ملبوسات ہیں۔"

کیرن اسے سائٹس کھول کر دکھانے لگی جس میں ہالی ووڈ کی سیلی برٹیز کے گھروں میں ان کے وارڈ روب اور استعمال کی دوسری چیزوں کا ذخیرہ دکھایا گیا تھا۔ یہ چیزیں ایسی اور اتنی تعداد میں تھیں کہ عام آدمی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا جیسے مشہور اداکار جیسن برگ کے پاس درجنوں ڈائمنڈز رولیکس گھڑیاں تھیں اور ان میں سے اکثر خاص طور سے اسی کے لیے ڈیزائن کی گئی تھیں۔ لونی اور باربرا آگئیں اور وہ بھی ان کے مشغلے میں شامل ہو گئیں۔ وہ چاروں کمسن تھے اور ان کے اندر خواہشات بہت زیادہ تھیں۔ وہ چاروں ہائی اسکول کے آخری گریڈ کے طالب علم تھے اور ان کے گھر والے چاہتے تھے کہ وہ اچھی تعلیم حاصل کر کے اپنا کیریئر بنائیں۔

لونی نے حسرت سے کہا۔ "کاش کہ ہم یہ سب حاصل کر سکیں۔ مجھے اچھے کپڑے چاہئیں۔"

کیرن نے کہا۔ "میں اچھی مہنگی کار ڈرائیو کرنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے مہنگے جوتے اچھے لگتے ہیں۔" باربرا بولی۔

"ہم کر سکتے ہیں۔" وین نے اچانک کہا، وہ تینوں حیران ہو گئیں۔

"وہ کیسے؟" کیرن نے پوچھا۔

وین نے لیپ ٹاپ اسکرین پر نظر آنے والی تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ "ان سیلی برٹیز کے گھر سے۔"

"مطلب؟" لونی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، سمجھ میں تو کیرن اور باربرا کے بھی نہیں آیا تھا۔

"دیکھو، اکثر سیلی برٹیز اکیلے رہتے ہیں۔ ان کے گھر پر کوئی ملازم بھی نہیں ہوتا جیسا کہ ہم نے نیٹ پر دیکھا ہے۔ شوٹنگ اور تقریبات میں شرکت کے لیے یہ گھر سے باہر زیادہ رہتے ہیں اور گھر میں کم ہوتے ہیں۔ جب یہ گھر سے باہر ہوں تو ہم ان کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

کیرن پُرجوش ہو گئی۔ "زبردست آئیڈیا ہے۔"

لونی نے اسے گھورا۔ "یہ کیسے پتا چلے گا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔"

''نیٹ سے۔'' وین نے کہا۔''اس پر ان کی تمام سرگرمیوں کی اپ ڈیٹ رہتی ہے۔''

''ہم آج ہی کوشش کرتے ہیں دیکھو کون اس وقت گھر پر نہیں ہے۔'' کیرن نے کہا تو وین نے تلاش کیا اور جلد انہیں معلوم ہو گیا کہ اداکارہ اور گلوکارہ جولیا فلاور گھر پر نہیں ہے، وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے لاس ویگاس گئی ہوئی تھی۔ اس کا گھر بیورلی ہلز پر تھا۔ وین نے گوگل ارتھ کی مدد سے اس کے گھر کی لوکیشن نکالی اور پھر تھری ڈی گوگل کی مدد سے اس کے گھر کا چاروں طرف سے معائنہ کیا تھا۔ ذرا دیر میں وہ ساری لوکیشن سمجھ گئے تھے۔ باربرا جوش سے بولی۔

''یہ تو بہت آسان ہے۔''

''ہاں، لیکن انٹرنیٹ سے ہم گھر میں نہیں گھس سکتے۔'' لونی بولی۔''اس کے لیے ہمیں وہاں جانا ہوگا۔''

''ہم آج ہی جائیں گے۔'' کیرن فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

رات نو بجے وین خاموشی سے گھر سے نکل آیا۔ اس نے سیل فون اور اپنا پرس گھر میں چھوڑ دیا تھا۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ کوئی شناخت والی چیز ساتھ نہیں رکھنی ہے۔ ویسے بھی اب وہ بڑا ہو گیا تھا اس لیے اس کے گھر سے دیر تک باہر رہنے کے لیے ماں باپ کو بتا کر جانا ضروری نہیں تھا۔ وہ چاروں بیورلی ہلز کے پاس ایک پارک میں جمع ہوئے اور وہاں سے پیدل اوپر پہنچے۔ جولیا کا خوب صورت مکان ایک پہاڑی کے کنارے پر تھا جہاں سے شہر کا نظارہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ مکان کئی سطحوں پر تھا وہ سامنے والے حصے سے اندر داخل ہوئے مگر فرنٹ ڈور بند تھا۔ اس لیے انہوں نے عقب میں سوئمنگ پول کے ساتھ شیشے کے سرکنے والے دروازں پر طبع آزمائی کی۔ پہلا دروازہ بند تھا۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ کوئی شیشہ نہیں توڑنا ہے ورنہ لازی الارم بجے گا۔ وہ کسی کھلے راستے سے فائدہ اٹھانے کا سوچ کر آئے تھے۔ آخر کار انہیں ایک کھڑکی کھلی مل گئی اور وہ اس کے راستے اندر داخل ہوئے۔

وہ اندر آئے تو ان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ مکان اندر سے کسی سیٹ کی طرح سجا ہوا تھا، سفید براق فرش شیشے کی طرح چمک رہا تھا اور وہاں جدید ترین دھات اور کرسٹل کا بنا ہوا فرنیچر اور دوسرا سامان تھا۔ وہ خوش تھے۔ کیرن نے کہا۔''کیا خیال ہے آج رات یہیں نہ رہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' وین بولا۔''بس اپنا کام کرو اور جلد از جلد نکلو یہاں سے۔''

''کام کی ساری چیزیں اس کے بیڈ روم یا وارڈ روب میں ملیں گی۔'' باربرا نے کہا۔ وہ اطمینان سے پورے گھر کا معائنہ کر رہے تھے اور وین مضطرب تھا حالانکہ یہ اسی کا منصوبہ تھا۔ مگر وہ اب پریشان ہو گیا تھا، اسے خیال آ رہا تھا کہ اگر پولیس آ گئی یا کسی وجہ سے وہ پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟

نچلے حصے میں جا بہ جا بہت قیمتی شوپیس اور تصاویر تھیں لیکن یہ سب ان کے لیے بیکار تھیں۔ اس لیے بالآخر انہوں نے اوپر کا رخ کیا۔ یہاں بیڈ رومز تھے اور جولیا کی ذاتی سٹنگ تھی۔ اس نے اپنے لیے دو بیڈ رومز مخصوص کیے تھے اور یہاں اس کے استعمال کی ہر چیز بے انتہا قیمتی تھی۔ وارڈ روب خود ہال تھا جہاں بلاشبہ سیکڑوں کی تعداد میں سوٹ موجود تھے اس سے متصل جوتوں کا کمرا تھا جس پر شاپس ریک کی طرح لاتعداد جوتے سجے ہوئے تھے۔ میک اپ اور جیولری کے لیے الگ سے کمرا تھا۔ وین حیران تھا کہ ایک فرد واحد کے ذاتی استعمال کے لیے اتنی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لڑکیاں ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ اس وقت وہ بھول گئی تھیں کہ وہ کہاں تھیں اور کس لیے آئی تھیں۔ پھر وین کو ہوش آیا۔

''پلیز، تم لوگ جلدی کرو...'' اس نے کہا اور خود کلوزٹس کی تلاشی لینے لگا لیکن رقم اسے بستر کے نیچے رکھے ایک ڈبے سے ملی یہ سو ڈالرز کے نوٹوں کا ایک بنڈل تھا جو ربر بینڈ سے بندھا تھا، اس ڈبے میں کئی قیمتی زیور تھے لیکن وین نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ طے کر کے آئے تھے کہ جس کے ہاتھ جو لگے گا وہ اس کا ہوگا۔ کچھ رقم لونی کو ڈریسنگ ٹیبل کی ایک دراز سے ملی تھی۔ پھر انہوں نے جلدی جلدی کپڑے، جوتے، پرس، جیولری، پرفیومز اور میک اپ کی چیزیں سمیٹیں اور وہاں سے نکل آئے۔ نقد ساڑھے چار ہزار ڈالرز ہاتھ آئے تھے۔ اس سے اگلے دن ہی وین نے دل کھول کر شاپنگ کی۔ اس نے کپڑے، جوتے اور سن گلاسز لیے۔ کیونکہ جولیا کے گھر سے صرف لڑکیوں کی چیزیں ملی تھیں۔ پھر وہ رات ایک مہنگے نائٹ کلب میں گئے تھے۔ صرف دو دن میں انہوں نے ساری رقم اڑا دی۔ لڑکیوں نے کپڑے اور جوتے پہن کر اپنا شوق پورا کر لیا تو انہوں نے یہ فٹ پاتھ پر پرانے کپڑے اور جوتے بیچنے والوں کو فروخت کر دیے تھے۔ اگرچہ انہیں بس چند سو ڈالرز ملے تھے، ان کپڑوں کے عوض جو یقیناً جولیا کو دسیوں ہزار ڈالرز میں پڑے تھے لیکن انہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا ان کے لیے یہ مال مفت تھا۔

اس کے بعد وہ زیادہ پُراعتماد ہو کر یہ کام کرنے لگے تھے۔ وہ انٹرنیٹ پر سیلی بریٹیز کی سرگرمیاں تلاش کرتے اور جب انہیں پتا چلتا کہ فلاں شخص گھر میں نہیں ہے تو وہ اس کے گھر پہنچ جاتے تھے۔ گھر تلاش کرنا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اگر گھر میں کہیں کیمرے لگے ہوتے تو وہ انہیں اسپرے پینٹ مار کر ناکارہ کر دیتے تھے۔ وہ کوئی شیشہ یا لاک نہیں توڑتے تھے اس لیے الارم سے بھی محفوظ رہتے تھے اور واپسی میں عموماً کوئی کار چوری کر کے بیورلی ہلز سے نکل آتے تھے ورنہ ڈھیر سارے سامان کے ساتھ پولیس مشکوک سمجھ کر انہیں روک لیتی تو ان کے پاس پولیس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ فائنل ٹرمز میں ابھی چھ مہینے باقی تھے۔ وین کا ان چکروں میں پڑنے سے پہلے ارادہ تھا کہ وہ اتنے نمبر حاصل کر لے کہ اسے کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں داخلہ مل جائے، وہ نینو ٹیکنالوجی میں داخلہ چاہتا تھا۔ مگر وہ جن چکروں میں پڑ گیا تھا ایسا لگ رہا تھا وہ اسے کہیں اور ہی داخلہ دلاتے۔

☆☆☆

پہلی بار انہوں نے کسی مرد سیلی برٹی کا گھر منتخب کیا تھا۔ جیڈ کیرٹن فلموں اور ٹی وی سیریز میں سخت جان ہیرو یا ولن کے کردار نبھاتا تھا اور اپنے حلقہ شائقین میں خاصا مقبول تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور مضبوط جسامت کا حامل تھا۔ بیورلی ہلز کے ایک کونے میں اس کا دو منزلہ راک پیلس الگ تھلگ تھا۔ سفید رنگ کی پتھروں سے بنی اس عمارت میں خوب صورتی سے زیادہ مضبوطی کا خیال رکھا گیا تھا۔ اس کے دروازے بہت مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے اور کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ اندر داخلے کا ایک ہی راستہ تھا۔ اس بار لونی اپنی چھوٹی بہن کونی کو ساتھ لائی تھی۔ وہ صرف بارہ سال کی تھی لیکن جسامت میں نو سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وین اور کیرن فکرمند تھے کیونکہ وہ بچی تھی اور ڈر تھا کہ کسی کو بتا نہ دے مگر لونی نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سے بھی زیادہ پکی ہے۔ اپنی زبان بند رکھے گی۔

مکان کے فرنٹ ڈور میں نیچے ایک چھوٹا سا کھلنے والا تختہ تھا۔ جیڈ کے پاس ایک خوب صورت اور چھوٹا سا کتا تھا۔ یہ کھلنے والا تختہ اسی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کونی اس راستے سے کسی قدر مشکل سے لیکن اندر داخل ہوگئی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ رات نو بجے مکان میں داخل ہوئے تھے۔ جیڈ کے بارے میں خبر تھی کہ وہ شوٹنگ کے لیے لاس اینجلس سے کچھ دور ایک صحرا میں گیا ہوا تھا جہاں ویسٹرن مووی کی شوٹنگ چل رہی تھی۔ اس کا کم سے کم دو دن تک واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ اندر آئے۔ یہاں تاریکی تھی اور کہیں کہیں ہلکی سی روشنی تھی۔ فرنیچر بھی گہرے رنگوں کا اور پرانے انداز کا تھا، دیواروں پر ساگوان اسٹائل کے پینل لگے تھے اور یہ بھی تاریک تاثر دے رہے تھے وہ اب تک جتنے گھروں میں گئے تھے یہ سب سے الگ اور کچھ پراسرار لگ رہا تھا۔ کیرن نے سرگوشی میں وین سے کہا۔

''یہاں کچھ الگ سا محسوس نہیں ہو رہا ہے؟''

''ہاں شاید، اس لیے کہ روشنی کم ہے۔'' وین نے کہا ''خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

## اخبار میں

دو چوروں نے چوری کی۔
ایک نے کہا۔''یار پیسے گن لیتے ہیں۔''
دوسرا بولا۔''بے وقوف وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ کل اخبار میں دیکھ لیں گے۔''

## سوال و جواب

ایک کریانہ فروش اپنے نالائق بیٹے کو سمجھا رہا تھا۔
''ارے نالائق۔ نپولین جب تمہاری عمر کا تھا تو فوجی جرنیل تھا اور تو ابھی تک میٹرک ہی پاس نہیں کر سکا۔''
بیٹے نے جواب دیا۔''ابا نپولین جب آپ کی عمر کا تھا تو بادشاہ تھا اور آپ ابھی تک لوبیا بیچ رہے ہیں۔''

## ذرا توجہ ادھر بھی

☆ بیوی میں اداکاری کی صلاحیتیں کب اجاگر ہوتی ہے؟
○ جب شوہر کو تنخواہ ملتی ہے۔
☆ کیا شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی پی سکتے ہیں؟
○ بالکل بشرطیکہ بکری شیر کے پیٹ میں ہو۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچانک ایک تاریک گوشے سے کتا بھونکا تو لڑکیوں کی چیخ نکل گئی اور ایک لمحے کو وہ سب اچھل پڑے۔ یہ چھوٹا سا سفید بالوں والا کتا بھونکتا ہوا نمودار ہوا اور دوستانہ انداز میں دم ہلانے لگا۔ کیرن نے بے ساختہ اسے اٹھالیا۔ ”اف، کتنا پیارا ہے یہ۔“

گونی نے کتے کو گود میں لے لیا۔ اسے وہ زیادہ ہی اچھا لگا تھا۔ کچھ دیر میں سب پرسکون ہوئے تو انہیں خیال آیا۔ کیرن نے کہا۔ ”چلو کام شروع کرو، یہ پیلس بہت بڑا ہے۔“

راک پیلس کی مستطیل عمارت تقریباً سو فٹ لمبی اور تقریباً ستر فٹ سے زیادہ چوڑی تھی۔ اس کی دو منزلیں تھیں اور سب سے اوپر وسط میں وہائٹ ہاؤس جیسا ایک گول گنبد جیسا بنا ہوا تھا۔ یقیناً اس میں بہت سارے کمرے تھے کیونکہ عمارت خاصے بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ درمیانی عمارت کے مرکزی ہال میں داخل ہوئے تھے اس میں دائیں بائیں سے دو سیڑھیاں بیک وقت اوپر جا رہی تھیں وین نے ان تینوں سے کہا۔ ”تم تینوں اوپر جاؤ، میں گونی کے ساتھ نیچے کا دیکھتا ہوں۔“

”نیچے کیا ہوگا؟“

”یہ مرد کا گھر ہے اور وہ پورا گھر استعمال کرتا ہے۔“ وین نے اندازے سے کہا۔ ”تم اوپر جاؤ اور پلیز جو کرنا جلد کرنے کی کوشش کرنا درست کرنا ٹھیک ہے؟“

کیرن نے شانے اچکائے اور وہ تینوں اوپر کی طرف بڑھ گئیں۔ وین نے کتے کو گود میں تھامے ہوئے گونی سے کہا۔ ”تم یہیں رکو گی یا میرے ساتھ رہو گی؟“

گونی نے جھرجھری لی۔ ”میں تمہارے ساتھ رہوں گی، مجھے اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگے گا۔“

وین نے اسے ساتھ لیا اور پہلے دائیں حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں بڑی سی راہداری تھی جس میں جا بجا میزوں پر شوپیس رکھے تھے، دیواروں پر پینٹنگز تھیں اور کہیں کہیں چھوٹے صوفے موجود تھے۔ دائیں بائیں کمرے تھے۔ وین انہیں کھول کھول کر دیکھتا رہا، ان میں سے بیشتر لاک تھے۔ جو چند ایک کھلے تھے ان میں کچھ خاص نہیں تھا۔ ایک اسٹڈی تھی اور ایک شاید گیسٹ روم تھا باقی سب کمرے بند تھے۔ وین نے گیسٹ روم اور اسٹڈی میں جھانکا۔ اسے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ وین واپس آیا پھر اس نے بائیں طرف کا حصہ دیکھا۔ یہاں کچن، ڈائننگ ہال، ایک چھوٹا لیونگ روم اور چند کمرے تھے۔ کمرے سارے بند تھے۔ وین نے فریج کھولا اور اس میں موجود اعلیٰ درجے کی اٹالین چاکلیٹ کا ڈبا نکال کر گونی کو تھما دیا۔ ”لو عیش کرو۔“

وہ خوش ہو گئی تھی۔ اپنے لیے وین نے برانڈی کی چھوٹی بوتل نکالی لیکن اس سے پہلے وہ وہسکی کی کھلی بوتل سے چند گھونٹ لینا نہیں بھولا تھا۔ ان چند مہینوں میں وہ بہت تیزی سے شراب، کوکین اور سگریٹ کا عادی ہو گیا تھا۔ اس نے بوتل کھولی اور اس سے گھونٹ لیتا ہوا درمیانی ہال کی طرف آیا، نیچے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔ گونی نے چاکلیٹ کا ڈبا اور کتے کو سنبھالا ہوا تھا اور وہ خود کھانے کے ساتھ ساتھ کتے کو بھی کھلا رہی تھی۔ وہ ہال کے صوفے پر بیٹھ گئی اچانک کتا اچھل کر فرش پر آیا اور بھونکتا ہوا عمارت کے دائیں حصے کی طرف بھاگا۔ گونی چلائی۔ ”اسے روکو...“

”تم یہیں بیٹھو۔“ وین نے کہا۔ ”میں اسے لے کر آتا ہوں۔“

وین کتے کے پیچھے آیا وہ راہداری میں بھاگتا ہوا اسٹڈی کے سامنے پہنچ کر رک گیا اور دروازے کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ وین نے اسے چمکارتے ہوئے اٹھایا اور واپسی کے لیے پلٹ رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا، کتا یہاں کیوں آیا تھا؟ اور وہ کس پر بھونک رہا تھا؟ کیا اس نے کسی کی موجودگی محسوس کی تھی؟ لیکن چند منٹ پہلے اس نے اسٹڈی میں جھانکا تھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کتے کو سہلاتے ہوئے وہ اندر کی سن گن لینے لگا۔ پھر اس نے ہمت کر کے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ مگر اس بار بھی اسے کوئی نظر نہیں آیا اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ اندر میز کا لیمپ روشن تھا اور اس کی روشنی کمرے کے ہر گوشے تک پہنچ رہی تھی۔ اگرچہ یہ مدہم تھی مگر سب نظر آ رہا تھا۔ وین اندر جھانکتا رہا پھر اس نے دروازہ بند کرنا چاہا تھا کہ اندر سے ہلکی سی کراہ سنائی دی اور آواز نسوانی لگ رہی تھی۔

وین کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ آواز واضح تھی مگر یہ پتا نہیں چلا تھا کہ کمرے کے کس حصے سے آئی تھی۔ وین نے کتے کو نیچے چھوڑا تو وہ بھونکتا ہوا میز کی طرف دوڑا اور اس کے عقب میں چلا گیا۔ وہ بھونکے جا رہا تھا۔ وین محتاط قدموں سے اندر آیا اور اس نے ہچکچاتے ہوئے میز کے عقب میں جھانکا۔ کتا نیچے کسی چیز پر بھونک رہا تھا۔ وین نے جھک کر دیکھا اور پھر جھٹکے سے پیچھے گیا۔ میز کے نیچے خلا میں ایک عورت مڑی تڑی گھسی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس کا پورا جسم زخموں اور



ان سے بہنے والے خون سے ڈھکا ہوا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ اور پاؤں رسی سے نہ بھی بندھے ہوتے تب بھی وہ میز کے نیچے اس خلا میں اس طرح گھسائی گئی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی تھی اور لازماً اسے یہاں پھنسایا گیا تھا۔ چھوٹی سی جگہ میں وہ تڑمڑ کر ہی آئی ہوگی۔ اس کے سوجے اور نیلے چہرے پر بھی نشان ہی نشان تھے اور ایک آنکھ تو بالکل بند تھی۔

”کک... کون ہو تم؟“ وین نے ہکلا کر پوچھا مگر عورت نے کوئی جواب نہیں دیا وہ شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔ وہ بے ہوشی میں کراہ رہی تھی۔ وین جلدی سے کتا اٹھا کر وہاں سے نکلا اور بھاگتا ہوا ہال میں آیا۔ اس نے چاکلیٹ کھاتی گونی کو کتا تھمایا اور بولا۔ ”اسے پکڑ کر رکھنا، میں ابھی آتا ہوں۔“

وین بھاگتا ہوا اوپر آیا۔ وہ دبی آواز میں کیرن، لونی اور باربرا کو پکارتا ہوا انہیں تلاش کر رہا تھا۔ پھر ان کی ہنسی نے وین کی رہنمائی کی اور وہ ان تک جا پہنچا۔ وہ ایک کمرے میں جمع ہو کر نسوانی ملبوسات پہن کر دیکھ رہی تھیں۔ وین نے بدحواسی میں ہانپتے ہوئے کہا۔ ”جلدی... نکلو یہاں سے۔“

کیرن نے غور سے اسے دیکھا۔ ”ایک منٹ، کیا ہوا ہے؟“

وین نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”نیچے اسٹڈی میں ایک عورت زخمی حالت میں پڑی ہے۔ پلیز یہاں سے نکلو۔“

زخمی عورت کا سن کر وہ تینوں بھی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے اب تک جو چیزیں چنی تھیں وہ سمیٹیں اور وین کے ساتھ نیچے روانہ ہو گئیں۔ وہ نیچے آئے تو وین نے گونی سے کہا۔ ”چلو اٹھو اور کتے کو یہیں چھوڑ دو۔“

”ایک منٹ۔“ کیرن بولی۔ ”یہاں صرف وہی عورت ہے؟“

”ہاں اور وہ بھی بندھی ہوئی ہے۔“

”تب ہم پہلے اسے دیکھیں گے۔“ کیرن نے فیصلہ کیا۔ ”ممکن ہے اسے طبی مدد کی ضرورت ہو۔“

وین متفق نہیں تھا لیکن ان سب میں کیرن باس تھی اور اسی کا فیصلہ چلتا تھا۔ لونی بھی فوراً نکلنے کے حق میں تھی البتہ باربرا اس عورت کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسٹڈی میں آئے۔ زخمی عورت کو دیکھ کر لڑکیوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ لونی ہکلا کر بولی۔ ”یہ... یہ تو بہت زخمی ہے۔“

وین نے مخمل لیمپ اٹھا کر عورت پر روشنی ڈالی۔ اس بار وہ کہیں واضح نظر آئی اور اس کی حالت دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے پورے جسم پر جگہ جگہ چاقو یا کسی تیز دھار آلے سے کٹ لگے تھے۔ البتہ اس کے زخم خاصے پرانے تھے ان سے خون رسنا بھی بند ہو گیا تھا۔ باربرا نے کہا۔ ”ہمیں ایمرجنسی کو کال کرنی چاہیے۔“

”ہرگز نہیں۔“ لونی نے مخالفت کی۔ ”اس طرح تو ہم خود پھنس جائیں گے۔“

”اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہ عورت مر جائے گی۔“ کیرن نے باربرا کی تائید کی۔

”یہاں فون ہے۔“ وین بولا۔ اس نے کئی جگہوں پر فون سیٹ دیکھے تھے۔ ”ہم نکلتے وقت پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔“

”نہیں اگر پولیس جلدی آ گئی تو ہم بھی پھنس سکتے ہیں۔“ لونی نے پھر کہا۔ ”پلیز یہاں سے نکلو ایسا نہ ہو کوئی اور آ جائے۔“

”اور کون...“ باربرا نے پوچھا۔

”جس نے اس عورت کا یہ حال کیا ہے۔“

اس وقت ان کے ذہن میں آیا کہ کسی نے تو اس عورت پر یہ انسانیت سوز تشدد کیا ہوگا؟ وہ شخص کون تھا اور کہاں تھا؟ وین کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ”لونی ٹھیک کہہ رہی ہے ہمیں فوراً سے پیشتر یہاں سے نکل جانا چاہیے اور ہم راستے میں کسی فون بوتھ سے پولیس کو کال کر سکتے ہیں۔“

کیرن قریب سے عورت کا معائنہ کر رہی تھی۔ ”یہ مجھے جانی پہچانی لگ رہی ہے۔“

”ٹھیک کہا تم نے...“ باربرا نے تائید کی۔ ”اوہ میرے خدا، میں نے اسے پہچان لیا... یہ رابین مشل ہے... یہ بھی ماڈل ہے اور جیڈ کی گرل فرینڈ ہے۔“

وہ سب بھی اسے پہچان گئے تھے۔ کیرن نے ہمت کر کے گردن پر اس کی نبض دیکھی اور تشویش سے بولی۔ ”اس کی نبض کی رفتار بہت سست ہے۔ یہ مرنے والی ہے، اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”اسے یہاں سے تو نکالو۔ کیسے بے دردی سے پھنسا رکھا ہے اسے یہاں۔“

لونی اور باربرا اسے ہاتھ لگانے کو تیار نہیں تھیں، وین اور کیرن نے بہ مشکل اسے میز کے خلا سے نکالا اور قالین پر لٹا دیا۔ میز کے نیچے قالین پر اس کا خون جما ہوا تھا۔ رابین نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا تھا۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے وہ اس کا جسم ڈھک سکتے۔ کیرن بولی۔ ”یہ کم سے کم ایک دن سے اس حالت میں ہے۔“



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

وین کو حیرت ہوئی کہ اتنی دیر وہ ان زخموں کے ساتھ زندہ کیسے رہی۔ اس نے رومال سے پکڑ کر اسٹڈی کے فون کا ریسیور اٹھایا، اس سے ٹون آ رہی تھی لیکن جب اس نے کال کرنے کی کوشش کی تو ریکارڈ شدہ آواز آئی۔

''پلیز ان لاک ٹو ایکسس۔''

''یہ بند ہے۔'' وین نے انہیں مطلع کیا کیرن نے اس سے ریسیور لے کر سُنا اور بولی۔

''یہ مرکزی سسٹم سے منسلک ہے اور جیڈ نے اس پر لاک کیا ہوا ہے جب تک وہ لاک نہیں کھلے گا یہاں سے کال نہیں کی جا سکتی۔''

''خدا کے لیے۔'' لونی رونے والی ہو رہی تھی۔ ''یہ تم لوگ کن چکروں میں لگ گئے ہو، یہاں سے نکلو اور باہر کہیں سے پولیس کو کال کرو۔ اگر کوئی آ گیا تو ہم کہیں بڑے معاملے میں پھنس جائیں گے۔''

اس بار سب متفق ہو گئے۔ وہ جلدی سے اسٹڈی سے باہر آئے۔ گونی بہ دستور کتے کے ساتھ چاکلیٹ کھانے میں مگن تھی اس نے کسی عورت کی یہاں موجودگی کی اطلاع کا نوٹس بھی نہیں لیا تھا۔ لونی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ''چلو یہاں سے۔''

لونی نے چاکلیٹ کا ڈبا پکڑا ہوا تھا البتہ اسے کتے کو چھوڑنا پڑا اور وہ بھونکتا ہوا ان کے پیچھے آیا۔ لونی نے اپنی بہن سے پوچھا۔ ''کیا میں اسے لے جا سکتی ہوں؟''

''ہرگز نہیں، یہ کسی اور کا کتا ہے۔''

وہ دروازے تک آئے لیکن جیسے ہی وین نے دروازہ کھولا سامنے پورچ میں روشنی لہرائی اور اس نے پھرتی سے دروازہ بند کر دیا۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو آنے والا کھلا دروازہ دیکھ لیتا۔ کیرن نے کھڑکی سے جھانکا اور گھبرا کر بولی۔ ''میرے خدا، یہ تو جیڈ ہے۔ وہ گاڑی سے اتر رہا ہے۔''

''اب کیا ہو گا؟'' لونی پھر رونے والی ہو گئی۔ ''میں کہہ رہی تھی نا کہ یہاں سے چلو۔''

''ہاں، تمہیں پہلے پتا چل گیا تھا کہ کوئی یہاں آنے والا ہے۔'' باربرا نے طنز کیا۔

''پلیز آپس میں لڑو نہیں۔'' وین نے کہا۔ ''یہاں سے ہٹو۔''

وہ افراتفری میں پیچھے ہوئے اور پھر وہ دائیں طرف والی گیلری میں آ گئے۔ وین کو گیسٹ روم کا خیال آیا۔ وہ ان سب کو وہاں لے آیا۔ اس نے کہا۔ ''سب یہاں چپ کر کے بیٹھو جب جیڈ اوپر چلا جائے تو ہم خاموشی سے یہاں سے نکل جائیں گے۔''

''کتا...'' لونی نے نقطہ اٹھایا۔ ''اس کا کیا کریں؟ اسے چھوڑتے ہیں تو یہ جیڈ کو ہمارے بارے میں بتا دے گا۔''

''زبان سے۔'' باربرا نے پھر طنز کیا۔

''خدا کے لیے۔'' لونی جھنجلا کر بولی۔ ''کتا اپنے مالک کو کیسے کچھ بتا سکتا ہے کیا تم نہیں جانتی ہو۔ اگر اسے باہر نکال دیا اور یہ دروازے پر کھڑا ہو کر بھونکنا شروع کر دے تو کیا جیڈ آ کر اس کمرے میں نہیں جھانکے گا؟''

''لونی ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' وین بولا۔ ''اس کتے کا کچھ کرنا ہو گا۔''

گیسٹ روم سے متصل ایک باتھ روم تھا۔ کیرن اور لونی نے گونی کو کتے سمیت وہاں بند کر دیا۔ گونی تیار نہیں تھی اس لیے اسے جیڈ کا خوف دلایا کہ وہ ظالم آدمی ہے اگر انہیں یہاں پکڑ لیا تو بہت برا کرے گا۔ وین نے کہا۔ ''اس کتے کو چپ کرانا ورنہ یہ بھونک کر اپنے مالک کو بتا دے گا کہ ہم کہاں ہیں۔''

اسی اثنا میں داخلی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ جیڈ اندر آ گیا تھا۔ پھر راہداری کے فرش پر اس کے قدموں کی آواز گونجنے لگی۔ وین نے سرگوشی میں کہا۔ ''وہ یہیں آ رہا ہے۔''

انہوں نے گیسٹ روم کا دروازہ اندر سے لاک کر لیا تھا، اب باہر سے اسے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ گیسٹ روم کا دروازہ پہلے تھا اور اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند لمحے کو قدموں کی آواز رکی اور ان سب کی سانس بھی رک گئی۔ دروازہ لاک تھا مگر جیڈ کے لیے مسئلہ نہیں تھا وہ چابی سے کھول کر بھی اندر آ سکتا تھا مگر پھر آواز آگے بڑھ گئی اور انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ کیرن نے وین کے کان میں کہا۔ ''رابین مشل کا حشر کرنے والا جیڈ ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔'' وین نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ ''ویسے بھی مشہور ہے وہ وحشی قسم کا آدمی ہے۔ لیکن ایسا سلوک...'' وین نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جھرجھری لی۔

''وہ مرنے والی ہے اور وہ مر گئی تو یہ قتل ہو گا۔'' کیرن نے خیال آرائی جاری رکھی۔

''خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔''

''ہمیں سوچنا چاہیے، اس صورت میں جیڈ قاتل ہو گا اور اگر ہم نے یہاں سے نکل کر پولیس کو اطلاع کر دی تو وہ پکڑا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے جیل چلا جائے گا، کیا وہ یہ چاہے گا؟''

وین نے غور کیا۔ ''ہرگز نہیں...''

''جب اسے خطرہ ہوا کہ کوئی اسے پکڑوا سکتا ہے تو وہ اس کے ساتھ کیا کرے گا؟''

جواب خاصا خوفناک تھا۔ وین نے تھوک نگل کر کہا۔ ''وہ اسے بھی قتل کر دے گا۔''

''ہم اسے پکڑوا سکتے ہیں اس لیے اگر وہ جان گیا کہ ہم یہاں ہیں تو وہ کسی صورت ہمیں جانے نہیں دے گا۔''

''وہ کیسے جان سکتا ہے۔'' لونی نے مداخلت کی۔

''ہم نے رابین کو میز کے نیچے سے نکال کر غلطی کی۔ وہ بندھی ہوئی تھی اور اس کی حالت بھی ایسی نہیں تھی، جیڈ اسے دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ کسی نے اسے یہاں سے نکالا ہے اور پھر وہ ہمیں تلاش کرے گا۔'' کیرن کی کھینچی تصویر خاصی ہولناک تھی۔

''تب ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' باربرا نے جلدی سے کہا۔ کیرن نے نفی میں سر ہلایا۔

''ابھی ہم باہر نہیں نکل سکتے... جب تک جیڈ اوپر نہیں چلا جاتا۔''

باہر سے جیڈ کی ہلکی سی آواز آئی وہ کسی روڈی کو پکار رہا تھا۔ یقیناً روڈی وہی چھوٹا کتا تھا جو گونی کے ساتھ واش روم میں بند تھا۔ اس نے اپنے مالک کی آواز سن لی تھی مگر کسی وجہ سے خاموش تھا بعد میں پتا چلا کہ گونی نے اس کا منہ دبایا ہوا تھا تاکہ وہ بھونک نہ سکے۔ وہ گھبرا گئے، لونی نے کہا۔ ''وہ کتے کی تلاش میں ہے۔''

''اب وہ لازمی یہاں آئے گا جب اسے کتا نہیں ملے گا۔'' باربرا بولی۔

''لیکن وہ پہلے اسے پورے گھر میں تلاش کرے گا جب تک وہ ہر جگہ نہیں دیکھ لے گا یہاں نہیں آئے گا کیونکہ اتنی عقل تو اس کے پاس بھی ہو گی کہ کتا بند دروازہ نہیں کھول سکتا۔''

''اسے پورا گھر دیکھنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی کیونکہ اکثر کمرے تو لاک ہیں۔'' وین نے کہا۔ ''نیچے بس یہی دو کمرے کھلے ہیں۔''

''اوپر بھی بیشتر کمرے لاک ہیں۔'' کیرن نے بتایا۔ ''صرف جیڈ کا بیڈ روم اور اس کے ساتھ والا کمرا کھلا تھا جہاں عورتوں کے کپڑے بھی تھے۔''

وین نے سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے تک آیا۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ جیڈ غالباً روڈی کو تلاش کرتا ہوا کچن والے حصے کی طرف گیا تھا۔ اس نے کیرن سے کہا۔ ''اب وہ اوپر جائے گا اور ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔''

کیرن اور باقی سب نے سر ہلایا۔ وین نے دروازہ کھولا اور لونی سے اس کا چھوٹا سا آئینہ لے کر اسے فرش کے ساتھ لگا کر باہر نکالا۔ اسے ہال کی طرف کا منظر دیکھنا تھا جیڈ جب بھی سیڑھیوں سے اوپر جاتا اسی حصے سے گزر کر جاتا۔ وہ آئینے میں نظر نہیں آیا تھا چند لمحے بعد وہ کچن والے حصے کی طرف سے نمودار ہوا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی وین کھڑا ہو گیا۔ ''بس نکلو یہاں سے۔''

''گونی... ''لونی نے یاد دلایا۔ ''میری بہن کو چھوڑے جا رہے ہو۔''

''کتا...'' اب کیرن کو بھی خیال آیا۔ ''وہ بھونک بھونک کر اپنے مالک کو اطلاع کر دے گا۔''

باربرا نے اس کا حل نکالا۔ اس نے اپنا موزہ اتارا اور روڈی کے منہ پر باندھ دیا۔ اب وہ بھونک نہیں سکتا تھا اور نہ ہی خود سے واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آ سکتا تھا۔ وہ سب لائن سے باہر نکلے، انہوں نے اپنے اپنے جوتے اتار لیے تھے تاکہ چلنے کی آواز نہ ہو اور دبے قدموں دوڑتے ہوئے دروازے تک آئے، وین نے بے تابی سے ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ نہیں کھلا اس نے ذرا زور آزمائی کی مگر دروازہ ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔ کیرن نے اسے روکا اور دروازے کے درمیان میں لگے قطار میں تین لاک کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا خیال ہے اس نے انہیں بند کر دیا ہے۔''

یہ حفاظتی لاک تھے جو اندر اور باہر دونوں طرف سے صرف چابی سے ہی کھلتے تھے۔ لونی کانپتی آواز میں بولی۔ ''ہم پھنس گئے ہیں، وہ جان گیا ہے ہم یہاں ہیں۔''

''لیکن وہ تو کتے کو تلاش کر رہا ہے۔'' کیرن نے یاد دلایا۔ ''اور کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں جب وہ گھر میں ہوتے ہیں تو اس طرح کے لاک لگاتے ہیں جنہیں صرف چابی سے کھولا جا سکتا ہے۔''

''ممکن ہے وہ اس طرح دھوکا دے رہا ہو۔'' وین نے کہا۔ ''کتے کے بہانے وہ ہمیں تلاش کر رہا ہو۔''

''اب یہاں سے کیسے نکلیں گے؟'' باربرا نے پوچھا۔

''تم بتاؤ نا... کیا صرف سوال کرنے آتے ہیں یا اعتراض۔'' اس بار لونی نے جوابی طنز کیا۔

''پلیز خاموش رہو۔'' کیرن نے کہا۔ ''وہ تم لوگوں





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی آوازیں سن کر ہی ہمیں تلاش کرے گا۔"

وین نے کہا۔"سنو، ہمیں الگ الگ ہو جانا چاہیے۔۔ تاکہ نکلنے کا راستہ تلاش کرسکیں۔ سب ایک جگہ ہوں گے تو پکڑے جانے کا امکان بھی زیادہ ہوسکتا ہے۔"

اچانک لوئی کو دروازے کے نیچے کتے والے خانے کا خیال آیا۔"کیا ہم اس سے نہیں نکل سکتے؟"

"صرف گونی اور روکی نکل سکتے ہیں۔" کیرن نے کہا۔

"ہم ان دونوں کو نکال دیتے ہیں گونی باہر جاکر پولیس کو کال کرسکتی ہے۔"

"اور جب پولیس ہمیں پکڑے گی تب ہم کیا وضاحت پیش کریں گے؟" گونی نے سوال کیا۔

"اس وقت کی اس وقت دیکھی جائے گی۔ ابھی تو جان پر بنی ہے۔" کیرن نے وین کی تائید کی۔"ہم تینوں الگ ہوجاتے ہیں۔ گونی وین کے ساتھ رہے گی۔"

"ہم کہاں جائیں؟" باربرا نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم لوگ کچن کی طرف جاؤ اور جب جیڈ اوپر سے آئے تو تم لوگ اس طرف کی سیڑھیوں سے اوپر چلی جانا۔" وین نے مشورہ دیا۔"گونی میرے ساتھ ہے میں روکی کو لے کر آتا ہوں ان دونوں کو باہر نکالنے کے لیے۔"

"میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔" گونی نے گھبرا کر کہا۔

"تمہیں ہمت کرنا ہوگی بے بی آؤ، میرے ساتھ۔"

وین نے اس کا ہاتھ تھاما اور راہداری میں آگیا۔ گیسٹ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئے۔ کتا باتھ روم میں تھا اور بند منہ کی وجہ سے بس ہلکی سی کوں کوں کی آوازیں ہی نکال پارہا تھا۔ وین نے شکر ادا کیا کہ جیڈ نے اپنے جیسا لمبا تڑنگا کتا نہیں پالا ہوا تھا ورنہ وہی ان کے لیے کافی ہوتا۔ اگر وہ ان سے مل بھی جاتا تب بھی اس کا منہ بند رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ وین نے گونی کو بیڈ پر بٹھایا اور بولا۔"گونی تم ایک بہادر اور ذہین بچی ہو۔۔۔"

"میری تعریفیں کرنے کے بجائے یہ بتاؤ کہ مجھے کرنا کیا ہے؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"اوکے گونی تم نے یہ کرنا ہے کہ روکی کو لے کر یہاں سے نکلنا اور باہر جاکر کسی بھی فون بوتھ سے پولیس کو کال کرنا۔ اس مکان کا ایڈریس سمجھ لو۔۔۔" وین نے پتا بتایا اور کئی بار بتایا تاکہ گونی کو ذہن نشین ہوجائے پھر کئی بار اس سے پوچھا۔ اس نے فرفر دہرا دیا۔"گڈ، اب تم تیار ہو لیکن باہر نکل کر ڈرائیو وے سے مت جانا بلکہ لان والی طرف سے پودوں کی آڑ لیتے ہوئے جانا اور باہر نکلتے ہی سر پر

پاؤں رکھ کر بھاگنا۔"

"میں سمجھ گئی۔"

وین نے اسے مزید پکا کرنے کے لیے کہا۔"دیکھو گونی تمہاری بہن اور ہم تینوں کی زندگی خطرے میں ہے یہاں ایک عورت ہے جو بہت زخمی ہے اور اسے جیڈ نے زخمی کرکے بے رحمی سے اسٹڈی کی میز کے نیچے ٹھونسا ہوا تھا۔ تم اندازہ کرسکتی ہو کہ یہ شخص کس قدر سفاک ہے۔ اس لیے باہر نکلتے ہی جلد از جلد مدد لانے کی کوشش کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس بات پر گونی سنجیدہ ہوگئی شاید اس لیے کہ اس کی بہن بھی ان لوگوں میں شامل تھی۔"میں ایسا ہی کروں گی۔"

"گڈ گرل۔" وین نے اس کا سر تھپکا۔ وہ واش روم میں آیا جہاں روکی دروازے سے لگا بیٹھا تھا۔ اس نے وین کو دیکھ کر مظلومانہ سی آواز نکالی، وین نے اسے گود میں اٹھا لیا۔"گڈ بوائے۔۔ بس کچھ دیر کی تکلیف اور ہے پھر تم اور تمہارا منہ آزاد ہوں گے۔"

وہ کتے کو باہر لایا اور گونی کے حوالے کر دیا۔ اس نے چاکلیٹ کا پیکٹ بھی سنبھال رکھا تھا وہ وین نے لے لیا۔"میں اسے سنبھال کر رکھوں گا اور بعد میں تمہیں مل جائے گا ابھی تو تم صرف اس کتے پر اور اس کام پر توجہ دو جو تمہارے ذمے لگایا ہے۔"

گونی نے منہ بنایا اور روکی کو پکڑ لیا۔"اب چلو۔"

"خیال رکھنا یہ آزاد نہ ہو ورنہ یہ واپس گھر میں آکر ہمارا راز فاش کردے گا۔"

"میں اسے زیادہ دیر نہیں اٹھا سکتی۔" گونی نے شکایت کی۔"یہ ہلکا ہے لیکن میں بھی بچی ہوں۔"

وین نے اس کی شکایت پر غور کیا۔"اوکے، تم اسے کسی ایسی جگہ چھوڑ دینا یا باندھ دینا جہاں سے یہ واپس نہ آسکے۔"

وین نے احتیاط کے پیش نظر دروازہ کھول کر پہلے آئینے سے باہر دیکھا اور یہی احتیاط کام آگئی۔ جیڈ نے اپنے جوتے اتار دیے تھے اور ربر سول کے تقریباً بے آواز پمپ شوز پہن کر نیچے آچکا تھا اور وہ راہداری میں داخل ہورہا تھا۔ وین نے آئینہ واپس کھینچا اور دروازہ بند کرکے گونی اور روکی سمیت جلدی سے واش روم میں آگیا۔ پہلے یہاں کی لائٹ روشن تھی اب اس نے لائٹ بھی بجھا دی اور سرگوشی میں گونی سے کہا۔"خاموش رہنا وہ باہر آگیا ہے اور اس کا منہ بھی بند کرو۔"



وین کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ اس بار قدموں کی چاپ نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ کب جیڈ دروازے تک آیا اور اس نے اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھولا۔ آواز آئی تو وین اور گونی دونوں اچھل پڑے تھے۔ اس موقع پر کتے نے بھی آواز نہیں نکالی ورنہ چند گز کے فاصلے سے اس کی کوں کوں بھی اس کے مالک کو صاف سنائی دیتی۔ جیڈ چند لمحے سن گن لیتا رہا پھر اس نے جھٹکے سے دروازہ بند کردیا۔ غالباً اسے کوئی آہٹ یا آواز سنائی دی تھی اور اس نے اپنا شک دور کرنے کے لیے کمرے میں جھانکا تھا لیکن ایک بات تھی کہ اسے رابین مشل کو میز کے نیچے سے باہر دیکھ کر شک نہیں ہوا تھا ورنہ وہ اس وقت انہیں تلاش کررہا ہوتا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ رابین نے کسی طرح خود کو میز کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ وین اور گونی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس وقت باہر نکلتے۔ گونی نے دبی دبی آواز میں رونا شروع کردیا تھا۔

☆☆☆

کیرن، لوئی اور باربرا کچن پہنچیں۔ یہ بہت بڑا اور جدید ترین کچن تھا۔ باربرا کھانے پینے کی شوقین تھی اس نے فوراً فریج کھول کر دیکھا اور چاکلیٹ کا دوسرا ڈبا نکال لیا۔ لوئی نے خوف زدہ ہونے کے باوجود ایک انرجی ڈرنک لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ کیرن نے انہیں گھورا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ہنگامی حالات میں چھپنے کے لیے کون سی جگہ موزوں ہوسکتی تھی۔ کچن کیبنٹ چھوٹی تھیں اور ان میں سامان بھی رکھا ہوا تھا اگر وہ سامان نکالتی تو وہ فوراً نظر میں آجاتا۔ اس نے ان دونوں کو خبردار کیا۔"یہاں سے کوئی چیز مت ہلانا اور نہ اٹھانا۔ ورنہ وہ فوراً نظر میں آجائے گی۔"

واقعی وہاں اتنی صفائی ستھرائی اور ہر چیز ایسی ترتیب سے رکھی تھی کہ اس میں ذرا سی بھی گڑبڑ فوراً نظر میں آجاتی۔ لوئی ایک فلاور پاٹ چھیڑ رہی تھی جس میں چھوٹے چھوٹے خوش رنگ پھولوں والا پودا لگا ہوا تھا۔ باربرا کی توجہ کا مرکز نازک کرسٹل کے گلاس تھے جو یقیناً بہت بیش قیمت تھے۔ وہ ڈائننگ ہال میں آئیں یہاں چاروں طرف شیشے سے بنی الماریوں میں کراکری سجی تھی مگر چھپنے کی کوئی جگہ یہاں بھی نہیں تھی۔ کیرن نے زیر لب جیڈ اور اس کے گھر پر لعنت بھیجی جہاں اتنی جگہ ہونے کے باوجود چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اچانک باربرا تیزی سے نیچے جھکی تو وہ دونوں بھی میز کے پیچھے ہوگئیں۔ مگر کوئی آیا نہیں تھا بلکہ باربرا کے ہاتھ سے ایک چاکلیٹ چھوٹ کر گر گئی تھی۔ لوئی

## اپنا محاسبہ

یونان کے ایک مصور نے تصویر بنائی اس میں ایک آدمی کو انگور کا خوشہ پکڑے دکھایا گیا تھا۔ اس نے تصویر کو بازار میں ایک جگہ لٹکا دیا۔ ہر کوئی تصویر کو دیکھتا اور اس کی تعریف کرتا تھا۔ مصور کے کچھ دوست اس سے ملے اور مبارکباد دیتے ہوئے کہنے لگے۔"تم نے انگور کا خوشہ اس قدر زبردست بنایا ہے کہ چڑیاں آتی ہیں اور اسے اصلی سمجھ کر چونچ مارتی ہیں۔ مصور خوش ہونے کے بجائے افسردہ ہوگیا۔ کہنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ آدمی کو بنانے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ورنہ چڑیاں اگر آدمی کو بھی اصل سمجھتیں تو اس کے ڈر سے انگوروں پر چونچ مارنے کی جرأت نہ کرتیں۔ مصور نے وہ تصویر اتاری اور ایک دوسری تصویر بنائی اس تصویر میں بھی ایک آدمی انگور کا خوشہ لیے کھڑا تھا۔ انگور کا خوشہ دوبارہ اس قدر شاندار بنایا گیا تھا کہ چڑیاں اس کو دیکھ کر اس کے پاس آتیں مگر اب چونچ مارنے کی ہمت نہ ہوتی جو آدمی انگور کا خوشہ لیے ہوئے تھا اس کی آنکھوں میں اس قدر غصہ بھرا تھا کہ چڑیاں دیکھ کر ہی اڑ جاتی تھیں۔

دنیا میں اعلیٰ مقام انہی لوگوں نے حاصل کیا ہے، جنہوں نے خود اپنے آپ پر تنقید کی۔ اپنا محاسبہ خود کیا کیونکہ جب دوسرا تنقید کرتا ہے تو انسان ردعمل کا شکار ہوجاتا ہے۔ انسان اپنے آپ پر خود تنقید کرے، اپنی غلطیاں خود نکالے تو جتنا زور اور جتنا وقت وہ دوسروں سے اس بحث میں لگائے کہ وہ بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی نقص نہیں ہے، وہی وقت، وہی کوشش وہ اپنے آپ کو درست کرنے میں اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے میں صرف کرسکتا ہے۔

مرسلہ: توصیف احمد، پٹھان کالونی، کراچی



SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے دانت پیس کر کہا۔ ”ہم یہاں کھانے نہیں آئے ہیں۔“

”ہم یہاں پینے بھی نہیں آئے ہیں۔“ باربرا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اس کا اشارہ انرجی ڈرنک کی طرف تھا۔

”پلیز چپ رہو۔“ کیرن گھبرا کر بولی۔ وہ دوبارہ کچن میں آگئے تھے۔ ”ضروری نہیں ہے وہ اب آواز کرتا ہوا آئے اور ہم خبردار ہو جائیں۔“

ابھی کیرن کہہ رہی تھی کہ لونی اور باربرا ایک وقت آڑ میں ہو گئیں۔ کیرن نے گہرا سانس لیا اور اشارے سے بولی۔ ”کیا؟“

جواب میں لونی نے اس کے پیچھے اشارہ کیا اور اس نے مڑ کر دیکھا تو جیڈ ہال سے ہوتا ہوا دوسری راہداری میں جا رہا تھا۔ کیرن بدحواسی میں لونی کے پاس آڑ میں آ گری تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا جیڈ جا چکا تھا اس کی قسمت کہ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا ورنہ کیرن سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”شکر ہے دیکھا نہیں۔“

”اس لیے لیکچر دینے سے زیادہ تم آس پاس توجہ دو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ لونی نے کہا۔ اس نے خالی انرجی ٹن شیلف پر رکھا تھا کیرن نے اسے اٹھا کر واپس فریج میں رکھ دیا اور بولی۔

”ہمیں اوپر جانا چاہیے۔“

”اوپر تو ہم پھنس جائیں گے۔“ باربرا نے اختلاف کیا۔

”ممکن ہے کوئی راستہ مل جائے۔“ کیرن بولی۔ ”وہ نیچے ہے اور یہاں زیادہ خطرہ ہے۔“

”ہمیں چابی تلاش کرنی چاہیے جس سے دروازہ کھل سکے۔“ لونی نے کام کی بات کی۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ کیرن نے سر ہلایا وہ ہال میں آئیں۔ لونی اور باربرا سیڑھیوں پر چڑھ گئیں اور کیرن ہال میں چابیاں دیکھنے لگی۔ وہاں ایک کی ہولڈر دیوار پر نصب تھا لیکن اس میں کوئی چابی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ چابیاں جیڈ نے اپنے پاس رکھی تھیں۔ کیرن سوچ رہی تھی کہ کیا اسے گھر میں کسی کی موجودگی پر شک ہوا تھا اور اس نے جوتے بھی بدل لیے تھے اس لیے انہیں اس کے نیچے آنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ کیا وہ ان کے ساتھ بلی چوہے والا کھیل کھیل رہا تھا؟ کیرن پلٹ کر سیڑھیوں پر آئی، یہ کچن کی طرف جانے والی راہداری کے ساتھ تھیں۔ اگر جیڈ ان سے اترتا تو لازمی انہیں دیکھ لیتا لیکن وہ دوسری سیڑھی سے اترا تھا جو اسٹڈی کی طرف جانے والی راہداری کے ساتھ تھی۔ لونی اور باربرا سیڑھیوں پر اکٹھی بیٹھی تھیں، کیرن ان کے پاس سے ہوتی اور ان کو اشارہ کرتی اوپر آئی۔ یہاں بڑے ہال کے دائیں بائیں اسی طرح دو دو قطاروں میں ہر طرف چار چار کمرے تھے۔ جیڈ کا بیڈروم اور اس سے ملحقہ کمرا اسٹڈی والی سمت کے اوپر والے حصے میں تھا، اسی وجہ سے آنے جانے کے لیے اسی طرف کی سیڑھیاں استعمال کرتا تھا۔ وہ پہلے دائیں طرف آئیں اس طرف کے آٹھوں دروازے لاک تھے۔ وہ پہلے بھی چیک کر چکے تھے لیکن کیرن نے ایک بار پھر چیک کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ راہداری کا آخری حصہ ایک چھوٹی سی بالکونی میں کھل رہا تھا۔ کیرن نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا مگر یہاں بلندی بیس فٹ سے زیادہ تھی اور نیچے پکا فرش تھا، اگر وہ گر کر بچ بھی جاتیں تب بھی ہڈی پسلی لازماً ٹوٹ جاتی۔ لونی نے کہا۔

”ہم رسّی کی مدد سے اتر سکتے ہیں۔“

”رسّی کہاں سے آئے گی اور اسے باندھا کہاں جائے گا۔ بالکونی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔“

کیرن درست کہہ رہی تھی بالکونی میں کوئی جگہ نہیں تھی جہاں رسی باندھی جا سکتی اور وہ بھی اس صورت میں جب رسی ملتی۔ وہ واپس آئیں اور ہال سے ہوتے ہوئے بائیں طرف کی راہداری میں داخل ہوئیں۔ یہاں بس وہی دو کمرے کھلے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیڈ بس یہی کمرے استعمال کرتا تھا اور باقی پورا گھر اس نے بند کیا ہوا تھا۔ دوسرا کمرا بھی بیڈروم تھا اور وہاں شاید اس سے ملاقات کے لیے آنے والی خواتین اور لڑکیاں سوتی تھیں کم سے کم نسوانی ملبوسات سے ایسا ہی لگ رہا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ یہ ملبوسات رابین کے ہوتے جو اس وقت بے لباس اسٹڈی میں لب مرگ پڑی تھی۔ کیرن کو اس پر رحم آیا تھا مگر وہ اس کے لیے کیا کر سکتے تھے جب کہ انہیں اس وقت اپنی جان کی فکر تھی۔ جیڈ خوفناک آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ کا یہ حال کیا تھا۔ اگر وہ اس کے ہاتھ آ جاتے تو وہ ان کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرتا۔

جیڈ کے بیڈروم میں داخل ہو کر انہوں نے سب سے پہلے چابیوں کی تلاش کی۔ ڈریسنگ ٹیبل، سائڈ دراز، ٹی وی ٹرالی اور دیواروں پر لگے ریکس پر چیک کیا مگر چابیاں غائب تھیں۔ لونی اور باربرا دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ دونوں کمرے ایک درمیانی دروازے سے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ کیرن سائڈ دراز دیکھ رہی تھی، اچانک اسے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی اور وہ نہایت تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس سے پہلے کہ جیڈ اندر آتا وہ بیڈ کے نیچے جا چکی تھی۔ نیچے آنے کے بعد اس نے ہاتھ بڑھا کر لٹکتی بیڈ شیٹ تھام لی اور اسے ساکت کر دیا اسے خوف تھا کہ ہلتی چادر جیڈ کو متوجہ نہ کر لے۔ مگر وہ دوسری طرف گیا تھا اور اس نے ادھر توجہ نہیں دی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کر رہا تھا انہیں شبہ تھا کہ وہ ان کے بارے میں جان گیا تھا مگر اس کے انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ انہیں تلاش کر رہا تھا۔

کیرن کا خوف سے برا حال تھا۔ اسے خیال آیا کہ برابر والے کمرے میں لونی اور باربرا تھیں کہیں وہ بے خبری میں کوئی آواز نہ نکال دیں اور پکڑی جائیں۔ کوئی ایک پکڑا جاتا تو سب ہی پکڑے جاتے۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ وہ آواز نہ نکالیں اور جیڈ جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی دعا قبول ہوئی اور جیڈ شاید عجلت میں کسی کام سے آیا تھا، اس نے الماری سے بڑا سا پیراشوٹ سے بنا ہوا بیگ لیا اور چلا گیا، اس کے جاتے ہی کیرن بیڈ کے نیچے سے نکلی اور دوسرے کمرے میں آئی وہاں لونی اور باربرا بھی بیڈ کے نیچے چھپی ہوئی تھیں۔ دونوں کمروں میں چھپنے کے لیے یہی جگہیں تھیں۔ اس نے نیچے جھانکا تو ان دونوں کی ہلکی سی چیخیں نکل گئیں۔ کیرن نے جلدی سے کہا۔ ”آرام سے... آرام سے، یہ میں ہوں۔“

”وہ چلا گیا۔“ لونی نے تصدیق چاہی۔ ”شکر ہے، میں کمرے میں آ رہی تھی کہ وہ اندر آیا اور اس نے دیکھا ہی نہیں کہ دروازہ ذرا سا کھلا ہے۔“

”اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ باربرا بولی۔ ”اس سے پہلے کہ وہ ہمیں دریافت کر لے۔“

”تم لوگ بھول رہی ہو۔ باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے تمام کھڑکیوں پر گرلز ہیں اور اس پیلس میں آمد و رفت کا ایک ہی دروازہ ہے جو لاک ہے۔“

”بالکونی۔“ لونی نے پھر کہا۔ ”اگر رسی نہیں ہے تو ہم اس چادر کے ٹکڑے کر سکتے ہیں۔ اس کی رسی بنا کر نیچے اتر سکتے ہیں۔“

اس بار لونی کی تجویز دل کو لگی۔ انہوں نے دوسرے بیڈروم کے بیڈ کی چادر اتاری یہ خاصی موٹی اور مضبوط تھی چادر تھی۔ اس کی پتلی تہ کاٹن کی تھی تا کہ یہ بیڈ پر سرکے نہیں۔ اب مسئلہ اسے کاٹنے کا تھا کیونکہ اسے پھاڑنا ممکن نہیں تھا۔ یہ مسئلہ باربرا نے حل کیا، اس نے ڈریسنگ کی دراز سے ایک قینچی نکالی جو زیادہ بڑی تو نہیں تھی لیکن اس سے کام چل سکتا تھا۔ کیرن نے کہا۔ ”یہاں خطرہ ہے وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے ہمیں بالکونی میں چل کر یہ کام کرنا چاہیے۔“

انہوں نے اتفاق کیا اور وہ تینوں بیڈروم سے نکلیں اور ہال سے ہوتی ہوئی دائیں طرف والی بالکونی میں آ گئیں۔ یہاں تاریکی تھی لیکن نیچے لان میں جلنے والی روشنیوں کا عکس کسی قدر آ رہا تھا۔ وہ قینچی سے چادر کاٹنے میں لگ گئیں۔ لونی چادر پکڑے ہوئے تھی اور باربرا قینچی سے کاٹ رہی تھی جب کہ کیرن کاٹے جانے والے ٹکڑوں میں پہلے مناسب فاصلے پر گرہیں لگا رہی تھی پھر انہیں آپس میں جوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

وین اور گونی ساکت بیٹھے تھے۔ بالآخر وین باہر نکلا اور اس نے دروازے کے پاس جا کر سن گن لی۔ مسئلہ یہ تھا کہ کمرے خاصی حد تک ساؤنڈ پروف تھے اور ہلکی سی آواز اندر یا باہر سنائی نہیں دیتی تھی۔ جب تک جیڈ نے لیدر شوز پہن رکھے تھے اس کے چلنے پھرنے کی آواز آتی تھی مگر ربر شوز میں بہت معمولی سی آواز تھی۔ اس لیے وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ باہر موجود ہے یا نہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ اتفاق سے اسی وقت جیڈ راہداری سے مڑ کر سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ وین نے عجلت میں گونی کو آواز دی۔ وہ واش روم سے باہر آئی۔ وین نے ایک بار پھر جھانکا اور گونی سے کہا۔ ”میں سیڑھیوں تک جا رہا ہوں اگر ہال میں کوئی نہ ہوا تو میں تمہیں اشارہ کروں گا اور تم بھاگ کر آنا مگر اپنے جوتے اتار دو۔ یہ آواز کریں گے۔“

”میں جوتوں کے بغیر باہر نہیں جا سکتی۔“

”او کے انہیں تسموں سے گلے میں باندھ لو۔“ وین نے مشورہ دیا۔ ”باہر نکل کر پہن لینا۔“

گونی نے ایسا ہی کیا۔ روی دکھی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا غالباً وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا جا رہا تھا؟ وین دبے قدموں چلتا ہوا راہداری کے سرے تک آیا اور اس نے جھانک کر سیڑھیوں پر دیکھا جیڈ اسے نظر نہیں آیا تھا، اس نے ہاتھ کے اشارے سے گونی کو آگے آنے کو کہا اور وہ دوڑ کر آنے لگی تھی۔ وین نے ایک بار پھر جھانکا تو اسے جیڈ اوپر سے نمودار ہوتا دکھائی دیا اور وین واپس بھاگا۔ وہ آواز نہیں نکال سکتا تھا، گونی کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ اسے بھی کھینچ کر واپس لے گیا۔ گونی





SCANNED BY PAKSOCIETY
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

حیران ہوئی مگر اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ ادھر وہ گیسٹ روم میں داخل ہوئے اور ادھر جیڈ سیڑھیوں سے پیراشوٹ کا بنا ہوا بیگ اٹھائے نمودار ہوا۔ وین نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کیا اور گونی کو واش روم میں جانے کا اشارہ کیا وہ واش روم میں چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کرلیا تھا۔

وین کمرے کے دروازے کے ساتھ لگا ہوا کھڑا تھا۔ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور یہ آہٹ پھر دروازے کے سامنے رکی۔ وین جلدی سے دروازے کے عقب میں اور ساکت ہوگیا۔ اچانک دروازہ کھلا۔ وین نے آنکھیں بند کرلیں اور سانس روک لی اسے لگا کہ اب وہ پکڑا جائے گا لیکن جس طرح اچانک دروازہ کھلا تھا اسی طرح دھڑام سے بند ہوگیا اور وہ آواز سن کر اچھل پڑا۔ پتا نہیں جیڈ کے ساتھ کیا مسئلہ تھا کہ وہ اس کمرے کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا تھا۔ وین نے رکی ہوئی سانس خارج کی اور دوبارہ کان لگا کر سنا، اسٹڈی کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ وین کے خیال میں یہ آخری موقع تھا جب وہ گونی اور روکی کو اس جیل ثابت ہونے والے گھر سے نکال سکے اور یہی ان کی بچت کا آخری موقع تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اوپر وہ تینوں بالکونی میں کیا کر رہی تھیں۔ اس نے واش روم کا دروازہ کھولا اور گونی کو باہر آنے کا اشارہ کیا وہ سہمی ہوئی اور بیزار تھی۔ وہ دبے قدموں باہر آئے اور پھر داخلی دروازے تک پہنچے لیکن اس سے پہلے کہ وین گونی کو باہر کرتا اچانک کال بیل بجی۔ بدحواس وین نے گونی کو کھینچا اور دائیں طرف والی سیڑھیوں کے ساتھ رکھے صوفے کے پیچھے جا دبکا اسی لمحے راہداری سے جیڈ نمودار ہوا تھا۔

☆☆☆

رسی تیار ہوچکی تھی اور وہ سوچ رہی تھیں کہ اسے کہاں باندھا جائے کہ وہ سب بہ حفاظت نیچے اتر سکیں۔ اچانک کیرن بولی۔ ”میرے خدا......ہم وین کو بھول گئے۔“

”ہاں گونی نکل جائے گی لیکن وین تو اندر ہی ہوگا۔“ باربرا پریشانی سے بولی۔ لونی رسی اٹھا کر اسے نیچے لٹکا کر دیکھ رہی تھی کہ وہ زمین تک پہنچ بھی سکتی ہے یا نہیں۔ رسی کی لمبائی مناسب تھی۔ اچانک سامنے سڑک پر ایک پولیس کار نمودار ہوئی وہ آہستہ سے چلتی ہوئی جا رہی تھی جیسے معائنہ کر رہی ہو۔ لونی تیزی سے بالکونی کی دیوار کے پیچھے ہوگئی۔ وہ دونوں بھی ڈر گئی تھیں باربرا نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”پولیس کار... سامنے سڑک پر ہے۔“ لونی نے کہا۔

باربرا نے ذرا سر نکال کر جھانکا اور پھر پیچھے کرلیا۔ ”وہ کونے تک پہنچ گئی ہے۔“

وہ تینوں پولیس سے ڈر رہی تھیں کیونکہ وہ خود اس گھر میں چوری کے ارادے سے گھسے تھے اور پولیس کا خوف ان کے ذہنوں پر تھا اسی وجہ سے کچھ دیر کے لیے بھول گئیں کہ وہ کس صورت حال سے دوچار تھیں۔ پھر کیرن چونکی۔ ”یہ کیا حماقت ہے، ہمیں پولیس کو متوجہ کرنا چاہیے تھا۔“

”او سوری مجھے خیال نہیں رہا۔“ لونی ندامت سے بولی۔ وہ تینوں بیک وقت اٹھیں مگر اس دوران میں پولیس کار گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے میں آچکی تھی اور اب وہ بالکونی سے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ تینوں مایوس ہوگئیں۔ باربرا نے کہا۔

”وہ چلی گئی۔“

”وقت مت ضائع کرو۔“ کیرن نے کہا۔ ”میں وین کو بلانے جا رہی ہوں۔ جب تک تم لوگ یہیں رہو اور خدا کے لیے اس رسی کو تو کھینچ لو۔“

لونی رسی کھینچنے لگی اور کیرن اندر آئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور دبے قدموں چلتی ہوئی سیڑھیوں تک آئی تھی کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ اچھل پڑی تھی۔ جلدی سے سیڑھیوں کے ساتھ ریلنگ سے پیچھے ہوگئی۔ اسے ڈر تھا کہ جیڈ اوپر ہوا تو نیچے جاتے ہوئے اسے دیکھ سکتا تھا، اگرچہ وہ دوسری سیڑھی سے ہی نیچے جاتا جو اس کے بیڈ روم کے پاس پڑتی تھی مگر وہ ہال سے گزرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ کیرن کو علم نہیں تھا کہ جیڈ نیچے اسٹڈی میں ہے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے نیچے سرکنے لگی۔ نصف سیڑھیوں پر اسے نچلا ہال نظر آیا اور پھر اس کی نظر بالکل نیچے صوفے کے پیچھے دبکے وین اور گونی پر گئی کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اسی لمحے جیڈ داخلی دروازے تک پہنچا، اس نے چابی سے تینوں لاک کھولے اور پھر دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ وہ فوراً باہر نکل کر دروازہ بند کر گیا۔ اس کے جاتے ہی کیرن نے ہلکی سی آواز نکال کر وین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

☆☆☆

وین اور گونی صوفے کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ جیڈ اندر سے آکر دروازے تک پہنچا اور اس نے دروازہ کھولا تو وین نے ہلکی سی آواز سنی باہر کوئی شخص جیڈ کا پوچھ رہا تھا۔ جیڈ نے باہر جا کر دروازہ بند کرلیا تھا۔ وین نے صوفے سے جھانک کر دیکھا اور پھر ہلکی سی ”شش“ کی آواز سن کر چونکا اس نے پیچھے دیکھا تو کیرن کی آواز آئی۔ ”ادھر دیکھو، میں اوپر ہوں۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو وہ دونوں کہاں ہیں؟“ وین نے آواز دبا کر پوچھا۔

”ہم نے بالکونی سے فرار کا راستہ تلاش کرلیا ہے۔“ کیرن نے کہا۔ ”میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“

وین گونی کے ساتھ اوپر آیا۔ ”بالکونی سے کیسے؟“

کیرن نے اسے بتایا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ وین خوش ہوگیا۔ ”ٹھیک ہے یہاں سے نکلنا تو مشکل لگ رہا ہے، میں نے جتنی بار کوشش کی گونی اور روکی کو نکالنے کی اتنی بار یہ شخص آگیا۔“

”بس فوراً چلو اب کوئی نئی مصیبت نہ آگئی ہو باہر۔“ کیرن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ باہر پولیس آئی ہے تو وہ اوپر کے بجائے نیچے کا رخ کرتے۔

☆☆☆

جیڈ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور ایک پولیس والے نے اپنا بیج آگے کیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آیا۔ باہر دو پولیس والے موجود تھے۔ وہ اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بولا۔ ”آفیسرز... میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔“

اپنا بیج دکھانے والے نے کہا۔ ”مسٹر کیرگٹن... ہم تمہارے لیے کچھ کرنے آئے ہیں۔ ایک لڑکی تمہارے مکان کی بالکونی میں ہے اور وہ رسی جیسی کوئی چیز لٹکا رہی ہے۔“

”اوہ...“ جیڈ نے صرف اتنا کہا۔

”اگر اس نے ٹریس پاس نہیں کیا تو یقیناً بہت خطرناک حرکت کر رہی ہے۔“

”اوہ ہاں... وہ ٹریس پاسر نہیں ہے، میری بھانجی ہے میری کزن کی بیٹی، میں اسے سمجھاتا ہوں۔ وہ بس کچھ ایڈونچرس ہے خبردار کرنے کا شکریہ آفیسرز۔“ جیڈ واپس اندر جانے لگا کہ دوسرے آفیسر نے اسے روکا۔

”ایک منٹ مسٹر کیرگٹن۔“ اس نے اپنی جیب سے ایک آٹوگراف بک اور پین برآمد کیا۔ ”میرا بیٹا آپ کا فین ہے آپ آٹوگراف دینا پسند کریں گے؟“

بادل ناخواستہ جیڈ نے اس سے آٹوگراف بک لے کر اس پر کچھ لکھ دیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس نے کیا لکھا اور پھر معذرت کی۔ ”سوری آفیسرز مجھے اس شرارتی لڑکی کو روکنا ہوگا اس سے پہلے کہ وہ کوئی غلط حرکت کرکے خود کو نقصان پہنچا لے۔“

دونوں پولیس والے مسکرائے اور واپسی کے لیے مڑ گئے۔ ان کی کار راک پیلس کے باہر موجود تھی۔ جیڈ دروازے کی جھری سے انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر وہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے تینوں لاک بند کیے اور پھر تقریباً بھاگتا ہوا اپنی اسٹڈی میں آیا؟ اس نے ایک دراز چابی سے کھولی اور اس میں رکھا ہوا چاندی جیسا پستول نکالا۔ رابین قالین پر کروٹ کے بل پڑی تھی اور جیڈ کا لایا ہوا بیگ اس کے برابر میں پڑا تھا، ایسا لگ رہا تھا وہ رابین کو بیگ میں ڈال کر کہیں منتقل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ مگر اب یہ نیا مسئلہ سامنے آگیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے گھر میں ایک لڑکی موجود ہے اور وہ بالکونی کے راستے اترنے کی تیاری کر رہی ہے۔ یقیناً اس نے رابین کو دیکھ لیا تھا اور بالکونی کے راستے فرار ہونا چاہتی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اندر کیسے آئی اور کیوں آئی؟ ان سوالوں کے جواب وہی دے سکتی تھی۔ جیڈ پستول لیے باہر آیا اور اوپری منزل کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

وہ تینوں بالکونی میں آئے جہاں لونی اور باربرا چاکلیٹ کے آخری پیس کھا رہی تھیں۔ وین نے انہیں گھورا ”تم لوگ کھانے پینے آئے ہو کیا؟“

”اب کیا کریں یہاں تو فرار کا راستہ ہی نہیں ہے۔“ لونی نے کہا۔

”بس اب جلدی کرو اس سے پہلے کہ پکڑے جائیں۔“ وین بولا۔ ”سب سے پہلے گونی کو اتارتے ہیں۔“

مگر گونی نے اس رسی کے سہارے اترنے سے صاف انکار کردیا جس کی گرہیں نہایت اناڑی انداز میں باندھی گئی تھیں۔ وین نے باربرا کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے پھر تم جاؤ۔“

وہ مجبوراً راضی ہوئی تھی۔ انہوں نے رسی کا سرا اس کی کمر سے باندھا مگر اس طرح کہ وہ آسانی سے کھول سکے۔ رسی ان تینوں نے پکڑی اور باربرا نیچے اتر گئی۔ اس کی حالت بری تھی اگر رسی اس کی کمر سے نہ بندھی ہوتی تو وہ شاید نیچے ہی گر جاتی اس وقت بھی وہ جھولتے ہوئے ڈری ڈری آوازیں نکال رہی تھی۔ مگر ابھی وہ کچھ ہی نیچے گئی تھی کہ دروازہ کھلا اور جیڈ نے بالکونی میں قدم رکھا اور پستول لہراتے ہوئے کہا۔ ”اسے واپس اوپر لاؤ۔“

ان کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وین اور کیرن کے چہرے سُت گئے تھے۔ جب کہ لونی اور واپس آنے والی باربرا نے رونا شروع کردیا تھا۔ البتہ گونی پرسکون تھی، اس نے کہا۔ ”مسٹر کیرگٹن میں بچی ہوں، مجھے




SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:-

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paksociety1

امید ہے تم مجھے کچھ نہیں کہو گے۔"

"بالکل میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ دانت پیس کر بولا۔ وہ ایک لڑکی کا سوچ کر آیا تھا اور یہاں پورا ٹولہ تھا۔ "اب اندر چلو اور یہ رسی بھی اٹھاؤ تم لوگوں نے میری قیمتی بیڈ شیٹ کا کیا حشر کیا ہے؟" جیڈ کے لہجے میں غصہ تھا۔ وہ پستول کے زور پر انہیں سیڑھیوں سے سب سے اوپر والی منزل پر لایا یہاں گنبد نما کمرا تھا۔ اس کا دروازہ چابی سے کھولتے ہوئے انہیں اندر جانے کا حکم دیا۔ یہ کمرا اصل میں کاٹھ کباڑ کے لیے مخصوص تھا۔ جیڈ نے انہیں اندر دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اپنا کتا واپس نہیں لیا تھا۔ اس کے جاتے ہی کیرن بولی۔

"یہ یقیناً رابین کو ٹھکانے لگانے گیا ہے۔"

"رابین زندہ ہے۔" لونی بولی۔

"تم نے اس کی حالت دیکھی تھی۔ وہ کچھ دیر کی مہمان تھی۔ اسے اس حال میں پہنچانے والا یہ شخص اسے زندہ رہنے دے گا، اس صورت میں وہ کم سے کم دس سال کے لیے جیل جائے گا اور اس کا کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

"تب تو وہ ہمیں بھی نہیں چھوڑے گا۔" باربرا نے گھبرا کر کہا۔ "ہم اس کے جرم کے عینی گواہ ہیں۔"

"مجھے چھوڑ دے گا۔" کونی نے کہا۔ "وہ فلموں میں بچوں سے نرمی سے پیش آتا ہے۔"

"احمق وہ فلمیں ہوتی ہیں اور یہ اس کی حقیقی زندگی ہے۔" لونی نے اپنی بہن کو جھڑک دیا۔

"وہ کسی کو نہیں چھوڑے گا، ہمیں آزادی کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

"یہاں سے آزادی..." کیرن نے مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ گنبد نما کمرا گول اور تقریباً تیس فٹ قطر کا تھا۔ چھت تقریباً بیس فٹ اوپر تھی اور اس میں زمین سے پانچ فٹ کے بعد شیشے کی کھڑکیاں تھیں جن کے باہر ڈیزائن والی فولادی گرل تھی، گنبد کے اوپری حصے میں دائرے میں رنگین شیشے لگے تھے۔ وسط میں ایک فانوس بھی لٹکا ہوا تھا لیکن وہ آف تھا۔ روشنی کے لیے دیواروں کے ساتھ چند لائٹس لگی تھیں اور وہی روشن تھیں۔ آمدورفت کے لیے واحد دروازہ بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا اور جیڈ اسے باہر سے لاک کر گیا تھا۔ ڈین نے کسی ایسی چیز کی تلاش شروع کر دی جس سے دروازہ کھولا یا اس کا لاک توڑا جا سکے مگر وہاں کاٹھ کباڑ میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈین پلاسٹک اور ٹن کے ڈبے چیک کر رہا تھا اس نے ایک ڈبا اٹھایا تو اس میں کچھ تھا، اس نے ڈھکن کھول کر سونگھا تو اس میں مٹی کا تیل تھا۔ یہ تقریباً ایک لیٹر تیل تھا۔

"اس میں مٹی کا تیل ہے۔"

"میرے پاس لائٹر ہے۔" لونی بولی۔

"اس سے ہم صرف خود کو آگ لگا سکتے ہیں۔" باربرا نے کہا۔ "یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے۔"

"اگر ہم دروازے کو آگ لگا دیں۔" کیرن نے کہا۔

"ضرور، جتنی دیر میں یہ دروازہ جل کر راکھ ہوگا ہم سب دھوئیں سے دم گھٹ کر ہلاک ہو چکے ہوں گے۔" باربرا اس بار طنزیہ انداز میں بولی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" ڈین نے سر ہلایا۔ "ہم اس بند کمرے میں آگ لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ہمیں کچھ اور سوچنا ہوگا۔"

"ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" لونی رونے لگی۔ "یہ شخص ہمیں مار دے گا۔ وہ بہت سفاک ہے جو اپنی محبوبہ کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے تو وہ ہمارے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرے گا؟"

بہن کو روتے دیکھ کر کونی کا اعتماد بھی ڈانواں ڈول ہو گیا اور وہ بھی رونے لگی۔ "کیا یہ بچوں کو بھی مار دیتا ہے؟"

"ڈرو مت، ہم کچھ نہ کچھ سوچ لیں گے۔" ڈین نے اسے تسلی دی۔ وہ آس پاس دیکھ رہا تھا اور کوئی ترکیب سوچ رہا تھا جس سے اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ اس نے گھوم کر آس پاس دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اوپر دیکھا۔ فانوس فرش سے کوئی پندرہ فٹ کی اونچائی پر تھا اور اسے دیکھتے ہوئے اچانک ڈین کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور جیسے جیسے وہ اس پر غور کرتا گیا اسے لگا کہ وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس نے کیرن سے کہا۔ "ایک آئیڈیا ہے لیکن سب کو میرے ساتھ تعاون کرنا ہوگا اور جیسا میں کہوں ویسا کرنا ہوگا، اس کے بعد امید ہے کہ ہم بچ سکتے ہیں۔"

"آئیڈیا کیا ہے؟"

ڈین نے اپنا آئیڈیا بیان کیا تو کیرن فوراً اس سے متفق ہو گئی لیکن باربرا اور لونی نہیں مان رہی تھیں، وہ ڈر رہی تھیں کہ اگر وہ ناکام رہے تو جیڈ ان کے ساتھ زیادہ سخت سلوک بھی کرے گا۔ کیرن نے انہیں سمجھایا کہ جیڈ انہیں کم سے کم بھی قتل کرے گا اور یہ بھی امکان ہے وہ انہیں یہاں بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دے اور بعد میں آ کر صرف ان کی لاشیں ٹھکانے لگائے۔ کونی نے ان دونوں کو سخت سست کہا کہ وہ کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تب کہیں جا



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

کروہ متفق ہوگئیں اور پھر سب حرکت میں آگئے۔ وین نے کہا۔ ”ہمیں کچھ تاریں درکار ہیں۔“

انہوں نے تلاش شروع کی اور مچھلی پکڑنے والی ڈور ایک ڈبے سے ملی۔ پھر انہوں نے ایک میز اور اس کی چھوٹی میزوں کی مدد سے وین کو فانوس تک پہنچایا اور اس نے اس تین منزلہ میز پر کرسی رکھ کر تقریباً ڈولتے ہوئے اپنا کام کیا۔ یہ بہت نازک کام تھا اور ذرا سی غلطی سے پورا منصوبہ برباد ہوجاتا۔ یہ کام کرکے انہوں نے فرنیچر واپس اپنی جگہ رکھا اور وین نے فرش پر نشان لگایا۔ پھر تار ایک کرسی کے پائے سے باندھ کر گونی کو روی سمیت اس پر بٹھا دیا۔ اب انہیں جیڈ کا انتظار تھا۔ اگر وہ آتا تو ان کا منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا لیکن اگر وہ نہ آتا تو پھر انہوں نے جو اتنی جدوجہد کی تھی وہ رائگاں جاتی۔

☆☆☆

جیڈ اس وقت اسٹڈی میں رابین کی لاش بیگ میں ٹھونس رہا تھا اور زیر لب اپنے مقدر کو گالیاں دے رہا تھا۔ پہلے ایک لاش ٹھکانے لگانے کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا رابین اس کی محبوبہ تھی لیکن وہ جیڈ سے بے وفائی کررہی تھی اور وہ یہ کام تواتر سے پچھلے تین سال سے کررہی تھی۔ جب یہ حقیقت جیڈ کے علم میں آئی تو اس کے اندر کا درندہ جاگ اٹھا اور ایک جھگڑے کے بعد اس نے رابین کو بے بس کرکے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا۔ جب اس کا غصہ سرد ہوا تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کیا کردیا ہے اور اب اسے رابین کو ٹھکانے لگانا تھا۔ وہ پورے بارہ گھنٹے انتظار کرتا رہا کہ رابین مرے اور وہ اسے ٹھکانے لگائے۔ غصہ سرد ہونے کے بعد اس میں ہمت نہیں ہورہی تھی کہ وہ اسے قتل بھی کرتا۔ اس کی شوٹنگ طے شدہ تھی۔ مجبوراً اسے رابین کو ایسے ہی چھوڑ کر شوٹنگ پر جانا پڑا اور وہاں اسے ایک سائٹ مل گئی جہاں وہ آرام سے رابین کی لاش ٹھکانے لگا سکتا تھا اور پھر وہ قیامت کے دن ہی دریافت ہوتی۔ شوٹنگ پیک ہوتے ہی وہ وہاں سے روانہ ہوا۔ وہ اسے لینے آیا تھا، اس کا خیال تھا کہ رابین اب تک مرچکی ہوگی اور اسے زندہ پاکر جیڈ کو حیرت ہوئی تھی مجبوراً اسے کچھ دیر رابین کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھنا پڑا۔ اب وہ اسے اس بیگ میں پیک کررہا تھا۔ یہ بیگ اس نے کچھ عرصے پہلے شاپرز لانے کے لیے لیا تھا یہ شاپرز اس نے بند کمروں میں فرنیچر اور دوسرے قیمتی سامان پر چڑھائے تھے تاکہ وہ گرد و غبار سے محفوظ رہیں۔ اب خالی بیگ اس کے کام آرہا تھا، اگر اتفاق سے لاش دریافت بھی ہوجاتی تو کوئی اس بیگ سے جیڈ کا تعلق ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے لاش ٹھونس کر بیگ بند کیا۔

پھر وہ بیگ گھسیٹتا ہوا باہر اپنی گاڑی تک لایا۔ روانہ ہونے سے پہلے اسے خیال آیا کہ وہ جاکر ایک نظر ان پانچوں کو دیکھ لے ایسا نہ ہو وہ کسی طرح سے خود کو آزاد کرلیں اور وہ مارا جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ انہیں اس وقت تک وہاں بند رکھے گا جب تک وہ بھوک پیاس سے مر نہیں جاتے۔ اس طرح اسے ان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا پڑیں گے ویسے بھی وہ بچے تھے۔ اسے ان پر اور خاص طور سے چھوٹی بچی پر رحم آرہا تھا مگر جیڈ اپنی آزادی کی قیمت پر انہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا نہیں کہ وہ کون ہیں مگر وہ جان گیا تھا کہ وہ چوری کی نیت سے اس کے گھر میں داخل ہوئے تھے اور کس طرح داخل ہوئے تھے یہ بھی جان گیا تھا۔ یہ وہی مشہور گروہ تھا جو بیورلی ہلز میں پہلے بھی کئی وارداتیں کرچکا تھا۔ وہ اوپر آیا اور اس نے پہلے دروازے پر رک کر سن گن لی لیکن اندر خاموشی تھی۔ اس نے چابی سے دروازہ کھولا اور اندر آیا تو پہلے اسے یوں محسوس ہوئی لیکن وہاں کوئی مشکوک چیز نہیں تھی، وہ چاروں ایک طرف قالین پر بیٹھے تھے اور بچی جس کے پاس اس کا کتا تھا، ان سے ذرا دور کرسی پر براجمان تھی۔ اس نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔

”تم لوگ کیا کررہے ہو؟“

”ہم بیٹھے ہیں اور کیا کررہے ہیں۔“ کیرن نے کہا۔

وین نے اپنے ہاتھ پیچھے کررکھے تھے، جیڈ ان کی طرف بڑھا۔ ”بیٹے تم مجھ سے کیا چھپا رہے ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ وین نے یوں کہا جیسے اس کے ہاتھ میں سچ مچ کچھ ہو۔ جیڈ نے آگے آتے ہوئے اپنا پستول سامنے کیا۔

”اپنا ہاتھ آگے لاؤ، اس میں کیا ہے؟“

”کچھ نہیں ہے۔“ وین نے اس کے قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو فرش پر ان کے بنائے نشان سے کچھ پیچھے تھے وہ دل ہی دل میں اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ آگے آئے۔ جیڈ اس کے انداز سے مزید مشکوک ہورہا تھا، اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور دھمکی دی۔

”ہاتھ آگے کرو ورنہ میں گولی چلادوں گا۔“

”پلیز۔“ کیرن نے گھبرا کر کہا۔ ”اسے ہاتھ دکھادو۔“

”لو دیکھو۔“ وین نے اپنے دونوں خالی ہاتھ آگے کردیے اور گونی کی طرف دیکھا جس نے آڑ میں لائٹر جلا کر



اسے مچھلی پکڑنے والی ڈور کو دکھایا وہ ایک سیکنڈ میں جل کر ٹوٹ گئی اور اوپر فانوس میں سے لٹکا ہوا مٹی کے تیل کا ڈبا الٹا ہوا۔ ڈوری نے اسے سیدھا رکھا تھا، اب وہ الٹا لٹک رہا تھا اور اس میں موجود سارا تیل چند سیکنڈ میں جیڈ کو سر سے پاؤں تک بھگو گیا تھا۔ عقب سے گونی نے لائٹر اس کے قریب کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مسٹر، اپنا پستول پھینک دو ورنہ میں لائٹر تم پر پھینک دوں گی۔“

”اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت تمہیں جل کر مرنے سے نہیں بچا سکے گی۔“ وین نے کہا۔ جیڈ نے کن انکھیوں سے جلتے لائٹر کو دیکھا جو اس سے مشکل سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھا اور وہ واقعی سر سے پاؤں تک مٹی کے تیل میں بھیگا ہوا تھا، ایک شعلہ اسے بھسم کرنے کے لیے کافی تھا۔ جب اس نے حرکت نہیں کی تو وین نے گونی کی طرف دیکھا۔ ”میں تین تک گنوں گا اگر اس نے پستول نہ پھینکا تو تم اس پر لائٹر پھینک دینا۔“

”ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔“ کیرن نے جلدی سے کہا۔ ”ہمارا پولیس کے پاس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اس صورت میں ہم خود پھنس سکتے ہیں۔“

وین نے گننا شروع کیا۔ ”ایک... دو... تین۔“

”اوکے۔“ جیڈ نے کہا اور پستول وین کے سامنے فرش پر پھینک دیا اور فوراً ہی اس نے ہاتھ گھمایا مگر جب اس نے پستول پھینکا تو سب کے ساتھ گونی کی نظر بھی اس طرف گئی تھی اور اس... کا لائٹر والا ہاتھ نیچے ہوا۔ نتیجے میں جیڈ کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر لگنے کے بجائے اوپر سے گزرا اور لائٹر کے شعلے سے اس کی آستین نے آگ پکڑ لی۔ آگ تیزی سے اوپر آئی اور اسے بجھانے کی کوشش میں جیڈ نے دوسری آستین میں بھی آگ لگالی تھی۔ گونی کتے سمیت بھاگی اور اس سے دور چلی گئی۔ دس سیکنڈ سے بھی پہلے جیڈ کا پورا جسم شعلوں کی زد میں آچکا تھا اور وہ بھیانک آواز میں چلاتا ہوا پورے کمرے میں ناچ رہا تھا اور چیزوں سے ٹکرا رہا تھا۔ وہ سب اس سے بچ کر بھاگتے ہوئے کمرے سے نکلے، چابیوں کا گچھا دروازے کے لاک کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ وین سب سے آخر میں باہر آیا اور اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے چابی گھما کر اسے لاک بھی کردیا پھر اس نے چابی نکالی۔ اس دوران میں وہ سب نہایت پھرتی سے نیچے والی منزل تک پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے کتے کو وہیں چھوڑا اور چابیوں سے لاک کھول کر باہر نکل آئے جب وہ راک پیلس کے سامنے والی سڑک پر بھاگ رہے تھے تو اس کے اوپری کمرے کی کھڑکیوں سے شعلوں کی چمک دور سے نظر آرہی تھی۔ ایک اسٹریٹ کراس کرکے انہیں ایک کار مل گئی اور وہ اس میں بیورلی ہلز سے نکلنے میں کامیاب رہے۔ جب ان کی کار پہاڑی سے اتر رہی تھی تو فائر بریگیڈ کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی اوپر جارہی تھیں۔ راک پیلس میں لگی آگ اب دور سے دکھائی دے رہی تھی۔

☆☆☆

وین بستر پر اوندھے منہ لیٹا ہوا ٹی وی پر راک پیلس میں لگنے والی آگ، جیڈ کیرگٹن کی جلنے سے ہلاکت اور اس کی گاڑی میں پائی جانے والی رابین مشل کی لاش کے بارے میں ٹی وی رپورٹ دیکھ رہا تھا۔ رپورٹرز کے سوالوں کے جواب میں تفتیشی پولیس افسر نے بتایا کہ ایسے شواہد ملے ہیں کہ راک پیلس میں کچھ اور لوگ بھی تھے جو وہاں سے فرار ہوگئے اور پولیس انہیں تلاش کررہی ہے۔ پولیس نے آس پاس رہنے والوں سے بھی اپیل کی، اگر انہوں نے کچھ دیکھا ہے تو وہ پولیس سے رابطہ کریں۔ پولیس نے ایسے شواہد حاصل کرلیے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ رابین مشل کا قاتل جیڈ ہی تھا لیکن جیڈ کو آگ لگا کر اس کمرے میں کس نے بند کیا تھا اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ پولیس جاننے کی کوشش کررہی تھی۔ اچانک وین کے موبائل کی بیل بجی اس نے دیکھا، کیرن کی کال تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”تم ٹی وی دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ وین نے جواب دیا۔

”میرا نہیں خیال کہ پولیس ان لوگوں تک پہنچ سکے۔ اب اس بات کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔“

”مجھے بھی امید ہے۔“

”تب کیا خیال ہے کوئی نیا کام کریں؟“ کیرن نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ وین کچھ دیر کے لیے چپ رہا پھر اس نے کہا۔

”سوری کیرن، میں آج سے ایسے کسی کام میں شامل نہیں ہوں گا۔ اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے غلطی کی اور تم لوگوں کے ساتھ مل کر جرم کرتا رہا۔ اگر ہم پکڑے جاتے تو ہم سب کا مستقبل برباد ہوجاتا۔ اس معاملے کو اب یہیں ختم کردو، ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنی تعلیم اور کیریئر پر توجہ دیں یہی ہمارا مستقبل ہے۔“ وین نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور پھر ٹی وی بھی بند کردیا۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

# آبِ طلب

ڈاکٹر ساجد امجد

بے شک جوڑے آسمان پر بنتے ہیں لیکن... ٹوٹتے زمین پر ہیں... خوابوں کا دیکھنا، بکھر جانا... لوگوں کا ملنا، بچھڑ جانا زندگی کا حصہ ہوتے ہیں... مکمل زندگی نہیں اور اگر ایسا ہو جائے تو اس ماحول میں کوئی مکمل زندگی نہیں جی سکتا کیونکہ زندگی کسی پابند غزل کے مانند نہیں گزاری جاسکتی البتہ آزاد نظم کی صورت اس کا عنوان بھلا لگتا ہے لیکن سکون تب ہی ملتا ہے جب سب کچھ ایک ردھم میں چل رہا ہو، جہاں توازن بگڑا وہیں تباہی نے دروازے پر دستک دی... یہ اور بات کہ سماعت اپنی شناخت قائم رکھے اور دستک کے انداز سے آنے والے کو پہچان لے۔ وہ جو گلی گلی، کبھی صحرا میں کبھی جنگل میں کسی روح کی طرح بھٹکتی پھر رہی تھی جانے کیسی پیاس من میں چھپائے ایک مخصوص دریا کی تلاش میں تھی۔ ابر کی خواہش میں دھوپ میں جل رہی تھی۔ پیروں کے آبلے تھے کہ پڑائو کا تقاضا کرتے تھے مگر دل کی لگن اسے ٹھہرنے سے روک رہی تھی۔ احساسات کی ڈور میں گرہیں لگ جائیں اور جب... ادراک و شعور اور قوتِ فیصلہ میں برجستگی اور حالات کی نزاکت کو جانچنے کی صلاحیت نہ ہو تو روحیں یونہی بھٹکتی رہتی ہیں... دل یونہی پیاسا رہ جاتا ہے اور من کا مندر کسی دیوتا کی آس میں بند گنبد کے مانند گونجتا رہ جاتا ہے۔ اپنی ہی صدائیں پلٹ کر آتی ہیں اور سرگوشیوں میں وحشتوں کی خبر دے جاتی ہیں۔ وہ بھی انہی وحشتوں کے بیچ اپنی ڈولتی کشتی کو سنبھالنے کی کوشش میں دھیرے دھیرے بھنور کی جانب بڑھ رہی تھی۔

**جذبوں کے سمندر میں طوفانی لہروں سے ٹکراتی ایک دوشیزہ کی**
**بکھری ذات کی کرب انگیز داستان**

جوڑے آسمان پر بنتے ہیں لیکن ٹوٹتے زمین پر ہیں۔

درخشاں کی ماں شوہر کے مرنے کے بعد آسمان سے زمین پر آگئی تھی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھی مرنے کے بعد بھی سوا لاکھ کا۔ حامد علی خاں بہت بڑے آفیسر تھے لیکن ایماندار تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے پوش علاقے میں شاندار مکان بنوا لیا تھا۔ ایک لائق بیٹا اور ایک خوب صورت بیٹی پسماندگان میں چھوڑے تھے۔ چھت کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ جمیلہ خاتون دونوں بچوں کو لے بیٹھ گئیں۔ گھر کی گاڑی تھی۔ میاں کی ہینڈسم پنشن تھی۔ اچھی طرح گزارہ ہونے لگا لیکن شوہر کی بات ہی دوسری ہوتی ہے جبکہ بیٹا ابھی ملازمت کے لائق نہیں ہوا تھا۔ درخشاں بڑی تھی اور علی حامد چھوٹا تھا۔

درخشاں تو ماں سے لگی بیٹھی رہی لیکن علی باپ کے عدم وجود سے فائدہ اٹھا کر گلی میں نکل گیا۔ ابھی میٹرک کیا تھا کہ بری صحبتوں میں پڑ کر نشے کا عادی ہو گیا۔ لڑکا تھا اور بن باپ کا تھا۔ ماں کے لیے اکلوتا تھا۔ کسی نے غور بھی نہیں کیا کہ کس راہ پر چل نکلا ہے، ہوش تو اس وقت آیا جب گھر کی چیزیں غائب ہونے لگی تھیں۔

''اماں میری گھڑی یہاں رکھی تھی اب نہیں ہے۔''

''یہیں ہوگی بیٹا۔ کہاں چلی جائے گی۔''

''سب جگہ دیکھ لی۔ کہیں بھی نہیں ہے۔''

''تمہاری ہمیشہ سے عادت ہے۔ چیزیں رکھتی کہیں ہو دیکھتی کہیں ہو۔''

''ابھی تو رکھ کر گئی ہوں۔ کیا مصیبت ہے۔''

''میں تو تمہاری چیزیں دیکھتی نہیں ہوں۔ خود ہی کہیں رکھ کر بھولی ہوگی۔'' ماں نے کہا اور بہ ظاہر بات ختم ہو گئی۔ درخشاں نے گھر کا چپا چپا چھان مارا۔ گھڑی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ درخشاں نے ایک مرتبہ پھر گھر سر پر اٹھا لیا۔

''اماں میرے ٹاپس۔''

''کہاں رکھے تھے؟''



SCANNED BY PAKSOCIETY / URDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

"رات اتارے تھے۔ یہیں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔"

"کہیں اور دیکھو۔"

"سب جگہ دیکھ کر ہی آپ سے پوچھ رہی ہوں۔"

"کہیں اور چھوڑ کر آئی ہوگی۔ چیز گھر میں ہو تو کہیں نہیں جاتی۔"

"کہاں چھوڑ کر آئی ہوں گی۔ ٹاپس کوئی پاؤں کے چپل ہیں کہ کہیں جا کر اتار دیے ہوں گے اور پھر ننگے پاؤں گھر آگئی۔"

"اب میں کیا بتاؤں۔ گھر میں تم ہو یا میں ہوں۔"

"علی بھی تو ہے۔"

"وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟ میں اسے باقاعدگی سے پاکٹ منی دیتی ہوں اور اب تو وہ سدھر بھی گیا ہے۔ باقاعدگی سے کالج جانے لگا ہے۔"

"پھر تو جنات ہی ہوں گے جو میرے ٹاپس لے گئے۔" ایک مرتبہ پھر خاموشی نے چادر تان لی۔ درخشاں رو دھو کر چپ ہوگئی۔

جمیلہ خاتون نے ڈرتے ڈرتے علی کو بلا کر پوچھا بھی لیکن اس نے قسمیں کھا کر ماں کو یقین دلا دیا کہ درخشاں کے ٹاپس اس نے دیکھے تک نہیں لینا تو بڑی بات ہے۔

وقت پھر دبے قدموں گزرنے لگا۔ گھر میں لوگ ہی کتنے تھے ہر وقت سناٹا منہ چڑاتا رہتا۔ علی کو دوستوں سے فرصت نہیں تھی۔ درخشاں اپنے کمرے میں بند رہتی۔ جمیلہ خاتون ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر وقت گزار لیتیں۔

ایک دن یہ خاموشی پھر ٹوٹی۔ اس وقت یہ واردات جمیلہ خاتون کے کمرے میں ہوئی۔ درخشاں اور وہ شاپنگ کے لیے بازار گئی ہوئی تھیں۔ علی گھر پر تھا۔ شام کے وقت گئی تھیں، واپس آتے آتے رات ہوگئی۔ صبح ہوئی۔ کسی کام سے الماری کھولی تو پرائز بونڈ وہاں نہیں تھے۔ انہوں نے گھبرا کر درخشاں کو آواز دی۔

"درخشاں، دس ہزار کے پرائز بونڈ میں نے الماری میں رکھے تھے۔ اب نہیں ہیں۔"

"آپ کو اچھی طرح یاد ہے۔ الماری ہی میں تھے؟"

"ہاں بیٹا کل ہی تو جب ہم شاپنگ کے لیے جا رہے تھے میں نے دیکھے ہیں۔"

"اماں، اب تو آپ کو یقین آگیا کہ چور گھر کا ہے۔"

"بیٹا، میں کمرے کو لاک کر کے گئی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کمروں کی چابیاں بھی کسی کے پاس ہیں اور یہ علی کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"بیٹا بغیر دیکھے کسی کو چور کیسے کہہ دوں۔"

"خدا کو دیکھا نہیں ہے عقل سے پہچانا جاتا ہے۔ جب ہم شاپنگ کے لیے گئے تھے تو علی گھر پر تھا۔"

"اگر یہ اس کی حرکت ہے تو بیٹا میں کس کس چیز کی حفاظت کروں گی، گھر میں ہزار چیزیں ہیں۔"

"آپ بٹھا کر اس سے بات کریں۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

"کیا بات کروں؟ ایسی آنکھیں نکالتا ہے جیسے کھا جائے گا۔"

"تو پھر اسی طرح چیزیں لٹواتی رہیے۔ ایک دن گھر خالی ہو جائے گا۔"

"اپنی حفاظت خود کرو بیٹا۔"

"کس طرح حفاظت کریں۔"

جو حفاظت ممکن تھی وہ یہی تھی کہ دونوں نے اپنے اپنے کمروں کے لاک بدلوا لیے کہ اگر علی کے پاس چابیاں ہوں تو وہ چابیاں بےکار ہو جائیں۔

جب نگرانی بہت بڑھنے لگی تو علی جھنجلانے لگا۔ بات بات پر درخشاں سے الجھنے لگا۔ ماں بیچ میں بولتی تو وہ ان سے بھی بدزبانی پر اتر آتا۔ گھر کے ماحول میں ایسا تناؤ ہوگیا کہ درخشاں کا سانس لینا محال ہوگیا۔ ایسے میں اس نے یہی سوچا کہ کہیں نوکری کرلے۔ دن بھر تو گھر سے دور رہے گی۔

"اماں گھر میں رہ رہ کر اکتا گئی ہوں۔ میں نے اپنی ایک سہیلی کے ابو سے کہا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے کہیں نوکری دلا دیں گے۔"

"بس ایک یہی کمی رہ گئی تھی۔ اب تم نوکری بھی کروگی۔"

"تو پھر اور کیا کروں۔ مجھ سے گھر کے اس ماحول میں نہیں رہا جاتا۔ گھر سے نکلوں گی تو چار پیسے ہی آئیں گے۔"

"خاندان والے کیا کہیں گے کہ خان بہادر کی پوتی حامد علی خاں کی بیٹی معمولی سی نوکری کر رہی ہے۔"

"خاندان والے ہم سے ملنا تک تو گوارا نہیں کرتے۔ کچھ کہیں گے کس منہ سے۔"

"بیٹی، میں نے بہت سے لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ کوئی اچھا سا رشتہ آئے تو میں تجھے تیرے گھر کا کردوں۔ اس ماحول سے خود نجات مل جائے گی۔ نوکری کا خیال دل سے نکال دے۔"

کئی دن یہ تکرار چلتی رہی اور بالآخر جمیلہ خاتون کو اس کی بات ماننا پڑی۔

اس کی سہیلی کے ابو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ





وہ کسی دفتر کے بجائے اسکول میں نوکری کرے۔ آدھے دن کی نوکری ہوتی ہے اور سب خواتین ٹیچرز ہوتی ہیں لیکن وہ بضد تھی کہ نوکری تو وہ کسی دفتر ہی میں کرے گی، گورنمنٹ نہ سہی پرائیویٹ سہی۔ اب وہ انہیں یہ کیا بتاتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہنا چاہتی ہے۔

ایک روز اسے یہ خوش خبری مل گئی کہ اس کی نوکری پکی ہے۔ سفارش اتنی مضبوط ہے کہ وہ جائے گی اور کسی انٹرویو کے بغیر اسے نوکری مل جائے گی۔

گھر کی گاڑی تھی۔ وہ ڈرائیو کرتی بھی تھی لیکن جب سے علی نے جوانی میں قدم رکھا تھا گاڑی پر اس کا قبضہ ہوگیا تھا۔ ویسے بھی اس نے سوچا کہ دن بھر گاڑی اس کے پاس رہے گی تو اماں کو تکلیف ہوگی۔ وہ کبھی کبھی علی کے ساتھ کہیں چلی جاتی ہیں۔ بس سے جانا ہی ٹھیک رہے گا۔

پہلا دن تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جہاں اسے جانا ہے وہاں کون سی بس جاتی ہے، اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ ٹیکسی کرکے چلی جائے۔

اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو پتا سمجھایا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ پہلا موقع تھا جب وہ ٹیکسی میں اکیلی جا رہی تھی لیکن مطمئن تھی کہ دن کا وقت تھا اور راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی۔ درخشاں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر جائزہ لیا اور دروازہ کھول کر اتر گئی۔ کرایہ ادا کیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر سڑک پار کرلی۔ اس نے دور ہی سے ایک عمارت پر لکھا دیکھا تھا۔ "دہلی گارمنٹ (ہیڈ آفس)" یہی نام اسے بتایا بھی گیا تھا۔

سڑک پار کرکے وہ اس عمارت کے نیچے رک گئی۔ پرس سے ٹشو پیپر نکال کر ماتھے پر ابھرنے والے پسینے کے قطرے صاف کیے اور مرکزی دروازے سے اندر جا کر لفٹ میں داخل ہوگئی۔ اسے اس عمارت کی پانچویں منزل پر جانا تھا۔ پانچویں منزل پر پہنچنے کے بعد بھی اسے ایسا ہی ایک بورڈ نظر آیا۔ وہ اس بورڈ پر بنے تیر کے نشان پر چلتی رہی، ایک راہداری سے گزرنے کے بعد دائیں طرف مڑی تو استقبالیہ کا دفتر نظر آگیا۔

"مجھے اکرام صاحب سے ملنا ہے۔"

"آپ نے ان سے وقت لیا تھا؟"

"میرا نام درخشاں ہے اور مجھے تسکین صاحب نے بھیجا ہے۔ یہ دونوں باتیں انہیں بتا دیجیے۔"

استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور انٹرکام پر اطلاع دے دی۔

"جائیے آپ کو بلا رہے ہیں۔"

"مجھے کس طرف جانا ہوگا؟"

"ٹھہریے، میں چپراسی کو بلاتی ہوں، وہ آپ کو چھوڑ آئے گا۔"

اس نے چپراسی کو بلایا اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی مسٹر اکرام کے کمرے میں پہنچ گئی۔

اس کے سامنے ایک نہایت خوش شکل مہذب نوجوان بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر غرور ذرا سا بھی نہیں تھا۔ درخشاں کو دیکھتے ہی اکرام کے ہونٹوں پر ایک لطیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"تشریف رکھیے۔"

"سر! وہ میں......" درخشاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تسکین صاحب نے آپ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ آپ نے چونکہ بی۔کام کیا ہے اس لیے آپ ہمارے اکاؤنٹس سیکشن میں بہتر کام کرسکیں گی۔ کیا کہتی ہیں آپ؟"

"سر! مجھے نوکری سے غرض ہے۔"

"ہمیں کام سے غرض ہے اور میرے خیال میں آپ اکاؤنٹس کے شعبے میں ٹھیک رہیں گی۔ میں منیجر کو بلواتا ہوں۔ وہ آپ کو کام سمجھا دیں گے۔ شعبے کے انچارج سے بھی ملوا دیں گے۔ بس ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ میں زیادہ چھٹیاں کرنے والے ملازمین کو قطعی پسند نہیں کرتا۔"

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اپنے گھر سے اتنی تنگ ہے کہ اس کا بس چلے تو رات بھی دفتر ہی میں گزار دے، چھٹی کیا کرے گی۔

اکرام نے فون اٹھایا اور منیجر کو بلا لیا۔ دفتر تھا ہی کتنا بڑا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کمرے میں آیا اور نہایت ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

"یہ مس درخشاں ہیں۔ میں نے ان کا اکاؤنٹ کے شعبے میں تقرر کیا ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے کہیں ملازمت نہیں کی ہے لہٰذا قطعی تجربہ نہیں ہے البتہ بی کام ہیں۔ مرزا صاحب سے کہنا انہیں ان کا کام سمجھا دیں بلکہ کچھ دنوں میں محنت کرکے سکھا بھی دیں۔"

"جی بہتر۔" منیجر نے کہا۔

"آپ جب چاہیں میرے پاس آسکتی ہیں۔"

"شکریہ سر۔"

وہ منیجر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اکاؤنٹ کا شعبہ غالباً اوپری منزل پر تھا اسی لیے منیجر اسے لے کر سیڑھیاں چڑھ گیا۔ درخشاں کے ذہن میں پہلی مرتبہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

خطرے کی گھنٹی بجی۔ وہ سوچ رہی تھی اس نے اس دفتر کا انتخاب کرکے غلطی کی۔ یہاں تو عورت نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ اتنے مردوں میں اکیلی کام کیسے کروں گی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ منیجر نے اس کا ذہنی تسلسل توڑ دیا۔

''میرا نام ارشاد حسین ہے۔ آپ کو یہاں کوئی بھی تکلیف ہو فوراً مجھ سے رابطہ کریں۔ اکرام صاحب سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے لوگ کسی کے کام نہیں آتے۔''

درخشاں دل ہی دل میں ہنس دی۔ بی بی ابھی تو دیکھتے جاؤ کتنے ہمدردوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مردوں کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ جہاں کوئی لڑکی دیکھی اور لگے ہمدردی کے ڈونگرے برسانے۔

منیجر اسے لے کر لکڑی کے بنے ہوئے ایک کیبن میں لے گیا۔ وہاں انہی کی عمر کا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ متین صاحب ہیں۔ اس شعبے کے انچارج اور یہ مس درخشاں ہیں۔ آپ کی نئی ماتحت۔ اکرام صاحب نے ان کا تقرر کیا ہے۔ آپ کو انہیں کام سمجھانا اور سکھانا ہے۔''

''سر، میں پوری کوشش کروں گا کہ ان کا یہاں دل لگ جائے۔''

ارشاد صاحب اس کا تعارف کرانے کے بعد رخصت ہوگئے۔ متین صاحب کی آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

''یہاں کام زیادہ نہیں ہے اور جتنا کچھ ہے بھی اس کے کرنے کے لیے یہاں اور لوگ موجود ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔''

''سر! میں یہاں کام کرنے کے لیے آئی ہوں۔ بیٹھی رہوں گی تو کام سیکھوں گی کیسے؟''

''میرا مطلب یہ تھا کہ آہستہ آہستہ کام سیکھتی رہیں کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔''

''سر! میں تو کام سے زیادہ یہ سوچ رہی ہوں کہ اتنے مردوں کے درمیان میں اکیلی بیٹھوں گی کیسے؟''

''میں بھی یہ کب چاہوں گا کہ آپ سب کے درمیان بیٹھیں۔ آپ جب کمرے میں داخل ہوئی تھیں میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ آپ کو کہاں بٹھانا ہے۔ میرے کیبن کے برابر میں ایک کیبن ہے۔ وہ آپ کا ہوگا۔ اس کا ایک پچھلا دروازہ بھی ہے اس سے آپ میرے کیبن میں آ جا سکتی ہیں۔ آپ کو سیکشن میں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ کی ہر مدد کے لیے میں جو موجود ہوں۔''

اس نے شکر کا سانس لیا لیکن متین صاحب کی طرف سے کچھ چوکنی بھی ہوگئی۔ ان کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا جیسے ایک عورت اچھی طرح پہچانتی ہے۔

''ایک بات اور بتا دوں۔'' متین صاحب پھر گویا ہوئے۔ ''یہ ارشاد بھروسے کے لائق نہیں۔ ان سے ربط ضبط کچھ کم ہی رکھیے گا۔''

''مجھے کسی سے کیا سروکار۔''

''آئیے میں آپ کو آپ کے کیبن میں لے چلوں۔''

وہ پچھلے دروازے سے دوسرے کیبن میں چلے گئے۔ اس کا ایک دروازہ سیکشن میں کھلتا تھا دوسرے سے وہ متین صاحب کے کمرے میں آسکتی تھی۔ ''سیکشن میں بھی کسی کو منہ لگانے کی ضرورت نہیں۔ بس مجھ سے تعلق رکھیے گا۔''

''متین صاحب جیسے حالات ہوں گے ویسا کرلوں گی۔ آپ بے فکر رہیں۔''

متین صاحب کو اس کی طرف سے ایسے خشک جواب کی توقع نہیں تھی۔ جھینپ کر رہ گئے۔ ''میں ضروری فائلیں لاکر آپ کی میز پر رکھ دیتا ہوں۔ ٹائپسٹ باہر بیٹھا ہے۔ اگر کچھ ٹائپ کرانا ہوا کرے تو آپ اسے بلوا سکتی ہیں۔''

وہ کچھ اس طرح باہر نکلے تھے جیسے خفا ہوگئے ہوں۔ ان کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگی تھی کہ اسے ایسا جواب نہیں دینا چاہیے تھا۔ ان سے تو بنا کر رکھنی چاہیے۔ آنکھوں میں بے ہودگی ہے تو ہوا کرے۔ کچھ دن میں خود ہی مایوس ہو جائیں گے۔

کیبن میں اکیلے بیٹھے بیٹھے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ پچھلے دروازے سے نکلی اور متین صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ ''سر! فائلیں ابھی نہیں پہنچیں۔ کوئی کام بھی آپ نے نہیں بتایا۔ میں تو اکیلی بیٹھی بیٹھی بور ہوگئی۔''

''میں نے چپراسی سے کہہ تو دیا تھا۔ خیر آپ چلیں میں آتا ہوں۔''

وہ اپنے کیبن میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد چپراسی فائلیں لے کر آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے متین صاحب بھی پہنچ گئے۔ وہ اسے ایک ایک فائل کے بارے میں بتاتے اور سمجھاتے رہے۔ اسی میں دوپہر ہوگئی۔

''آپ لنچ یہیں کریں گی یا میرے ساتھ باہر چلیں گی۔'' متین صاحب نے نہایت بے تکلفی سے بہت بڑی بات کہہ دی۔

''میں دوپہر کا کھانا نہیں کھاتی۔''

''اوہ تو آپ اسی لیے اتنی اسمارٹ ہیں۔''

یہ جملہ بھی کم از کم ان کی عمر کے آدمی کی زبان سے ناقابل برداشت تھا لیکن درخشاں کو برداشت کرنا پڑا۔





البتہ وہ یہ سوچ ضرور رہی تھی کہ یہ آدمی تو اس کے لیے مصیبت بن جائے گا۔

متین صاحب اٹھ کر چلے گئے تھے۔ وہ فائلوں پر جھکی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ایک اٹھارہ بیس سال کا لڑکا اندر آیا۔ ''مس، میرا نام ارسلان ہے۔ میں یہاں ٹائپسٹ ہوں۔ متین صاحب نے کہا تھا، آپ سے مل لوں۔''

''میں خود ابھی باہر آنے والی تھی۔ سب لوگوں سے ملوں گی۔ آخر آپ لوگوں کے ساتھ ہی کام کرنا ہے۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ کوئی کام ہوا کرے گا تو تمہیں بلوا لیا کروں گی۔''

''جی میڈم۔'' وہ بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ چلا گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہی خوش خبری سنادی کہ مس درخشاں ابھی باہر آئیں گی اور سب سے ملیں گی۔

''ابے تو نے کیا جادو کر دیا کہ وہ پنجرے سے باہر آنے پر تیار ہوگئی۔''

''جادو کیسا۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کبھی کبھی آپ کے پاس آکر بیٹھ جایا کروں۔ کہنے لگیں صرف تم آؤ گے تو سب کو اعتراض ہوگا۔ پہلے میں خود باہر آکر سب سے ملوں گی۔ پھر تم آجایا کرو گے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ابے شرم کر۔ تجھ سے تو وہ بڑی ہی ہوگی۔ وہ تو ہمارے جوڑ کی ہے۔'' ایک نے کہا اور سب نے قہقہے لگائے یہ قہقہے اچانک منہ کے منہ میں رہ گئے۔ درخشاں اپنے کیبن سے باہر نکلی تھی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔''

''بھئی، آپ لوگوں سے تعارف ضروری تھا۔ آپ ہی لوگوں کے ساتھ مل کر مجھے کام کرنا ہے۔''

''ہم لوگ تو خود ہی یہ سوچ رہے تھے کہ جب تک تعارف نہیں ہوگا کام کیسے چلے گا۔''

''میرا نام درخشاں ہے۔'' اس نے اپنا نام بتایا اور پھر ایک ایک کے نام سے واقفیت حاصل کی۔ کچھ دیر کام سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے کیبن میں آگئی لیکن اپنے پیچھے باتوں کا بازار چھوڑ آئی۔

''یار ویسے ہے بااخلاق۔ پہلے ہی دن گھل مل گئی۔''

''یار! یہ جو نوکری والی لڑکیاں ہوتی ہیں، ہوتی بڑی چلتر ہیں۔''

''ابے سب ایک سی نہیں ہوتیں۔ کوئی مجبوراً بھی نوکری کرنے نکلتی ہے۔''

''یہ مجبوری والی نہیں لگتی۔ کپڑے دیکھے تم نے۔''

''دیکھو کس کے ہاتھ لگتی ہے۔ پہلے والی تو متین صاحب نے اچک لی تھی۔''

''یہ تو مجھے ایسی لگتی ہے کہ سب کی پلیٹ میں کھائے گی۔ صرف متین صاحب سے بہلنے والی نہیں۔'' ایک مرتبہ پھر قہقہہ بلند ہوا۔

''چلو یار، اس کے آنے سے کچھ رونق تو آئی۔ پڑے بور ہوتے رہتے تھے۔''

یہ دن اس نے دفتر میں کوئی ایسا برا بھی نہیں گزارا تھا۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔ کوئی لمبا چوڑا اسٹاف نہیں تھا اور سب بظاہر ہمدرد ہی معلوم ہوتے تھے۔ چھٹی کے بعد وہ خوش خوش گھر پہنچی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ کوئی ہنگامہ اس کا منتظر ہوگا۔ اسے دیکھتے ہی علی نے گھر سر پر اٹھا لیا۔

''سنا ہے تم نے نوکری کرلی ہے؟''

''ہاں اور کیا کرتی۔ نوکری تو تمہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''گھر میں کیا فاقے ہو رہے ہیں؟''

''تم سلامت ہو تو وہ بھی ہونے لگیں گے۔''

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں گھومنے پھرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔'' پھر وہ ماں سے مخاطب ہوا۔ ''اماں اس کی شادی کردو ورنہ یہ ہم سب کی ناک کٹوا دے گی۔''

''بکواس بند کرو علی۔'' ماں نے اسے ڈانٹا۔ ''بڑی بہن سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''میں بھائی ہوں۔ اس کی آوارگی کا دکھ مجھے نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔ لڑکے تو مجھے طعنے دیں گے ناکہ تمہاری بہن نوکری پر جاتی ہے۔''

''اتنی غیرت ہے تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو۔''

''میں یہ بھی معلوم کرلوں گا کہ یہ نوکری پر جاتی ہے یا کسی سے ملنے۔'' اس نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

درخشاں بڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ جمیلہ خاتون بھی بھیگی آنکھوں سے علی کی ہدایت کے لیے دعائیں مانگتی رہیں۔ اسی دن درخشاں کے پرس سے سو روپے کا نوٹ پھر غائب ہوگیا لیکن اس نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا کہ ابھی اتنا ہنگامہ ہوا ہے۔ ایک جھگڑا اور کھڑا ہو جائے گا۔

وہ رات کو سونے کے لیے لیٹی تو دفتر کا ماحول گھر کے ماحول سے کہیں بہتر نظر آنے لگا۔ اب تک وہ یہ سوچتی رہی تھی کہ اتنے مردوں کی ندیدی نظروں کا وہ کب تک مقابلہ کرے گی جبکہ اس کا حصہ بانٹنے کے لیے دوسری عورت بھی موجود نہیں۔ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو تو دفتر سے باہر ہی سمجھو۔



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com

www.paksociety.com

صبح وہ وقت سے بہت پہلے اٹھ گئی۔ جلدی جلدی تیار ہوئی اور دفتر کے لیے نکل گئی۔ اسے ڈر تھا کہ علی اٹھ گیا تو پھر کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ اس نے ٹیکسی کے بجائے بس کا سہارا لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ وقت سے پہلے دفتر پہنچ گئی۔ اس وقت تک کوئی بھی نہیں آیا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر کانپ گئی کہ اس کے پہنچتے ہی متین صاحب بھی پہنچ گئے۔

"کیا اس دفتر میں لوگ دیر سے آتے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"لوگ دیر سے نہیں آتے ہم جلدی پہنچ گئے ہیں۔ مجھے معلوم تھا تم ابھی نئی ہو جلدی دفتر آؤ گی لہٰذا میں بھی آ گیا۔ گھر سے چائے بنوا کر لایا ہوں آؤ بیٹھ کر پیتے ہیں۔"

درخشاں کو بھی مذاق سوجھا اور وہ ان کے ساتھ ان کے کیبن میں چلی گئی۔

"سر! آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"بھئی یہ بچے درمیان میں کہاں سے آ گئے۔ یہ لو چائے پیو۔" انہوں نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"سر! بتایئے نا۔ بیٹیاں کتنی ہیں؟"

"دو بیٹیاں ہیں میری۔" متین صاحب کا جوش وخروش رخصت ہو گیا تھا۔

"شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں بھائی بیٹے بڑے ہیں۔ بیٹیاں چھوٹی ہیں۔"

"کتنی چھوٹی۔ میرے برابر تو ہوں گی۔" وہ دیکھ رہی تھی کہ متین صاحب کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ "کبھی آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلوں گی۔ آنٹی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور آپ کی بیٹیوں سے بھی۔"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" انہوں نے اس طرح کہا جیسے قبر سے مردہ بول رہا ہو۔

"میں اپنے کیبن میں ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔"

وہ کیبن سے باہر آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سب لوگ آ چکے ہیں۔ وہ سب کی طرف ایک مسکراہٹ اچھالتی ہوئی اپنے کیبن کی طرف بڑھ گئی۔

"یار! یہ متین صاحب اس عمر میں بھی خوب چکر باز ہیں۔ آتے ہی درخشاں پر جادو کر دیا۔"

"تف ہے تم جوانوں پر۔"

"یار، یہ اپنے عہدے کا غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔"

"یہ لوگ رات کو گئے بھی تھے یا نہیں۔ صبح ہوتے ہی میڈم باوری کیبن سے برآمد ہوئی۔"

کچھ دیر بعد درخشاں خود باہر آ گئی اور باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ اب پورا سیکشن اس کی تعریفوں اور خوشامد میں لگا ہوا تھا۔

متین صاحب کی زبان درازیوں کا سلسلہ کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا تھا۔ بیٹیوں کا ذکر چھیڑ کر درخشاں نے انہیں شرمندہ کر دیا تھا لیکن ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد وہ اپنی روش پر لوٹ آئے۔ درخشاں ان کی فطرت سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔ ایک روز اسے معلوم ہوا اکرام صاحب دورے پر آ رہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ خبر ارسلان ٹائپسٹ نے آ کر اسے دی۔

"اکرام صاحب دورے پر آ رہے ہیں۔ آپ کوئی فائل کھول کر بیٹھ جائیں تاکہ انہیں معلوم ہو آپ مشغول ہیں۔" سیکشن میں سناٹا چھا گیا۔ صرف ٹائپ مشین کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ بھی کام میں مشغول ہو گئی۔

دروازے پر کسی نے دستک دی اور اکرام صاحب اس کے کیبن میں داخل ہوئے۔ وہی ہنستا مسکراتا مہذب چہرہ۔

"گڈ مارننگ سر۔"

"گڈ مارننگ۔ کیسی ہو درخشاں؟"

"ٹھیک ہوں سر۔"

"میرے دفتر میں تو تم اس دن کے بعد سے آئیں ہی نہیں۔"

"جی، میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"جب مناسب سمجھو تو ضرور آنا۔" انہوں نے کہا اور کیبن سے نکل گئے۔

ابھی دو تین دن ہی گزرے تھے کہ معلوم ہوا اکرام صاحب پھر دورے پر آ رہے ہیں۔ وہ تصدیق کے لیے کیبن سے باہر آئی تو وہاں ہونے والی باتوں میں سے کچھ اس کے کانوں میں بھی پڑ گئیں۔

"اکرام صاحب آج کل بڑے دورے کر رہے ہیں۔ پہلے تو مہینوں میں چکر لگاتے تھے۔"

"درخشاں کو دیکھنے آتے ہیں اور کچھ نہیں۔"

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

وہ الٹے قدموں لوٹ آئی۔ "کیا یہ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اکرام صاحب کیا واقعی مجھ میں دلچسپی لے رہے ہیں؟" اسے اپنے آپ پر فخر ہونے لگا۔

سیکشن میں پھر سناٹا چھا گیا۔ کسی مخبر نے آ کر اطلاع دی تھی کہ اکرام صاحب نیچے آنے کے لیے اپنے کمرے سے نکل چکے ہیں۔




# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## ہم خاص کیوں ہیں:-

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

کچھ دیر بعد پھر وہی ہوا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور اکرام صاحب اس کے سامنے تھے۔

''گڈ مارننگ سر۔''

''گڈ مارننگ۔ کیسی ہو درخشاں؟'' انہوں نے کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ پہلے وہ کھڑے کھڑے چلے گئے تھے لیکن اس مرتبہ بیٹھ گئے تھے۔

''اسٹار فیبرکس کی فائل مجھے دکھایئے۔''

''جی بہتر۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور شیلف میں اسی جگہ ہاتھ ڈالا جہاں وہ فائل تھی۔

''گڈ۔ ویری گڈ۔ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ تمام فائلیں آپ کی نظر میں ہیں یا نہیں۔''

''میری نظر میں فائلیں ہی نہیں لوگ بھی ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''کبھی آپ نے موقع دیا تو ضرور بتاؤں گی۔''

''یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ آپ کچھ دیر بعد میرے کمرے میں تشریف لائیں۔ تفصیلی بات وہاں ہوگی۔''

ان کے چلے جانے کے بعد اس نے اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکالا۔ لپ اسٹک کے شیڈ کو گہرا کیا۔ بالوں میں ہلکا سا کنگھا پھیرا اور کیبن سے نکل گئی۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ سیکشن کا مخبر دوڑتا ہوا آیا۔

''باادب باملاحظہ ہوشیار۔ آپ لوگوں میں سے کوئی بتا سکتا ہے مس درخشاں یہاں سے نکل کر کہاں گئی ہیں۔ یقیناً نہیں بتا سکتا۔ یہ بندۂ ناچیز مطلع کر رہا ہے کہ اس کی گناہ گار آنکھوں نے درخشاں کو اکرام صاحب کے کمرائے خاص میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''لو بھئی کر لو گل۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

''ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ اکرام صاحب کا جلد جلد دورے کرنا خالی از علت نہیں۔ چڑیا گئی ہمارے ہاتھوں سے۔''

اکرام نے اسے کمرے میں دیکھتے ہی کسی مہذب آدمی کی طرح کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور جب تک وہ بیٹھ نہیں گئی وہ اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا۔

اس نے گھنٹی بجائی اور چپراسی چائے اور بسکٹ لے کر آ گیا۔

''سر آپ نے یہ تکلف کیوں کیا؟''

''اس لیے کہ آرام سے اور تفصیل سے بات ہو سکے۔ اب مجھے بتایئے وہ کیا بات تھی جو آپ مجھ سے کہنا چاہتی تھیں؟''

''سر کوئی خاص بات نہیں۔ آپ تو فکرمند ہو گئے۔''

''میں نے آپ کے لہجے کی تشویش کو بھانپ لیا تھا۔ کہیے کیا بات ہے۔''

''سر میری عادت نہیں کہ کسی کی شکایت کروں لیکن بات ایسی ہے جو میرے کام پر اثر انداز ہو رہی ہے اس لیے کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔''

''اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔''

''سر متین صاحب کے رویے نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ وہ اپنی عمر کا بھی خیال نہیں کرتے اور ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو میرے لیے کوفت کا باعث بنتی ہیں۔ صاف لفظوں میں تو یہ ہے کہ وہ اپنی دانست میں مجھ سے عشق فرما رہے ہیں اور دوسروں کے سامنے اس کا چرچا بھی کرتے ہیں۔''

''اسے آپ معمولی بات کہہ رہی ہیں لیکن کیا کروں کہ دہلی سے ان کا اور میرے والد صاحب کا ساتھ ہے ورنہ آپ کے سامنے بلا کر انہیں ڈانٹتا بلکہ کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیتا۔ پھر بھی آپ اطمینان رکھیں میں اکیلے میں بلا کر انہیں سمجھاؤں گا۔''

''شکریہ سر لیکن بات اس طرح کیجیے گا جیسے آپ کو کہیں سے معلوم ہوا ہے۔ میرا نام درمیان میں نہ آئے۔''

''میں اتنا نادان نہیں ہوں۔''

اس کے بعد وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لیے بہت کچھ پوچھتے رہے۔ وہ بھی محتاط انداز میں کچھ چھپاتی کچھ بتاتی رہی۔ وہ وہاں سے لوٹ کر آئی تو اکرام کے کمرے میں ہونے والی گفتگو پر غور کرنے لگی۔ اسے اب پورا یقین ہونے لگا تھا کہ اکرام اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ کوئی اپنے ملازموں سے اس طرح پیش نہیں آتا جس طرح وہ پیش آیا تھا۔ وہ کوئی مہمان نہیں تھی جو اس کے لیے چائے منگائی جاتی۔ پھر اس نے اس کی ذاتی زندگی سے متعلق جو باتیں پوچھی تھیں ان کے ذریعے شاید وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں شادی شدہ تو نہیں ہوں۔

اس کو اکرام کا اس طرح دلچسپی لینا برا نہیں لگا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ دولت مند تھا یا نوجوان تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی آنکھوں میں شیطانیت نہیں تھی۔ بوالہوسی کے رنگ نہیں جھلک رہے تھے۔ ایک معصومیت تھی جو اس کے اعتماد کی انگلی تھام کر آگے بڑھنا چاہتی تھی۔

اگلے دو دنوں میں اسے معلوم ہوا کہ متین صاحب کو اکرام نے بلایا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ چونکتی۔ کسی دفتری کام سے بھی بلایا جا سکتا تھا۔ وہاں کیا باتیں





ہوئی تھیں یہ تو اس کو اس وقت معلوم ہوا جب متین صاحب شرمندگی اور گھبراہٹ کا مجسمہ بن کر اس کے سامنے آئے۔

''بیٹی درخشاں تم نے کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اکرام صاحب سے میری شکایت کر دی۔ پہلے مجھ سے تصدیق تو کر لی ہوتی۔ لوگوں نے تمہیں بھڑکا دیا اور تم پہنچ گئیں اکرام صاحب کے پاس۔''

''متین صاحب! نہ مجھے کسی نے بھڑکایا نہ میں نے آپ کی شکایت کی۔ انہیں خود کچھ معلوم ہوا ہو تو الگ بات ہے۔ کیا انہوں نے میرا نام لیا ہے کہ میں نے شکایت کی ہے؟''

''وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ آپ کا نام لیتے۔ کہا تو انہوں نے یہی ہے کہ انہیں کہیں سے معلوم ہوا ہے لیکن میں نے بھی بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ بیٹی درخشاں! میں اس کے باپ کا دوست ہوں۔ وہ میرے بچوں کی طرح ہے۔ اس کے سامنے میری بڑی بے عزتی ہوئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

درخشاں کو ان کے بڑھاپے پر رحم آ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ان کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''انکل! آپ یقین کیجیے میں نے اکرام صاحب سے آپ کی شکایت نہیں کی۔ مجھے آپ سے شکایت ضرور تھی لیکن میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔''

''مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنی عمر کو بھول کر تم سے کچھ باتیں کیں۔ اب اگر میری عزت کا تمہیں پاس ہے۔ میرے سفید بالوں کا خیال ہے تو اکرام صاحب سے جا کر کہو کہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں۔ کسی نے غلط چغلی کی ہے اور اگر کوئی بات ہے بھی تو تم نے مجھے معاف کر دیا۔ پلیز درخشاں، میری نوکری چلی جائے گی ورنہ ابھی مجھے بیٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ میں اکرام صاحب سے بات کر لوں گی۔ آپ کی نوکری نہیں جائے گی۔ آپ بھی وعدہ کریں کہ آئندہ مجھے اپنی بیٹی سمجھیں گے۔''

''سمجھیں گے کیا۔ آج سے تم واقعی میری بیٹی ہو۔'' انہوں نے جذباتی انداز میں کہا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اب آپ اپنے کمرے میں تشریف لے جائیں۔ میں اکرام صاحب کے پاس جاتی ہوں۔''

''درخشاں بیٹی! میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔''

''باپ بیٹی کے درمیان شکریے کا لفظ موزوں نہیں ہوتا۔''

اس یاددہانی کے باوجود متین صاحب نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کیبن کی طرف چلے گئے۔ وہ بھی وعدے کے مطابق اکرام کے پاس پہنچ گئی۔

''آیئے درخشاں۔ اس مرتبہ بڑی جلدی کرم فرمایا۔ یقیناً متین صاحب آپ سے ملے ہوں گے۔''

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا سر میں ان کی سفارش لے کر آئی ہوں۔ بے چارے بہت شرمندہ تھے۔ میرے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ مجھے اپنی بیٹی ماننے کو تیار تھے۔ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ آپ بھی اس قصے کو یہیں ختم کر دیجیے پلیز! ان کی نوکری پر حرف نہ آئے۔''

''درخشاں، کچھ نہیں ہوگا۔ میں اگر چاہوں بھی تو انہیں نوکری سے نہیں نکال سکتا۔ وہ ڈیڈی کے بہت پکے دوست ہیں۔ میں یہاں سے انہیں نکال دوں گا تو ڈیڈی انہیں فیکٹری میں بلا لیں گے۔ میرا مقصد تو یہ تھا کہ وہ راہ راست پر آ جائیں۔ تم کہتی ہو کہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''

''اچھا تو پھر میں چلتی ہوں۔''

''ارے ایسے کیسے۔ میں نے چائے کو کہہ دیا ہے۔''

''سر! کام بہت پڑا ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر آ گئی تھی۔''

''اچھا جی! تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ تم بہت کام کرتی ہو۔''

''آپ کے دفتر میں کام ہے ہی کہاں۔ میں نہ بھی ہوتی تو کام پینڈنگ نہ رہتا۔ مجھے تو خواہ مخواہ رکھ لیا آپ نے۔''

''چلو اس ''خواہ مخواہ'' کا ازالہ بھی کر دیں گے۔ فی الحال تو چائے پئیں۔'' چپراسی کو چائے لاتے ہوئے دیکھ کر اکرام نے کہا۔

اس دفتر میں کسی سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ خبر بھی پہنچ گئی کہ درخشاں نے متین صاحب کی شکایت کر دی اور انہیں خوب ڈانٹ پڑی۔ درخشاں کے کیبن میں جا کر معافی مانگنی پڑی متین صاحب کو۔

''بیٹا اپنی اپنی خیر مناؤ۔ درخشاں جب چاہے گی ہم میں سے کسی کا بھی پتا صاف کرا دے گی۔''

''اکرام صاحب آخر اس کی ہر بات کیوں مانتے ہیں؟''

''یہ پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی بات ہے۔ بس چپ رہو تو بہتر ہے۔''

ابھی اس خوشگوار حادثے کو دو دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اکرام نے اسے بلایا۔ دفتر میں چھپا مخبر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ اکرام کے دفتر میں داخل ہوئی۔

''درخشاں! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

اکاؤنٹ کے شعبے میں تم فٹ نہیں ہو۔ کام صحیح نہیں ہو رہا ہے۔"

"اگر آپ مطمئن نہیں ہیں تو میں استعفیٰ دے دیتی ہوں یا آپ خود نکال دیں۔"

"اگر آپ کو کسی اور شعبے میں ٹرانسفر کر دیا جائے؟"

"مجھے دیکھنا پڑے گا کہ میں اس شعبے میں بھی فٹ رہوں گی یا نہیں۔"

"میری سیکریٹری استعفیٰ دے کر چلی گئی ہے۔ آپ اس کی جگہ آجائیں۔"

"سچ بتایئے اس نے خود استعفیٰ دیا ہے یا آپ نے اسے نکال دیا؟"

"یہ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں کسی کو نکال سکتا ہوں۔"

"مجھے تو نوکری کرنی ہے، وہاں نہ سہی یہاں سہی۔"

باتوں کے بازار میں ایک تذکرہ اور چھڑ گیا۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے بےکار کلرکوں کو ایک موضوع اور مل گیا۔

"یار یہ تو بڑی مرچ نکلی۔ اکرام صاحب کے منہ کا ذائقہ بھی بدل دیا۔"

"میں نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ کر کے ہی دم لے گی۔"

"تیز لگتی تھی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنا بڑا ہاتھ مارے گی۔"

"اس نے متین صاحب کو چت کر دیا تو ہم کیا چیز ہیں۔"

ایک موضوع خود درخشاں کے ہاتھ بھی لگ گیا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ اکرام خودبخود اس کے شیشۂ دل میں اتر گیا تھا۔ اس نے کس خوب صورتی سے اسے خود سے قریب کر لیا تھا۔ اب وہ چاہے گی بھی تو اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکے گی۔ اس نے لیڈی سیکریٹری اور باس کے بڑے بڑے قصے سن رکھے تھے۔ وہ ایسا ہی کوئی قصہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایک حد تک ہی ڈور کو ڈھیل دے گی۔ اگر اکرام نے شادی کرنی چاہی تو بات الگ ہوگی ورنہ وہ کھلونا بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔

وہ اکرام کے کمرے سے متصل ایک کمرے میں منتقل کر دی گئی۔ اس کی میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون تھا یا پچھلا دروازہ جس سے وہ اکرام کے کمرے میں جا سکتی تھی۔ پابندی اکرام پر بھی نہیں تھی۔

"آج تمہیں میرے ساتھ لنچ پر جانا ہوگا۔"

"کیا پچھلی سیکریٹری بھی آپ کے ساتھ لنچ پر جایا کرتی تھی؟"

"وہ صرف سیکریٹری تھی۔"

"اور میں؟"

"یہ اگر لنچ کی محفل پر بیٹھ کر بتاؤں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

وہ خاموشی سے نکلی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

وہ ایک اعلیٰ ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"تم پوچھ رہی تھیں کیا پچھلی سیکریٹری بھی میرے ساتھ لنچ پر جایا کرتی تھی۔"

"میں پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا لنچ پر آنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے؟"

"میں نے کہا تھا، وہ صرف سیکریٹری تھی۔ تم نے پوچھا تھا اور اس کا جواب یہ ہے کہ تم میری محبت ہو۔ اظہار کیے بغیر بات تم تک بھی پہنچ گئی۔ سچائی کی گواہی تمہارے دل نے بھی دی ہوگی لیکن تمہیں بجا طور پر اظہار کی طلب ہوگی۔ درخشاں تم میرے لیے کھلونا نہیں ہو۔ میرا مستقبل ہو۔ میں تمہیں بار بار لنچ پر بلانے کے بعد یہ کہنا نہیں چاہتا کہ میری فلاں مجبوری تھی ورنہ میں تم سے شادی کر لیتا بلکہ آج ہی کہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا گھر دکھا دو تا کہ میں تمہارے گھر والوں سے تمہیں مانگ لوں۔ جتنے دن گزریں گے دفتر میں باتیں ہی بنیں گی۔"

"سر! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم غریب لوگ ہیں آپ کے لائق نہیں ہیں۔"

"میں نے تم سے تمہاری آمدنی نہیں پوچھی گھر کا ایڈریس پوچھا ہے۔"

"جس رنگ کا کپڑا ہوتا ہے اسی رنگ کے دھاگے سے سیا جاتا ہے۔"

"میں اسی رنگ میں آکر تمہاری ماں سے ملوں گا۔"

"میں جتنی آزاد خیال لگتی ہوں میرے گھر والے ویسے نہیں ہیں۔ وہ کہیں گے یہ مکان ہے دکان نہیں کہ خریدار آگئے۔"

"میں تمہیں خریدنے نہیں خود کو بیچنے آؤں گا۔"

"اس کے لیے آپ کے بڑوں کو آنا چاہیے۔"

"میں پہلے تمہاری والدہ سے مل کر ان کا عندیہ تو لے لوں۔ یہ تو معلوم کر لوں کہ وہ میرے بڑوں سے ملنا چاہتی بھی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد بڑوں کو بھی لے آؤں گا۔ بڑوں میں ہے کون۔ سب تو ہجرت کے دوران کٹ مر گئے۔ والدہ بھی اب اس دنیا میں نہیں۔ صرف والد ہیں وہی میرے ساتھ آئیں گے۔"





"میرے خیال میں آپ کا جانا مناسب نہیں ہوگا۔ میں کسی ذریعے سے آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گی۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہیں۔"

"تم کوئی ذریعہ کیوں تلاش کرو۔ ان سے خود کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔"

"میں نہیں چاہتی کہ ان پر یہ ظاہر ہو کہ اس میں میرا بھی کوئی عمل دخل ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ کوئی ذریعہ تلاش کرے گی لیکن جب کوئی ذریعہ تلاش کرنے بیٹھی تو کوئی نام سامنے نہیں آرہا تھا۔ پہلے اسے اپنے بھائی علی کا خیال آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے رد کر دیا۔ جب سے وہ نوکر ہوئی تھی کچھ نہ کچھ پیسے علی کے ہاتھ میں رکھ دیا کرتی تھی۔ اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی اس سے یہ کام لے سکتی تھی لیکن پھر اسے یہ خیال آیا کہ وہ اسے بلیک میل کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔

اگر کوئی آدمی دفتر کا ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں اکرام نے خود پیغام بھیجا ہے۔ اس کے ذہن میں ارسلان ٹائپسٹ کا نام آیا جو اس کا بہت ادب کرتا تھا لیکن یہ نام بھی اس کی کم عمری کی وجہ سے جچا نہیں۔ کوئی ایسا آدمی ہو جو بُردبار ہو تا کہ اماں کو قائل کر سکے۔ وہ انکار بھی کریں تو وہ ان کے انکار کو اقرار میں بدل دے۔ بُردبار کا خیال آتے ہی متین صاحب کا نام اس کے ذہن میں گونجا۔ وہ مجھے بیٹی کہنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ اس دن کے بعد سے کبھی شکایت کا موقع بھی نہیں دیا۔ وہ ضرور میرا یہ کام کر دیں گے۔

جب متین صاحب کے نام پر اس کا دل ٹھٹک گیا تو اس نے دفتر پہنچتے ہی انہیں اپنے کیبن میں بلا لیا۔

"انکل! آپ کی بیٹی پر ایک پریشانی آپڑی ہے۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"بولو بیٹی۔ مجھے تمہارا کوئی کام کر کے خوشی ہوگی۔"

"بات یہ ہے انکل......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"بولو بیٹی، کیا بات ہے؟ کہو گی نہیں تو مجھے معلوم کیسے ہوگا؟"

"انکل! اکرام صاحب مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"ارے یہ تو خوشی کی بات ہے۔ ہماری بیٹی کو اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔"

"پریشانی یہ ہے کہ میری والدہ تک یہ بات پہنچانی ہے اور ان کی رضا بھی لینی ہے۔ وہ اگر تیار ہوں گی تو پھر اکرام صاحب اپنے والد کو لے کر اماں کے پاس چلے جائیں گے۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں تو اپنی بیٹی کے لیے ان کے قدموں میں سر رکھ کر اجازت لے لوں گا۔"

"بس انکل یہ خیال رکھیے گا کہ اماں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس میں میری پسند بھی شامل ہے۔ آپ تو اکرام صاحب کے نمائندہ بن کر جائیں گے بلکہ ان سے یہ کہیے گا کہ آپ درخشاں کو راضی کر لیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں۔"

"بیٹا! یہ تم مجھے سمجھا رہی ہو۔ میں ان معاملات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ بس تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اور اپنے گھر کا ایڈریس مجھے سمجھا دو۔ میں صاحب سے ایک دو گھنٹے کی چھٹی لے کر ابھی جاتا ہوں۔ اس وقت تم بھی گھر پر نہیں ہوگی۔ اطمینان سے باتیں ہو جائیں گی۔"

"میں گھر پر ہوتی تو بات دوسری تھی۔ اماں آپ کو گھر میں بلائیں یا نہیں۔"

"ارے بچی، تیرا انکل اتنا چرب زبان تو ہے کہ وہ نہ صرف بلائیں گی بلکہ چائے پی کر لوٹوں گا۔" یہ کہتے کہتے وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

درخشاں نے سوچا، متین صاحب کا اس وقت جانا ایک لحاظ سے اچھا بھی ہے۔ ان سے بدتمیزی کرنے کے لیے علی گھر پر نہیں ہوگا۔ وہ اطمینان سے اماں سے بات کر لیں گے۔

متین صاحب ایک چلتا پرزا۔ بیٹھے بیٹھے ذہن میں منصوبہ تیار کیا اور اکرام صاحب سے اجازت لے کر دفتر سے نکل گئے۔ اکرام کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کیا کر کے آئیں گے۔ انہوں نے ایڈریس اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کسی دقت کے بغیر درخشاں کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔

جمیلہ خاتون دروازے پر آئیں اور کسی اجنبی کو دیکھ کر دروازہ دوبارہ بند کر لیا۔

"کون صاحب ہیں؟"

"میرا نام متین ہے۔ درخشاں بی بی کے دفتر سے آیا ہوں۔ آپ سے ایک اہم بات کرنی ہے جو یقیناً درخشاں سے متعلق ہے۔"

"اے ہے، کیا ہوا میری بچی کو۔ خیریت تو ہے؟"

انہوں نے دروازہ آدھا کھول دیا اور خود آڑ میں ہو گئیں۔

"بات فکر کی نہیں، خوشی کی ہے۔ درخشاں بیٹی کی شادی کی بات ہے۔"

"ہائے میں لٹ گئی۔ کیا اس نے شادی کر لی؟"

"آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دیں تو بیٹھ کر



SCANNED BY PAKSOCIETYNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

تفصیل سے بات کروں۔"

"میں کیسے مان لوں کہ آپ اس کے دفتر ہی سے آئے ہیں؟"

"نہ صرف اس کے دفتر سے آیا ہوں بلکہ اس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ دیکھیے اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے اپنا ایڈریس لکھ کر دیا ہے۔ یہ دیکھیے۔ اچھی طرح دیکھ لیں اسی کی رائٹنگ ہے۔" انہوں نے پرچہ جمیلہ خاتون کی طرف بڑھا دیا۔

"ہے تو اسی کی رائٹنگ لیکن میرا بیٹا اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں۔ جب میرا بیٹا آجائے اس وقت آیئے گا۔"

"اس وقت تک تو بہت دیر ہوجائے گی۔ بہن، آپ مجھ پر بھروسا کریں۔ بس آپ کا تھوڑا سا وقت لوں گا۔ ممکن ہے اس وقت تک آپ کا بیٹا بھی آجائے۔ ویسے درخشاں نے منع کر دیا تھا کہ میں اس کے بھائی کے سامنے کوئی بات نہ کروں۔ اس وقت اچھا موقع ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ بس جلدی جلدی کچھ باتیں کرلوں گا۔"

انہوں نے یہ باتیں کچھ اس انداز سے کیں کہ جمیلہ خاتون طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا ہوگئیں۔ انہوں نے بھی سوچا اچھا ہے بات جتنی جلدی کھل کر سامنے آجائے۔

"آیئے بھائی صاحب اندر آجایئے۔"

"شکریہ بہن کہ آپ نے مجھ پر اعتبار کیا۔"

جمیلہ خاتون انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آگئیں۔

"بہن! مجھے درخشاں کا بزرگ سمجھیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ جب بچیاں گھر سے باہر نکلتی ہیں تو کوئی نہ کوئی انہیں پسند آہی جاتا ہے یا کوئی انہیں پسند کرلیتا ہے۔ درخشاں کو بھی ہمارے دفتر کے مالک اکرام صاحب نے پسند کرلیا ہے۔ درخشاں بھی انہیں پسند کرتی ہے۔ دونوں شادی کا وعدہ کرچکے ہیں۔ میرے ذمے دونوں کی جانب سے یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ میں اس رشتے کے لیے آپ کو راضی کروں۔ اس کے بعد لڑکے کے والد آپ سے بات کریں گے۔"

"جب اس نے سب باتیں خود ہی طے کرلیں تو مجھ سے کیا پوچھنا۔ خود چلی جائے اور شادی کرلے۔"

"ایسا نہ کہیں۔ رشتہ ہوگا تو آپ کی اجازت سے ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔"

"وہ دفتر کا مالک ہے تو عمر میں بھی زیادہ ہوگا۔"

"عمر کا تو زیادہ نہیں لیکن چند باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ کل کو آپ میرا گریبان نہ پکڑیں کہ میں نے آپ سے کوئی بات چھپائی۔ سوچ کر تو کچھ اور آیا تھا لیکن جب آپ کو بہن کہہ دیا تو بھائی بن کر بھی دکھاؤں گا۔"

"ایسی کون سی بات ہے بھائی؟"

"بات یہ ہے کہ اکرام صاحب آج دولت مند بن گئے ہیں ورنہ ان کے باپ تو دہلی میں کسی کے گھر سودا سلف لانے پر ملازم تھے۔ خیر یہ بھی کوئی بری بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ لوگ خاندانی فقیر تھے۔ ان کے دادا بھیک مانگتے تھے۔ اکرام صاحب کے والد نے بھی کچھ دنوں یہی پیشہ اختیار کیے رکھا پھر کسی گھر میں ملازمت کرلی۔ پھر ان کا گھر چھوڑ کر میرے گھر آگئے یعنی میرے گھر ملازمت کرلی۔ پھر پاکستان بن گیا۔ دہلی میں قتل و غارت گری ہوئی تو وہ کہیں گئے ہم کہیں۔ کئی برس بعد ملاقات ہوئی تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک بن چکے ہیں اور میں ملازمت ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے ملازمت دے دی۔ میں ضرورت مند تھا میں نے قبول کرلی۔ قدرت کے کھیل دیکھیے کہ کل کا نوکر آج کا مالک بن گیا۔ اس کا بیٹا جب چاہتا ہے مجھے ڈانٹ دیتا ہے اور میں چپ کرکے سنتا رہتا ہوں۔"

"اتنی اصلیت بتانے کے بعد بھی آپ مجھ پر زور دیں گے کہ میں یہ رشتہ منظور کرلوں۔ فقیروں کے خاندان میں اپنی بیٹی بیاہ دوں؟"

"ارے بیگم صاحب، اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب خاندان کون دیکھتا ہے۔ اب تو سب دولت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ لڑکا تو دولت مند ہے اور پھر درخشاں کی پسند بھی ہے۔"

"آپ کا یہ خیال ہوگا میرا نہیں۔ میں اپنے خاندان میں یہ پیوند نہیں لگا سکتی۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ درخشاں اس کے باوجود بھی اسی سے شادی کرلے۔"

"میں درخشاں کو جانتی ہوں۔ جب میں اسے یہ باتیں بتاؤں گی تو وہ خود انکار کردے گی۔"

"آپ اسے وہ سب باتیں بتادو گی جو میں نے آپ سے کی ہیں؟"

"یہ باتیں بتائے بغیر میں اسے روکوں گی کیسے؟ جب تک آئینہ سامنے نہ ہو چہرہ نظر کیسے آئے گا اور پھر آپ کیوں ڈرتے ہیں، آپ نے تو یہ سب باتیں اس کی بھلائی کے لیے کی ہیں۔"

"ایسا نہ کیجیے گا بیگم صاحبہ۔ جوانی کا بہاؤ بڑا تیز ہوتا ہے۔ درخشاں تو یہی سمجھے گی کہ میں نے آپ کو بھڑکا دیا ہے۔ میری بتائی ہوئی کسی بات پر یقین نہیں کرے گی۔ الٹا اکرام صاحب سے کہہ کر مجھے نوکری سے نکلوا دے گی۔" وہ اٹھے اور اب جمیلہ خاتون کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

"بھائی صاحب! آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔"

"میری نوکری اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ باتیں میرے حوالے سے درخشاں تک پہنچیں تو سمجھو میری نوکری گئی۔"

"عجیب آدمی ہو۔ اتنا ڈرتے تھے تو یہ باتیں بتائیں کیوں؟ میں اندھیرے میں مکھی نگل لیتی تو دوسری بات تھی۔ اب تم ہی بتاؤ مکھی ماروں تو کیسے..... نگلوں تو کیسے؟"

"ترکیب میں بتاتا ہوں عمل آپ کر لیجیے گا۔ آپ فی الحال اپنی رضامندی ظاہر کردیں۔ درخشاں کے سامنے میری تعریف کیجیے اور اس سے کہیے کہ متین صاحب نے لڑکے کی اتنی تعریف کی ہے لہٰذا میں اجازت دے رہی ہوں کہ اس کے گھر والے باقاعدہ رشتہ لے کر آجائیں۔ میں حتمی فیصلہ لڑکے کے باپ سے مل کر کروں گی صرف متین صاحب کے کہنے پر "ہاں" نہیں کرسکتی۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے یہ ہوگا کہ جب اللہ دیا یعنی اکرام صاحب کے والد، آپ کے ہونے والے سمدھی سے آپ کی ملاقات ہوجائے گی تو آپ درخشاں سے کہہ سکتی ہیں کہ لڑکے کے خاندان کی طرف سے آپ مطمئن نہیں۔ یا ایسے کیجیے گا کہ اللہ دیا سے میرا تذکرہ مت کیجیے گا۔ وہ پوچھے گا بھی نہیں۔ اس لیے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔"

جمیلہ خاتون کو یہ تجویز معقول معلوم ہوئی اور انہوں نے اجازت دے دی کہ لڑکے کا باپ ان سے آکر مل سکتا ہے۔

متین صاحب سرخرو ہوکر درخشاں کے گھر سے نکلے۔

دفتر پہنچے تو وہ بے چینی سے ان کا انتظار کررہی تھی۔

"کیا ہوا انکل، سب ٹھیک ہوگیا نا؟"

"بھئی تمہاری والدہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہیں۔ یہ میرا ہی دم تھا کہ انہیں قائل کرلیا۔ اکرام صاحب اور ان کے ان دیکھے خاندان کی اتنی تعریف کیں کہ میرا منہ دکھ گیا تب جاکر انہوں نے اجازت دی کہ اکرام صاحب کے والد ان سے مل سکتے ہیں بس ایک ڈر ہے۔"

"وہ کیا انکل؟"

"بھئی، تمہاری والدہ بھی دہلی کی ہیں اور اکرام صاحب کے والد بھی دہلی کے ہیں۔ کوئی ایسی جان پہچان نہ نکل آئے جس سے میری محنت ہی اکارت چلی جائے۔"

"انکل آپ بھی کیا اندیشے لے کر بیٹھ گئے۔ دہلی اتنا بڑا شہر تھا۔ گھر میں بیٹھی ہوئی عورت بھلا انہیں کیا جان سکے گی۔ جان پہچان کیا نکلے گی۔"

"بس بیٹا، میں تو شکرانے کے نفل پڑھوں گا جب میری بیٹی رخصت ہوکر اکرام صاحب کے گھر پہنچے گی۔ ہاں ایک بات ہے۔ اکرام صاحب کو یہ مت بتانا کہ تم نے مجھے اپنے گھر بھیجا تھا۔ اللہ نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ الزام مجھے دیں گے۔ میں نہ لینے میں نہ دینے میں۔ میں کیوں سزا بھگتوں۔"

"آپ کا نام قطعی درمیان میں نہیں آئے گا۔ میں اٹھتے بیٹھتے آپ کے لیے دعا کیا کروں گی انکل۔"

"جیتی رہو بیٹی۔" انہوں نے درخشاں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اپنے کیبن میں آگئے۔ بہت اونچا اڑنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے پر کاٹ کر زمین پر پھینک دیے۔ اللہ دیا نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میری بیٹی بی اے کرلے تو اکرام سے اس کی شادی کردے گا۔ یہ بیچ میں خوامخواہ کود پڑی۔ اگر اب بھی درخشاں کی ماں پھسلنے لگی تو کوئی اور چال چلوں گا۔ میرے ترکش میں کوئی تیروں کی کمی ہے۔ بڑی آئی مجھے انکل کہنے والی۔

اس نے سوچا کہ وہ یہ خوش خبری ابھی اکرام تک پہنچا دے لیکن یہ جلد بازی اسے اپنی حیثیت کے منافی معلوم ہوئی۔ اسے ابھی دو چار دن اکرام کو سراپا انتظار بنائے رکھنا چاہیے۔ اسے بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ اماں کو منانے کے لیے مجھے کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ گھر جاؤں تو یہ بھی معلوم ہو کہ متین صاحب نے کیا باتیں کی ہیں اور اماں کا ردعمل کیسا ہے۔ اکرام کے والد کو آنا چاہیے۔ اماں کے منہ سے سنوں گی تو اور اطمینان ہوجائے گا۔

وہ گھر پہنچی تو جمیلہ خاتون نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی اجنبیت اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "ہاتھ منہ دھوکر فریش ہوجاؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"خیریت تو ہے اماں۔ علی نے پھر کوئی حرکت کر ڈالی ہے؟" درخشاں نے انجان بنتے ہوئے کہا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اماں کیا بات کرنے والی ہیں۔

"میں نے کہا نا آرام سے بیٹھو تو بات کرتی ہوں۔"

وہ جلدی سے غسل خانے میں گھس گئی۔ شاور لینے کے بعد باہر نکلی۔ جمیلہ خاتون نے چائے تیار کرلی تھی۔ صرف یہ انتظار تھا کہ علی باہر جائے تو وہ درخشاں سے بات کریں۔





SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

انہیں زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑا۔ علی چائے پیتے ہی روانہ ہوگیا۔ وہ گھر میں زیادہ ٹکتا ہی کہاں تھا۔ ”درخشاں! یہ اکرام صاحب کون ہیں۔“

”اماں میں جس دفتر میں کام کرتی ہوں اس کے مالک کے بیٹے ہیں۔ کیوں؟ ان کا کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”کوئی متین صاحب آئے تھے۔ اکرام صاحب کا رشتہ تمہارے لیے لے کر۔ اکرام صاحب کے والد مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”میرا رشتہ! کیا کہہ رہی ہو اماں؟“

”تو تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم؟“

”قسم لے لو اماں۔ مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔“

”میں نے ایک عمر گزاری ہے۔ دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تمہاری مرضی کے بغیر وہ تمہارا رشتہ بھیج سکتے تھے؟ سچ بتاؤ بات کہاں تک پہنچی ہے؟“

”اماں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ان کے دل میں کچھ ہو تو ہو۔“

”تمہارے دل میں کچھ نہیں؟“

”وہ میرے باس ہیں۔ اچھے آدمی ہیں۔ نہایت مہذب ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”اگر اس رشتے سے میں انکار کردوں تو تمہیں دکھ تو نہیں ہوگا؟“

وہ کچھ دیر کے لیے گڑبڑا گئی لیکن پھر ہمت کر کے بولی۔ ”صرف اتنا دکھ ہوگا کہ یہ ایک اچھا رشتہ تھا۔“

”میں نے متین صاحب سے کہہ دیا ہے کہ ان کے والد کو بھیج دیں۔ سنا ہے دہلی کے ہیں۔ خاندان وغیرہ کے بارے میں معلوم کرلوں گی۔ اگر مناسب ہوا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا ورنہ انکار کردوں گی۔ اگر تمہاری پسند ہوتی تو میں یہ اجازت بھی نہیں دیتی، کیونکہ ہمارے خاندان میں لڑکیاں لڑکوں کو پسند نہیں کرتی پھرتی ہیں۔“

درخشاں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ بھی تو نہ کہہ سکی۔ اب اسے آنے والے وقت کا انتظار کرنا تھا اور کچھ نہیں۔ پھر بھی وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”دیکھ لیں اماں۔ آج کل خاندانوں کو کون دیکھتا ہے۔ اکرام صاحب اتنے بڑے دفتر کے مالک ہیں۔ آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ علی سے بھی پوچھ کر دیکھ لیں۔“

”علی کے سامنے تو ابھی منہ سے بھانپ بھی نہیں نکالنی ہے۔ وہ تو یہی کہے گا کہ گھڑی کی چوتھائی میں تجھے نکال باہر کروں مگر میں تیری شادی خوب ٹھوک بجا کر کروں گی۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کی میں قائل نہیں۔“

دو چار دن کانٹوں کے بستر پر سونے کے بعد درخشاں نے اکرام کو بتادیا کہ وہ اپنے والد کو اس کے گھر بھیج سکتا ہے۔ لیکن آنے سے ایک دن پہلے وہ اسے بتادے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایسے وقت کا انتخاب کیا جائے جب علی گھر پر نہ ہو۔

اکرام نے اسے دوسرے دن ہی بتادیا کہ دو دن بعد اس کے والد اس کے گھر آئیں گے۔

علی کو گھر سے بھگانے کا آسان طریقہ تھا۔ اس کی جیب میں پیسے ہوتے تو وہ گھر میں نہیں ٹکتا تھا۔ اس نے علی کی جیب میں چند نوٹ ٹھونس دیے اور وہ غائب ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ہی چم چم کرتی ایک کار اس کے دروازے کے سامنے آکر رکی، اس روز وہ بھی گھر پر رہی تھی تاکہ جو بات ہو اس کے سامنے ہو۔

جمیلہ خاتون نے اتنی رعایت ضرور برتی کہ اس سے کہا کہ اکرام کے والد کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے لیکن خبردار وہاں ایک منٹ بھی نہ بیٹھے اور نہ گفتگو میں شریک ہو۔ اچھا نہیں لگتا کہ لڑکی ہونے والے سسر کے سامنے بیٹھے یا بات چیت میں شریک ہو۔ وہ دروازے پر گئی اور اکرام کے والد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی آئی۔ شاید انہیں معلوم بھی نہ ہوسکا ہوگا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا رشتہ مانگنے وہ آئے ہیں۔

جمیلہ خاتون کمرے میں پہنچیں تو بیٹھتے ہی انہیں احساس ہوا کہ اس شخص کو وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہیں۔ یہی حال اللہ دیا کا بھی ہوا تھا۔ جمیلہ خاتون دیکھ رہی تھیں کہ اس آدمی کے چہرے کا رنگ وہ نہیں ہے جو کچھ دیر قبل تھا۔ اللہ دیا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

”آپ دہلی میں کہاں رہتے تھے؟“

”بلی ماراں کے نزدیک ایک چھوٹے سے گھر میں۔ اس وقت ہمارے حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ یہ پاکستان کی برکت ہے کہ آج میرے پاس سب کچھ ہے۔“

”تم نے سچ کہا۔ کچھ لوگ وہاں سے آکر اجڑ گئے کچھ بن گئے۔ وہاں میرے سسر خان بہادر کہلاتے تھے۔ نوکر چاکر گھر میں تھے۔ یہاں بس دن گزار رہی ہوں۔“

”میں یہاں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کے لیے آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ سکوں۔ آپ میرے بیٹے کے بارے میں کوئی سوال کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں۔“

جمیلہ خاتون کی نظریں اللہ دیا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں کچھ یاد کرنے کی کوشش کررہی تھیں مگر کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔



”آپ وہاں کیا کرتے تھے۔“

”بیگم صاحبہ سچ بتادوں۔ آپ کی مروت شاید کہنا نہیں چاہتی لیکن میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں وہی اللہ دیا ہوں جو آپ کے گھر کا سودا سلف لانے پر ملازم تھا۔ آپ کے نمک میں اتنی برکت تھی کہ آج میں لاکھوں میں کھیل رہا ہوں۔“

”لاکھوں میں کھیلنے سے انسان کی ذات نہیں بدل جاتی۔“

”آپ نے بجا کہا لیکن یہ بھی تو سوچیے آپ کا ملازم میں تھا میرا بیٹا نہیں۔ وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ ہمیں بچوں کی خوشی کے لیے اپنے اصولوں کو بھول جانا چاہیے۔“

”آدھا رشتہ خاندان سے ہوتا ہے۔ میں اپنی نسل نہیں بگاڑ سکتی۔ درخشاں کا باپ حکومت پاکستان کا ایک بڑا افسر تھا۔ آپ تو اپنے مرحوم سمدھی پر فخر کرسکیں گے۔ میں کس بات پر فخر کروں گی۔ تم جاسکتے ہو اور ہاں اپنے بیٹے سے کہنا جس گھر میں تمہارا باپ ملازم تھا اس گھر کی لڑکی تمہارے دفتر میں ملازمت نہیں کرسکتی۔ اس کا استعفیٰ انہیں ڈاک سے مل جائے گا۔“

اللہ دیا ممکن ہے کچھ اور کہتا لیکن جمیلہ خاتون اسے چھوڑ کر کمرے سے باہر آچکی تھیں۔ انہوں نے تو بس یہ دیکھا کہ درخشاں دروازے سے لگی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن رہی تھی، انہیں دیکھتے ہی جھپاک سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اللہ دیا باہر جانے کا راستہ دیکھ ہی چکے تھے۔ کچھ دیر ڈرائنگ روم میں کھڑے دیواروں کو تکتے رہے اور پھر قدموں سے باہر نکل گئے۔ جمیلہ خاتون سیدھی درخشاں کے کمرے میں پہنچیں۔

”تم نے کہا تھا، اگر میں انکار کردوں تو تمہیں دکھ نہیں ہوگا۔ گفتگو تم نے سن لی ہے۔ میں نے انکار کردیا ہے۔ مجھے یہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔“

”اماں مجھے اپنا دکھ نہیں ہے۔ دکھ تو یہ ہے کہ آپ باپ کی سزا بیٹے کو کیسے دے سکتی ہیں جبکہ یہ گناہ بھی نہیں کہ اللہ دیا آپ کے گھر ملازم رہ چکے ہیں بلکہ وہ تو عظیم آدمی ہیں کہ انہوں نے اپنی محنت سے ترقی کی۔“

”اسے محنت کیا خاک کی ہوگی۔ کسی کا گھر لوٹا ہوگا یا بینک میں ڈاکا ڈالا ہوگا۔ بٹوارے کے وقت یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ تم ایسے ایماندار باپ کی اولاد ہو کہ اس نے یتیم تک داخل نہیں کرایا۔ آج جس گھر میں بیٹھی ہو وہ اپنی محنت سے کھڑا کیا اور میں تمہیں اللہ دیا کے گھر میں جھونک دوں۔ تم فوراً اپنا استعفیٰ لکھ کر بھیج دو۔ نہ شادی ہوگی نہ نوکری۔“

اس کی تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ خم ٹھونک کر ماں کے سامنے آجاتی۔ صرف اتنی اجازت لے سکی کہ وہ ایک مرتبہ اکرام صاحب سے مل آئے۔ اس کے بعد بے شک استعفیٰ دے دے گی۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ جب استعفیٰ دینا ہی ہے تو ملنا کیا ضروری ہے۔

وہ ماں کی اجازت کے بعد دوسرے دن حسب معمول دفتر گئی۔ اکرام پہلے ہی اس گفتگو سے واقف ہوچکا تھا جو اس کے گھر میں ہوئی تھی۔ درخشاں نے کچھ بتانا چاہا تو

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

اکرام نے اسے خاموش کر دیا۔

"درخشاں! مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ ڈیڈی نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم بہت غریب لوگ تھے لیکن غریب ہونا جرم تو نہیں۔"

"اکرام! میں تم سے متفق ہوں، تمہارا ساتھ دینے کو اب بھی تیار ہوں۔ تم اگر مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو میں اپنی ماں سے بغاوت کے لیے تیار ہوں۔"

"اب میں یہ کہوں گا کہ تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔ ماں باپ اس لیے نہیں ہوتے کہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔"

"میں انہیں چھوڑنے کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ ہم شادی کے بعد بھی ان کا خیال رکھ سکتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنے کے لیے ان کا بیٹا یعنی میرا بھائی بھی موجود ہے۔ تم خود بتاؤ کیا ہم شادی کر کے کوئی غیر اسلامی قدم اٹھائیں گے؟"

"شادی غیر اسلامی نہیں لیکن ماں کی نافرمانی غیر اسلامی ضرور ہو گی۔"

"اکرام! ہم دونوں بالغ ہیں۔ اپنی مرضی سے شادی کر سکتے ہیں۔"

"اسلام اس کی اجازت دیتا ہے لیکن ذرا سوچو تمہاری ماں کے دل پر کیا گزرے گی۔ تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ کسی طرح بھی تم اپنی ماں کو منا لو ورنہ ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔"

"اگر آپ ماں کی فرماں برداری کی بات کرتے ہیں تو اماں نے کہا تھا میں استعفیٰ دے کر واپس آ جاؤں۔ میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

"رشتے آسمان پر بنتے ہیں لیکن ٹوٹتے زمین پر ہیں۔ اوپر والے نے تو ہمیں ملانے کی پوری تیاری کر لی تھی لیکن زمین والے اس پر تیار نہیں۔"

اس نے بڑی ہمت دکھائی تھی کہ اتنی باتیں کر لی تھیں، ڈوبی تو وہ اتنے گہرے پانی میں تھی کہ کئی چھندے ایک ساتھ لگے تھے لیکن جب وہ اکرام کی جھولی میں اپنا استعفیٰ ڈال کر گھر پہنچی تو بادل اس زور سے گرجے، گھٹا ایسی امڈ کر آئی کہ جل تھل ہو گیا جتنا رو سکتی تھی جی بھر کے روئی۔ روتے روتے تھک گئی تو ماں سے لڑنے پہنچ گئی۔

"اماں اب زمانہ تمہارا والا نہیں رہا۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔"

"جو کچھ آپ کر رہی ہیں وہ جہالت ہے۔"

"غریب، امیر کی تفریق تو ہمارے مذہب کو بھی پسند نہیں۔"

"آپ ایک نہیں دو دلوں کو توڑ رہی ہیں۔"

وہ دلیلوں کے انبار لگاتی رہی۔ جمیلہ خاتون کے پاس بس ایک جواب تھا۔

"ہم اپنی نسل نہیں بگاڑ سکتے۔"

"علی بھی تو آپ کی اعلیٰ نسل کا اعلیٰ سپوت ہے۔ دیکھ لو کیا کرتا پھر رہا ہے۔"

"وہ لڑکا ہے جو بھی کرے۔ بی بی تم اپنا مقابلہ اس سے مت کرو۔"

اکرام کا خط آیا۔

"درخشاں! میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنی ماں کا کہا مان لو۔ کسی اعلیٰ خاندان میں شادی کر لو تاکہ بقول تمہاری والدہ "نسل نہ بگڑے۔" ہم اتنی ہی دیر کے لیے ملے تھے۔ اب میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ ہاں تمہیں یاد ضرور رکھوں گا۔

"کاش! میں نے شادی کی بات نہ کی ہوتی تو تم بہت دن تک میرے دفتر میں کام کر سکتی تھیں۔ اگر تم کہو تو میں کسی اور جگہ تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دوں؟"

درخشاں نے پردے گرا دیے کھڑکیاں بند کر لیں۔ دل کے محلے میں اب نہ کسی کی یاد تھی نہ آواز۔

☆☆☆

وہ دل کی تمام کھڑکیوں پر دبیز پردے ڈالے بیٹھی تھی کہ ہوا کے ایک جھونکے نے ایک پردہ ہٹا دیا۔ دروازے کے باہر ایک کار آ کر رکی۔ ڈرائیور تیزی سے اترا اور آگے پیچھے کے دونوں دروازے کھول دیے۔ ایک عورت اور دو لڑکیاں ایک ایک کر کے کار سے اتریں۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر کال بیل پر ہاتھ رکھ دیا اور دوبارہ کار میں جا کر بیٹھ گیا۔

درخشاں کو تو جیسے اب گھر سے کوئی سروکار ہی نہیں رہ گیا تھا۔ جمیلہ خاتون دروازے پر گئیں۔ ان کے سامنے انہی کی عمر کی ایک عورت غرارہ پہنے چنا ہوا دوپٹا گلے میں ڈالے کھڑی تھی۔ دونوں لڑکیاں البتہ فیشن ایبل نظر آ رہی تھیں۔ جمیلہ خاتون حیران تھیں کہ یہ کون سی رشتہ دار آ گئیں۔

"حامد علی خاں مرحوم کا مکان یہی ہے؟"

"جی ہاں۔"

"یقیناً آپ ان کی بیگم جمیلہ خاتون ہیں؟"

"آپ اندر تو آئیے سب تعارف ہو جائے گا۔"

"شکریہ بہن۔"

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ جمیلہ خاتون نے انہیں





ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔

"بہن! آپ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں آن ٹپکی۔ میں مسز امیر علی ہوں اور یہ میری دونوں بیٹیاں عدیلہ اور فرخندہ ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آپ یہاں کس سلسلے میں تشریف لائی ہیں۔ کوئی سابقہ تعارف نہ ہونے کی صورت میں یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔"

"بہن سلسلہ نہ پوچھو۔ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ ہم لوگ آپ کی بیٹی درخشاں کو دیکھنے آئے ہیں کہاں ہے وہ۔ اسے بلائیے نا۔"

"میں اسے دیکھتی ہوں۔ شاید سو رہی ہے۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دوا کھا کر سوئی ہے۔"

جمیلہ خاتون کو یقین نہیں تھا کہ وہ ان کے بلانے پر آ جائے گی۔ اسی لیے انہوں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ پہلے ہی کر دیا تھا۔

وہ ڈرتے ڈرتے درخشاں کے پاس آئیں۔

"درخشاں! خدا نے ہماری سن لی ہے۔ کوئی بیگم صاحبہ آئی ہیں۔ بہت اچھے خاندان کی معلوم ہوتی ہیں۔ گاڑی میں آئی ہیں ڈرائیور کے ساتھ۔ تمہیں دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کر رہی ہیں۔ جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔ ان کے ساتھ ان کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔"

"اماں! ان کا خاندان دیکھ لیا ہے؟"

"خاندانی لوگ الگ سے پتا چل جاتے ہیں۔ جب بات آگے بڑھے گی تو مزید معلومات کر لیں گے۔"

جمیلہ خاتون نے اسے تیار ہونے کا حکم دیا اور مہمانوں کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"بہن! میرا بیٹا مراد انجینئر ہے۔ ویسے ہم بزنس پیشہ لوگ ہیں۔ میرے شوہر کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ اگر درخشاں ہمارے گھر آ جائے تو ہمارا گھر مکمل ہو جائے گا۔"

"بہن جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ اگر قسمت میں ہو گا تو ضرور ہماری مراد پوری ہو گی۔"

"آمین۔"

ابھی کچھ اور باتیں ہوتیں لیکن اسی وقت درخشاں کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ ہے میری بیٹی درخشاں۔"

"ماشاء اللہ جیسی کسی نے بتایا تھا ویسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔"

## موسم

ٹیچر۔ "بتاؤ سال میں کتنے موسم آتے ہیں؟"
شاگرد۔ "4"
ٹیچر۔ "کون، کون سے؟"
شاگرد۔ "ہڑتال، ہنگامے، ڈبل سواری پر پابندی اور موبائل سروس بند۔"
ٹیچر۔ "لخ دی لعنت۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریزدی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

درخشاں نے سلام کیا۔ دونوں لڑکیوں سے ہاتھ ملایا اور ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر وہی روایتی باتیں۔ کیا کرتی ہو، تعلیم کتنی ہے، وقت کیسے گزارتی ہو، کون سا رنگ اچھا لگتا ہے، کھانے میں کیا پسند ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ درخشاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ناشتا وغیرہ تیار کرنے کے لیے اٹھ گئی۔

"بہن آپ کی مرضی ہو تو میں کسی روز مراد کو لے کر آ جاؤں۔ اچھا ہے وہ بھی لڑکی دیکھ لے گا۔ آج کل تو یہ کوئی معیوب بات نہیں رہی ہے۔"

"میں اپنے اصولوں پر اب تک قائم ہوں۔ لڑکی لڑکے کے ملنے کی میں قائل نہیں۔ آپ تصویر لے جائیں، لڑکے کی تصویر مجھے بھیج دیں ہم اپنے طور پر چھان بین کر لیں گے۔ اس کے بعد آپ کی مرضی ہو گی تو بسم اللہ۔"

"میں مراد کی تصویر پہنچا دوں گی۔ درخشاں کی تصویر کی ہمیں ضرورت نہیں۔ میں نے دیکھ لیا بس یہ کافی ہے۔ اب یہ بتائیے آپ کب جواب دے رہی ہیں؟"

"ہتھیلی پہ سرسوں نہ جمائیے۔ میں اچھی طرح تحقیق کر کے جواب دوں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

یہ عورتیں جمیلہ خاتون کے دل میں اتر گئی تھیں۔ اکھڑی اکھڑی باتیں تو وہ دکھاوے کے لیے کر رہی تھیں ورنہ دل میں فیصلہ کر چکی تھیں کہ درخشاں کے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہیں کی جان نہ پہچان۔ یہ مہمان تو غیب سے آ گئے۔

انہوں نے علی کے سامنے آنے والی عورتوں کا نقشہ ایسا بڑھا چڑھا کر پیش کیا کہ اس نے بھی ماں پر زور دیا کہ یہ شادی جلد سے جلد ہو جانی چاہیے۔ اتنا اچھا رشتہ ہے کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

درخشاں دوسرے دن اچھی طرح تیار ہوئی اور ماں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے کسی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے اکرام کے دفتر پہنچ گئی۔ اتنے دن بعد وہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی ہو گیا۔

''سر! میں یہ پوچھنے آئی ہوں کہ وہ عورتیں آپ نے میرے گھر بھیجی تھیں؟''

''کون عورتیں؟''

''کچھ عورتیں میرے گھر آئی تھیں میرا رشتہ لے کر۔ انہیں یقیناً آپ نے گائڈ کیا ہے۔ آپ کی کوئی جاننے والی ہوں گی۔''

''میں تمہارے لیے کبھی برا سوچ سکتا ہوں؟ آپ کی والدہ کسی اعلیٰ خاندان میں آپ کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ میں نے وہ خاندان بتا دیا اور میں اپنے ہم پلہ خاندان میں شادی کر رہا ہوں۔ میری شادی متین صاحب کی بیٹی سے ہو رہی ہے۔''

''اکرام! کیا یہی تمہاری محبت ہے کہ مجھے کسی اور کے حوالے کر رہے ہو؟''

''محبت کا ایک رنگ یہ بھی ہے۔ ہم شادی کے بغیر بھی تو محبت قائم رکھ سکتے ہیں۔ میں غربت اور امارت کی دیوار گرا سکتا تھا مگر یہ احساس مجھے ہمیشہ رہتا کہ تم اپنے سے کم تر خاندان میں بیاہ کر آ گئی ہو۔ اب یہ احساس مجھے طمانیت بخشے گا کہ تم کسی اچھے خاندان میں گئی ہو۔ میں تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں شادی سے انکار مت کرنا۔ اسی میں میری خوشی ہے اور تم یقیناً مجھے خوش دیکھنا چاہو گی۔''

''انسان نفرت کے واسطے ٹھکرا دیتا ہے محبت کے نہیں۔ تمہارا بھیجا ہوا تحفہ میں ضرور قبول کروں گی۔''

وہ گھر آئی اور ماں سے کہہ دیا کہ اسے مراد کا رشتہ قبول ہے۔ جتنی جلدی ہو شادی کر دیں۔

''ہمیں ایسی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں جو منہ پھاڑ کر کہیں کہ ان کی شادی کر دو۔ ویسے بھی ہمارے خاندان میں پہلے منگنی ہوتی ہے۔ اس بہانے آنا جانا ہوتا ہے۔ دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اس کے بعد شادی کا سوال اٹھتا ہے۔ پہلے تمہاری منگنی ہو گی اور اس کے سال دو سال بعد شادی۔''

''آپ کی جو مرضی ہو کریں۔ زہر کوئی سا ہو میں پینے کے لیے تیار ہوں۔''

''توبہ بچی۔ زہر پئیں تیرے دشمن۔ کیوں ایسی باتیں کرتی ہے۔ دیکھ تو سہی میں کس دھوم دھام سے تیری منگنی کرتی ہوں۔''

مراد کے گھر میں کس چیز کی کمی تھی۔ ارمانوں کی بہتات یہاں بھی تھی۔ جمیلہ خاتون اچھے دن دیکھے ہوئے تھیں۔ کنجوس تھیں نہیں کہ سادگی شعار کرتیں۔ ایسی دھوم دھام سے منگنی کی کہ بڑی بڑی شادیوں کو مات کر دیا۔ درخشاں تو ڈوریوں سے چلنے والی کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ جب چاہا اٹھا دیا، جب چاہا بٹھا دیا۔ خاموشی سے پیسوں کو آگ لگتے ہوئے دیکھتی رہی۔

منگنی کی دھوپ نے صحن پار کیا تو جمیلہ خاتون نے گاڑی میں پاؤں رکھا۔ ''علی چل ذرا ہونے والے بہنوئی کے گھر تو لے چل۔ آنے جانے سے محبت بھی بڑھتی ہے اور وقت ناوقت جانے سے گھر کے رنگ ڈھنگ بھی آنکھوں پر کھل جاتے ہیں۔ شادی ہونے سے پہلے مجھے اچھی طرح تحقیق بھی تو کرنی ہے۔ ذرا اڑوس پڑوس بھی گھوم آؤں گی۔ پڑوسیوں سے کوئی بات چھپی نہیں ہوتی۔''

اب یہ ان کا ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول ہو گیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ لڑکے والوں کے خاندان کی تحقیق کر رہی تھیں۔

منگنی کو تقریباً چھ مہینے ہو گئے تھے۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔ اتفاق سے گاڑی گھر پر کھڑی تھی۔ علی کہیں گیا ہوا تھا وہ تیار ہوئی اور ماں سے اجازت لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

ماں نے اس کی طرف اس طرح دیکھا تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ ہفتوں بعد وہ تیار ہوئی تھی اور ماں سے بات کی تھی۔ انہوں نے خوشی خوشی اجازت دے دی۔

''ہاں بیٹا جاؤ۔ کہیں گھوم پھر آؤ۔''

وہ گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کہاں جائیں۔ کوئی اور ساتھ ہوتا تو کسی ریسٹورنٹ ہی میں جا کر بیٹھ جاتی۔ اکیلی بیٹھتی کیا اچھی لگوں گی۔ کسی پارک میں جا کر تو اور اداس ہو جاؤں گی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن منزل کا تعین نہیں کر پائی تھی۔ پھر اسے خیال آیا آرٹس کونسل میں تصویروں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ اس نے گاڑی آرٹس کونسل کے راستے پر ڈال دی۔

گاڑیوں کی قطار میں اس نے بھی اپنی گاڑی پارک کی اور نمائش گاہ میں داخل ہو گئی۔ اسے اپنے باپ کی یاد آ گئی جن کے ساتھ وہ ایسی ہی ایک نمائش دیکھنے آئی تھی۔ وہ مصورہ نہیں تھی لیکن مصوری کا شوق ضرور رکھتی تھی۔ اس بارے میں اس نے کچھ لٹریچر بھی پڑھ رکھا تھا۔

یہ تصویریں بالکل جدید طرز کی تھیں۔ رنگوں کا امتزاج اور اسٹروکس نہایت شاندار تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا



کہ کسی نوجوان ذہن کے زندہ شاہکار ہیں۔ ایک تصویر تو ایسی شاندار تھی کہ بے اختیار اس کا جی چاہا اسے خرید لے لیکن اس کی قیمت دیکھ کر دل گئی۔ قیمت اس لیے زیادہ لگ رہی ہے کہ میری جیب سے بہت زیادہ ہے ورنہ یہ تصویر واقعی انمول ہے۔

اتنی دیر میں شور سا مچا، نقاش آرزو اپنے مداحوں کو آٹوگراف دینے آئے ہیں، یہ نقاش آرزو کون ہیں؟

ارے بھائی ان تصویروں کے خالق۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک نوجوان لڑکا کچھ لڑکیوں کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔ یہ ہے مصور؟ مصوروں کے بارے میں تو اس نے نہ جانے کیا کیا سن رکھا تھا۔ یہ تو ان سب کے برعکس تھا۔ بالکل عام لوگوں کی طرح۔ سلیقہ مند شرفا کے حلیے میں۔ نہ بکھرے روکھے سوکھے بال۔ نہ اجاڑ سا وجود۔ نہ انسان بیزار آنکھیں۔ نہ تکبر نہ غرور۔ اس کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگا۔ اس شخص سے تو نہ صرف آٹوگراف لیے جائیں بلکہ ملاقات بھی ضروری ہے۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ لڑکیوں کی بھیڑ چھٹے تو وہ بھی اپنی جگہ بنائے۔

کچھ دیر میں لڑکیوں نے اس کا پیچھا چھوڑا اور وہ اپنی ایک تصویر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت درخشاں وہاں پہنچ گئی۔

''میرا نام درخشاں ہے۔''

''بہت اچھا نام ہے۔''

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ملیے۔''

''یہاں نہیں۔ اگر آپ کا کوئی اسٹوڈیو ہے تو وہاں۔''

''معاف کیجیے گا، اگر آپ مصورہ وغیرہ ہیں تو مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''میں تصویروں سے دلچسپی اور مصوروں سے عقیدت رکھتی ہوں۔''

''میں مردم بے زار نہیں ہوں۔ میں نے اپنی ہر تصویر کے نیچے اپنا فون نمبر لکھ دیا ہے۔ کوئی بھی شخص اس فون نمبر پر رابطہ کر کے مجھ سے ملاقات کر سکتا ہے۔''

''میں کوئی بھی بننا نہیں چاہتی۔''

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ ''آپ میرا ذاتی نمبر لے لیجیے۔ یہ نمبر صرف چند دوستوں کے پاس ہوتا ہے۔'' اس نے نمبر دے دیا۔ اسی وقت کچھ لوگ اس کے پاس آ گئے اور درخشاں کو اس کے پاس سے ہٹنا پڑا۔

وہ کچھ دیر یہ سوچ کر نمائش میں رکی رہی کہ شاید اس سے پھر ملاقات ہو جائے لیکن لوگ اسے گھیرے کھڑے رہے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آئی۔ اس کا نمبر تو وہ لے ہی چکی تھی، گھر پہنچتے ہی اس نے اسے فون کیا۔ ''آپ کی مداح جس کو آپ نے اپنا ذاتی نمبر دیا تھا۔''

''میں کتنے ہی لوگوں کو نمبرز دیتا ہوں۔ اب مجھے کیا معلوم آپ کون بول رہی ہیں؟''

''میرا نام درخشاں ہے۔''

''بہ خدا مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ ناموں کے معاملے میں میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے نام یاد نہیں رہتے ہاں چہرے کبھی نہیں بھولتا۔ آپ سامنے آئیں تو ممکن ہے آپ کو پہچان لوں۔''

''بلانے کا یہ اچھا بہانہ ہے۔ اچھا یہ بتائیے کہاں ملاقات ہو سکے گی؟''

''ابھی تو میں اپنی نمائش میں مصروف ہوں۔ کل آخری دن ہے پرسوں آرام کروں گا۔ اس کے بعد آپ مجھے فون کیجیے گا۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اس نے فون رکھ بھی دیا۔

''برخوردار بڑے نخرے والے معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکیاں ذرا بات کیا کر لیتی ہیں دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے۔''

جمیلہ خاتون دیکھ رہی تھیں کہ درخشاں ایک تبدیلی سے دوچار ہو رہی ہے۔ اجاڑ پڑی رہتی تھی اب بات بے بات تیار ہو رہی ہے۔ اسے گنگناتے ہوئے بھی دیکھ رہی تھی۔ یہ مثبت تبدیلی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی ہوں گی کہ درخشاں نے اب منگنی کو قبول کر لیا ہے۔

☆☆☆

درخشاں کئی ملاقاتوں کے بعد اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ نقاش آرزو کو اس کے اسٹوڈیو سے ریسٹورنٹ تک لے آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''تم اپنے گھر والوں کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟''

''میری مصروفیات کچھ ایسی ہیں کہ دنیا داروں کی تنگ جھولی میں نہیں سما سکتیں۔ ویسے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ صبح شام گھر جاتا ہوں۔ والدہ تو ہیں نہیں والد صاحب بڑے بھائی کے پاس رہتے ہیں۔ ان کا تمام خرچ میں اٹھاتا ہوں۔ بس یوں سمجھو کہ تصویریں بنانے اور سونے کے لیے اسٹوڈیو آ جاتا ہوں۔''

''جس سے شادی کرو گے وہ بھی تو دنیا دار عورت ہو گی۔ ایسا کرو کسی مصورہ سے شادی کر لو۔''

''دو بادشاہ ایک مملکت میں نہیں رہ سکتے۔ شادی تو میں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس لڑکی سے کروں گا جو مصوری کا شوق رکھتی ہو مصور نہ ہو۔“

”اور مصور سے عقیدت رکھتی ہو۔“ درخشاں نے اس کا جملہ مکمل کیا۔

”اچھی رعایا ہونے کی پہلی شرط تو یہی ہے۔“

”تو آپ بیوی کو رعایا سمجھتے ہیں؟“

”بہت اچھے حکمران کی بہت اچھی رعایا۔ اگر حکمران اچھا ہو تو اس سے بڑھ کر رعایا کی خوش نصیبی اور کیا ہوگی۔ حکمران رعایا کی ضرورتوں کا خیال رکھے گا اور رعایا عیش کرے گی۔“

”پھر کب کر رہے ہیں شادی؟“

”جب آپ کہیں۔“

نقاش نے یہ سوال اتنی جلدی کر دیا کہ درخشاں اسے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر اس نے ہمت جمع کی۔

”آپ مجھ سے شادی کریں گے؟“

”اگر آپ کی اجازت ہوگی۔“

”آپ کے بڑے اجازت دے دیں گے؟“

”نہیں۔ میری شادی میں کوئی شریک نہیں ہوگا۔ میری منگنی میری خالہ زاد سے کر دی گئی ہے اور میں وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے وہ منگنی توڑنی ہوگی۔ اس کے بعد سوچو میری شادی میں کون شریک ہوگا۔ ہو بھی سکتا ہے وہ مجھے معاف بھی کر دیں۔

”میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں۔ میری بھی منگنی کر دی گئی ہے۔ مجھے بھی وہ منگنی توڑنی پڑے گی۔ مجھے معلوم ہے یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے نہیں ہوگا لیکن تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔

دونوں اپنی اپنی مہم پر روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

”ہیلو، مراد صاحب؟“

”جی بول رہا ہوں۔“

”میں آپ کی منگیتر درخشاں بات کر رہی ہوں۔“

”زہے نصیب۔ آپ کو ہمارا ایک سال بعد خیال آیا ہے۔ فرمایئے۔“

”جو بات میں کہنا چاہتی ہوں وہ فون پر نہیں ہو سکتی۔ کیا ہم کسی جگہ مل سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے نہ آپ کے گھر نہ میرے گھر۔“

”خیریت تو ہے۔ آپ کی آواز سے کچھ گھبراہٹ بھی ظاہر ہو رہی ہے۔“

”شاید اسی لیے کہ میں آپ سے پہلی بار مخاطب ہو رہی ہوں۔“

”آپ فرمایئے، میں آپ سے کہاں مل سکتا ہوں؟“

”فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں آسکتے ہیں۔ وہ میرے گھر سے قریب بھی ہے۔“

”بالکل آسکتا ہوں۔ کس وقت آجاؤں؟“

”آج شام پانچ بجے آجائیں۔ میں نے آپ کو تصویر میں دیکھ رکھا ہے پہچان لوں گی۔“

”میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر لیں۔ جب تک آپ آنہیں جاتیں میں گاڑی میں بیٹھا رہوں گا۔“ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرا دیا۔

جمیلہ خاتون حالات سے بے خبر مراد کے گھر جانے کے لیے تیار ہوئیں۔

”درخشاں، میری تحقیق بھی مکمل ہوگئی ہے اور تیاری بھی۔ آج میں تیری سسرال جا رہی ہوں۔ ان لوگوں سے کہوں گی بھئی ایک سال مکمل ہو گیا ہے اب آپ لوگ تاریخ لینے آجائیں۔ میں نے تمہارے چچا اور پھوپھیوں سے کہہ دیا ہے کہ بھی بھول کر اس طرف کا رخ نہیں کیا لیکن یہ موقع ایسا ہے کہ انہیں آنا ہوگا۔ دو چار مرے جیتے میرے بھی ہیں وہ بھی آجائیں گے۔“

انہوں نے علی کو ساتھ لیا اور چلی گئیں۔

درخشاں نے ان سے کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کہاں جائے گی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے گھر کو تالا لگایا اور باہر آگئی۔

ریسٹورنٹ گھر کے نزدیک ہی تھا لیکن اسے اتنی جلدی تھی کہ اس نے رکشا لیا اور ریسٹورنٹ پہنچ گئی۔ گاڑی کا نمبر بھی وہی تھا اور اس گاڑی کے قریب کھڑا ہوا لڑکا بھی وہی تھا جسے وہ تصویر میں دیکھ چکی تھی۔ اس لڑکے نے بھی درخشاں کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

”آپ ہی مراد ہیں؟“

”اور آپ درخشاں؟“

مزید کچھ کہے بغیر وہ ریسٹورنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ درخشاں اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ دونوں ایک خالی میز دیکھ کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

”کیا پئیں گی۔ چائے، کولڈ ڈرنک یا کافی؟“

”میں یہاں کچھ پینے نہیں آئی ہوں۔“

”پھر بھی۔ یہاں بیٹھے ہیں تو اس میز کا کرایہ تو دینا ہوگا۔“

”چائے منگوالیں۔ کولڈ ڈرنک تو ہم باہر کھڑے ہو کر





بھی پی سکتے تھے۔“

”جتنی دیر میں چائے آتی ہے میں اپنی بات شروع کیے دیتی ہوں۔“

مراد نے چائے کا آرڈر دے دیا اور پھر درخشاں کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی فرمایئے۔“

”میں بات کو بے جا طول نہیں دوں گی۔ مختصراً اتنا کہوں گی کہ میں آپ سے شادی کے حق میں نہیں ہوں، آپ میری خاطر اتنا کیجیے کہ مجھ پر الزام نہ آنے دیں خود انکار کر دیں۔“

وہ اس کا عجیب و غریب مطالبہ سن کر سناٹے میں آگیا۔ وہ ایسا خوفزدہ نظر آرہا تھا جیسے وہ ابھی اٹھے گی اور اس کا منہ نوچ لے گی۔

”میں اپنا وہ عیب پوچھ سکتا ہوں جس کی وجہ سے آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گی؟“

”عیب آپ میں کیا ہوگا یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ عیب مجھ میں ہے کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔“

”یہ خیال آپ کو ایک سال بعد آیا ہے؟“

”کسی سے محبت کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ نفرت کا تو کوئی سبب ہوتا بھی ہے، محبت کا سبب کوئی نہیں ہوتا یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ محبت تو مجھے آپ سے کبھی تھی ہی نہیں۔ نفرت کا حق نہیں۔ بس اتنا چاہوں گی کہ آپ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔ مجھے اپنانے سے انکار کر دیں۔“

”یہ اتنا معمولی فیصلہ نہیں جو میں یہاں اکیلا بیٹھ کر کرلوں گا۔“

”میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ آپ گھر جائیں اور اپنی والدہ سے بات کریں۔“

”جی ہاں، میں ان سے کہوں میں آپ لوگوں کی عزتیں اچھال رہا ہوں۔ ایک نہایت نیک اور پارسا لڑکی سے کسی وجہ کے بغیر شادی سے انکار کر رہا ہوں۔ منگنی توڑ دیں۔ محترمہ! یہ منگنی ٹوٹے گی تو صرف اس لیے کہ آپ انکار کر رہی ہیں۔ یہ داستان آپ کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔“

”آپ مرد ہیں۔ اپنی بات منوا سکتے ہیں کہہ دیں کہ آپ نے میرے بارے میں کچھ ایسی باتیں سنی ہیں جس کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔“

”معاف کیجیے گا، یہ منگنی بڑوں نے طے کی تھی انہی کے سامنے ٹوٹے گی اور مطالبہ آپ کی طرف سے ہوگا۔ منگنی ہم نہیں تم توڑ رہی ہو۔“

”اگر آپ کہتے ہیں یہ داستان میرے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوگی تو بے شک میرا نام لے دیجیے۔ کہیے کہ میں ہوٹل میں آپ سے ملی تھی اور آپ سے منگنی توڑنے کا کہا تھا۔“

”محترمہ! یہ بھی میں کیوں کہوں۔ آپ خود اپنی والدہ سے کیوں نہیں کہتیں؟“

”اس لیے کہ اگر آپ نے زبردستی مجھ سے شادی کر بھی لی تو میں نہ آپ کو خوش رکھ سکوں گی نہ خود خوش رہوں گی، اگر آپ جہنم خریدنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ریسٹورنٹ سے نکل گئی۔ اس نے رکشا کا انتظار بھی نہیں کیا اور پیدل ہی گھر کی طرف چل دی۔

وہ مراد کے دل میں شک کا ایسا بیج بو آئی تھی کہ اسے یقین تھا مراد کی طرف سے انکار کا پیغام آجائے گا۔ اس کا نام درمیان میں آیا تو یہ بھی اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

وہ انتظار کرتی رہی کہ ادھر سے کیا جواب آتا ہے۔ دوسری طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ اسے یہ خیال بھی ہو رہا تھا کہ اگر مراد نے چپ سادھ لی تو کیا ہوگا۔ اسی کشمکش میں چار دن گزر گئے لیکن پانچویں دن مراد کی والدہ کا فون آگیا۔ وہ جمیلہ خاتون سے ملنے آنا چاہتی تھیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن ان کا لہجہ غالباً ایسا تھا کہ جمیلہ خاتون نے بھی محسوس کیا اور درخشاں کو بھی بتایا۔

”مجھے کچھ اکھڑی اکھڑی لگ رہی تھیں۔ بڑی رکھائی سے بات کر رہی تھیں۔ میں ابھی بات ہی کر رہی تھی کہ فون کھٹاک سے بند کر دیا۔“

”کبھی کبھی لائن بھی کٹ جاتی ہے اماں۔“

”مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کسی نے ان کے کان بھر دیے ہیں۔“

”کان کون بھرے گا؟“

”تمہاری پھوپیاں کیا کم کٹ کھنی ہیں۔ میں نے خوشی میں آکر انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں ان کے گھر لے کر بھی گئی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی وہ آگ لگائیں گی۔“

”اماں تم بھی تو عقل مندی کے کام کرتی ہو۔ خیر انہیں آنے تو دو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو آپ کچھ اور سمجھ رہی ہوں۔“

”دیکھو بھیا، مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں۔“

درخشاں سمجھ رہی تھی وہ کیا بات کرنے آرہی ہیں لیکن وہ پریشان ہونے کے بجائے خوش تھی کہ داستان مکمل ہوگی۔ آخر وہ دن آہی گیا جب مراد کی والدہ اور اس کی دونوں



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

بہنیں اس کے گھر پہنچ گئیں۔ گاڑی سے اترتے ہی ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کیا ارادہ لے کر آئی ہیں۔ درخشاں جان بوجھ کر ان کے ساتھ نہیں بیٹھی کہ جب کوئی بات ہوگی تو اماں خود اسے بلا لیں گی۔ وہی ہوا کچھ دیر بعد جمیلہ خاتون غصے میں بھری ہوئی باہر آئیں۔

''تم مراد سے ملی تھیں؟''

''میں کیوں ملنے لگی۔ میں نے تو انہیں آج تک سامنے دیکھا بھی نہیں ہے مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''اس کی ماں کہہ رہی ہے کہ تم اس سے ملی تھیں اور اس سے کہہ کر آئی ہو کہ وہ منگنی توڑ دے۔''

''جھوٹ بولتی ہیں وہ۔ اماں قسم لے لو جو میں اس سے ملی ہوں۔ آخر ان لوگوں کے مقاصد کیا ہیں؟ کیا چاہتی ہیں وہ؟ اگر انہیں منگنی توڑنی ہے تو توڑ دیں لیکن کسی پر الزام تو نہ دھریں۔ اپنے بیٹے سے جا کر پوچھیں کہ وہ کس کے دام میں پھنسا ہوا ہے کیوں منگنی توڑنا چاہتا ہے۔''

''ہاں بات تو یہی ہے لیکن انہوں نے بہت گھٹیا راستہ اختیار کیا ہے۔ منع کرنے کے اور بھی طریقے تھے۔ یہ الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ بس تو ان کے سامنے آ کر کہہ دے کہ تو مراد سے نہیں ملی پھر دیکھ میں انہیں کیسا ذلیل کرتی ہوں۔''

درخشاں تو کھیل بگاڑنے کو تیار ہی بیٹھی تھی۔ ماں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچی اور ان پر برس پڑی۔ جمیلہ خاتون تو ان کی بے عزتی کیا کرتیں جو اس نے کی۔ سارا الزام مراد کے سر تھوپ دیا۔ ان لوگوں کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا جس سے وہ ثابت کرتیں کہ درخشاں مراد سے ملی تھی۔ منگنی تو انہیں ختم کرنی ہی تھی یہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

''اگر یہ بات غلط بھی ہے تو بھی ہم نے لڑکی کی زبان درازی دیکھ لی۔ اچھا ہوا ہم بال بال بچ گئے۔ ایسی لڑاکا لڑکی کو ہم اپنی بہو نہیں بنا سکتے۔ اس قصے کو یہیں ختم کرو۔ میں منگنی توڑتی ہوں۔''

''میری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔ میری تحقیق تو اب مکمل ہوئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے ہم بچ گئے۔ منگنی ٹوٹنے کا داغ اتنا طلاق کا نہیں۔''

اتنی بے عزتی کے بعد کون کہیں نکلتا ہے۔ وہ یوں اٹھیں جیسے کسی نے دھکے دے کر نکالا ہو۔

ان کے چلے جانے کے بعد جمیلہ خاتون کا طیش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مراد کے گھر والوں کو جھولیاں پھیلا پھیلا کر کوس رہی تھیں۔ درخشاں بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''اماں! انہیں اگر منگنی ختم کرنی ہی تھی تو مجھ پر الزام تو نہ لگاتے۔ انہوں نے یہ کیوں کہا کہ میں مراد سے ملنے گئی تھی۔''

''بیٹا! اسی سے تو خاندان کا پتا چلتا ہے۔ پیسا آ جانے سے خاندان تھوڑی بدل جاتا ہے۔ اچھا ہوا ہم پھنسنے سے بچ گئے۔ میری عقل مندی دیکھو۔ میں نے اسی لیے ایک سال تک منگنی رہنے دی تھی تاکہ حقیقت سامنے آنے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ ویسے تو فکر مت کر۔ میں نے دو چار سے کہا ہوا ہے۔ کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ آ ہی جائے گا۔''

درخشاں نے داستان کا ایک حصہ مکمل کر لیا تھا۔ اب اسے نقاش سے کہنا تھا کہ وہ اپنی منگنی ختم کرلے اور اس کے گھر رشتہ لے کر آئے۔

وہ کئی دن سے مسلسل رابطے کی کوشش کر رہی تھی لیکن نقاش سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ تھک ہار کر وہ اس کے اسٹوڈیو پہنچ گئی۔ یہاں وہ ایک دو بار اور بھی آ چکی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس میں اس کے دو اور ساتھی بھی کام کرتے تھے۔ اسی لیے وہ یہاں آنے سے گریز کرتی تھی لیکن اب آنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ ایک روز اس کے والد یہاں آئے تھے۔ دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کے بعد سے ہم سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔

''کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

''اس کے والد نے اس کی کہیں منگنی کر دی تھی۔ وہ اب چاہ رہا ہے کہ اس کی منگنی توڑ دی جائے۔''

''خیر یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے تو ایک تصویر کے بارے میں اس سے بات کرنی تھی۔ اس لیے چلی آئی۔ میں پھر فون کر کے دیکھوں گی۔ شاید بات ہو جائے۔''

وہ چلی آئی۔ شام کو اس نے پھر فون کیا اور فون مل گیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ خاندان میں بہت جھگڑے ہو رہے ہیں۔ اس کی منگیتر چونکہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی اس لیے پورا خاندان ملوث ہو گیا تھا۔ اس کے والد کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا اس لیے اس پر بہت دباؤ پڑ رہا تھا۔ خاندان کے لوگ اسے فون کر کر کے پریشان کر رہے تھے اس لیے اس نے فون بند کر دیا تھا۔

''یہ تو سوچا ہوتا میں کتنی پریشان ہو جاؤں گی۔''

''مجھے احساس تھا لیکن سوچ رہا تھا کسی خوش خبری کے بعد ہی تمہیں فون کروں گا۔''



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
پریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں اس کال کو خوش خبری سمجھوں؟"
"ابھی نہیں لیکن بہت جلد معاملات طے ہوجائیں گے۔"
اگلے ہی دن اس کا فون آگیا۔ اس کی منگنی ختم ہوگئی تھی۔
"بس ذرا معاملہ ٹھنڈا ہوجائے پھر میں والد صاحب کے ساتھ تمہارے گھر آؤں گا۔"

درخشاں خود بھی یہ چاہتی تھی کہ ابھی کچھ دن ٹھہر کر وہ اس کے گھر آئے تو اچھا ہے۔ کہیں اس کی والدہ کو کچھ شک نہ ہوجائے۔ اس دوران وہ دونوں گھر سے باہر ملتے رہے۔ درخشاں نے ایک ٹیوشن کا بہانہ کرکے کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر رہنے کا موقع نکال لیا تھا۔

گھر کا ماحول پھر اپنی جگہ آگیا تھا۔ علی کی آوارگیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ اب وہ نشے کی حالت میں گھر بھی آنے لگا تھا۔ جمیلہ خاتون کی سختیاں دم توڑنے لگی تھیں۔ علی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ طبیعت کا برا نہیں تھا لیکن نشے کی لت نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کردی تھیں۔ کبھی وہ اتنا میٹھا بن جاتا کہ جمیلہ خاتون کو اس پر پیار آنے لگتا کبھی زہر سے زیادہ کڑوا ہوجاتا۔ ایسی غلیظ زبان استعمال کرتا کہ دیواریں بھی اپنے کان بند کرلیں۔

ایک روز درخشاں نقاش سے ملنے گئی تو وہ معمول سے زیادہ خوش تھا۔

"تم اگر کچھ دیر اور نہ آتیں تو میں تمہیں فون کرکے بلانے والا تھا۔"
"کیوں ایسی کیا بے تابی ہوگئی؟"
"تم بھی سنوگی تو فخر سے گردن تن جائے گی۔ فرانس میں میری تصویروں کی نمائش ہونے والی ہے۔"
"سچ! یہ تو واقعی بہت بڑی خوش خبری ہے۔"
"مزے کی بات یہ ہے کہ یہ نمائش میں نہیں کررہا ہوں۔ وہاں کے آرٹسٹوں نے مشترکہ طور پر اس نمائش کا اہتمام کیا ہے۔ پچھلے دنوں میری ایک تصویر کی بہت دھوم مچی تھی۔ اسی تصویر سے متاثر ہوکر یہ نمائش ہورہی ہے۔ مختلف شہروں میں تقریباً بیس دن تک یہ نمائش ہوگی۔ اس کے بعد دیکھنا میری شہرت بین الاقوامی سرحدوں کو چھونے لگے گی۔ میرا اپنا ملک بھی میری قدر کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔ اس کے بعد ہم شادی کریں گے تو سوچو اس شادی کی خبریں کہاں کہاں شائع نہیں ہوں گی۔ تم دنیا کے بہت بڑے آرٹسٹ کی بیوی کہلاؤ گی۔ والد صاحب کہہ رہے تھے، تمہاری منگنی ختم ہوگئی ہے جہاں چاہتے ہو وہاں شادی کرلو۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا ہے کہ فرانس سے واپس آتے ہی ان کے لیے ایک عدد بہو کا انتظام کردوں گا۔"

"تو کیا تم بھی فرانس جاؤ گے؟"
"مجھے تو جانا پڑے گا۔ میرے اعزاز میں وہاں تقاریب ہوں گی۔ ہزاروں ڈالرز کا نذرانہ ملے گا۔ میں تمہیں بھی ساتھ لے جاتا لیکن ہفتے کے اندر اندر روانگی ہے۔ اتنی جلدی شادی کیسے ہوسکتی ہے؟ شادی کے بکھیڑوں میں پڑوں گا یا جانے کی تیاری کروں گا؟"
"میں اتنے دن تمہارے بغیر کیسے گزاروں گی؟"
"اخباروں میں خبریں پڑھ پڑھ کر اور کیسے۔ روزانہ میرے نام کے قصیدے شائع ہوں گے۔ بیس دن چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔ واپس آتے ہی میں تمہارے گھر رشتہ لے کر آؤں گا۔ اتنی شہرت ہوچکی ہوگی کہ تمہاری والدہ انکار نہیں کرسکیں گی۔"

کوئی ایسی مدت نہیں تھی۔ بیس دن یوں گزر جاتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ پیروں میں زنجیر ڈال کر اسے روک لیتی۔

نقاش آرزو اتنا مصروف ہوگیا تھا کہ اس ایک ہفتے میں وہ ایک دن بھی درخشاں سے ملنے نہ آسکا۔ درخشاں اسے رخصت کرنے ایئرپورٹ تک نہ جاسکی۔ جاتی بھی تو کس رشتے سے۔ اس نے بس اگلے دن کے اخبار میں پڑھ لیا کہ مایہ ناز مصور نقاش آرزو کی فرانس روانگی۔

دن پر دن گزرتے جارہے تھے۔ وہ تو یہ کہہ کر گیا تھا کہ اخبارات اس کی خبروں سے بھرے ہوں گے۔ قصیدے شائع ہوں گے لیکن ایک خبر کے سوا کوئی خبر تک نہیں چھپی۔ وہ تمام قابل ذکر اخبارات روزانہ خرید کر لاتی اور مایوس ہوکر دور پھینک دیتی۔

اس کی تعریفوں کے پل تو کیا باندھے جاتے ایک دن خبر آئی تو یہ "مصور نقاش آرزو فرانس میں ایک حادثے کا شکار ہوکر جاں بحق۔"

اس نے اخبار کے پرزے کرکے ہوا میں اچھال دیے۔ دوسرا اخبار اٹھایا۔ دیوانوں کی طرح خبر ڈھونڈنے لگی کہ شاید اس اخبار میں یہ ہو کہ وہ زخمی ہوا ہے۔ اس اخبار میں بھی ہلاکت کی خبر تھی۔ اس نے اس اخبار کو بھی پرزے پرزے کیا اور ہوا میں اچھال دیا۔ پھر اخباروں کے پرزے ہوتے رہے۔ پرزوں کے ساتھ ساتھ اس کے قہقہے بھی ہوا میں بکھرنے لگے۔ جمیلہ خاتون کمرے میں آئیں تو سمجھ ہی میں نہ آسکا کہ ہوا کیا ہے۔ کمرے میں ہر طرف





اخبار بکھرے ہوئے تھے اور درخشاں دیوانہ وار قہقہے لگا رہی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی اس کے قہقہے آنسوؤں میں بدل گئے۔ گلے لگ کر خوب روئی۔ اچانک وہ پھر قہقہے لگانے لگی۔ جمیلہ خاتون کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ درخشاں کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی علی کے کمرے میں گئیں۔ اتفاق سے وہ گھر پر تھا۔ اس نے جو سنا تو وہ بھی بھاگتا ہوا آیا۔ بہن بھائیوں میں کچھ دنوں سے بول چال بند تھی لیکن آخر بھائی تھا۔ بہن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ جیسے تیسے گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے کر بھاگا ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد بتایا کہ یہ لڑکی اچانک کسی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔

یہ راز نہیں کھلتا تھا کہ اس نے اخبار کیوں پھاڑے یا اخبار پڑھ کر پاگل پن کا دورہ پڑا؟ پھر یہ بھی سوال اٹھتا تھا کہ اس نے صرف اخبار ہی کیوں پھاڑے۔ کمرے میں رکھی اور چیزوں کو ہاتھ کیوں نہیں لگایا۔ اخبار میں ایسی کیا خبر تھی جس نے اسے صدمہ پہنچایا۔ یہ صرف اسی وقت معلوم ہوسکتا تھا جب درخشاں اس پاگل پن سے نکلے تو شاید کچھ بتاسکے۔

ڈاکٹروں کو یہ بھی شک تھا کہ شاید شادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ پاگل پن کا شکار ہوئی ہے لہٰذا انہوں نے ہدایت دی کہ جیسے ہی اس کی طبیعت بحال ہو اس کی شادی کردی جائے۔ اسے ایک اسپتال میں داخل کرادیا گیا۔

"آپ کسی نقاش کو جانتی ہیں؟" ڈاکٹروں نے مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد جمیلہ خاتون سے پوچھا۔
"نہیں، اس نام کے تو کسی آدمی کو ہم نہیں جانتے۔"
"بے ہوشی کے عالم میں وہ کہہ رہی تھی، نقاش تم جلدی آجاؤ ورنہ گھر والے میری شادی کہیں اور کردیں گے۔"
"معلوم نہیں یہ نام اس کے ذہن میں کہاں سے آگیا۔ اس کے منگیتر کا نام تو مراد تھا اور یہ منگنی ٹوٹ بھی گئی۔"
"یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لڑکیاں تصور میں کوئی نام آباد کرلیتی ہیں۔ یہ نام ہے بھی رومانٹک سا۔ ممکن ہے یہ فرضی نام ہو۔ بہرحال ہم اور کوشش کریں گے۔ اگر تفصیلات معلوم ہوئیں تو ہم آپ لوگوں کو ضرور بتائیں گے۔ ٹھیک ہوجانے کے بعد آپ اس سے پیار سے پوچھیے گا اور اگر کوئی نقاش نام کا لڑکا ہے تو اس سے شادی کرنے میں دیر نہ لگائیے گا ورنہ یہ دورہ پھر بھی پڑسکتا ہے۔"

وہ پندرہ دن اسپتال میں رہ کر گھر آگئی لیکن اب بھی حالت یہ تھی کہ جیسے کسی اجنبی جگہ آگئی ہو۔ دن دن بھر دیواروں کو تکتی رہتی تھی۔ کسی نے کھانے کو دے دیا تو کھالیا۔ بات کرلی تو جواب دے دیا۔ جمیلہ خاتون اسے دیکھ دیکھ کر کڑھ رہی تھیں۔ بیٹی کو اس حال میں دیکھ کر خود ان کا حال یہ ہوگیا کہ چہرے پر اچانک جھریاں نمودار ہوگئیں۔ بال کچھ سیاہ تھے کچھ سفید اب بالکل سفید ہوگئے۔

درخشاں کی دوائیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ علاج ہورہا تھا۔ اس دوا ہی کا اثر تھا کہ رفتہ رفتہ اس کے ہونٹ ہنسی سے واقف ہونے لگے۔ اس کی سنبھلتی ہوئی حالت کو دیکھ کر جمیلہ خاتون کی ہمت ہوئی۔

"بیٹی تو کسی نقاش کو جانتی ہے؟" جمیلہ خاتون نے بڑے پیار سے پوچھا۔
"کون نقاش؟"
"تو جب اسپتال میں تھی تو بے ہوشی کے عالم میں اسے پکار رہی تھی۔"
"بے ہوشی میں تو میں نے اور نہ جانے کیا کیا بتایا ہوگا۔ ہر بات صحیح تھوڑی ہوگی۔ میں تو اس نام سے واقف نہیں۔"
"اگر تو کسی نقاش سے واقف ہے تو بتادے۔ میں اس سے تیری شادی کرادوں گی۔ اس کا خاندان کیسا بھی ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ تو بتا تو سہی وہ ہے کون؟"
"اماں میں کیسے بتاؤں میں کسی نقاش کو نہیں جانتی۔ اور میری شادی کو تو آپ بھول جائیں۔ میں کسی سے شادی نہیں کروں گی۔ مٹی یہ چلتے چلتے مٹی میں سو جاؤں گی۔"
"ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں تیری شادی کردی جائے۔ یہی تیرا علاج ہے۔"
"بکواس کرتے ہیں ڈاکٹر۔ کسی نے اگر شادی کا نام بھی لیا تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔"

جمیلہ خاتون خاموش ہوگئیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ غصہ اتر جائے گا تو خود ہی تیار ہوجائے گی۔ وقت نے پھر آگے بڑھنا شروع کردیا۔ درخشاں کی حالت میں صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ وہ کبھی کبھی باہر جانے لگی تھی۔ گھر میں آتے ہی پھر اداس ہوجاتی تھی۔ شادی کے نام پر تو ایسی بھڑک جاتی کہ سنبھالنا مشکل ہوجاتا تھا۔

اس حادثے کا البتہ اتنا فائدہ ہوا تھا کہ علی کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونے لگا تھا۔

"باجی! ایک بات کہوں۔" یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسے باجی کہہ کر مخاطب کررہا تھا ورنہ ہمیشہ وہ اس کا نام ہی لیتا رہا تھا۔
"کیا بات ہے، آج مجھے باجی کہہ رہے ہو؟"
"باجی وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنالیا جاتا ہے۔"



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

www.paksociety.com
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کتنے پیسے چاہئیں؟"
"میں پیسے مانگنے کی نہیں کمانے کی بات کر رہا ہوں۔"
"کہیں نوکری مل گئی ہے؟"
"اسی کی تو بات کرنے آیا ہوں۔ آپ جہاں نوکری کرتی تھیں۔ وہاں جو اکرام صاحب ہوتے ہیں جنہوں نے آپ کے لیے رشتہ بھی بھیجا تھا۔ اگر انہیں ایک فون کر دو تو مجھے نوکری مل سکتی ہے۔"
"میں بڑی اچھی لگوں گی ان سے بات کرتی ہوئی۔"
"میں نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔"
"ایسا کون سا وقت پڑ گیا۔ جب تم نے تہیہ کر ہی لیا ہے تو دفتر بہت نوکریاں بہت۔"
"باجی کتنے دن سے تو ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ انٹر پاس کو نوکری کون دیتا ہے؟ ہر جگہ تو سفارش، اس نے اتنی ضد کی کہ درخشاں نے فون تو نہیں کیا البتہ اسے یہ اجازت دے دی کہ وہ اس کا نام لے کر اکرام سے مل سکتا ہے۔ ایک پرچا بھی لکھ کر دے دیا جس پر صرف اتنا لکھا۔
"یہ میرا بھائی ہے۔ اسے نوکری چاہیے۔ مجھ پر احسان ہوگا۔"
یہ قدم بھی اس نے صرف اس لیے اٹھایا تھا کہ علی اس وقت نوکری کرنے کے موڈ میں ہے۔ ناکامی ہوئی تو کہیں ارادہ ہی نہ بدل دے۔ دفتر میں چند اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھے گا تو کچھ عقل آ جائے گی۔ آوارہ لڑکوں کی صحبت سے بھی بچے گا۔
اکرام نے اس کا اتنا خیال کیا کہ پرچا پڑھتے ہی علی کے لیے جگہ نکال لی۔ اب درخشاں کی مروت نے گوارا نہیں کیا کہ فون پر شکریہ بھی ادا نہ کرے۔ اس نے اکرام کو فون کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اکرام نے چند باتوں کے بعد اسے مشورہ دیا کہ وہ شادی کر لے۔ وہ پھر بھڑک گئی۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔
دو سال گزر گئے۔ جمیلہ خاتون اس کی شادی کے لیے کیا کوشش کرتیں جبکہ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ کہہ چکی تھی کہ اگر اسے شادی کے لیے مجبور کیا گیا تو وہ گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔
گھر قبرستان بنا ہوا تھا۔ علی دفتر چلا جاتا تھا۔ درخشاں کو گھر کے کام کاج سے سروکار نہیں رہا تھا۔ گھر کے ہزار کام ہوتے ہیں جمیلہ خاتون کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ علی کی شادی کر دی جائے۔ گھر میں بہو آ جائے گی تو کچھ رونق ہو جائے گی۔ گھر کے کام کاج بھی سنبھال لے گی۔
درخشاں سے مشورہ کیا تو اس نے بھی لاتعلقی سے سہی لیکن اس فیصلے کی تائید کی۔
جمیلہ خاتون کو پھر ایک کام ہاتھ لگ گیا۔ بہو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئیں۔ بہو کے لیے شرط یہ تھی کہ جاننے والوں میں ہو یا جاننے والوں کے توسط سے ہو۔
درخشاں کو معلوم تھا کہ جتنی چھان بین وہ کرتی ہیں بہو ڈھونڈنے میں برسوں لگا دیں گی لیکن ایسا ہوا نہیں کیونکہ علی کی نہ تو تعلیم زیادہ تھی اور نہ ملازمت ایسی کوئی قابل ذکر تھی کہ کسی بڑے خاندان کے نخرے اٹھائے جاتے۔ انہوں نے شروع ہی سے غریب گھر کی لڑکی لانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ جس خاندان میں وہ گئیں اس کے لیے یہی بہت تھا کہ علی کا گھر بہت بڑا تھا۔
جمیلہ خاتون کو اس مرتبہ اتنی جلدی تھی کہ منگنی کا اصول بھی بالائے طاق رکھ کر مہینے بھر میں بہو بیاہ کر لے آئیں۔ بہو آئی تو جیسے گھر میں نیا موسم آ گیا۔ جمیلہ خاتون کی ساری توجہ بہو کی جانب ہو گئی۔ علی کو بھی اب بہن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ درخشاں نے کچھ دن تو اس نئے موسم سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ سب لوگ بیٹھے ہوتے تو وہ بھی ان کے درمیان جا کر بیٹھ جاتی۔ کسی بات پر سب ہنستے تو وہ بھی ہنسنے لگتی لیکن وہاں سے ہٹتے ہی اسے محسوس ہوتا جیسے دل میں کوئی چیز جل رہی ہے۔ اس کی تنہائیاں اداسی سے بھر گئی ہیں۔ کوئی اس کا حق مارنے آ گیا ہے کوئی کام ہو اماں اسے نظر انداز کر کے بہو کو پکارتی ہیں۔ وہی بیٹا جو کل تک ان کی چہیتی تھا آنکھوں کا تارا بن گیا ہے۔ نئی آنے والی کے سامنے اس کی تعریفوں کے پل باندھتی رہتی ہیں۔ اگر بھائی کا بھرم رکھتی ہیں تو اس کی بھی تعریف کریں۔ وہ آہستہ آہستہ سب سے دور ہوتی چلی گئی۔ دراصل اس کا مزاج ہی ایسا ہو گیا تھا کہ خود خوش نہیں تھی تو دوسروں کو بھی خوش نہیں رکھ سکتی تھی بلکہ دوسروں کو خوش دیکھ کر اداس ہو جاتی تھی۔ میں بنجر ہوں تو دوسرے کے باغ میں پھول کیوں کھلے ہوئے ہیں۔ وہ پہلے سے زیادہ تلخ ہونے لگی تو اس نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔
"اماں میں کہیں ملازمت کر لوں؟"
"بیٹا میں تو کب سے سوچ رہی تھی کہ تم سے کہوں لیکن پھر سوچتی تم کہو گی اماں کو پیسوں کا لالچ ہے۔ گھر سے نکلو گی تو کچھ دل بہلے گا۔ چار پیسے بھی ہاتھ میں آ جائیں گے۔ اپنے پیسے اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔"



وہ ایک مرتبہ مردوں کے ساتھ دفتر میں تو نوکری کر کے دیکھ چکی تھی۔ اس مرتبہ وہ بچوں کے کسی اسکول میں نوکری کرنا چاہتی تھی۔ تنخواہ کا لالچ تھا نہیں۔ اس کی منزل تو صرف وقت گزاری تھی۔ اردگرد بہت سے اسکول تھے۔ ان اسکولوں کو کھال کھینچنے کے لیے ہر وقت نئی لڑکیوں کی تلاش رہتی تھی۔ ہزاروں روپے فیس وصول کر کے سیکڑوں تنخواہیں دینے والی یہ تجارت گاہیں ہر موڑ پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس نے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ مقصد اب بھی یہی تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ خوش ہو گئی کہ ننھے فرشتوں کے درمیان وقت گزرے گا تو اس کا نشہ بہت دیر تک رہے گا۔
اس کی توقع کے برعکس اسکول پہنچتے ہی اس کی نفسیاتی گرہیں مزید سخت ہونے لگیں۔ بچوں کو ہنستے چہچہاتے دیکھ کر اس کے اندر اداسیوں کے موسم اتر آئے۔ میں بڑی ضرور ہو گئی ہوں لیکن کھل کھلا کر ہنسنے کے دن ابھی گئے نہیں ہیں۔ پھر میں ہنستی کیوں نہیں۔ میرے یہ قیمتی سکے کون چرا کر لے گیا ہے۔ میرے ہاتھ اتنے چھوٹے کیوں ہو گئے ہیں۔ ستارے دور کیوں چلے گئے ہیں۔ میں معذوری کے دن کیوں کاٹ رہی ہوں۔ سب کے ساتھ کیوں نہیں چل سکتی۔ چلنے والے کیوں مجھ سے آگے نکل جاتے ہیں۔ کیا میرے حالات نے مجھے نفسیاتی مریض بنا دیا ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی مریض کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو درست سمجھ رہا ہوتا ہے، زمانے بھر کو غلط۔ غلطی کا احساس ہو بھی جاتا ہے تو مختلف جواز قطار بنا کر آن کھڑے ہوتے ہیں اور اپنی بات منوا کر چھوڑتے ہیں۔ درخشاں کو بھی اپنی غلطی کا کبھی احساس ہوتا تو کوئی جواز بنا کر دوسرے کو غلط ٹھہرا دیتی لیکن کچھ دنوں سے ایک مثبت تبدیلی اس کے اندر پیدا ہو رہی تھی۔ یہ جواز اسے خود ساختہ معلوم ہونے لگے تھے۔ ایک روز ایک بچہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، درخشاں اپنے ذہن میں اپنے دکھوں کی کتاب کھولے بیٹھی تھی۔ بچے کی ہنسی اسے اتنی زہر لگی کہ فوراً اسے اپنے پاس بلایا اور پھول سے رخساروں پر دو طمانچے ایسے جڑے کہ بچہ بلبلا اٹھا۔ قصور اس کا یہ تھا کہ وہ ہنس رہا تھا۔
وہ جب اسکول سے چھٹی کے بعد گھر گئی تو وہ بچہ اس کے خیالوں میں اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔
"مس میرا قصور کیا تھا؟ مجھے کیوں مارا؟"
"تمہارا یہ قصور کیا کم ہے کہ تم ہنس رہے تھے۔"
"میری امی تو کہتی ہیں بچے رونے پر پٹتے ہیں ہنسنے پر نہیں؟"
"وہ تمہارا گھر نہیں تھا جو تمہاری امی کا حکم چلے گا۔ اسکول پڑھنے کے لیے آتے ہیں ہنسنے کے لیے نہیں۔"
"مگر وہ تو لنچ ٹائم تھا۔"
"کچھ بھی تھا۔ میں نے صحیح مارا۔ آئندہ ہنسو گے تو آئندہ بھی پٹو گے۔ جب میں نہیں ہنستی تو کوئی اور بھی کیوں ہنسے۔"
پھر وہ خود ہی سے کہنے لگی۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ تم نہیں ہنسو گی تو کیا کوئی اور بھی نہیں ہنسے گا۔ وہ بچہ تھا اور اس وقت لنچ ٹائم تھا۔ اگر وہ کسی بات پر ہنس پڑا تو اس میں برائی کیا ہو گئی۔"
دوسرے دن وہ اسکول گئی تو اس نے اس بچے کو اپنے پاس بلایا۔ اسے پیار کیا اور اپنے ساتھ لائی ہوئی دو ٹافیاں اسے دیں۔ وہ خوش ہو گیا۔
"دو ٹافیاں تمہیں مل گئیں اور تم ہنسے تک نہیں؟"
"مس! میں ہنسا تو آپ پھر ماریں گی۔"
"نہیں، میں نہیں ماروں گی تم خوب ہنسو۔"
وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کی اجازت کے باوجود اسے ہنسنے کی ہمت نہ ہوئی اور خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔
وہ اپنی اس تبدیلی پر خود بھی حیران تھی۔ یہ تبدیلی اس کی عادت بننے لگی۔ بچوں کے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگی لیکن یہ عادت اسکول تک محدود تھی۔ گھر پہنچتے ہی وہ اداسی کی چادر اوڑھ لیتی۔ وہ اپنی اس عادت سے بھی تنگ آنے لگی تھی لیکن امید ہی کر سکتی تھی کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح زندگی گزار سکے گی۔ وہ آہستہ آہستہ زندگی کی طرف پلٹ رہی تھی۔ جب کسی کو اپنی کسی کمی کا احساس ہو جائے تو ایسے اسباب خود بخود فراہم ہو جاتے ہیں جو اس کمی کو پورا کر دیں۔ ایسا ہی ایک موقع اس وقت فراہم ہو گیا جب وہ اپنے ایک اسٹوڈنٹ کی دلجوئی کے لیے اس کے گھر گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اسکول سے باہر کسی سے ہنس بول رہی تھی۔
"فرحان آپ کی بہت تعریف کرتا ہے، آپ تو بہت ہنسنے بولنے والی ہیں۔"
اس کے کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ اسی کے بارے میں کہا جا رہا ہے یا کسی اور کے بارے میں۔
وہ وہاں سے واپس آئی تو راستے میں بھی کئی جگہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی نے جگہ بنا لی۔ گھر پہنچی تو مسکراتے ہوئے ماں کو سلام کیا۔ جمیلہ خاتون سلام کا جواب دینا بھول کر اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اس کی تصویر



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر پڑی جو نقاش نے خاص طور پر اس کے لیے بنائی تھی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی اس کی اداسی دراز ہوگئی۔ اسے اس جرم کا احساس ہونے لگا جو کچھ دیر پہلے اس سے سرزد ہوا تھا۔ وہ ہنسنے کی گناہ گار ہوئی تھی جبکہ وہ یہ سوچ کر ہنسنا بھول گئی تھی کہ یہ ہنسی نقاش کی امانت ہے اسے کسی اور پر ظاہر نہیں کرے گی۔ وہ کچھ دیر اس تصویر کی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نیچے گرے۔ وہ آگے بڑھی اور تصویر اتار کر الماری کے پیچھے اس طرح کھڑی کردی کہ ہر وقت اس پر نظر نہ پڑے۔ اس نے اپنی اداسی کا پیرہن تلاش کرلیا تھا۔ اسے میلے کپڑوں میں چھپا رہنے دو۔ اب میں نیا لباس بدلوں گی۔ مرنے والے کے ساتھ مرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ میں اس کی یاد کو اپنی کوکھ میں رہنے دوں گی اور جب کوکھ میں کچھ ہو تو عورت کا زندہ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ میں زندگی کی دعا مانگتی ہوں میرا کمرا قبر کا گڑھا نہیں کھلونوں کا شیلف ہے۔ کوئی کھلونا ٹوٹ جائے تو پورا شیلف خالی نہیں کردیتے۔ جینے کے بہت سے سامان ہیں، ہنسنے کے بہت سے میدان ہیں۔

وہ ہنسنا سیکھ گئی تھی لیکن اس بچے کی طرح تھی جس نے ابھی نیا نیا چلنا سیکھا ہو۔ چلتے چلتے گر پڑے ہنستے ہنستے رونے لگے۔ ابھی میٹھی ہنس رہی ہے ابھی ہونٹوں میں ہنسی دبا کر چپ ہوگئی۔

اپنی اس عادت کو پختہ کرنے کے لیے وہ اپنے اسٹوڈنٹ فرحان کے گھر کبھی کبھی جانے لگی۔ جس طرح بچہ کسی اور کے گھر جاکر وہ کچھ نہیں کرتا جو اپنے گھر میں کرتا ہے یہی حال اس کا تھا۔ گھر میں ہنستے ہوئے ڈرتی تھی یہاں خوب ہنستی تھی۔

فرحان کی والدہ نے اسے فرحان کی سالگرہ کی دعوت دی تو وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ ”یہ دعوت تو فرحان صاحب مجھے پہلے ہی دے چکے ہیں اور میں قبول بھی کرچکی ہوں۔ یہ میرا اور فرحان کا معاملہ ہے آپ بیچ میں کیوں دخل دیتی ہیں۔“

”چلیے ہمیں تو مطلب ثواب سے ہے۔ آپ ہماری نہ سہی فرحان کی مہمان سہی۔ گھر تو ہمارا ہی ہوگا۔“

”میں فرحان کی مہمان ہوں اس لیے مہمان خصوصی ہوئی۔“

”آپ کو پروٹوکول بھی ایسا ہی ملے گا۔“

اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ سالگرہ میں ضرور آئے گی۔

برسوں بعد اس نے قفس سے نکل کر باغ میں چہچہانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے اس تقریب کے لیے نیا سوٹ خریدا۔ بھائی سے گاڑی مانگی اور فرحان کے گھر پہنچ گئی۔

اس وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ وہ وقت سے پہلے پہنچ گئی ہے۔ وہ شاید پہلی مہمان تھی جو پہنچی تھی۔ جلدی آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ گھر والوں کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے وہی تھی۔ پورا گھر اس کے گرد جمع تھا فرحان کی خوشی کا تو ٹھکانا نہیں تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مہمان آنا شروع ہوگئے۔ وہ کتنی ہی اہم سہی باقی مہمان بھی بن بلائے تو نہیں تھے۔ گھر والے ان مہمانوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ آیا کہ وہ اکیلی رہ گئی۔ صرف فرحان اس کے پاس تھا۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھے بیٹھے اکتا گیا۔

”مس باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

”میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”آپ کمال کرتی ہیں کیک تو وہیں کٹے گا۔ سب لوگ وہیں تو بیٹھیں گے۔“

وہ اس کے ساتھ اٹھ کر لان میں آگئی۔ کچھ دیر بعد اندھیرا ہوا تو برقی قمقموں سے کوٹھی روشنی میں نہا گئی۔ روشنی تیز ہو تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ وہ برسوں بعد اپنی تنہائی سے باہر آئی تھی۔ ابھی اتنی بھیڑ کی عادی نہیں تھی۔ زرق برق لباس، میک اپ کی تہیں، ادھر ادھر بکھرے ہوئے قہقہے یہ سب اسے پریشان کررہے تھے۔ وہ کسی کو بتائے بغیر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اسی وقت اعلان ہوا کہ کیک کٹ رہا ہے۔ ایک میز کے گرد عورتوں کا ہجوم لگ گیا۔ وہ میز کی طرف جانے کے بجائے کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں اسی کی طرح تنہا ایک بنچ پڑی نظر آئی۔ یہاں ایک پیڑ بھی اداس کھڑا تھا جو عورتوں کے ہجوم اور اس کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا۔ وہ اس بنچ پر بیٹھ گئی۔ اگر میں فرحان کو بتائے بغیر چلی گئی تو وہ بھری کلاس میں گلہ کرے گا۔ یوں بھی اس مروت سے بعید تھا مجھے تنہائی چاہیے ہے، وہ یہاں میسر ہوگئی ہے کچھ دیر یہاں بیٹھی رہوں تو کیا حرج ہے۔ اس طرف کوئی آئے گا بھی نہیں۔ جب مہمان رخصت ہونے لگیں گے تو وہ بھی فرحان کی والدہ سے اجازت لے کر چلی جائے گی۔

ایک تکلیف دہ یاد نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ایسی ہی ایک پروقار تقریب تھی جب میری منگنی ہوئی تھی۔ انجام کیا ہوا۔ کیسی منحوس تقریب تھی وہ۔ نقاش نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کی تقریب ایسی شاندار کرے گا کہ مہینوں چرچے ہوں گے۔ ہوا کیا تقریب سے پہلے ہی تقریب اجڑ گئی۔ خدا فرحان کو ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ اس نے پھر





سوچا کہ یہاں سے بھاگ کھڑی ہو۔ اس نے غیر ارادی طور پر کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف دیکھا۔ اسے ایک بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ گہرے سرخ رنگ کی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ سر پر فلیٹ کیپ تھی۔ ڈھیلی ڈھالی پینٹ میں وہ عجیب جوکر سا لگ رہا تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی یہ آدمی گزر جائے پھر میں اٹھوں گی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کوئی اس کے پاس آکر رک گیا ہے۔

”اے اداس لڑکی اتم یہاں خود بیٹھی ہو یا میرے استقبال کے لیے کسی نے تمہیں یہاں بٹھایا ہے؟“

”میں یہاں خود بیٹھی ہوں۔“

”ہماری بیٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”آپ فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں۔“

”پھر تم یہاں تنہائی میں آکر کیوں بیٹھ گئی ہو۔ میرے تو بیٹے کا فون آنے والا تھا اس لیے ذرا دیر ہوگئی ورنہ ایسی تقریبوں میں، میں سب سے پہلے پہنچتا ہوں۔“

”مجھے وحشت ہوتی ہے اس بھیڑ بھاڑ سے۔“

اسے ابتدا میں اس بوڑھے سے ڈر لگ رہا تھا۔ بڑے گھروں کے یہ بوڑھے کچھ کم خطرناک نہیں ہوتے لیکن انہوں نے جس پیار سے اسے بیٹی کہہ کر پکارا تھا اس سے اس کی ہمت ہوگئی تھی۔

”بھیڑ بھاڑ سے گھبراتا تو میں بھی ہوں لیکن صحت کے لیے ضروری بھی ہے کہ انسان خوش رہے۔“ وہ اسی بنچ پر بیٹھ گئے۔ ”بیٹی، میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں۔“

”میرا نام درخشاں ہے۔ اس گھر میں ایک بچہ رہتا ہے اس کا نام فرحان ہے۔ میں فرحان کی ٹیچر ہوں۔“

”اوہو ہماری بیٹی تو بولتی بھی ہے۔ زیادہ بولنے سے پھیپھڑوں کی ورزش ہوتی ہے۔ خوب بولا کرو۔ دیواروں سے نہیں آدمیوں سے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے بہت سے دوست ہوں۔ میں تو خوب دوست بناتا ہوں۔ آج ایک دوست کا اور اضافہ ہوگیا جو میری بیٹی بھی ہے اور دوست بھی۔“

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اسے بیٹی کہا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ اسی شفقت نے اسے مجبور کیا کہ وہ ان کے بارے میں کچھ اور جانے۔ ”آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟“

”بوڑھوں کا نام تو کوئی ہوتا نہیں۔ لوگ ان کا نام انکل رکھ دیتے ہیں۔ تم بھی مجھے اسی نام سے پکار سکتی ہو۔“

”میرا مطلب ہے آپ اکیلے ہی اس تقریب میں آئے ہیں؟“

”اکیلا کہاں ہوں تم بھی تو میرے ساتھ ہو۔ تمہاری آنٹی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں اب میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ ایک میرا بیٹا ہے وہ میرے ساتھ رہتا ہے کہیں آتا جاتا نہیں بڑا موڈی ہے۔ یہ میرے دوست کے بیٹے کا گھر ہے اسی رشتے سے آیا ہوں۔ تم مجھے اپنا ایڈریس دو۔ میں تمہارے گھر بھی آؤں گا۔ ملتی رہے گی۔“

اسی وقت فرحان کہیں سے بھاگتا ہوا آیا۔

”مس ڈنر شروع ہوچکا ہے اور آپ یہاں ان کے ساتھ بیٹھی ہیں۔“

درخشاں انہیں اپنا ایڈریس بتانا نہیں چاہتی تھی۔ فرحان نے ... مشکل آسان کردی اور اس کے ساتھ چل دی۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے تھے لیکن وہ عورتوں کی طرف بڑھ گئی اور کچھ دیر کے لیے شکر بھیجا کہ جان بچی۔ ڈنر کے دوران بھی وہ ہاتھ میں پلیٹ لے کر کئی مرتبہ اس کے قریب آئے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے سے آگے بڑھ گئی۔ کبھی سالن لینے کبھی پلیٹ میں کباب ڈالنے کے بہانے۔

ابھی ڈنر ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ چپکے سے وہاں سے کھسک گئی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر انکل نے اسے تلاش کرلیا تو وہ اسے باتوں میں الجھالیں گے اور اسے اب دیر ہونے لگی تھی۔

یہ بداخلاقی ضرور تھی لیکن وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر وہاں سے نکل آئی۔

وہ گھر پہنچی تو معمول کے برخلاف بہت خوش تھی لیکن دیر بہت ہوچکی تھی اس لیے کسی کے پاس بیٹھنے کا موقع نہ ملا اور وہ علیک سلیک کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ بالکل نارمل تھی لیکن شاور لینے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب بستر پر لیٹی تو احساس جرم اس کے قریب آکھڑا ہوگیا۔ اسے وہ بوڑھا یاد آگیا جس نے بڑی شفقت سے اس کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے یہ بداخلاقی کی کہ ان سے مل کر بھی نہیں آئی۔ ایڈریس دینا تو بڑی بات۔ انکل سچ تو کہہ رہے تھے کہ خوش رہنا ہے تو زیادہ سے زیادہ دوست بناؤ۔ یہاں تو جس کو دوست بناؤ وہ رشتہ لے کر آجاتا ہے۔ اس لحاظ سے انکل ٹھیک رہتے، وہ صرف دوست بن کر رہتے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کرلیں کہ ان کے بارے میں فرحان کی امی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ وہ ضرور انہیں جانتی ہوں گی۔ اسے ڈاکٹر نے سکون کی گولیاں دی تھیں وہ کھا کر سوگئی۔

صبح اٹھی تو ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسکول جانے



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM



کے لیے تیار ہونے لگی تو اسے اس بوڑھے کا خیال پھر آ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک نفرت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس بوڑھے آدمی کا خیال مجھے کیوں آ رہا ہے۔ کون لگتا ہے وہ میرا؟ وہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا۔ خدا خدا کر کے تو جان چھوٹی تھی اب پھر اس کا پتا پوچھ کر اسے پیچھے لگا لوں۔

اس کی طبیعت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ ابھی ایک بات سے خوش ہے ابھی اسی بات سے ناخوش۔ ابھی ایک بات مان لی دوسرے لمحے اسی بات کو ٹھکرا دیا۔

وہ اسکول گئی تو فرحان کو دیکھ کر اسے پھر اس بوڑھے کا خیال آیا لیکن اس نے فرحان سے کچھ نہیں پوچھا اور پڑھانے میں مشغول ہو گئی۔

دو چار دن خیریت سے گزر گئے لیکن ایک روز وہ اسکول سے نکلی تو اس نے اس بوڑھے کو اسکول سے باہر کھڑے دیکھا۔ اس نے نظر بچا کر ایک طرف نکل جانا چاہا لیکن اسے فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ بالکل اس کے سامنے آ چکے تھے۔

”ہیلو لیڈی۔“

”انکل، آپ اور یہاں۔“

”تم عجیب بیٹی ہو۔ ہمیں تمہارا گھر تک معلوم نہیں۔ وہ تو اچھا ہوا تم نے بتایا تھا کہ تم فرحان کے اسکول میں پڑھاتی ہو۔ سو میں یہاں آ گیا اور یہ دیکھو تمہارے لیے حلوا سوہن لے کر آیا ہوں۔ شوق سے کھاتی ہو؟“

”میں حبشی حلوا کھاتی ہوں۔ اسے تو زبان پر بھی نہیں رکھتی۔“ اس نے یہ سوچ کر کہہ دیا کہ اچھا ہے واپس لے جائیں گے۔

”میرا بیٹا بھی سوہن حلوا نہیں کھاتا۔ تمہاری اور اس کی پسند کتنی ملتی جلتی ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کل حبشی حلوے لے آئیں گے اپنی بیٹی کے لیے۔“

”نہیں انکل یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں؟“

”تکلیف کیسی۔ تم سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ چلو تمہارے گھر چل کر بیٹھتے ہیں۔ گھر دیکھ لوں گا تو کبھی کبھی آ جایا کروں گا۔“

”آج تو گھر پر کوئی نہیں ہے۔ پھر کبھی آ جایئے گا۔“

”چلو پھر کبھی آ جائیں گے۔“

”اچھا خدا حافظ۔“

”میں رکشا سے آیا ہوں۔ وہ دیکھو رکشا کھڑا ہے۔ تمہیں تمہارے گھر چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔“

”میں تو یہاں سے ٹیوشن پڑھانے جاتی ہوں۔ آپ جائیں میں چلی جاؤں گی۔“

”ارے ہماری بیٹی کتنی محنت کرتی ہے۔ بس کچھ دن کی بات ہے پھر تمہیں اتنی محنت نہیں کرنی پڑے گی۔“

درخشاں ان کے اس جملے پر چونکی ضرور تھی لیکن اس وقت تو اسے بس یہ خوشی تھی کہ اس بن بلائے مہمان سے جان چھوٹ رہی ہے۔ اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بوڑھا اپنے رکشا میں بیٹھ کر چل دیا۔ درخشاں نے دوسرا رکشا کیا اور گھر پہنچ گئی۔

اس دن وہ بہت الجھی ہوئی تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی قصہ ختم ہوا لیکن ان کے اس طرح اسکول آ جانے سے وہ پریشان ہو گئی تھی۔ انہوں نے اسکول دیکھ لیا ہے۔ وہ تو روز آ جایا کریں گے۔ ان سے کہہ سکتی تھی کہ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی لیکن وہ اتنی شفقت سے مل رہے تھے کہ ان کا دل توڑنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ ان سے کیسے پیچھا چھڑائے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہ جانے کس دکھ میں ہیں مجھ سے مل کر اپنا جی ہلکا کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ انہیں کہاں لے کر بیٹھے۔ گھر لائے تو کس رشتے سے لائے۔ ماں سے کیا کہتی۔ بھاوج کو کیا بتاتی۔ ایک بوڑھے آدمی میں اسے کیا دلچسپی ہوتی۔ وہ دو چار ملاقاتوں ہی میں اکتا گئی تھی۔

دوسرے دن اس نے یہ ترکیب نکالی کہ چھٹی کے بعد وہ اسکول کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی اور گھر آ گئی۔ اس کے ضمیر نے اسے ملامت ضرور کی کہ وہ کسی کو دھوکا دے رہی ہے لیکن وہ اور کیا کرتی۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ انکل سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اب وہ ان سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ ایک کشش تھی جو اسے انکل کی جانب کھینچ رہی تھی۔ اس نے وہ پچھلا دروازہ چھوڑ کر سامنے کے دروازے سے باہر آئی۔ اس کی توقع کے خلاف وہ وہاں نہیں تھے۔ بے چارے کب تک آتے آنا چھوڑ دیا ہو گا۔ وہ مایوس ہو کر گھر چلی آئی۔ سو کر اٹھی تو شام ہو چلی تھی اس کا دل ایسا گھبرایا کہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ آج اس نے گاڑی لے لی تھی کہ نہ جانے کتنی دور جانا پڑ جائے۔ فرلانگ دو فرلانگ کے فاصلے پر اسے ایک پارک نظر آیا۔ اس نے گاڑی وہیں پارک کر لی۔ کچھ دیر اس پر فضا پارک میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔ شاید دل بہل جائے۔

وہ پارک کے اندر گئی اور ایک خالی بنچ دیکھ کر بیٹھ گئی۔ بچے ادھر ادھر کھیلتے پھر رہے تھے۔ انہیں پھول کہوں



یا تتلی بچے بھی کتنے معصوم ہوتے ہیں۔ کاش! میں بچی ہی رہتی۔ علی کا بیٹا تھا لیکن ابھی ایک سال کا تھا۔ اس نے سوچا، وہ ذرا بڑا ہو جائے تو اسے لے کر پارک آ جایا کروں گی۔ گھر کے قریب ہی تو ہے۔ اکیلے پارک آتے کوئی اچھا لگتا ہے۔ آدمی خوامخواہ ایسا درخت لگنے لگتا ہے جس میں نہ شاخیں ہوں نہ پتے۔

یہاں بیٹھنے سے واقعی اس کی طبیعت میں بشاشت آ گئی تھی۔ بچے گرتے پھر اٹھ کر بھاگنے لگتے تھے۔ وہ اس منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ بچوں کا یہ کھیل زندگی سے کتنا ملتا جلتا ہے۔ زندگی میں بھی ٹھوکریں لگتی ہیں لیکن آدمی اٹھ کر پھر چلنے لگتا ہے۔ ان بچوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔ یہ کیا کہ گر گئے تو گر گئے۔ میں بھی اب سنبھلنے کی کوشش کروں گی۔ کسی کے چلے جانے یا بچھڑ جانے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ نقاش، مراد، اکرام مجھے معاف کر دینا۔ میں کسی کنارے پر بھی آباد نہ ہو سکی لیکن آباد نہ ہونے اور برباد ہونے میں بڑا فرق ہے۔ میں برباد ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی رگوں میں تازہ لہو گردش کرنے لگا ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ ان رنگوں میں نہا رہی ہے۔ ہوا میں خوشبو ہے اور خوشبو میں حوصلے کی جوت جگمگا رہی ہے۔ اس کے پیروں میں گھنگرو سے بندھ گئے۔ وہ اٹھی اور ہری گھاس پر سفید پاؤں رکھ دیے۔ کچھ دیر چہل قدمی کرتی رہی لیکن وہ جو کہتے ہیں مور ناچتا ہے پیروں کو دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ اس نے کئی جوڑوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے دیکھا تو اداس ہو گئی۔ میں اکیلی کیوں ہوں۔ وہ پھر اپنی بنچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ چند گہرے گہرے سانس لیے اور پارک سے باہر آ گئی۔

دوسرے دن اس کے گھر میں شام اتری تو اسے پھر پارک کا خیال آیا۔ اس نے گاڑی نکالی اور پارک پہنچ گئی۔ ایک اکیلی بنچ پھر تلاش کر لی لیکن زیادہ دیر وہ اکیلی رہ نہیں سکی۔ ایک شناسا آواز نے اس کی تنہائی کو دور کر دیا۔

”ہیلو لیڈی۔“

اس نے گردن گھما کر دیکھا تو انکل کھڑے مسکرا رہے تھے۔

”جس کو میں دوست بنا لیتا ہوں وہ مجھ سے دور رہ نہیں سکتا۔“ انہوں نے کہا اور اس کے برابر آ کر بیٹھ گئے۔

”انکل! آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ آپ پھر اسکول آئے ہی نہیں۔ مجھے آپ کا ایڈریس معلوم ہی نہیں تھا ورنہ میں آ جاتی۔“

گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS
www.paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میں تو اسکول آیا تھا مگر تم شاید نہیں آئی تھیں۔ مجھے بھی تمہارا ایڈریس معلوم نہیں تھا ورنہ میں گھر آجاتا۔''

''میں ایک دن نہیں کئی دن نہیں آسکی تھی۔ بس ہلکا سا بخار ہو گیا تھا۔ خیر چھوڑیے آپ بھی پارک میں آتے ہیں۔''

''بات یہ ہے کہ جب میرا شرارتی بیٹا چھوٹا تھا تو میں اسے لے کر یہاں آیا کرتا تھا۔ اب وہ خبیث کہتا ہے میں بڑا ہو گیا ہوں۔ میرے ساتھ آنے پر تیار ہی نہیں ہوتا۔ میں اکیلا آجاتا ہوں اور یہ سوچ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ وہ بھی ان بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ کھیلتے کھیلتے دور چلا گیا ہے۔ اسی لیے مجھے نظر نہیں آرہا ہے۔ ابھی کہیں سے نکل کر آجائے گا۔''

''آپ تو بہت ہی دلچسپ ہیں لیکن آپ کا بیٹا شاید آپ سے محبت نہیں کرتا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ جان دیتا ہے مجھ پر۔''

''پھر آپ کے ساتھ کیوں نہیں آتا؟''

''نہیں آتا۔ مرضی اس کی لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔''

''اس سے کہیں شادی کر لے۔ شادی کے بعد وہ بیوی کے ساتھ تو ضرور آئے گا۔ آپ کو بھی کمپنی مل جائے گی۔''

''بیٹی، میں تو اس سے کہہ کہہ کر تھک گیا ہوں۔ ایک جگہ منگنی بھی کر دی تھی۔ اس نے وہ منگنی بھی توڑ دی چپ لگ گئی اس کو۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔ بولے تو ایک لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔ فوراً اس کی شادی کر دوں۔''

''اچھا، آپ نے لڑکی بھی دیکھ لی؟''

''اور نہیں تو کیا۔ اور لڑکی بھی ایسی ہے کہ اگر وہ دیکھ لے تو انکار کر ہی نہ سکے مگر وہ تو میرے ساتھ کہیں جاتا ہی نہیں۔''

''آپ کا بیٹا کرتا کیا ہے؟''

''انجینئر ہے بہت بڑا۔''

''آپ کو کھانے پینے کی تو بہت دقت ہو جاتی ہو گی؟ آنٹی تو اس دنیا میں رہی نہیں۔ بہو آجائے تو کھانے پینے کا آرام ہو جائے۔''

''میرے بیٹے نے میرے لیے خانساماں رکھ دیا ہے۔ ایک سے ایک ڈش بناتا ہے۔ کل آنا کوئی ڈش بنوا کر لاؤں گا۔ دونوں بیٹھ کر کھائیں گے۔ ہو سکا تو اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔ وہ بھی تو دیکھے میں نے کیسی دوست بنائی ہے۔ تمہارا کہوں گا تو آجائے گا۔'' یہ آخری الفاظ سرگوشی میں درخشاں کے کان کے قریب منہ لا کر کہے تھے۔

درخشاں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ کسی کو خوش رکھنے سے انسان کو کتنی خوشی ملتی ہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جب وہ اس سے ملتے ہیں ان کی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگتے ہیں۔ اس بوڑھے آدمی سے ملنا اور کچھ دیر کے لیے انہیں خوشی سے ہم کنار کرنا ثواب کمانے کے برابر ہے۔ وہ یہ ثواب کماتی رہی اور ان سے برابر ملتی رہی۔ ہر ملاقات میں وہ اپنے بیٹے کی اتنی تعریفیں کرتے تھے کہ درخشاں یہ سوچنے لگی کہ وہ لڑکی میں ہی تو نہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے دیکھ لی ہے۔ وہ تہیہ کر چکی تھی کہ شادی نہیں کرے گی۔ اس نے گھر میں بھی اعلان کر دیا تھا کہ کوئی اسے شادی کے لیے مجبور نہ کرے لیکن اب وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا ذہنی ماحول تبدیل ہو رہا ہے۔ وہ اب یہ سوچ رہی تھی کہ اگر انکل کے بیٹے سے اس کی شادی ہو جائے تو وہ خوش رہے نہ رہے انکل کو کتنی خوشی ہو گی۔ اس نے ان کے بیٹے کو دیکھا نہیں تھا لیکن اس کا مقصد تو یہ تھا کہ انکل کو زیادہ سے زیادہ خوشی دے۔

وہ ان ملاقاتوں کے دوران مسلسل یہ سوچتی رہی تھی کہ انکل کے دل کا حال کیسے معلوم کیا جائے۔ اس نے کئی مرتبہ ہمت کی کہ انکل سے کھل کر بات کرے لیکن اپنے خیال کی خود ہی تردید کرتی رہی۔ یہ بات اگر اماں کی طرف سے پوچھی جائے تو مناسب ہو گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ماں کو اعتماد میں لیا جائے۔

''اماں، آپ نے ایک روز بھی نہیں پوچھا کہ میں روزانہ پارک کیوں جاتی ہوں۔ کیا میں ایسی فالتو چیز ہوں کہ کسی کو میری پروا ہی نہیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں کیوں جا رہی ہوں؟''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات تھی بیٹا۔ پارک جانا تو اچھی بات ہے۔ وہاں سے فریش ہو کر آتی ہو۔ میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ پارک جانے سے تمہاری صحت پر اچھے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ تم اب خوش رہنے لگی ہو۔''

''خوش رہنے کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کے بارے میں، میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔''

''ایسا کیا ہے اس پارک میں؟''

''وہاں ایک بڑے میاں آتے ہیں۔ ستر سال سے زیادہ ہی عمر ہو گی۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہے۔ نہایت خوش مزاج ہیں لیکن لگتا ہے کوئی بڑا دکھ چھپائے پھر رہے ہیں۔ اس دکھ کو ہنسی میں چھپاتے ہیں۔''

''ہاں بیٹی، دنیا بہت دکھی ہے۔ ہو گا انہیں بھی کوئی دکھ۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ تیری فکر کھائے جاتی ہے۔ تیری اگر شادی ہو جاتی تو میں کتنی خوش رہتی۔''

''اماں، وہ اپنے بیٹے کی بہت تعریف کرتے ہیں۔





مجھے تو لگتا ہے مجھے سنانے کو تعریف کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے میری شکل میں لڑکی ڈھونڈ لی ہو۔ آپ ان سے کہہ کر دیکھیں۔ میں ان کے بیٹے سے شادی کے لیے تیار ہوں۔''

جمیلہ خاتون کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ اگر درخشاں یہ کہتی کہ کل سے سورج مغرب سے نکلے گا تو انہیں اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

''یہ تم کہہ رہی ہو۔ تم شادی کرو گی؟''

''ہاں اماں! یوں کب تک آپ لوگوں پر بوجھ بنی رہوں گی؟''

''انہوں نے کبھی ذکر کیا؟''

''کھل کر تو نہیں کہا لیکن اشارہ میری ہی طرف ہے۔ میں انہیں گھر لے کر آتی ہوں۔ آپ خود ان سے کہیے گا۔''

''پاگل ہو گئی ہے۔ میں ان سے کہوں گی کہ میری بیٹی کی اپنے لڑکے سے شادی کر دو۔''

''اگر آپ خود نہیں کہتیں تو میرا نام لے کر کہہ دیجیے گا۔''

جمیلہ خاتون کے سامنے پھر ایک مجبوری کھڑی تھی، جو انہیں نہ صرف اپنے بلکہ دنیا کے اصولوں سے بھی ہٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔ دنیا کا قاعدہ ہے پیغام لڑکے والوں کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ ان کی بیٹی الٹی گنگا بہا رہی تھی۔ مجبوری یہ تھی کہ درخشاں کے ہونٹوں پر کم از کم چار سال بعد شادی کا نام آیا تھا اور وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے اجازت دے دی کہ وہ ان صاحب کو گھر لا سکتی ہے۔

وہ دن نکلنے کے انتظار میں جاگتی رہی۔ صبح اٹھ کر اسکول چلی گئی۔ اب شام کا انتظار تھا۔ شام ہوتے ہی وہ پارک میں چلی گئی۔ بڑے میاں اس سے پہلے ہی پہنچے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں ستارے سے اتر آئے۔

''میرا بیٹا مجھ سے پوچھ رہا تھا میں اتنی پابندی سے پارک کیوں جانے لگا ہوں؟''

''آپ نے کیا کہا؟''

''میں نے کہہ دیا وہاں میری ایک دوست ہے جو بیٹی بھی ہے۔ تیری طرح نٹ کھٹ تیری طرح اداس۔ اس سے ملنے جاتا ہوں۔ چپ ہو گیا کچھ بولا نہیں۔''

''میں بھی آپ کو ایک خوش خبری دینے آئی ہوں۔''

''کہیں رشتہ تو طے نہیں کر لیا؟''

''ارے نہیں۔ میں نے اماں سے ذکر کیا تھا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ آپ بہت کہتے تھے گھر کا ایڈریس دو۔ آج میں آپ کو اپنے گھر لے کر چلتی ہوں۔''

''ہم یہاں مل تو لیتے ہیں۔ گھر جانا کیا ضروری ہے؟''

''خود ہی تو کہتے تھے اب چل نہیں رہے۔ اگر آپ نہیں چلے تو میں آپ سے کبھی نہیں بولوں گی۔''

''ارے یہ تو بہت برا ہو جائے گا۔ اب تو چلنا ہی پڑے گا۔''

وہ انہیں لے کر گھر آگئی۔ جمیلہ خاتون نے ڈرائنگ روم میں جھانک کر دیکھا۔ ''یہ تو کس خبطی کو لے آئی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں یہ کھسکا ہوا ہے۔''

''اس عمر میں سب ایسے ہو جاتے ہیں اماں۔ ان کا بیٹا تو بہت قابل ہے اور وہ اس کی شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔''

''پھر میں یہیں سے بات آگے بڑھاؤں گی۔''

وہ کہہ کر تو بیٹھ گئی تھیں لیکن اس بوڑھے کی باتوں میں ایسی مشغول ہوئیں کہ اصل بات بھول ہی گئیں۔ یا تو انہیں خبطی کہہ رہی تھیں یا دل جمعی سے ان کے ماضی کے قصے سن رہی تھیں۔ بڑے میاں کو بھی اپنے مطلب کی خاتون مل گئی تھیں۔ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

درخشاں نے کئی مرتبہ ماں کو اشارے کیے کہ وہ اصل بات کی طرف آئیں۔ تب جا کر انہوں نے اصل بات چھیڑی۔

''درخشاں آپ کے بیٹے کی بہت تعریف کرتی ہے۔''

''ارے یہ تو ابھی اس سے ملی نہیں ہے۔ ملے گی تو اس کی دیوانی ہو جائے گی۔''

''کسی دن اسے لے کر آیئے۔ ہم بھی تو دیکھیں۔''

''درخشاں آپ کی بھی بہت تعریف کرتی ہے۔ ایک دن تو کہہ رہی تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ میں ہمیشہ انکل کے ساتھ رہوں۔ میں نے تو یہ صورت نکالی ہے کہ آپ بہو بنا کر اسے اپنے گھر لے جائیں۔''

''یہی تو مصیبت ہے بہن۔ وہ شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔''

''میری درخشاں تو بہت مایوس ہو گی۔ یہ تو چاہ رہی تھی کہ آپ کی بہو بن کر آپ کی خدمت کرے گی۔''

''میں بھلا اپنی بیٹی کو مایوس ہونے دوں گا؟ اس مرتبہ دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ اپنے بیٹے سے صاف کہہ دوں گا کہ درخشاں سے شادی کر دو ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔ پھر دیکھو وہ کیسے نہیں مانتا۔ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے۔ مجھے مرنے تھوڑی دے گا۔''

''تو پھر میں امید رکھوں کہ آپ اپنے بیٹے کو راضی کر لیں گے۔''



SCANNED BY FAMOUSURDUNOVELS

''میں درخشاں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں زندہ رہا تو اسے اپنی بہو بناؤں گا۔ کل نہیں تو پرسوں میں باقاعدہ رشتہ لے کر آؤں گا۔''

انہوں نے درخشاں کے گال پر پیار سے ایک چپت رسید کی اور رخصت ہوگئے۔

انہوں نے اتنے یقین سے بات کی تھی کہ درخشاں دوسرے دن پارک نہیں گئی اور شام ہوتے ہی ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی کہ وہ کوئی خوش خبری سنانے آئیں گے۔ بار بار جا کر دروازے پر بھی دیکھ آتی تھی۔ شام سے رات ہوگئی۔ وہ نہیں آئے۔

ابھی ایک ہی دن گزرا تھا۔ تشویش کی بات نہیں تھی۔ بیٹے کو راضی کرنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ اس کی آنکھیں انتظار میں جلتی رہیں۔ اب وہ واقعی پریشان ہونے لگی تھی۔ انکار کرنے ہی آجاتے۔ آتو جاتے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگلے دن وہ پارک جائے گی۔ شاید ملاقات ہوجائے۔ وہ اسکول سے آتے ہی بے چینی سے ٹہلتی رہی اور پھر شام ہونے سے پہلے ہی پارک پہنچ گئی۔ اس کا وہم اس کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ اس نے ایک ایک جھاڑی میں ایک ایک درخت کے پیچھے دیکھ لیا کہ شاید انکل اسے ستانے کے لیے چھپ گئے ہوں لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھے۔ پارک بند ہونے کا وقت آگیا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔ گھبراتی ہوئی گھر آئی کہ شاید وہ گھر آئے ہوئے ہوں۔ وہ یہاں بھی نہیں آئے تھے۔

اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان کا پتا تلاش کر کے ان کے گھر جائے گی۔ بوڑھے آدمی ہیں کہیں بیمار تو نہیں پڑ گئے۔

وہ اسکول کی لائبریری میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ اندر کے صفحات میں ایک جگہ ان کی تصویر دیکھ کر چونکی۔ پھر اس نے عبارت پر نظر ڈالی۔

''مشہور مصور نقاش آرزو (مرحوم) کے والد نے خودکشی کر لی۔ مرحوم اپنے بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو ابھی تک زندہ تصور کرتے تھے اور اس کی شادی کے لیے بے قرار پھرا کرتے تھے۔ ان کے خانساماں کے ذریعے معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ اس سے وعدہ بھی کر آئے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی اس سے کر دیں گے۔ بیٹا ہوتا تو شادی کراتے۔ انہوں نے مرنے سے ایک دن قبل خانساماں کو بتایا تھا کہ اب وہ اس لڑکی کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتے۔

واضح ہو کہ مرحوم اکیلے رہتے تھے۔ بیٹے کی زندگی میں بھی اور اس کی موت کے بعد بھی۔ بیٹے سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے لیکن مرنے کے بعد ساری محبتیں اس کے نام کر دی تھیں۔

جب رات انہوں نے خودکشی کی خانساماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دو دن کی چھٹی کر لے۔ انہیں کہیں جانا ہے۔ دو دن بعد جب خانساماں آیا تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ محلے والوں کی مدد سے دروازہ توڑا گیا۔ بیڈ روم میں مرحوم ثناءاللہ بیگ کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ فرش پر وہ پستول پڑا تھا جسے انہوں نے اپنی کنپٹی پر رکھ کر چلایا تھا۔''

یہ تحریر اس نے خواب میں پڑھی تھی۔ تعبیر اس کی یہ ہوئی کہ وہ آخری الفاظ پر پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہوگئی۔ اسکول والوں نے اسے اسپتال بھیج دیا۔ وہ ہوش میں آگئی لیکن اس کا شعور کہیں گم ہوگیا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ایک کو دیکھتی تھی اور پھر رونے لگتی تھی ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ لڑکی کسی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ یہ جب اس صدمے سے باہر آسکے گی، اسی وقت ٹھیک ہوگی۔

☆☆☆

عرصہ ہوگیا تھا۔ اس پر پاگل پن کے دورے پڑ رہے تھے۔ کئی مرتبہ الیکٹرک شاکس لگائے گئے۔ وہ کبھی ٹھیک ہوجاتی کبھی چیخنے چلانے لگتی۔ جمیلہ خاتون اس کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ پھر وہ خود بیمار پڑ گئیں اور چند ہی روز میں منوں مٹی نیچے چلی گئیں۔

بھائی بھاوج کب تک اس کی نگرانی کرتے۔ وہ اپنے کمرے میں بند پڑی رہتی یا پھر گلیوں میں نکل جاتی جیسے کسی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔

وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ درخشاں کے بال سفید ہوگئے۔

ایک بڑھیا اب بھی پارک میں نظر آتی ہے۔ درختوں کے عقب میں جھاڑیوں کے پیچھے کچھ ڈھونڈتی ہوئی۔ عجیب بھکارن ہے ہر آنے جانے والے سے پانی مانگتی ہے۔ اس کے پاس پانی کی بوتلیں رکھی رہتی ہیں۔ کچھ پیتی ہے کچھ پھینکتی ہے۔ ایک پیاس کا صحرا ہے جو اس کے اندر آباد ہے۔ پیاسی آنکھیں سیراب ہوں تو پیاس بجھے۔

کچھ واقف حال بتاتے ہیں اس بڑھیا کا نام درخشاں ہے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں :-
✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
We Are Anti Waiting WebSite
واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے
ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں
ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں
اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں
WWW.PAKSOCIETY.COM
Online Library For Pakistan
Like us on Facebook
fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety1